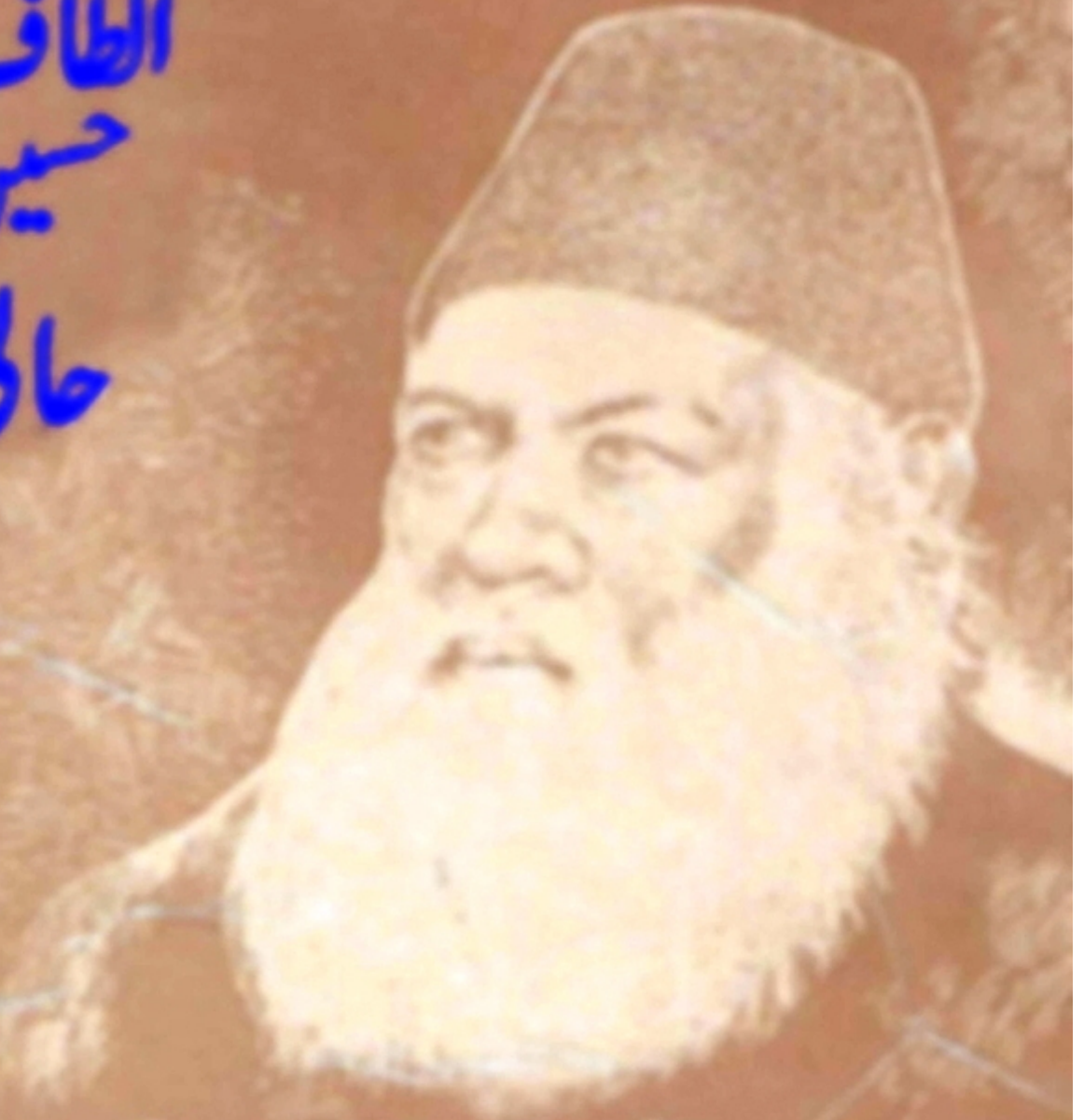


الطاف
حسین
حالی



حیاتِ جاوید

حیاتِ جاوید

جلد اول

مولانا الطاف حسین حالی

ارسلان بکس

علامہ قسطل رُوڈ میرپور آزاد کشمیر

حیاتِ جاوید

مولانا الطاف حسین حالی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر ————— ارسلان محمود

اہتمام ————— امجد محمود

اشاعت ————— مئی 2000ء

طابع ————— زاہد بشیر پرنٹرز لاہور

کلمات ————— قاری محمد حبیب الرحمن

قیمت ————— 550/- روپے

ملنے کا پتہ : —————

ارشاد بک سیلرز

چوک شہیداں، میرپور، آزاد کشمیر

فون : (058610) 42327

49522 - 49503

فہرست

66	تحقیقات	پہلا باب (1817ء - 1838ء)
	آثار الصنادید کا رائل ایشیاٹک	
69	سوسائٹی لندن میں پیش ہونا	25 تاریخ ولادت اور خاندان
69	آثار الصنادید پر نظر ثانی کرنا	30 سرسید کی نضیال
	آثار الصنادید کا فرانسیسی میں	36 سرسید کی والدہ
70	ترجمہ	44 بچپن
	رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں	52 تعلیم
70	سرسید کا آئری فیلو مقرر ہونا	55 عنوان شباب
71	تالیف رسائل مذہبی وغیرہ	
72	دلی سے بجنور کی تبدیلی	دوسرا باب (1838ء - 1857ء)
73	ضلع بجنور کی تاریخ لکھنا	
	آئین اکبری کی تصحیح اس کی	60 ملازمت
	مشکلات اور مشاہیر دہلی کی اس	63 تالیف رسائل مذہبی وغیرہ
75	پر تقریظیں	64 خطاب بادشاہی
	آئین اکبری پر اہل یورپ	فتح پور سے دلی کی منصفی پر
79	کی رائیں	تبدیلی، دوبارہ ہنگ کی صدر
	بجنور میں علاوہ فرائض منصبی	65 امینی پر جانا
	کے کمیٹی رفاہ عام کے تمام کام	کسی قدر تعلیم میں ترقی، آثار
80	سرا انجام کرنے	65 الصنادید لکھنا
		عمارات دہلی و نواح دہلی کی

تیسرا باب (1857ء - 1868ء)

	صاحب ممدوح کا فرخ آباد		ایام غدر کے مصائب اور
	کے وائس رینگل دربار میں ناراضی		خدمات
	کا اظہار کرنا مگر بعد شافی		خدمات غدر کا صلہ اور تعلقہ
105	جواب ملنے کے صاف ہو جانا	81	نچاند پور کے لینے سے
	سرکاری طور پر رسالہ مذکور کے		انکار کرنا
106	مشعد ترجمے ہونا		مراد آباد کی صدر الصدوری پر ترقی
	ملک معظمہ کے اشتہار معافی کا	93	اور کمیشن تحقیقات جائداد
	شکریہ پندرہ ہزار مسلمانوں		منصبہ باغیان کی ممبری
107	کے مجمع میں ادا کرنا		مولانا عالم علی مراد آبادی کا
	رسالہ لائل محمدز آف انڈیا	96	بغوات کے الزام سے
112	جاری کرنا		بری کرنا
	رسالہ تحقیق لفظ نصاریٰ		ترتیب تاریخ سرکشی بجنور
119	لکھنے کی ضرورت	98	مراد آباد میں اسکول
121	انتظام قحط ضلع مراد آباد	98	قائم کرنا
	ہندو مسلمانوں کے یتیم لاوارث		دریغکر اسکولوں کے خلاف رائے
124	بچوں کی بابت مشنریوں سے جھگڑا	99	لکھ کر گورنمنٹ میں پیش کرنا
	تاریخ فیروز شاہی ضیائے ہندی کی		رسالہ اسباب بغوات ہند لکھ کر
125	تصحیح	99	پارلیمنٹ اور گورنمنٹ ہند میں
	تبین الکلام (ابابیل کی تفسیر) اصول		بھیجنا
126	اسلام کے موافق لکھنا		بعض دوستوں کا رسالہ مذکور کے
	سرمد کی چھٹی متعلق بہ تفسیر	102	بھیجنے سے مانع آنا
	مذکور موسومہ جان میولسن آرنلڈ اور		مسٹر سل بیڈن کا رسالہ مذکور کو
	اس پر جان میولسن کا	104	ایک باغیانہ تحریر خیال کرنا
132	ریکارڈ		
	مصر کے ایک عیسائی عالم کی کتاب	105	

- 153 بنارس کی تبدیلی
- 154 ورنیکلر یونیورسٹی کے لیے تحریک
- 158 سوسائٹی کی ترقی کی ایک خاص تدبیر
- 159 ہومیوپیتھک علاج کی حمایت
- 160 اروو زبان اور فارسی خط کی حمایت
- رسالہ ”طعام المل کتاب“ اور انگریزوں
- 167 کے ساتھ کھانے کا پرہیز ترک کرنا
- چوتھا باب (1869ء - 1870ء)
- سفر انگلستان اور درخواست رخصت
- میں اس سفر کی ضرورت گورنمنٹ پر
- 170 ظاہر کرنا
- 173 سفر نامہ میں حب وطن کے خیالات
- 177 لندن کے عائد سے ملنا
- سول انجینئرس سوسائٹی کے جلسہ میں
- 178 شریک ہونا اور وہاں اسپچ دینا
- 160 سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب ملنا
- 180 لطیفہ
- 181 ملکہ معظمہ کی لومی میں شریک ہونا
- 182 پرنس آف ویلز کی لومی میں جانا
- 182 ایتھینیم کلب کی ممبری
- 183 کیمبرج یونیورسٹی میں جانا
- انگلستان کی تعلیم و ترقی پر غور کرنا
- اور انگلستان کے ناقص طریقہ
- 136 ”وحدۃ الادیان“ کا ذکر
- مصر کے اخبار ”اتحاد اسلامی“
- کا ذکر
- تبین الکلام پر فرانس کے مشہور
- 137 عالم گار ساں دتاسی کی رائے
- 138 بی بی کا انتقال
- غازی پور کی بدلی اور وہاں جا کر
- 138 سائنٹک سوسائٹی قائم کرنا
- سوسائٹی کی ضرورت اور اس
- 139 کے مقاصد
- ڈیوک آف آرگائل وزیر ہند
- نے سوسائٹی کا پٹرن اور لغتیتھ
- گورنران شمال مغرب و پنجاب نے وائس
- 140 پٹرن ہونا منظور کیا
- سوسائٹی کے لئے کلکتہ کا
- سفر کرنا اور مجلس مذاکرہ علیہ میں
- 141 سوسائٹی پر فارسی میں لکچر دینا
- 141 غازی پور میں مدرسہ قائم کرنا
- 143 غازی پور سے علی گڑھ کی تبدیلی
- سوسائٹی کا دفتر علی گڑھ میں ساتھ لانا
- 143 اور یہاں آکر اس کو ترقی دینا
- 146 برٹش ایڈوین ایسوسی ایشن قائم کرنا
- اضلاع شمال مغرب میں تعلیمی کمیٹیاں
- قائم کرنا
- 148 سوسائٹی سے اخبار نکالنا
- 149

194	پبلک پر	184	تعلیم پر پمفلٹ لکھنا
	تہذیب الاخلاق کے مقاصد اور اس		اہل وطن کی اطلاع کے لیے ولایت
195	کے مردود و مقبول ہونے کی وجہ		سے مضامین لکھ کر ہندوستان
	تہذیب الاخلاق کا بند ہونا اور پھر	186	میں بھیجنا
198	دوسری اور تیسری بار جاری ہونا	186	خطبات احمدیہ کا لکھنا اور چھپوانا
	کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم		سرسید کی ریس سے ہندوستانیوں میں
199	مسلمانان قائم کرنا		ولایت کی تعلیم
	سرسید کے جوش ہمدردی کی نسبت	188	کا خیال پیدا ہونا
201	محسن الملک کی ایک حکایت		نواب محسن الملک کی رائے سرسید کے
	انعامی اشتہار جاری کرنا اور اس	188	سفر انگلستان کی نسبت
	پر 32 رسالوں کا لکھا جانا جن میں	189	انگلستان سے واپس آنا
201	سے تین کو انعام دیا گیا		اخبار ہوم ورڈ میل میں سرسید
	رسائل مذکورہ سے ایک رپورٹ تیار	189	کی نسبت ایک آرٹیکل
	کرنا جس میں مسلمانوں کی تعلیم کے		
202	موائع بیان کیے گئے تھے		پانچواں باب (1870ء - 1878ء)
	رپورٹ مذکورہ کا گورنمنٹ ہند		
	میں اور تمام لوکل گورنمنٹوں	191	ہندوستان پہنچنا
	میں بھیجنا اور وہاں سے قابل	192	تہذیب الاخلاق جاری کرنا
203	اطمینان جو اہات موصول ہونے		تہذیب الاخلاق اور لندن کے میگزین
204	کمیٹی خزانہ البضاعہ کا انعقاد	193	ٹیلڈ اور اسکینینر میں مناسبت
	کالج کے لیے کثرت رائے سے		تہذیب الاخلاق کے سب سے زیادہ
204	مقام علی گڑھ تجویز ہونا	194	سرگرم مضمون نگار
	لارڈ ناتھ بروک کا دس ہزار کا عطیہ	194	تہذیب الاخلاق کی مخالفت
	اور سروولیم میور اور مسٹر اسپنکی	194	لطیفہ
205	کی امداد		تہذیب الاخلاق کا اثر مسلمان

252	کالج میں اپنی یادگار قائم کیے جانے سے سرسید کا انکار	205	کالج کی اسکیم مرتبہ سید محمود کا گورنمنٹ میں بھیجنا اور اس کے متعلق مولویوں سے فتوے طلب کرنا
255	کالج کا انتظام تعلیم	206	مولوی امداد العلی وغیرہ کی طرف سے مخالفت اور سرسید کا استقلال
256	کالج کلاس قائم ہونا	207	چندہ کے لئے مختلف اضلاع میں سب کمیٹیاں قائم کرنا اور سرسید کا دور دراز شہروں میں دورہ کرنا
257	تفسیر القرآن	206	لطیفہ
	چھٹا باب (1878ء - 1898ء)	209	ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو
269	یجسلیٹو کونسل کی ممبری	221	ابتدائی اسکول علی گڑھ میں قائم ہونا
270	قانون نیلے پیچک	222	مدرسہ قائم ہونے کی عجیب تاریخ کالج کے لیے زمین ملنے کی افسران ضلع کی طرف سے مخالفت اور آخر کو چند شرطوں پر اس کا ملنا
272	قانون تقرر قاضیان	224	سرسید کا پیشن لے کر علی گڑھ آنا
273	مسودہ قانون وقف خاندانی کونسل میں مختلف قوانین پر	225	سرسید کی اسپتج کا ایک فقرہ رؤسائے ضلع علی گڑھ کے جواب میں
276	اسبجیس	226	فوٹویشن اسٹون کا عالیشان جلسہ
	کونسل کی ممبری سے قبل از وقت استعفا دینا	229	چندہ وصول کرنے کی عجیب عجیب تدبیریں
278	کریل گریم کا ریمارک سرسید کی ممبری کونسل پر	246	عمارات کالج
279	ایجوکیشن کمیشن میں شہادت		
279	محمدن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن قائم کرنا		
293	محمدن ایسوسی ایشن علی گڑھ		
296	محمدن ایجوکیشنل کانفرنس		
305	پبلک سروس کمیشن کی ممبری		
307	انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت		

	316	پٹیریا تک ایسوسی ایشن
349	کا اس واقعہ پر افسوس ظاہر کرنا	بنگالی اخباروں کی ناراضی اور سرسید پر اعتراض کہ وہ اپنی قدیم رائے پر قائم نہیں رہے
349	لندن کا اظہار ہمدردی	317
349	ٹائمز آف لندن کی رائے	317
	320	ان کے اعتراض کا جواب
350	پال مال گزٹ اور المویڈ کے ریہارکس	ان کا دوسرا اعتراض اور اس کا جواب
	323	کے۔ سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب
350	پاپونیر اور ٹائمز آف انڈیا کی رائے	323
	327	خطاب ملنے کی تقریب میں رؤسائے علی گڑھ کا ڈنر دینے کا ارادہ اور سرسید کا اس سے انکار
351	مسٹر پورٹر کلکٹر میرٹھ کی اسپینج	327
354	مسٹر آر نڈ کی اسپینج لاہور میں	328
357	بیشار مرثیوں کا لکھا جانا	ڈاکٹر آف لاز ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری
358	ایک انگلش لیڈی کا مرہیہ	328
	330	یونیورسٹیوں کی ڈگریوں کی نسبت سرسید کی رائے
	331	ٹرمٹی بل پر اختلاف
359	میں قوم کی بھلائی کا جوش اٹھانا	331
	337	کالج کے روپے میں غبن
	345	سرسید کی وفات
	347	وفات کی دو عمدہ تاریخیں
	349	تعزیت کے ٹیلیگرام
363	چندہ میموریل فنڈ کے موصول ہونا	نواب لغیٹنٹ گورنر کی طرف سے
	349	صاحب کلکٹر علی
		گڑھ کا جنازہ کی مشابہت اور دفن
364	میں 25 ہزار کا چندہ میموریل کے لیے لکھا جانا	349
		میں شریک ہونا
		ہندوستان اور ولایت کے اخباروں
		دوسرا حصہ

404	مشرکہار سن کی رائے	366	سرسید کی ترقی کے اسباب
404	ہوم نیوز کی رائے	385	ملکی خدمات اور ان کے نتائج
405	برمنگھم ڈیلی گزٹ کی رائے		
405	سینٹ جیمس بجٹ کی رائے		سرکاری خدمات
406	کرل گریم کی رائے		
	رسالہ اسباب بغاوت کے	386	سرکاری ملازمت کی ابتدا
407	بعض نتائج	386	کام سیکھنے کا شوق
	پولٹیکل خدمات پر پالمال گزٹ	387	حسن خدمت
408	کا ریمارک	388	بے غرضی
408	آئندہ عنوان کی تمہید	389	دیانت داری
		390	آزادی
	ملکی و قوی خدمات	395	بے تعصبی اور انصاف
		397	وفاداری
410	ہمدردی کا مادہ	398	جھنڈ
410	خاندان کی محبت	399	استحقاق
411	وطن کی محبت		
411	عملی قوت		پولٹیکل خدمات
412	خارجی اسباب سے متاثر ہونا		
414	مدرسہ مراد آباد		مشرکین ممبر پارلیمنٹ کی
414	سرکاری طریقہ تعلیم پر اعتراض	401	رائے
414	بغاوت کے اصلی اسباب کا اظہار	401	مشرک کا قول
415	انتظام قحط اور قیہوں کی حفاظت		رسالہ اسباب بغاوت پر
415	رسالہ لائل محمد نر آف انڈیا	401	رائیں
416	شرح لفظ نصاریٰ	402	سرسید کی روایت
416	تفسیر یا نبیل	402	سر آکلنڈ کالون کی رائے

433	دسوزی کے پرائیویٹ خطوط	417	سائنٹفک سوسائٹی
438	مسلمانوں کی تعلیم کی تدبیریں	418	سوسائٹی کے بعض نتائج
438	ہندوستان کی تعلیم پر پمفلٹ	418	انجمنوں کا قائم ہونا
	انجمن خواستگار ترقی تعلیم	418	اخباروں کی اصلاح
439	مسلمانان	419	اردو، لٹریچر کی ترقی
440	تہذیب الاخلاق اور اس کے نتائج	420	اردو، ڈکشنری کا نمونہ
442	مدارس اسلامیہ کی کثرت	420	سوسائٹی کی ترقی میں کوشش
444	مولویوں کی راہوں میں انقلاب	421	غازی پور کا مدرسہ
	مسلمانوں کا سلف کی ترقیات سے	421	برٹش ایڈین ایسوسی ایشن
446	مطلع ہونا	422	ہومیوپیتھک علاج کی تائید
	عیسائی متورخوں کے الزامات	422	تعلیمی کمیٹیاں
447	رفع کرنے کا خیال پیدا ہونا	423	اردو، زبان کی حمایت
	تعصب، تقلید، توکل اور قناعت و		مسلمانوں اور انگریزوں میں میل
448	تقدیر کی مزاحمت کا کم ہونا	423	جول کا خیال
448	سیلف ہیلپ کا خیال پیدا ہونا	423	رسالہ طعام اہل کتاب
450	قومیت کا خیال	424	مسٹر بلنٹ کی دعوت میں اسپتج
	اردو، لٹریچر میں انقلاب		اس اسپتج پر سراجلفرڈ لائکس کا
451	پیدا ہونا		تعب، اسپتج کے بعض اشارات
451	مذہبی لٹریچر میں آزادی	426	کی شرح
452	مذہبی مناظرہ کی اصلاح		نمائش آگرہ میں بعض یورپین
453	اردو، شاعری میں انقلاب	427	افسروں سے جھگڑا
	محمدن کالج کی عظمت کا	431	ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو
453	خیال پھیلنا		ولایت میں مسلمانوں کی خیر خواہی
	محمدن کالج اور اس کے نتائج	432	کے خیالات
	کی ہندوؤں	433	دسوزی کے آرٹکل

476	اطاعت کی عادت	454	میں تحریک ہونا
476	قومی لباس کا خیال		مسلمانوں میں ترقی تعلیم
480	کالج کی سوسائٹیاں	454	کے موافق
481	مذہبی تعلیم		1875ء تک مسلمانوں کی تعلیمی
483	یورچین اسٹاف	457	حالت کیا تھی؟
488	کالج پر مدیران سلطنت کی رائیں		محمدن کالج نے 19 سال میں مسلمانوں
488	سرجان اسٹریٹیجی	457	کو کس قدر اعلیٰ تعلیم دی
489	ڈاکٹر ہنٹر		محمدن کالج کا اثر ملک کے دیگر
490	سرایلفورڈ لائسنس	458	حصوں پر
491	سر آکلنڈ کالون	459	تعلیم کی ابتدائی مشکلات
491	مشرکین ممبر پارلیمنٹ		شمالی ہند میں عموماً ولایت کی تعلیم
494	سرایٹوننی مکڈائل	460	کا زیادہ خیال پیدا ہونا
494	لارڈ ایکن		سرکاری ملازمت میں مسلمانوں کی
495	مصطف کاریمارک	463	تعداد کا بڑھنا
	سر سید کی دیگر تدبیریں متعلق بہ		کالج کے طلبہ کی تعداد
496	ترقی تعلیم	465	ملازمت میں
497	ہائی ایجوکیشن کی حمایت	467	محمدن کالج کی خصوصیات
497	پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت		تعلیم کے لحاظ سے کالج میں کسی
510	الہ آباد یونیورسٹی کی مخالفت	468	خصوصیت کے نہ ہونے کی وجہ
511	مصطف کاریمارک	469	سامان تربیت
513	ٹیکنیکل ایجوکیشن کی مخالفت		بورڈنگ سسٹم سے کن فائموں کی
515	محمدن ایجوکیشنل کانفرنس	470	توقع ہو سکتی ہے
516	سول سروس فنڈ اور سول سروس کلاس	471	قومیت کا خیال
516	کونسل کی ممبری	472	ریاضت جسمانی کے موافق
527	نیشنل کانگریس سے علیحدگی	475	پابندی وقت کی عادت

حیات جاوید

یہ ضخیم کتاب جو 1901ء میں سرسید کے انتقال کے بعد شائع ہوئی، حالی کی سات سال کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔ وہ اسے کئی سال سے مرتب کر رہے تھے۔ لیکن انہوں نے کبھی سرسید کو دکھائی اور نہ سرسید نے دیکھنے کی خواہش کی۔ جب سرسید کا انتقال ہو گیا تو حالی کو اس بات کا بڑا قلق ہوا کہ انہوں نے اس کا مسودہ سرسید کو کیوں نہ دکھایا تاکہ انہیں اندازہ ہوتا کہ ان کے بارے میں کیا لکھا جا رہا ہے۔ سرسید کی وفات کے بعد حالی اور بھی تندہی سے اس کی تکمیل میں مشغول ہو گئے تاکہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں ان کے محسن کی سیرت جلد سے جلد پہنچے اور اس سے سبق لے سکیں۔ لیکن وہ اتنی جلدی نہیں کرنا چاہتے تھے کہ کام خراب ہو جائے۔ اپنے ایک خط میں خواجہ سجاد حسین کو لکھتے ہیں: ”لوگ ہر طرف سے اصرار کر رہے ہیں کہ دو تین مہینے کے اندر اندر کتاب مکمل کر دو۔ مگر میں ہرگز کسی کی نہیں سنوں گا اور جب تک میرے حسب دلخواہ سرسید کی لائف مکمل نہ ہوگی اس وقت تک اس کا شائع ہونا نہ چاہوں گا۔ عربی میں ایک مثل ہے کہ کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ کام کتنی دیر میں ہوا بلکہ سب یہ دیکھتے ہیں کہ کام کیسا ہوا۔ لوگ اس بات کا لالچ دیتے ہیں کہ جس قدر جلد لائف تیار ہوگی اسی قدر کثرت سے فروخت ہوگی۔ مگر اس بات کی مجھے مطلق پرواہ نہیں۔ لائف عمدہ نکھی جائے اگرچہ اس کی ایک جلد بھی فروخت نہ ہو“ یہ ہے ایک سچے فن کار کا نقطہ نظر۔

یہ خط اپریل 1898ء کا ہے۔ دو سال بعد مارچ 1901ء میں حیات جاوید چھپ کر تیار ہوئی تو مولانا حالی نے اپنے بیٹے کو خط میں لکھا ”خدا کا شکر ہے کہ یہ فرض ادا ہو

گیا اور یہ کہنے کی کسی کو گنجائش نہ رہی کہ جس شخص نے قوم کی ایسی خدمات کیں قوم میں کسی کو اس کی لائف لکھنے کی توفیق نہ ہوئی۔“

اگرچہ اس سے پہلے حالی سیرت کی دو کتابیں لکھ چکے تھے۔ مگر اس کتاب کے لکھنے میں انہوں نے جو ڈھنگ اختیار کیا اور جو اصول ان کے پیش نظر تھے، ان کی تشریح کے لئے حیات جاوید کے دیباچے کا تھوڑا سا اقتباس پڑھئے:

”ہم نے جو دو ایک مصنفوں کا حال اب سے پہلے لکھا ہے جہاں تک ہمیں معلوم ہو سکیں ان کی اور ان کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور ان کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لکھنے دی لیکن اول تو ایسی باجوہ گرانی چاندی سونے کے ملمعے سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی، اس کے سوا وہ انہیں لوگوں کے حال سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے جنہوں نے اس موج خیز اور پر آشوب دریا کی منجھار میں اپنی ناؤ نہیں ڈالی اور کنارے کنارے ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ صحیح سلامت جا اترے، ان کو سب نے بھلا جانا کیوں کہ ان کو کسی کی یرائی سے سروکار نہ تھا۔ وہ کہیں رستہ نہیں بھولے کیوں کہ انہوں نے اگلی بھیلوں کی لیکھ سے کہیں اوہرا دھر قدم نہیں رکھا۔ لیکن ہم کو اس کتاب میں اس شخص کا حال لکھنا ہے جس نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا ہے۔ تقلید کی جڑ کاٹی ہے، بڑے بڑے علما مفسرین کو لتاڑا ہے، اماموں اور مجتہدوں سے اختلاف کیا ہے، قوم کے بچے پھوڑوں کو چھیڑا ہے اور ان کو کڑوی دوائیں پلائی ہیں۔ جس کو مذہب کے لحاظ سے ایک گروہ نے صدیق کہا تو دوسرے نے زندیق خطاب دیا ہے۔ اور جس کو پالیٹکس کے لحاظ سے کسی نے ٹائم سرور سمجھا ہے تو کسی نے راست باز لبرل جانا ہے۔ ایسے شخص کی لائف چپ چاپ کیوں کر لکھی جاسکتی ہے؟ ضرور ہے کہ اس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے اور اس کا کھرا پن ٹھونک بجا کر دیکھا جائے۔ وہ ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لڑیچہ پر نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی ہے۔ اس لیے مناسب ہے کہ سب سے پہلے اس کی لائف سے اس کی پیروی کی جائے اور نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ دیا جائے۔“

سرسید سے حالی کی عقیدت کی بڑی وجہ اس بلند مقصد اور قومی خدمت سے ان کی محبت تھی، جو سرسید کے پیش نظر تھا۔ حالی سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی رہ نمائی اور اصلاح کا جو حق سرسید نے ادا کیا اور جس طرح اپنی پوری زندگی قومی خدمت میں بسر کی وہ ایک بے مثال کارنامہ ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ قوم سرسید کے عظیم الشان کاموں اور پر خلوص خدمات کو حقیقت اور صداقت کی روشنی میں دیکھے اور اس سے سبق لے اور قوی رہنا ان کی سیرت اور کارناموں سے سیکھیں کہ قوم کی خدمت کیسے کی جاتی ہے۔ لیکن ان کا منشا محض سرسید کے ”فضائل و مناقب“ بیان کرنا اور ”مدلل مداحی“ نہیں تھا۔ جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا ہے۔ بلکہ حالی نے پوری ایمان داری اور صداقت کے ساتھ سرسید کی خوبیاں اور کمزوریاں دکھائی ہیں اور ان کے کارناموں کو تنقیدی نظر سے پرکھا ہے، یہ ضرور ہے کہ انسان کو اپنے عزیز یا دوست کی کمزوریاں ذرا مدہم اور خوبیاں زیادہ نظر آتی ہیں۔ اس لیے اگر حیات جاوید میں سرسید کی تعریف کا پہلو ضرورت سے زیادہ بھاری معلوم ہوتا ہے تو مقام تعجب نہیں۔ جہاں تک عمداً ”مدلل مداحی“ کا سوال ہے، حالی کی تمام ادبی زندگی اور سیرت کی داخلی شہادت اس کے خلاف ہے۔ حالی نے علمی دنیا اور عملی دنیا اور عملی زندگی دونوں میں عمر بھر دیانت داری، انصاف پسندی اور صداقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اس لیے یہ کسی طرح قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ انہوں نے سرسید کے لیے جو کچھ لکھا اس میں حقیقت کی طرف پوری توجہ نہیں کی۔ دوسری طرف یہ بھی دیکھیے کہ حالی پچیس سال تک سرسید کے نہایت قریبی دوست رہے تھے اور انہوں نے ان کی سیرت اور شخصیت کو قریب سے دیکھا اور ان کے کاموں میں ان کا ساتھ دیا اور ہاتھ بٹایا تھا۔ سرسید کے مقاصد اور ان کی صفات اور ان کے نقطہ نظر کو جس طرح وہ سمجھ سکتے تھے دوسروں کے لئے مشکل تھا۔ کسی انسان کی سیرت اور کاموں کو ٹھیک ٹھیک وہی سمجھ سکتا ہے جس نے اس کے ساتھ کافی وقت گزارا ہو اور خلوت و جلوت میں اس کے ساتھ رہا ہو۔ حالی سرسید کے دوست، رفیق کار، معتقد اور دیرینہ ساتھی تھے،

اس لیے ان کی سیرت اور کارناموں سے قوم کو روشناس کرانے کا حق حالی سے زیادہ اور کس کو ہو سکتا ہے؟ چنانچہ انہوں نے حیات جاوید میں سرسید کی ایک مکمل اور جامع تصویر دکھائی اور مورخ و نقاد دونوں کے فرائض کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر انہوں نے فلسفیانہ نقطہ نظر سے سرسید کی زندگی اور کاموں کو دیکھا اور پرکھا ہے۔ اس کتاب میں سرسید کے ساتھ ساتھ قوم کی ذہنی زندگی کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے بقول آل احمد سرور ”اس میں صرف سرسید کی نہیں بلکہ پوری قوم کی ذہنی تاریخ آگئی ہے۔ حالی نے تمام مواد کو سمیٹنے اور مرتب کرنے میں بڑی قابلیت دکھائی ہے۔ ان کا یہ خیال ہے کہ سرسید کے تمام کارناموں کا محرک مذہبی اصلاح کا جذبہ تھا“ بالکل صحیح ہے۔ اور انہوں نے سرسید‘ مذہبی خدمات پر بجا طور پر زور دیا ہے‘ سوانح عمری میں سب سے ضروری چیز وہ ہمدردی ہے جس کے بغیر سوانح نگار ہیرو کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکتا۔ حالی کے ہاں یہ چیز موجود ہے اور اسی وجہ سے ان کی کتاب کو ”مدلل مداحی“ یا ”کتاب المناقب“ اور ایک رخی تصویر کہا گیا‘ حالانکہ سوانح نگاری میں یہ سنگ راہ کا کام دیتی ہے۔“

حیات جاوید کی زبان اور طرز بیان بہت رواں اور سلجھا ہوا ہے باتوں باتوں میں بڑے بڑے مشکل مسائل پائی ہوتے چلے جاتے ہیں۔ نہ کہیں ذہن اٹکتا ہے نہ دماغ ٹھوکر کھاتا ہے۔ ان کے ایک نقاد نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ”حیات جاوید میں تو انہوں نے فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیے ہیں اور ہر لفظ گننے کی طرح جڑا ہوا ہے جو اپنی جگہ سے اٹھایا نہیں جا سکتا....“

لیکن ان سب خوبیوں کے باوجود اگرچہ ”حیات جاوید“ نے شہرت بہت پائی لیکن پھر بھی اسے اتنی مقبولیت نہ حاصل ہو سکی جتنی حالی کی بعض دوسری تصانیف کو ہوئی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ نظر آتی ہے کہ قوم کے نامشروں اور کتب فروشوں نے شروع سے اس سے بے اعتنائی برتی۔ اس قدر قابل قدر اور نتیجہ خیز کتاب کے مقابلے میں

جس کی قدر صرف صاحب ذوق اور علم دوست حضرات ہی کر سکتے تھے، انہوں نے زیادہ بکنے والی کتابوں کی اشاعت میں روپیہ لگانا پسند کیا اور اس لیے کتاب کی اتنی اشاعت نہ ہو سکی جتنی ہونی چاہیے تھی۔

دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آج کل کا زمانہ تیز رفتاری کا ہے لوگوں کی مصروفیات حد سے زیادہ بڑھ گئی ہیں، ہر کام میں عجلت اور ہر چیز میں اختصار پسند کیا جانے لگا ہے۔ ناولوں کی جگہ مختصر افسانے نے لے لی ہے۔ کتابوں کی جگہ ان کے خلاصے پسند کیے جاتے ہیں.... اس لیے ہزار صفحے کی یہ ضخیم کتاب پڑھنا لوگوں کے لیے مشکل ہو گیا ہے۔

شاید ایک اور وجہ یہ بھی ہو کہ سرسید کے بعد ان کی طرف سے غلط فہمیاں پھیل گئیں لوگ سرسید کے اصلی مقصد کو سمجھنے سے قاصر رہے اور ان کی شخصیت سے انہیں زیادہ دلچسپی نہ پیدا ہو سکی۔ اس لیے ان کی سیرت کو پڑھنے اور ان کے کارناموں کو سمجھنے کی زیادہ طلب نہ رہی۔ نئے زمانے میں ایک گروہ یعنی ترقی پسندوں نے سرسید کو انگریزی حکومت کا خیر خواہ اور ساتھی سمجھ کا ناقابل اعتنا جانا۔ دوسرے گروہ یعنی رجعت پسندوں نے ان کی وقتی مصلحت کو ان کا اصول زندگی قرار دے کر ان کی تصویر میں اپنے رنگ بھر دیے۔ یعنی ان کو پورا ابن الوقت بنا دیا۔ حالانکہ اگر ”حیات جاوید“ کا غور سے مطالعہ کیا جاتا تو ان دونوں فریقوں کی غلط فہمی دور ہو جاتی اور سرسید کا مقصد اور مشن آئینہ ہو جاتا۔ ہمارا خیال ہے کہ سرسید کے بارے میں جو غلط فہمیاں ہیں ان کو دور کرنے کی ایک یہی صورت ہے کہ کوئی صاحب نظر مورخ اور ادیب ”حیات جاوید“ کا خلاصہ مرتب کر کے شائع کرے۔ اس طرح ایک طرف سرسید کی سیرت سے قوم روشناس ہو گی۔ دوسری طرف حالی کی یہ ادبی اور قوی محنت سوارت ہو گی اور یہ انمول کتاب جو آج کسمپرسی کی حالت میں پڑی ہے قبولیت کا وہ درجہ پالے گی جس کی وہ حقدار ہے۔

یہاں ہم ”حیات جاوید“ کا ایک اقتباس دیتے ہیں جس میں حالی نے سرسید کی

ترقی کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔

”سرسید کی لائف میں جیسا کہ ان کے ابتدائی حالات پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے بہت سی ایسی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں جن پر ان کی ترقیات کی بنیاد قائم کی جا سکتی ہے۔ قطع نظر ان جسمانی اور اخلاقی قابلیتوں کے جن کے بخشنے میں قدرت نے بہت بڑی فیاضی کی تھی اور جن کے بغیر کوئی شخص بڑا آدمی نہیں ہو سکتا، اتفاقات حسن نے بھی ان کے ساتھ کچھ کم مساعدت نہیں کی۔ وہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جس میں قدیم خاندان کی نیکیاں اور نئے خاندان کی اولوالعزری اور ہمت مجتمع تھی۔ ان کی دوھیال سلطنت کے ایک قدیم متوسل گھرانے کی یادگار تھی اور ان کی انھیال ایک ایسے خاندان سے علاقہ رکھتی تھی جس نے اپنی ذاتی لیاقت، حسین تدبیر اور علم و فضل سے اپنے اقران و امثال میں امتیاز حاصل کیا تھا اور اپنے تئیں زمانے کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ وہ خوش قسمتی سے بچپن میں زیادہ تر اپنی انھیال ہی میں رہے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ انہوں نے اپنے نانا کا عہد اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے لائق ماموؤں کی صحبت برتی ان کی ماں ایک نیک نماؤ، سنجیدہ اور دانش مند بی بی تھیں، جن کی تعلیم و تادیب سرسید جیسے جوہر قابل کے لئے اکسیر کا حکم رکھی تھی۔ انہوں نے حسن اتفاق سے ایسی حالت میں نشوونما پائی کہ نہ ان کی حد سے زیادہ روک ٹوک ہوئی اور نہ ان کو بالکل مطلق العنان چھوڑا گیا۔ وہ پڑھتے لکھتے بھی تھے اور ہر قسم کے کھیل بھی کھیلتے تھے۔ مگر اپنے رشتے داروں کے سوا غیر جنس کے لڑکوں سے کبھی نہ ملنے پاتے تھے۔ نہ ان پر تعلیم کا ایسا بوجھ ڈالا گیا کہ قوائے جسمانی مضطرب ہو جائیں اور نہ ان کی ڈور ایسی ڈھیلی چھوڑی گئی کہ جدھر منہ اٹھ گیا چل نکلے۔

ان کے والد ایک آزاد منش اور تعلقات دنیوی سے الگ تھلگ رہنے والے آدمی تھے۔ گھر کے انتظام اور اولاد کی پرورش اور تربیت کا مدار زیادہ تر بلکہ بالکل سرسید کی والدہ پر تھا جو باوجود فطنت اور رعب و داب کے نہایت متحمل اور بردبار تھیں۔ پس وہ بے جا تشدد اور سختی جو اولاد کی تعلیم و تربیت کے زمانے میں اکثر والدین

سے ظہور میں آتی ہے اور جس سے رفتہ رفتہ اولاد کے دل میں خود اپنی حقارت اور ذلت بیٹھ جاتی ہے سرسید پر کبھی نہیں گزری۔

جوانی کے آغاز میں سرسید کو بچپن کی نسبت کسی قدر زیادہ آزادی حاصل ہوئی وہ اکثر رنگین جلسوں میں شریک ہونے لگے اور شہر کے نوجوان-امیرزادوں سے ملنے جلنے لگے سوسائٹی کا پرچھاواں ان پر بھی پڑا اور پڑنا چاہیے تھا۔ مگر ہونہار نوجوانوں کی لغزشیں بھی ان کی اصلاح کا باعث ہوتی ہیں۔ وہ ایک ٹھوکر کھا کر ایسے چوکنا ہو جاتے ہیں کہ پھر عمر بھر ٹھوکر نہیں کھاتے۔ بھائی کی عبرت انگیز موت سے دل پر ایسی افسردگی چھائی کہ ہمیشہ کے لیے لہو و لعب سے دست بردار ہونا پڑا۔ مگر چونکہ طبیعت میں آتش گیر مادہ بھرا ہوا تھا وہ آخر کار مشتعل ہوئے بغیر نہ رہا۔ وہی سودا جو غنغوان شباب میں ہواد ہوس کی شکل میں ظاہر ہوا تھا بیس برس بعد حب قومی کے لباس میں جلوہ گر ہوا، اور میر کا یہ شعر سرسید کے حال پر منطبق ہو گیا۔

دل عشق کا ہمیشہ حریف نہر تھا

اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا

جس حد تک کہ سرسید کی تعلیم ہوئی اس کو بھی ان کی ترقی کا مومد سمجھا جا سکتا ہے۔ انہوں نے جیسا کہ پہلے حصے میں بیان ہو چکا ہے، قدیم یا جدید کسی طریقے میں پوری تعلیم حاصل نہیں کی۔ اگر وہ پرانے طریقے کی تعلیم پوری کر لیتے اور علوم قدیمہ کا رنگ ان پر پوری طرح چڑھ جاتا، پھر ممکن نہ تھا کہ کسی دوسرے رنگ کو قبول کرنے کی قابلیت ان میں باقی رہتی۔ وہ تقلید کی بندشوں میں جکڑ جاتے اور تعصب کے تویر تو پردے ان کی آنکھوں پر پڑ جاتے۔ نئے طریقے کی تعلیم بھی ان نتائج تک پہنچانے والی نہ تھی جو سرسید سے ظہور میں آئے۔ یورپ کی اعلیٰ درجے کی سویلریشن اور حیرت انگیز ترقیات جو ایک ہندوستانی طالب علم کے دل پر تعلیم کے ساتھ نقش ہوتی جاتی ہیں وہ آخر کار اس کو اپنے ملک کی ترقی سے مایوس کر دیتی ہیں، یہاں تک کہ وہ ان کوششوں کو جو ہندوستانیوں کی ترقی اور اصلاح کے لیے کی جاتی ہیں، محض

بے سود اور لا حاصل جانے لگتا ہے۔ پس کہا جا سکتا ہے کہ سرسید کا پرانی تعلیم میں ادھورا رہنا اور نئی تعلیم سے آشنا ہونا منجملہ ان اتفاقات حسنہ کے تھا جنہوں نے قوم کی اصلاح کے عظیم الشان کام پر ہاتھ ڈالنے سے انہیں بچھکنے نہیں دیا۔“

(حیات جاوید)

حیات جاوید کی طرف سے اس وقت قوم نے جو بے توجہی برتی اس کا حالی کو بڑا قتل تھا۔ اس لیے نہیں کہ ان کی مجھے سات سالہ جاں کاہ محنت کا یہ ثمر ملا۔ اگرچہ اس کا افسوس ہوتا بھی انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ لیکن حیات جاوید کا مصنف شہرت کا پرستار اور تمسین کا بھوکا نہ تھا۔ وہ کام کا اصلی انعام خود کام کو سمجھتا تھا۔ انہیں رنج اس بات کا تھا کہ انہوں نے اپنے نزدیک مسلمانوں کے محسن اور قوم کے ایک بے مثال فرزند کی یہ سیرت اس خیال سے لکھی تھی کہ قوم اس سے سبق حاصل کرے گی اور اپنی گرتی حالت کو سنبھالنے کی کوشش کرے گی۔ مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی کو ایک خط میں کیسے دل شکستہ انداز میں لکھتے ہیں۔

”اگرچہ اس قلیل عرصے میں کتابیں توقع سے زیادہ فروخت ہو گئی ہیں مگر ایسی قدردانی سے وہی فہم خوش ہو سکتا ہے جو تجارت کے سوا تصنیف و تالیف کا کوئی اور مقصد خیال نہیں کرتا۔ بلاشبہ میں نے کسی سے اشتہار یا ریویو وغیرہ کے لکھنے کی خواہش ظاہر نہیں کہ مگر میرا یہ خواہش نہ کرنا اس بات کا ہرگز مقتضی نہ تھا کہ سرسید کا کوئی دوست کتاب کا بالکل نوٹس نہ لے۔ اور اخباروں کو جانے دیجئے علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ جس کو سرسید کی یادگار کہا جاتا ہے.... اس میں ایک حرف نہیں لکھا گیا۔ اگرچہ میں صدق دل سے اقرار کرتا ہوں کہ سرسید کی لائف جیسی کہ چاہیے تھی ویسی مجھ سے نہیں لکھی گئی لیکن اسی کے ساتھ میں یہ کہتا ہوں کہ میں نے باوجود اپنی ناقابلیت کے اس بارگراں کو اپنے ذمے لے کر سرسید کے تمام اصحاب اور حواریوں کو ایک فرض کفایہ سے سبک دوش کیا ہے۔۔۔“

ایک اور جگہ لکھا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کی بے وقعتی نے ہیرو

کی قدر بھی گھٹا دی ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ آج بچپن برس بعد بھی اردوواں طبقے میں یہ احساس اور بیداری نہ پیدا ہو سکی کہ وہ اس قابل قدر کتاب کی اصلی خوبی اور بڑائی کو سمجھتی۔ حالی کی عظمت اور بڑائی حالی کی خدمات اور کارناموں کا تو ہم بہت کچھ اعتراف کرتے ہیں، لیکن حالی کی تصانیف کی طرف سے یہ بے اعتنائی برتتے ہیں! حالی اور سرسید دونوں کی ادبی، سیاسی اور سماجی خدمات کیا اس کی مقتضی نہیں ہیں کہ نہ صرف حیات جاوید بلکہ سرسید اور حالی کی کل تصانیف کو اہتمام، خوبی اور صحت کے ساتھ شائع کرایا جائے تاکہ آئندہ نسلیں ہم پر یہ الزام نہ لگا سکیں کہ ہم اپنے بہترین سپوتوں اور بہترین ادیبوں تک کے کارناموں سے بے پروائی برتتے رہے۔

صالحہ عابد حسین

پہلا باب :

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سر سید مرحوم کی لائف

پہلا حصہ

۱۸۱۷ء عیسوی سے ۱۸۳۸ء تک
۱۲۳۲ھ سے ۱۲۵۲ھ تک

تاریخ ولادت، خاندان بچپن، تعلیم اور عنفوان شباب

تاریخ ولادت اور خاندان

سید احمد خاں ۵ ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہ باپ کی طرف سے حسینی سید ہیں اُن کا سلسلہ نسب ۳۶ واسطوں سے

سید مہدی قلی خاں وزیر فرخ سیرسنہ اپنی ذرارت کے زلسلے میں ترا بر بہرام خاں کے قریب ایک بڑی حویلی بنائی تھی جس میں دلیر نمانہ فیلعان اور اصطلیل وغیرہ متعدد مکانات تھے اسکو سر سید کے نانا خواجہ فرید الدین احمد سے خرید لیا تھا اور اب تک وہ خواجہ فرید کی حویلی کے نام سے مشہور ہے اس حویلی کے ایک حصے میں جو خواص پورہ کہلاتا تھا سید احمد خاں پیدا ہوئے تھے ۱۲

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے اور جیسا کہ شجرہ نسب مندرجہ بخطبات احمدیہ سے پایا جاتا ہے اُن کے سلسلہ نسب میں سب سے اخیر امام حضرت امام محمد تقی ابن امام موسیٰ رضا علیہما السلام ہیں اور اسی لیے وہ اپنے تئیں تقویٰ سید کہتے تھے۔

جس زمانے میں کہ بنی فاطمہ کو بنی امیہ اور بنی عباس کے ظلم و ستم سے عرب اور عراق عرب میں رہنا دشوار ہو گیا تھا اور اس لیے اکثر سادات کے خاندان وطن مالوٹ چھوڑ کر دور دراز ملکوں میں جا رہے تھے اُسی پر آسٹوب زمانے میں کسی وقت سرسید کے اجداد بھی وامغان میں جو ایران کا قدیم مشہور شہر ہے، چلے آئے تھے اور آخر کار ہرات میں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی تھی غالباً اُن کے بزرگ مہندوستان میں پہلے ہی پہلے شاہ بھہان کے عہد میں آئے ہیں اور اُس وقت سے اکبر شاہ ثانی کے زمانے تک اُن کو اس سلسلہ علیہ کے ساتھ برابر کسی نہ کسی قدر تعلق رہا ہے۔

سید محمد دوست جو کہ سرسید پانچ پشت اوپر ہیں، دکن کی مہم میں اورنگ زیب عالمگیر کے ساتھ تھے، وہ مع اپنی جمعیت کے ایک مورچہ پر متعین تھے جب اس مورچہ کو انھوں نے تنہا بلا شرکت کسی دوسرے افسر کے فتح کر لیا تو عالمگیر نے اُن کو یکم بہادر کا خطاب دیا تھا، اس کے بعد وہ اپنے وطن ہرات کو چلے گئے اور پھر ہندوستان میں واپس نہیں آئے، مگر لنگہ بیٹے سید برہان نے وہاں سے آکر دکن میں سکونت اختیار کی، سید برہان کے بیٹے سید عماد اور اُن کے دو بیٹے سید ہادی اور سید مہدی تھے، سید ہادی جو کہ سرسید کے دادا تھے اُن کو عزیز الدین عالمگیر ثانی کے سہ جلسہ مطابق سنہ ۱۰۶۵ ہجری میں خطاب جواد علی خاں اور منصب ہزاری ذات و پانصد سوار دو اسپہ دسہ اسپہ اور اُن کے بھائی سید مہدی کو بھی وہی منصب

اور قباد علی خاں کا خطاب ملا تھا۔ قباد علی خاں دکن چلے گئے اور وہیں انتقال کیا۔ مگر جواد علی خاں بدستور دلی میں بادشاہ کے پاس رہے جب عالمگیر ثانی کا زمانہ ختم ہوا اور شاہ عالم بادشاہ ہوئے تو سرسید کے دادا کے خطاب میں جواد الدولہ اور اضافہ کیا گیا اور عہدہ احتساب و کروڑوہ شاہجہان آباد اور ۱۵۰۰ جلوبس شاہ عالم مطابق ۱۸۸۸ء میں عہدہ قضاۃ لشکر عنایت ہوا اور ۱۸ شعبان سنہ ہجری کو انھوں نے دنیا سے رحلت کی۔ سرسید کہتے تھے کہ ”سید ہادی فارسی شعر کہتے تھے اور اُن کا پورا دیوان اُن کے ہاتھ کا لکھا ہوا میرے پاس موجود تھا جو غدر کے زمانے میں تلف ہو گیا۔“

سید ہادی کے بیٹے یعنی سرسید کے والد میر متقی ایک آزاد طبعت کے آدمی تھے، اگرچہ شاہ عالم کے زمانے میں اور ننگے بعد اکبر شاہ کے زمانے میں جو درجہ دربار عام اور دربار خاص میں اُن کے والد کا تھا وہی درجہ میر متقی کا بھی رہا مگر چونکہ بادشاہت صرف برائے نام رہ گئی تھی اور اُس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ جن لوگوں کو خطاب اور منصب دے اُس کے لوازمات بھی دے سکے اس لیے جب سید ہادی کے بعد اُن کا خطاب اور منصب میر متقی کو دیا جانا تجویز ہوا تو انھوں نے اُس کو قبول کرنا مصلحت نہ سمجھا۔ مگر چونکہ اُن کو اکبر شاہ کے ساتھ شاہزادگی کے زمانے سے نہایت خلوص اور خصوصیت تھی اس لیے شاہ عالم کے انتقال کے بعد اُن کا ر سوخ دربار میں پہلے سے بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ مٹھن برج سے پیوستہ جو مکان خوابگاہ کے نام سے مشہور تھا اور جہاں خاص خاص لوگوں کے سوا کوئی نہ جاسکتا تھا، میر متقی برابر وہاں جاتے تھے۔ سرسید کہتے تھے کہ ”میں بارہا اپنے والد کے ساتھ اور نیز تنہا بھی اُس خاص دربار میں گیا ہوں۔“

میر متقی کے آبائی سلسلہ میں میر قطبی کے سوا جو مجذوب ہو گئے تھے اور

جن کے لوگ بہت معتقد تھے، اور کوئی باقی نہیں رہا تھا اور ان کی ننھیال خواجہ میر درد کے خاندان سے علافہ رکھتی تھی۔ میر منقی کا موروثی مکان جامع مسجد کے قریب اُس کے گوشہ جنوب مشرق کی طرف تھا جو کئی دفعہ مادر گروی اور مرٹھہ گروی میں لٹ چکا تھا اور اُس کے اکثر حصے منہدم ہو گئے تھے۔ دالان اور کچھ مکان جو باقی رہ گئے تھے، ان میں رہتے تھے اور دن کو جامع مسجد کے مشرقی دروازے پر جو مکانات ہیں، ان میں بیٹھتے تھے۔

اس زمانے میں تشریفائے دہلی تیراکی اور تیراندازی کو ایک جوہر شرافت جانتے تھے۔ میر منقی کو ان دونوں فنوں میں کمال حاصل تھا۔ اکثر مرشد زادے اور شریف زادے ان دونوں فنوں میں ان کے شاگرد تھے۔ خود مر سید نے بھی تیراکی اور تیراندازی ان سے سیکھی تھی۔ مر سید کے ماسوں نواب زین العابدین خاں جو قطع نظر تیراندازی کے تیر اور کمانیں بنانے میں نہایت مشاق تھے، میر منقی ہی کے شاگرد تھے۔ میر منقی اپنی زندگی نہایت آزادی اور بے فکری سے بسر کرتے تھے جس کا اثر سر سید اور ان کی اولاد میں اب تک موجود تھا۔ ان کو حضرت شاہ غلام علیؒ سے جن کی خانقاہ دلی میں مشہور ہے، بیعت تھی اور شاہ صاحب ان پر پدرانہ شفقت رکھتے تھے، ہر روز بعد حلقہ کے ایک مرید جس کو حکم دے رکھا تھا، میر منقی کی زبانی ڈیوڑھی پہنا اور سب چھوٹے بڑوں کی خیر دعائیت پوچھ کر شاہ صاحب سے جا کر عزم کروا دیتا اور جب میر منقی یا ان کے گھر میں کوئی اور بیمار ہو جاتا تو مرزا سفور بیگ صاحب نور جوہی کو جو شاہ صاحب کے خلیفہ اور مریدان خاص میں سے تھے اور خود مرزا مظہر جان جاناں سے اکتساب کو چکے تھے، سلب مرمن کے لیے ان کے مکان پر بھیجتے اور وہ ہمیشہ جب تک کہ بیمار کو صحت نہ ہوتی برابر آتے تھے۔

جو خاص عنایت شاہ صاحب کو میر متقی کے حال پر بھی اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب شاہ صاحب نے شدتِ مرض میں مرزا صاحب کی قبر کے پاس اپنے لیے قبر کھدوانے کا حکم دیا تو میر متقی نے عرض کیا کہ میر متقی آرزو یہ ہے کہ ٹھیک آپ کی پتی میری قبر ہو۔ چنانچہ ان کے لیے بھی سروابہ تیار ہوا اور بعد انتقال کے جو ۱۵ رجب ۱۲۵۴ھ ہجری میں واقع ہوا، اسی سروابہ میں شاہ صاحب کی پانسی مدفون ہوئے۔

میر متقی کے والد شہید ہادی اور خواجہ فرید الدین احمد سے جن کا ذکر عنقریب آئے گا بہت رسم و راہ تھی، میر متقی بھی والد کے انتقال کے بعد خواجہ فرید سے نہایت ادب کے ساتھ ملتے تھے اور خواجہ فرید بھی ان کے حال پر بہت مہربانی کرتے تھے۔ جب وہ ایران اور آوا کے سفر سے واپس آئے تو انہوں نے اپنی بیٹی بیٹی عزیز النساء بیگم کی شادی میر متقی سے کر دی۔ اب میر متقی اپنے قدیم موروثی مکان سے اٹھ کر مہدی قلی خاں والی چوٹی میں جو خواجہ فرید نے خرید لی تھی آ رہے۔

میر متقی نہایت دھندرا اور راست باز آدمی تھے۔ معین الدین اکبر شاہ کے ایک بھائی مرزا شمس الدین تھے جن کی طرف سے بادشاہ کے دل میں نہایت رنج اور کچھ تو بہت متعلقی یہ دعویٰ سلطنت تھے، اتفاق یہ کہ میر متقی کو مرزا شمس الدین سے بھی نہایت خلوص تھا اور وہ ان کے ہاں برابر آتے جاتے تھے، مرزا شمس الدین بھی ان کی بہت عزت کرتے تھے، ان کو اپنی منہ کے برابر بٹھاتے تھے اور خاص اپنا جھنڈا پینے کو عنایت کرتے تھے، اکبر شاہ نے لوگوں کی دراندازی سے ایک بار ان کو مرزا شمس الدین سے ملنے سے منع کیا، میر متقی نے ہاتھ باندھ کر کہا، کیا حضور کو فدوی کی جاں نثاری میں کچھ تردد ہوا ہے! بادشاہ نے

ہنسر فرمایا نہیں نہیں میرے متقی نے عرض کیا تو پھر میں اپنے قدیم طریقہ کو چھوڑ کر
مضت میں کیوں رو سیاہی لوں۔ بادشاہ نے پھر کبھی اُن سے اس بات کا ذکر
نہیں کیا اور وہ بدستور مرزا شمس الدین سے ملتے رہے۔

اکبر شاہ کے اخیر زمانے میں وزارت کے اختیارات مرزا سلیم کے ہاتھ
میں جو بادشاہ کے چاہتے بیٹے تھے، چلے گئے تھے اور اس لیے راجہ سوہن لال
جو مرزا سلیم کی سرکار میں دیوان تھے، وزارت کا کام کرنے لگے تھے چونکہ میر متقی
کی راجہ سوہن لال سے موافقت نہ تھی اس لیے انھوں نے دربار، کا جانا بہت
کم کر دیا تھا۔ اکثر ضروری موقعوں پر سرسید جا پا کرتے تھے۔ جب بہادر شاہ
تخت پر بیٹھے اور تمام سنیبا دربار کی بدل گئی تو میر متقی کا دربار میں جانا بالکل
ہو گیا تھا۔ مگر جو تنخواہ قلعہ سے مقرر تھی وہ اور نوروز کو بادشاہ کی طرف سے
سنہری روپیلی چھٹوں کے آنے کی رسم اور اسی قسم کی اور اعزازی رسمیں ان کی وفات
تک بدستور جاری رہیں۔

سرسید کی ننھیال

سرسید کی ننھیال کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ سیرت فریدیہ میں جو خود
سرسید نے اپنے نانا خواجہ فرید الدین احمد کے حالات میں لکھی ہے، مندرج
ہے یہاں ہم اُس کا خلاصہ ایک یادداشت سے جو سرسید نے سیرت فریدیہ
لکھنے سے پہلے لکھوائی تھی، اخذ کر کے لکھتے ہیں۔

سرسید کے نانا خواجہ فرید الدین احمد جو خواجہ محمد یوسف ہمدانی کی اولاد میں
ہیں اول اُن کے دادا خواجہ عبدالعزیز بعنوان تجارت دلی میں آئے تھے جو کشمیری
شال کی تجارت کرتے تھے اور انھوں نے یہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اُن

کے بیٹے خواجہ اشرف تھے جن کے آٹھ بیٹے ہوئے ازاں جملہ دو شخصوں نے مختلف حیثیتوں سے بہت امتیاز حاصل کیا تھا اول خواجہ نجیب الدین جو نواح دہلی میں شاہ فدا حسین کے نام سے مشہور ہیں۔ سہروردی خاندان میں ایک نیا فرقہ رسول شاہ کے پیروں کا پیدا ہو گیا تھا۔ شاہ فدا حسین اس فرقہ میں ابتدائی عمر سے داخل ہو گئے تھے اور رسول شاہ کے جانشین مولوی محمد حنیف کے چیلے بن گئے تھے۔ شاہ فدا حسین نے تمام درسی کتابیں اپنے مرشد مولوی محمد حنیف سے پڑھیں اور جب تحصیل پوری ہو گئی تو مرشد کے حکم سے کتابیں کنویں میں ڈال دیں۔ وہ خاص کر تھاق و معارف میں بہت بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ قصوص الحکم، فتوحات مکیہ اور دیگر تصنیفات شیخ اکبر اور دیگر قائلین وحدت وجود کی بہت خوبی سے پڑھاتے تھے۔ مگر وضع یہ تھی کہ چار ابرو کا صفایا کیے ایک غرقی باندھے اور سارے بدن پر بھوت لے بیٹھے رہتے تھے۔ جب حجرہ سے باہر نکلتے تو تمہد گھٹنوں تک لپیٹ لینے اور سر پر ایک منڈٹ رد مال باندھ لیتے تھے ایک بار اکبر شاہ نے ان کے پاس آنا چاہا مگر انھوں نے ملنے سے انکار کر دیا۔ سر سید کہتے تھے کہ ”وہ نہایت خوش خلق اور خوش تقریر تھے جب میرے والد کا انتقال ہوا تو میری والدہ کو جوان کی بھتیجی تھیں اپنے پاس بلا کر ایسی عمدہ تقریر کی کہ اب تک اس کا لطف میرے دل سے نہیں بھولا۔ دلی میں ان کے دیکھنے والے اب تک موجود ہیں۔ وہ آخر عمر میں الور چلے گئے تھے اور ۱۲۵۹ھ میں وہیں انتقال کیا اور وہیں رسول شاہیوں کے تکبیر میں جو چیلی باغ کہلاتا ہے۔ ان کا ڈھیر ہے۔“

دومرے سر سید کے حقیقی نانا دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ جو اپنے خاندان میں سب سے زیادہ با اقبال لائق دانشمند صاحب علم و فضل اور خاص کر ریاضیات میں وحید عصر تھے۔ انھوں نے لکھنؤ

جا کر علامہ تفضل حسین خاں سے جب کہ اصناف الدولہ زندہ تھے ریاضی کی تحصیل تکمیل کی تھی خواجہ فرید ریاضی میں محطی اور مسائل متوسطات جو اکر کے نام سے مشہور ہیں، نہایت تحقیق سے پڑھاتے تھے اور زینچ اور آلات رصد کے علم میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ وہ خود آلات رصد کے بنانے اور رصد کرنے پر قادر تھے۔ بہت سے لوگوں نے ان سے ریاضی کی تحصیل کی اور اس میں کمال بہم پہنچایا اور نامور ہوئے۔ انہاں جملہ مولوی کرامت علی مولوی رجب علی خاں، خواجہ محمد ناصر جان اور حکیم رستم علی خاں ان کے مشہور شاگردوں میں سے تھے۔ خود ان کے چھوٹے بیٹے نواب زین العابدین خاں جو فنون ریاضی میں طوید لئی رکھتے تھے انھیں کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۲ء میں جب طالب علمی کے ارادے سے پہلی ہی بار میرادلی جانا ہوا اس وقت زین العابدین خاں زندہ تھے۔ اور دلی میں ان کی ریاضی دانی اور فنون ریاضی میں سے خاص کر موسیقی کے علم و عمل کی بہت بھرپور تھی۔

سرسید کہتے تھے کہ ”خواجہ فرید کے تصنیف کیے ہوئے چھوٹے چھوٹے متعدد رسالے علم ہیئت اور آلات رصد کے باب میں تھے جو ایام غدر میں ضائع ہو گئے مگر ان میں سے تین رسالے خود انھیں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خلیفہ سید محمد حسن خاں مرحوم وزیر اعظم بریاست پٹیا لہ کی عنایت سے دستیاب ہوئے ہیں جن کو مدرسۃ العلوم کے کتب خانہ میں داخل کر دیا ہے۔“ انھیں میں ایک

۱۔ یعنی مولوی کرامت علی خلیفہ مولوی حیات علی جو دلی کے مشہور عالم تھے اور اخیر کو حیدرآباد چلے گئے تھے۔ ۱۲۔

۲۔ یعنی ارسلو جاہ مولوی سید رجب علی خاں جنہوں نے پنجاب گورنمنٹ میں نہایت رسوخ پایا تھا۔ ۱۳۔

۳۔ یہ حضرت خواجہ میر درد کے سجادہ نشین تھے ۱۴۔

رسالہ ہے فوائد الافکار فی عمال الفرجا اس کے دیباچہ میں انھوں نے ایک واقعہ لکھا ہے جس سے ان کی اعلیٰ درجہ کی ذہانت اور ریاضی کے ساتھ جو ان کو فطری مناسبت تھی اس کا کافی ثبوت ملتا ہے۔

خواجہ فرید لکھنؤ کے پہلے سفر میں دو تین برس وہاں رہ کر ریاضی کی تکمیل کے بعد آئی واپس چلے آئے تھے۔ یہ زمانہ نواب آصف الدولہ کا تھا۔ ۱۲۱۲ھ میں وہ پھر لکھنؤ گئے۔ ان کے جانے کے بعد اسی سال آصف الدولہ نے قضا کی اور معاونت علی خاں ان کے جانشین ہوئے۔ اسی زمانہ میں مدرسہ کلکتہ کے لیے جس کو انگریزوں نے قائم کیا تھا، ایک سپرنٹنڈنٹ کی ضرورت ہوئی اور لکھنؤ کے یورپین عہدہ بیاروں کی سفارش سے خواجہ فرید اس عہدہ پر مینشاہرہ سات سو روپے یا ہوار مقرر ہو کر کلکتہ چلے گئے۔

اس کے بعد مارکونس اون ولزلی کو جو اس زمانہ میں گورنر جنرل تھے ایک خاص مقصد کے لیے جس کی تفصیل سیرت فرید میں درج ہے، ایران میں سفارت بھیجنے کی ضرورت ہوئی۔ ۱۸۰۳ء میں مسٹر لوٹ کا اوسان کے ساتھ خواجہ فرید کا بھیجا تجویز ہوا۔ مگر راہ میں مسٹر لوٹ بیمار ہو کر واپس چلے آئے اور گورنر جنرل کے حکم سے اکیلے خواجہ فرید بطور مستقل سفیر کے بوشہرہ موٹے ہوئے طہران میں پہنچے اور فتح علی شاہ قاجار کے دربار میں حاضر ہوئے اور مقاصد سفارت کو جن میں سب سے زیادہ

سیرت فرید میں سر تید نے اپنے نانا خواجہ فرید کا حال لکھا ہے اس میں یہ دیباچہ بھی نقل کیا چونکہ اس کا معنوں دلچسپی سے خالی نہیں ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا خلاصہ اردو زبان میں اس مقام پر لکھ دیا جاتا۔ وہ لکھتے ہیں کہ "کتب ریاضی کے کسی حاشیہ میں میری نظر سے گذرنا تھا کہ آلات ریاضی میں سے ایک آگہ تھا جس کو پرکار تناسب کہتے تھے اس سے اکثر اعمال تجویز اور بعض آسکان ہندسی اور مسائل حسابی آسانی سے حل ہو جاتے تھے مگر چونکہ اب وہ آلہ منقود ہے اس لیے اس کا علم اور عمل بھی باقی نہیں رہا۔"

اہم یہ امر تھا کہ ایران کی طرف سے ہندوستان میں بجائے حاجی خلیل خاں مقتول کے دوسرا سفیر بھیجا جائے، سنجولی انجام دیا، اور محمد نبی خاں کا ایران کی طرف سے بطور سفیر کے ہندوستان میں بھیجا جانا تجویز ہو گیا۔

اس کے بعد گورنمنٹ انگریزی نے خواجہ فرید کو آوا واقع برہما میں ایک پولیٹیکل معاملہ کے طے کرنے کو بطور ایجنٹ کے مقرر کر کے بھیجا۔ وہاں سے آنے کے بعد جب کہ ملک ہند لیکھنڈ فتح ہو چکا تھا پر گناہت اگاسی وغیرہ جو اب ضلع بانہہ میں شامل ہیں، مالگنداری وصول کرنے کے لیے عہدہ تحصیلداری پر مقرر ہوئے، اس زمانہ میں تحصیلداروں کو تنخواہ نہیں ملتی تھی بلکہ کل نہ مالگنداری میں سے کچھ فیصدی حتیٰ التحصیل ملتا تھا جب یہ انتظام نہ رہا اور زمانہ حال کے موافق تحصیلدار مقرر ہونے لگے تو وہ اس عہدہ سے کنارہ کش ہو کر بارہ تیرہ برس بعد آئی میں واپس آئے مگر چند روزہ کر پھر کلکتہ چلے گئے۔

۱۸۳۱ء ہجری میں اکبر شاہ ثانی نے ان کو کلکتہ سے بلا کر خلعت وزارت اور خطاب دربار الدولہ امین الملک مصلح جنگ عنایت کیا، انہوں نے ایام وزارت میں اس وجہ سے کہ بادشاہ بہت قرضدار ہو گئے تھے، قرضہ ادا کرنے اور آمدنی و خرچ برابر کرنے میں بہت کوشش کی، شاہزادوں اور بیگمات اور عملہ شاہی کی تنخواہوں میں سے دس فیصدی تنخواہ کم کر دی، بڑا خاصہ اور چھوٹا خاصہ جن میں زر کثیر صرف ہوتا تھا اور بعضے اور غیر ضروری کارخانے یک قلم موقوف کر دیئے اس کے سوا

نے بڑا خاصہ وہ کھانا کھلاتا تھا جو تمام ملازموں، عہدیداروں، خواصوں اور باری داروں کو بادشاہ کی طرف سے ہر روز دونوں وقت دیا جاتا تھا، چھوٹا خاصہ وہ کھانا کھلاتا تھا جو ہر روز نیا ہو کر محل میں بھیجا جاتا تھا اور درباری امیر یا حکیم جو اپنی باری یا کسی اور ضرورت سے قلعہ میں رہ جاتے تھے ان کو محل سے بھیجا جاتا تھا ۱۲

دیوان عام کی تائبی کی چھت جو شاہ عالم کے عہد میں بھاؤ مرہٹے نے سنہری طمع کے سبب خالص سونے کی سمجھ کر اکھڑا ڈالی تھی اور وہ اُس وقت سے اکھڑی پڑی تھی اس کا سونا لگ اور تائبانگ کر کے جتنا تائبانگلا اُس کے شاہی ٹکساں میں پیسے بنوا ڈالے اور سونا فروخت کر دیا۔ ان تدبیروں سے کئی لاکھ روپیہ کا قرضہ ادا کیا گیا۔ اب آمدنی اور خرچ برابر ہو گیا اور سب کی تنخواہیں جو کئی کئی مہینے بعد ملتی تھیں ماہ بساہ ملنے لگیں۔ لیکن قلعہ میں اُس سے عام ناراضی پھیل گئی اور آخر کار اُن کو عہدہ وزارت سے کنارہ کش ہونا پڑا اور وہ پھر کلکتہ چلے گئے۔

ایک بار پھر خواجہ فرید کو بادشاہ نے کلکتہ سے بلا کر عہدہ وزارت پر مامور کیا مگر اس دفعہ بھی چند وجوہات سے تین یا ساڑھے تین برس وزارت کا کام انجام دے کر یہ اصلاح جرنیل اختر لونی کے جوڈی میں رنڈ پیٹ تھے آخر کار استعفا دے دیا۔ دوسری بار وزارت سے علیحدہ ہونے کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے معقول سفر خرچ اور اپنا معتمد بھیج کر خواجہ فرید کو لاہور بلا دیا۔ مگر جیسا کہ آگے ذکر کیا جائے گا وہ اپنی بڑی بیٹی یعنی سرسید کی والدہ کے سمجھانے سے لاہور نہیں گئے اور سفر خرچ واپس کر دیا اور پھر اخیر وقت تک باوجود کی قلعہ کی طرف سے ایک دفعہ پھر بلاؤ ہوئی انھوں نے کوئی تعلق اختیار نہیں کیا اور ۱۸۴۸ء میں انتقال کیا۔ ان کی تاریخ وفات اس جملہ سے کہ "جایہ بہشت یافتم" بے کم و کاست نکلتی ہے۔

دربار الدولہ خواجہ فرید الدین احمد ایک حکیم مشرب یا صوفی منش آدمی تھے ایک زمانے میں وہ بھی اپنے بھائی شاہ فدا حسین کی طرح رسول شاہیوں میں داخل ہو گئے تھے اور مکاشاہ جو رسول شاہ کے ایک ممتاز چیلے تھے، اُن کے مرید ہو گئے تھے۔ چونکہ اس طریقہ میں یہ ضرور نہیں ہے کہ خواہ مخواہ چارابرو

کا صفایا کریں بلکہ دنیا دار اور متناہل لوگ بھی اس طریقہ میں داخل ہوتے ہیں اسلئے
 دبیر الدولہ نے مرنے سے دو برس پہلے تک کبھی ڈارھی موچھ نہیں منڈوائی مگر
 مرنے سے دو برس پہلے ان کو یہ خیال ہوا کہ ایک دفعہ تو مرشد کی پوری پوری پیری
 کرنی بھی چاہیے۔ آخر ایک دن چارہ ابرو کا صفایا کرا دیا۔ شہر میں اس کا بڑا چرچا
 ہوا اور لوگوں نے بہت کچھ طعن و تعریض کی مگر انھوں نے اُس کی کچھ پروا نہیں کی
 لیکن ایک دفعہ کے سوا کچھ بھی ایسا نہیں کیا۔ سرسید کہتے تھے کہ، جب انتقال ہوا
 تو اُن کی ڈارھی کسی قدر ٹبری ہو گئی تھی۔

دبیر الدولہ کے دربیٹے تھے جو سرسید کے ماموں ہوتے تھے۔ بڑے کا نام
 وجید الدین خاں جو مرزا جہانگیر کے بیٹے تیمور شاہ کی سرکار میں مختار تھے۔ یہ بعد فتح
 دہلی کے فوج کے کسی سپاہی کی گولی سے غاز پڑھتے ہوئے مارے گئے۔ دوسرے
 نواب زین العابدین خاں جن کو اُن کے والد کی وفات کے بعد دبیر الدولہ کا خطاب
 بادشاہ نے دیا تھا۔ ان کو قدیم ریاضی میں اعلیٰ درجہ کی دستگاہ تھی یہ تمام آلات
 رصد اپنے ہاتھ سے بناتے تھے۔ انھوں نے ایک بہت بڑے قطر کا برنجی گره
 اور برنجی اصطرلاب نہایت عمدہ بنایا تھا۔ نیز بہت سے آلات جن کی تفصیل،
 سیرت فرید میں مندرج ہے اُن کے ہاتھ کے بنے ہوئے موجود تھے۔ اُن میں ایجاد
 و اختراع کا بڑا ملکہ تھا۔ انھوں نے پتنگ بنانے کے اصول وضع کیے تھے اور اس
 باب میں ایک رسالہ لکھا تھا جو غدر میں ضائع ہو گیا۔

سرسید کی والدہ کا حال جو سیرت فرید میں لکھا ہے یا ہم نے دلی میں سرسید
 کے رشتہ داروں سے اور خود سرسید سے سنا ہے۔ چونکہ اُس کو سرسید کی تربیت
 اور اُن کے اخلاق و عادات بلکہ اُن کے تمام واقعات زندگی میں بہت بڑا دخل
 ہے، اس لیے ہم اس کو کسی قدر تفصیل سے بیان کرنا چاہتے ہیں۔ سرسید کے والد

میر متقی جیسا کہ او پر بیان کیا گیا، ایک نہایت آزاد نش آدمی تھے۔ حضور صاحب سے شاہ غلام علی صاحب کے مرید ہو گئے تھے ان کی طبیعت میں اور بھی زیادہ بے تعلق پیدا ہو گئی تھی۔ اس لیے اولاد کی تعلیم و تربیت کا مدار زیادہ تر بلکہ بالکل سرسید کی والدہ پر تھا۔ سرسید سے ایک دفعہ ان کے بچپن کے حالات پوچھے گئے تو انھوں نے یہ جواب دیا کہ میری تمام سرگذشت کے بیان کو یہ ایک شعر کافی ہے۔

طفلی و دامانِ مادر خوش بہشتے بودہ است

چوں پپائے خود رواں گشتم سرگر داں شمیم

سرسید کی والدہ خواجہ فرید کی تینوں بیویوں میں سب سے بڑی تھیں۔ ان میں قدرتی قابلیت معمولی عورتوں سے بہت زیادہ تھی، وہ صرف قرآن مجید پڑھی، زونہی تھی اور ابتدا میں کچھ فارسی کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھی تھیں مگر اولاد کی تربیت کا ان میں خداداد ملکہ تھا۔ سرسید کہتے تھے کہ جب میں ان کو سبق سنا تا یا نئے سبق کا مطالعہ ان کے پاس بیٹھ کر دیکھتا تو وہ ایک کڑی جس میں سوت کی گندھی بوٹی تین لڑکیوں یا ندھ رکھی تھیں اپنے پاس رکھ لیتیں۔ وہ خفا تو اکثر ہوتی تھیں مگر ان سوت کی لڑکیوں سے کبھی مجھے مارا نہیں۔

سرسید لکھتے ہیں کہ ”جس زمانے میں میری عمر گیارہ بارہ برس تھی میں نے ایک نوکر کو جو بہت پُرانا اور بڑھا تھا کسی بات پر تھپڑ مارا۔ والدہ کو بھی خبر ہو گئی تھوڑی دیر بعد جب میں گھر میں آیا تو انھوں نے نہایت ناراض ہو کر کہا کہ اس کو گھر سے نکال دو۔ جہاں اس کا جی چلے چلا جائے یہ گھر میں رہنے کے لائق نہیں رہا۔ چنانچہ ایک ماما میرا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی اور سڑک پر لاکر چھوڑ دیا۔ اسی وقت میری خالہ کے گھر سے جو بہت قریب تھا دوسری ماما نکلی اور خالہ کے پاس لیگی انھوں نے کہا ”دیکھو آجی تم سے بہت

ناراض ہیں، میں تم کو کوٹھے پر ایک مکان میں چھپا دیتی ہوں وہاں سے باہر نہ نکلنا ورنہ وہ ہم سے بھی ناراض ہو جائیں گی۔“ میں تین دن تک وہاں چھپا رہا، تیسرے دن خلد صاحبہ مجھے والدہ کے پاس لے گئیں تاکہ قصور معاف کرائیں، انھوں نے کہا اگر اس نوکر سے قصور معاف کرائے گا تو میں بھی معاف کر دوں گی، جب میں نے ڈیڑھ ہی میں نوکر کے آگے ہاتھ جوڑے تب قصور معاف ہوا۔“

سر سید کی والدہ کی دانشمندی اور دوراندیشی ذیل کی حکایت سے بخوبی ثابت ہوتی ہے سر سید کہتے تھے کہ ”جب دبیر الدولہ نے دہلی سے دوسری بار استعفا دیا تو کچھ دنوں بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنا معتمد اور ایک معقول رقم سفر خرچ کے لیے اُن کے پاس بھیجی اور لاہور بلایا۔ سدا کنبہا چاہتا تھا کہ وہ منظور کر لیں مگر اُن کی بڑی بیٹی یعنی میری والدہ نے کہا کہ خدا نے آپ کو اس قدر دیا ہے کہ جس طرح چاہیں آپ آرام سے بسر کر سکتے ہیں اور اس سے کچھ اور زیادہ ہو جائے تو بھی آپ کے آرام و آسائش میں کچھ زیادتی نہیں ہو سکتی۔ آپ کا مہاراجہ رنجیت سنگھ کی عملداری میں جانا اور اُس سلطنت کے اختیارات لینے اور ہم سب کا انگریزی عملداری میں رہنا اچھا نہیں معلوم ہوتا میں تو ہرگز صلاح نہیں دیتی کہ اس صنیعہ کے زمانے میں کہ آپ کی طبیعت بھی اکثر علیل رہتی ہے۔ آپ لاہور کا ارادہ کریں۔“

دبیر الدولہ کے دل پر اُن کے کہنے کا ایسا اثر ہوا کہ لاہور جانے سے انکار اور سفر خرچ واپس کر دیا اور پھر کبھی کوئی تعلق اختیار نہیں کیا۔

سر سید کا بیان ہے کہ ”میرے بڑے بھائی کے مرض الموت میں والدہ ہر وقت اُن کے پاس بیٹھی رہتی تھیں، ایک مہینے تک یہی حال رہا، جب انکا انتقال ہو گیا سب لوگ گریہ و زاری کرنے لگے، والدہ کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری تھے اتنے میں صبح کی نماز کا وقت ہو گیا، انھوں نے وضو کر کے نماز پڑھی اور اشراق

بیک مہلتے ہی پر بیٹھی رہیں، انھیں دنوں میں ایک رشتہ دار کی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی، تمام سامان شادی کا بوجھ بچا تھا، صرف چار دن تاریخ عقد میں باقی رہے تھے۔ جب یہ حادثہ ہم پر گذرا تو ان لوگوں نے دستور کے موافق شادی ملتوی کرنی چاہی، میری والدہ نے جب یہ سنا تو اس واقعہ کے تیسرے دن ان کے گھر گئیں اور کہا میں شادی میں آئی ہوں، ماتم تین دن سے زیادہ نہیں ہوتا اور شادی کے ملتوی کرنے سے تمہارا بڑا نقصان ہوگا جو خدا کو منظور تھا وہ بوجھ بچا تم شادی کو سب گز ملتوی مت کرو جب کہ میں خود تمہارے گھر آئی ہوں اور شادی کی اجازت دیتی ہوں تو اور کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔“

سرستید کہتے تھے کہ ”جو کچھ آمدنی ہوتی تھی اس میں سے پانچ فیصدی کے حساب سے میری والدہ ہمیشہ اگ رکتی تھیں اور اس سہ ماہیہ کو حسن انتظام کے ساتھ بیک کاموں میں صرف کرتی تھیں، کئی جوان لڑکیوں کا ان کی امداد سے نکاح ہوا، اکثر پردہ نشین عورتیں جو معاش سے تنگ ہوتیں ان کی پوشیدہ خبر گیری کرتیں، غریب خاندانوں کی جوان لڑکیاں جو بیوہ ہو جاتیں ان کو دوسرا نکاح کرنے کی نصیحت کرتیں اور دوسرے نکاح کو برا سمجھنے والوں سے نفرت کرتیں غریب رشتہ داروں کے گھر جاتیں اور خفیہ یا کسی حیلہ سے ان کی امداد کرتیں، بعض رشتہ دار مردوں نے ایسی عورتوں سے نکاح کر لیا تھا جن سے ملنا معیوب سمجھا جاتا تھا مگر وہ ان کے گھر برابر جاتیں اور ان کی اولاد کے ساتھ شفقت سے پیش آتیں۔“

سرستید کہتے تھے کہ ”میری تمام نھیاں کو شاہ عبدالعزیز اور ان کے خاندان سے عقیدت تھی مگر میری والدہ کو شاہ غلام علی صاحب سے بیعت اور عقیدت تھی، شاہ صاحب کے ہاں سنت اور نذر و نیاز کا کہیں پتہ نہ تھا، ان کی عادت تھی کہ جب کوئی اپنی حاجت لیجاتا تو سب حاضرین سے کہتے کہ دعا کرو خدا

اس کی حاجت پوری کرے، یہی عقیدہ میری والدہ کا تھا۔ اُنھوں نے خود کوئی منت یا تندر و نیانہ کبھی نہیں مانی۔ تعویذ یا گنڈے سے پرہ اور تاریخیوں یا دنوں کی سعادت و نحوست پر اُن کو مطلق اعتقاد نہ تھا۔ لیکن اگر کوئی کرتا تو اُس کو منع بھی نہ کرتیں اور یہ کہتیں کہ اگر ان کو منع کیا جائے اور اتفاق سے وہی امر پیش آجائے جس کے خون سے وہ ایسا کرتے ہیں تو اُن کو یقین ہو جائے گا کہ ایسا نہ کرنے سے یہ ہوا اگر ایسا کیا جاتا تو نہ ہوتا۔ سرسید کا بیان ہے کہ ”میری نھیاں وائے اگر چہ عام تو بہات میں مبتلا نہ تھے مگر شاہ عبدالعزیز کے ہاں جو کچھ ہوتا تھا اس پر سب اعتقاد رکھتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز اور اُن کے ہاں کے اور بزرگ بچوں کو ایک گنڈا دیا کرتے تھے اور اس کے ساتھ ایک تعویذ ہوتا تھا جس میں ایک ہندسہ یا حرف سفید مرغی کے خون سے لکھا جاتا تھا اور جس تجرہ کو دیا جاتا اس کو بارہ برس کی عمر تک اٹھایا مرغی کھانے کی ممانعت ہوتی تھی سید حامد اور سید محمود کو بھی اُن کی نھیاں والوں نے وہ گنڈے پنچائے تھے۔ باوجود اس کے میری والدہ جب کبھی وہ ان کے ساتھ کھانا کھاتے اور کھانے میں اٹھایا مرغی ہوتی تو وہ بے نائل ان کو کھلا دینیں سرسید کہتے تھے کہ ”اس زمانہ میں جب کہ میرے مذہبی خیالات اپنی ذاتی تحقیق پر مبنی ہیں۔ اب بھی میں اپنی والدہ کے عقائد میں کوئی ایسا عقیدہ جس پر شرک یا بدعت کا اطلاق ہو سکے نہیں پاتا البتہ وہ یہ سمجھتی تھیں کہ قرآن پڑھ کر بخشے کا یا فاتحہ دلا کر کھانا تقسیم کرنے کا ثواب سرورہ کو پہنچتا ہے مگر میں ان دونوں باتوں کا نائل نہیں ہوں۔ عبادت بدنی میں تو میں نیابت کا مطلق قائل نہیں اور عبادت مالی میں بھی سو اس کے کہ متوفی اپنی زندگی میں کچھ مال کسی کار خیر کے لیے کسی کے سپرد کر جائے اور کسی صورت میں نیابت کا قائل نہیں ہوں۔“

سرسید کا بیان ہے کہ ”جب میں دلی میں منصف تھا تو میری والدہ کی یہ

نصیحت تھی کہ جہاں تم کو ہمیشہ جانا ضروری ہے وہاں کبھی سواری پر جایا کرو اور کبھی پیادہ پا جایا کرو۔ زمانہ کا کچھ اعتبار نہیں، کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ، پس ایسی عادت رکھو کہ ہمیشہ کو نباہ سکو۔ چنانچہ میں نے جامع مسجد اور خانقاہ میں جانے کا یہی طریقہ رکھا تھا کہ اکثر پیدل اور کبھی کبھی سواری پر جاتا تھا۔

سرستید کی والدہ جیسی سمجھ دار اور دانشمند تھیں اُس سے زیادہ نیک دل اور پاک سرشت تھیں۔ سرستید کا بیان ہے کہ ”مسماۃ زین ایک لا وارث بڑھیا تھی میری والدہ اس کی خبر گیری کرتی تھیں جب میں دلی میں منصف تھا اتفاق سے میری والدہ اور زین دونوں ایک ساتھ بیمار ہوئیں اور دونوں کی بیماری بھی ایک ہی سی تھی حکیم نے والدہ کے لیے کسی قدر افاقہ کے بعد ایک معجون کا نسخہ جو قیمتی تھا، تجویز کیا۔ مگر جس قدر تیار ہوا تھا وہ مقدار میں ایک ہی بیمار کی چند روزہ خوراک تھی۔ میں اُس معجون کو تیار کر کے والدہ کے پاس لے گیا اور اُن سے کہہ دیا کہ اتنے دنوں کی خوراک ہے۔ انھوں نے لے لی۔ مگر اس خیال سے کہ یہ زین کو بھی مفید ہوگی۔ لیکن اُس کو کون بڑا کے دے گا، انھوں نے خود اُس معجون کو نہیں کھایا اور برابر زین کو کھلاتی رہیں۔ زین کو اُس سے بہت فائدہ ہوا، مگر والدہ بھی بغیر اُس معجون کے استعمال کے اچھی ہو گئیں۔ چند روز بعد میں نے کہا کہ معجون نے آپ کو بہت فائدہ کیا۔ وہ ہنسی اور کہا کیا بغیر دوا کے خدا صحت نہیں دے سکتا؟ آخر معلوم ہوا کہ وہ ساری معجون زین ہی نے کھائی مگر خدا نے دونوں کو صحت عنایت کی۔“

سرستید کہتے تھے کہ ”میرے بھائی سید محمد خاں اور حکیم غلام بخش خاں میں بہت دوستی تھی۔ ایک دوسرے کو بھائی بھائی کہتے تھے۔ میں بھی حکیم صاحب کو بڑے بھائی کے برابر سمجھتا تھا۔ مگر بھائی کے انتقال کے بعد ایک دفعہ حکیم صاحب

کچھ مجھ سے ناراض ہو گئے اور ہمارے ہاں آنا چھوڑ دیا مگر میں بدستور اُن کے ہاں جاتا رہا اور مدت تک میں نے کچھ خیال نہ کیا۔ لیکن آخر کو میں نے بھی اُن کے ہاں جانا بہت کم دیا۔ جب والدہ کو اس بات کی خبر ہوئی تو بہت افسوس کیا اور مجھ سے کہا کہ جس بات کو تم خود اچھا نہیں سمجھتے وہی بات آپ کرتے ہو۔ اگر وہ نہیں ملتے تو نہ ملیں مگر تم بدستور ملتے رہو۔“

مرسید نے ایک شخص کا ہم سے ذکر کیا کہ ”جب میں صدائین تھا تو اُس کے ساتھ میں نے کچھ سلوک کیا تھا اور اُس کو ایک سخت مواخذہ سے بچایا تھا مگر ایک ایک مدت کے بعد اُس نے درپردہ میرے ساتھ بُرائی کرنی شروع کی اور مدت تک میری شکایت کی گناہم عرضیاں صدر میں بھیجتا رہا۔ آخر تمام وجہ ثبوت جس سے اُسکو کافی سزا مل سکتی تھی، میرے ہاتھ آگئی اور اتفاق سے اُس وقت مجسٹریٹ بھی وہ شخص تھا جو اُس کے پھانسنے کی فکر میں تھا۔ میرے نفس نے مجھ کو انتقام لینے پر آمادہ کیا۔ میری والدہ کو جب میرا یہ ارادہ معلوم ہوا تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ ”سب سے بہتر تو یہ ہے کہ درگزر کرو۔ اور اگر بدلا ہی لینا چاہتے ہو تو اُس زبردست حاکم کے انصاف پر چھوڑ دو جو ہر بدی کی پوری سزا دینے والا ہے۔ اپنے دشمنوں کو دنیا کے کمزور حاکموں سے بدلا دلانا ٹری نادانی کی بات ہے۔“ اُن کے اس کہنے کا مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ اُس دن سے آج تک مجھ کو کبھی کسی اپنے دشمن یا بدخواہ سے انتقام لینے کا خیال نہیں آیا اور امید ہے کہ کبھی نہ آئے گا۔ بلکہ انھیں کی نصیحت کی بدولت میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ آخرت میں خدا اُس سے میرا بدلہ لے۔“

مرسید کی بہن صفیۃ النساء بیگم بھی جن کا انتقال دسمبر ۱۸۹۲ء میں جب کہ مرسید محمدان ایجوکیشنل کانفرنس کی تقریب سے واپسی میں موجود تھے کچھ کم تو بے برس کی عمر میں ہوا۔ عورتوں میں ممتاز اور قابل تھیں۔ اکثر مذہبی کتابیں اور کچھ حدیث

کی عربی کتابیں بھی مع ترجمہ کے پڑھی تھیں اور ان کے گھر میں کہنے کی اکثر لڑکیاں جمع ہوتیں اور ان سے پڑھتی تھیں۔

سرسید کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے صرف معمولی تعلیم پائی تھی مگر بہت زندہ دل اور شگفتہ مزاج تھے۔ ان کو بھی شاہ غلام علی صاحب سے بیعت تھی مگر وضع اس کے غلام تھی۔ اکثر ان کے والد کے ملنے والے ان سے کہتے کہ بیٹے کو سمجھاؤ کہ اپنی وضع درست کرے اور ڈارھی نہ منڈایا کرے۔ وہ یہ جواب دیتے کہ عمر کا تقاضا ہے جو اس کا دل چاہے کر لینے دو کبھی نہ کبھی خود درست ہو جائیگا آخر ایک مدت کے بعد ان کا طریقہ خود بخود بدل گیا۔ ڈارھی رکھ لی اور نماز کے سخت پابند ہو گئے۔ یہاں تک کہ تہجد اور اشراق کی نماز بھی ترک نہ ہوتی تھی اور قرآن مجید کی تلاوت بہت کرنے لگے۔

وہ تہگام ضلع فتحپور میں منصف تھے۔ ۱۸۴۵ء میں سرسید فتحپور سیکری سے جہاں وہ خود منصف تھے اور سید محمد خاں تہگام سے وسپرہ کی تعطیل میں واپس آئے وہاں اس وقت سنجار کی فصل تھی۔ سید محمد خاں کو سنجار آنے کا تعطیل کے بعد جب سرسید جانے لگے تو رخصت کے وقت ان کے بھائی نے ایسے کلمات کہے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کو اپنے زندہ رہنے کی امید نہیں ہے۔ اس کے بعد فی الواقع ان کا مرض بڑھنے لگا۔ وہ اسی حالت میں خواجہ باقی باللہ گئے اور وہاں اپنی قبر کے لیے خود جگہ تجویز کی۔ ہر چند لوگ کہتے تھے کہ ایسی بیماری نہیں ہے تم کہو ان خیال میں پڑے ہو، مگر ان کو مرنے کا یقین ہو گیا تھا۔ جب قبر تیار ہو گئی تو سوار ہو کر وہاں پہنچے اور قبر میں اتر کر لیٹے اور قبر کو پسند کیا۔ وہاں سے آکر دو سے دن کفن کے لیے کپڑا منگوایا اور اس کو سلوا کر پہنا اور بہت پسند کیا۔ اب مرض اور بھی زیادہ ہو گیا۔ ایک دن شاہ احمد سعید صاحب کے جو اس وقت خانقاہ میں سجادہ

نشین تھے بلدیہ اور ان کے ہاتھ پر نجد پر بیعت کی اور تیسرے دن انتقال کیا۔
 مفتی صدرالدین خاں نے جو سرسید کو ان کی تعزیت کا خط بھیجا تھا تو اس میں یہ
 شعر لکھا تھا۔

” قسمت نگر کہ گشتہ شمشیر عشق یافت
 مرگے کہ زندگان بہ دعا آرزو کنند“

سرسید کے خاندان کا حال جس قدر کہ ہم نے لکھا ہے شاید ناظرین کتاب اس
 کو قدر ضرورت سے زیادہ خیال کریں لیکن بائیوگرافی کا اصل مقصد جو ہیرو کے اخلاق
 و عادات و خیالات کا دنیا پر روشن کرنا ہے۔ وہ اُس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا
 جب تک یہ نہ دکھایا جائے کہ ہیرو میں یہ اخلاق و عادات و خیالات کہاں سے
 آئے؛ اور ان کی بنیاد اُس میں کیوں کر پڑی؛ انسان میں کچھ خصلتیں جلتی ہوتی ہیں
 جو آبا و اجداد سے بطور میراث کے اُس کو پہنچتی ہیں اور زیادہ تر وہ اخلاق و
 عادات ہوتے ہیں جو بچپن میں نامعلوم طور پر وہ اپنے خاندان کی سوسائٹی سے
 اکتساب کرتا ہے اور جو رفتہ رفتہ اس درجہ تک پہنچ جاتے ہیں جس کی نسبت
 ہمیشہ میں آیا ہے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے تو لٹ جائے لیکن آدمی اپنی جہت سے
 نہیں ٹل سکتا۔ پس ہیرو کے خاندان کا حال جس میں وہ پیدا ہوا اور اُس سوسائٹی کا حال
 جس میں اُس نے نشوونما پائی و حقیقت ہیرو کے اخلاق و عادات پر ایک ایسی
 روشنی ڈالتا ہے جس کے بعد کس اور ثبوت کے پیش کرنے کی چنداں ضرورت
 باقی نہیں رہتی۔

سرسید کا بچپن

سرسید کے پیدا ہونے سے پہلے ان کی بہن صفیۃ النساء بیگم اور ان کے بھائی

سید محمد خاں پیدا ہو چکے تھے۔ سید محمد خاں کی ولادت کے بعد چھ برس تک ان کے والدین کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا اس لیے سید احمد خاں کے پیدا ہونے کی ان کو نہایت خوشی ہوئی۔ سرسید سے چند مہینے پہلے ان کے ماموں نواب زمین العابدین خاں کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا تھا جس کا نام حاتم علی خاں تھا سرسید کو اول حاتم علی خاں کی والدہ نے دودھ پلایا اور پھر خود سرسید کی والدہ نے۔ وہ اپنے خاندان کے اکثر بچوں کی نسبت زیادہ قوی اور توانا اور ہاتھ پاؤں سے تندرسنت پیدا ہوئے تھے۔ وہ اپنی ماں کی زبانی بیان کرتے تھے کہ جب ان کے نانا دوسری بار کلکتہ سے واپس آئے اور ان کو پہلے ہی بار دیکھا تو یہ کہا کہ "یہ تو ہمارے گھر میں جاٹ پیدا ہوا ہے۔"

سرسید کے بیان سے مفہوم ہوتا تھا کہ ان کے بچپن میں جسمانی صحت اور فزیکل قابلیت کے سوا کوئی ایسی خصوصیت جس سے ان کے بچپن کو معمولی لڑکوں کے بچپن پر بے تکلف توفیق دی جاسکے، نہیں پائی جاتی تھی۔ یعنی جیسے کہ بعض بچے ابتدا میں نہایت ذکی اور طباع اور اپنے بھولپوں میں سب سے زیادہ تیز اور ہوشیار ہوتے ہیں، سرسید میں کوئی اس قسم کا صریح امتیاز نہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے قوائے ذہنیہ کو محض دماغی ریاضت اور گاتار غولہ و فکر سے تدریج ترقی دی تھی اور اسی لیے ان کی لائف کا آغاز معمولی آدمیوں کی زندگی سے کچھ زیادہ چمکدار معلوم نہیں ہوتا لیکن جس قدر آگے بڑھنے جائے اسی قدر اس میں زیادہ عظمت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ہیرد کو معمولی آدمیوں کی سطح سے بالاتر کر دیتی ہے۔ اسی لیے بعض حکماں کہتے ہیں کہ محنت سے آدمی جو چاہے سو ہو سکتا ہے۔

الغرض جب سرسید پیدا ہوئے تو ان کے والد نے شاہ غلام علی صاحب

سے نام رکھنے کی درخواست کی۔ شاہ صاحب ہی نے بڑے بھائی کا نام محمد رکھا تھا اُن کا نام احمد رکھا۔ سرسید کے دادا اُن کے والد کی شادی ہونے سے پہلے قضا کر چکے تھے اور یہ اورین کے بہن بھائی شاہ صاحب ہی کو دادا حضرت کہا کرتے تھے۔ سرسید کہتے تھے کہ ”شاہ صاحب کو بھی ہم سب سے ایسی ہی محبت تھی جیسی حقیقی دادا کو اپنے پوتوں سے ہوتی ہے۔ شاہ صاحب نے تاہل اختیار نہیں کیا تھا اور وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ گو خدا تعالیٰ نے مجھے اولاد کے جھگڑوں سے آزاد رکھا ہے لیکن تنقی کی اولاد کی محبت ایسی دیدی ہے کہ اس کے بچوں کی تکلیف با بیماری مجھ کو بے چین کر دیتی ہے۔“

سرسید کو مسماۃ مان بی بی نے جو ایک قدیم خیر خواہ خادمہ اُن کے گھرانے کی تھی پالا تھا۔ اس لیے اُن کو مان بی بی سے نہایت محبت تھی۔ وہ پانچ برس کے تھے جب مان بی بی کا انتقال ہوا۔ اُن کا بیان ہے کہ ”مجھے خوب یاد ہے مان بی بی مرنے سے چند گھنٹے پہلے قالہ کا شربت مجھ کو پلا رہی تھی۔ جب وہ مر گئی تو مجھے اُس کے مرنے کا نہایت رنج ہوا۔ میری والدہ نے مجھے سمجھایا کہ وہ خدا کے پاس گئی ہے۔ بہت اچھے مکان میں رہتی ہے۔ بہت سے نوکر چاکر اُس کی خدمت کرتے ہیں اور اس کی بہت آرام سے گزرتی ہے۔ تم کچھ رنج مت کرو۔ مجھ کو اُن کے کہنے سے پورا یقین تھا کہ فی الواقع ایسا ہی ہے۔ مدت تک ہر جمعرات کو اس کی فاتحہ ہوا کرتی تھی اور کسی محتاج کو کھانا دیا جاتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ سب کھانا مان بی بی کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اُس نے مرتے وقت کہا تھا کہ میرا تمام زیور سید کا ہے۔ مگر میری والدہ اُس کو خیرات میں دینا چاہتی تھیں۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ اگر کہو تو یہ گناہ مان بی بی کے پاس بھیج دوں۔ میں نے کہا ہاں بھیج دو۔ والدہ نے وہ سب گناہ مختلف

طرح سے خیرات میں دیدیا۔

بچپن میں سرسید پر نہ تو ایسی تہیہ تھی کہ کھیلنے کو دلے کی بالکل بندی ہو اور نہ ایسی آزادی تھی کہ جہاں چاہیں اور جن کے ساتھ چاہیں کھیلنے کو دتے پھریں۔ ان کی بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ خود ان کے ماموں ان کی خالہ اور دیگر نزدیک رشتہ داروں کے چودہ پندرہ لڑکے ان کے ہم عمر تھے جو آپس میں کھیلنے کو دلے کے بے کافی تھے اس لیے ان کو نو کروں اور اجلا فوں کے بچوں اور اسٹرائفوں کے آوارہ لڑکوں سے ملنے کھیلنے اور ان کے ساتھ کھیلنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ ان کے بزرگوں نے یہ اجازت دے رکھی تھی کہ جس کھیل کو تمہارا جی چاہے شوق سے کھیلو مگر کسی کھیل کو چھپا کر مت کھیلو، اس لیے سب لڑکے جو کھیل کھیلتے تھے اپنے بڑوں کے سامنے کھیلتے تھے، ان کے کھیلوں میں کوئی بات ایسی نہ ہوتی تھی جو اپنے بزرگوں کے سامنے نہ کر سکیں، خواجہ فرید کی تویلی جس میں وہ اور ان کے ہم عمر لڑکے رہتے تھے اس کا چوک اور اس کی چھتیں ہر قسم کا مہاگ دوڑ کے کھیلوں کے لیے کافی تھیں ابتدا میں وہ اکثر گیند بٹا، کبڈی، گیٹریاں، آنکھ مچول، چیل چلو وغیرہ کھیلتے تھے۔ اگرچہ گیٹریاں کھیلنے کو اثرات معیوب جانتے تھے، مگر ان کے بزرگوں نے اجازت دے رکھی تھی کہ آپس میں سب بھائی مل کر گیٹریاں بھی کھیلو تو کچھ مضائقہ نہیں۔

سرسید کہتے تھے کہ "کھیل میں جب کچھ جھگڑا ہو جاتا تو بڑوں میں سے کوئی آکر تصفیہ کر دیتا اور جس کی طرف سے چینیہ معلوم ہوتی اس کو بڑا بھلا کہتا اور شرمندہ کرتا کہ چینیہ کرنا بے ایمانی کی بات ہے، کبھی چینیہ مت کرو اور جو چینیہ کرے اس کو ہرگز اپنے ساتھ مت کھیلنے دو۔"

ان کا بیان تھا کہ "باوجود اس قدر آزادی کے بچپن میں مجھے تنہا باہر

جانے کی اجازت نہ تھی جب میری والدہ نے اپنے رہنے کی جُدا حویلی بنائی اور وہاں آ رہیں تو باوجودیکہ اس حویلی میں اور نانا صاحب کی حویلی میں صرف ایک سڑک درمیان تھی جب کبھی میں ان کی حویلی میں جاتا تو ایک آدمی میرے ساتھ جاتا۔ اسی لیے بچپن میں مجھے گھر سے باہر جانے اور عام صحبتوں میں بیٹھنے یا آواز پھرنے کا بالکل اتفاق نہیں ہوا۔

سر سید اپنے کھیل کود کے زمانے میں بہت مستعد اور چالاک اور کسی قدر شوخ بھی تھے۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اکثر شوخی کیا کرتے۔ وہ کہتے تھے کہ ”ایک بار میں نے اپنے ایک رشتہ دار بھائی کو جوا بتھا کر ہاتھ چپکے چپکے اُس کے پیچھے جا کر چپت کر دیا۔ اس کے سارے کپڑے خراب ہو گئے۔ وہ پتھر لیکر مجھے مارنے کو دوڑا اور کئی پتھر پھینکے مگر میں پیچ پیچ گیا۔ آخر سب بھائیوں نے پیچ بچاؤ کر کے صلح کرادی، اسی طرح ایک بار میں ٹمٹم کھیلنے میں ایک اپنے رشتہ دار بھائی سے لڑ پڑا، میرے نکلے سے اُس کے ہاتھ کی انگلی اتر گئی، اور کئی دن بعد اچھی ہوئی ہمیشہ یوں ہی لڑائی کھڑائی مار کٹائی ہوتی تھی مگر آخر کو سب ایک ہو جاتے تھے۔“

سر سید لکھتے ہیں کہ ”میرے نانا صبح کا کھانا اندر زمانے میں کھاتے تھے۔

ایک چوڑا چکلا دسترخوان بچھتا تھا۔ بیٹے بیٹیاں، پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں اور بیٹوں کی بیویاں سب اُن کے ساتھ کھانا کھاتے تھے، بچوں کے آگے خالی رکابیاں ہوتی تھیں۔ نانا صاحب ہر ایک سے پوچھتے تھے کہ کون سی چیز کھاؤ گے جو کچھ وہ بتاتا وہی چیز چمچے میں لیکر اپنے ہاتھ سے اُس کی رکابی میں ڈال دیتے۔ تمام بچے بہت ادب اور صفائی سے اُن کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ سب کو خیال رہتا تھا کہ کوئی چیز گرنے نہ پائے، ہاتھ کھانے میں زیادہ نہ بھرے اور نوالا چبانے کی آواز منہ سے نہ نکلے۔ رات کا کھانا دارہ باہر دیوانخانے میں کھاتے

تھے، زمانہ ہو جاتا تھا۔ بیری والدہ اور بیری چھوٹی خالا کھانا کھلانے آتی تھیں۔ ہم سب لڑکے اُن کے سامنے بیٹھتے تھے۔ ہم کو بڑی مشکل پڑتی تھی۔ کسی کے پانوں کا دھبہ سفید چاندنی پر لگ جاتا تھا تو نہایت ناراض ہوتے تھے۔ روشتائی وغیرہ کا دھبہ کسی کے کپڑے پر ہوتا تھا اُس سے بھی ناخوش ہوتے تھے۔ شام کو چراغ جلنے کے بعد اُن کے پوتے اور نواسے جو مکتب میں پڑھتے تھے اور جن میں سے ایک میں بھی تھا، ان کو سبق سنانے جاتے تھے۔ جس کا سبق اچھا یاد ہوتا اُس کو کسی قسم کی عمدہ مٹھائی ملتی اور جس کو یاد نہ ہوتا اس کو کچھ نہ دیتے اور گھر ک دیتے۔

گرمی اور برسات کے موسم میں اب بھی دلی کے اکثر باشندے سہ پہر کو جہنا پر جا کر پانی کی سیر دیکھتے ہیں اور تیرنے والے تیرتے ہیں۔ مگر پچاس برس پہلے وہاں اشرف تیرنے والوں کے بہت دلچسپ جلسے ہوتے تھے۔ سرسید کہتے تھے کہ ”میں نے اور بڑے مہائی نے اپنے والد سے تیرنا سیکھا تھا۔ ایک زمانہ تو وہ تھا کہ ایک طرف دلی کے مشہور تیراک مولوی علیم اللہ کا غول ہوتا تھا۔ جن میں مرزا مغل اور مرزا مغل بہت سربراہ اور وہ اور نامی تھے اور دوسری طرف ہمارے والد کے ساتھ موسا سوشا گردوں کا گروہ ہوتا تھا۔ یہ سب ایک ساتھ دریا میں کودنے تھے اور مجنوں کے ٹیلے سے شیخ محمد کی بائیں تک یہ سارا گروہ تیرتا جاتا تھا۔ پھر جب ہم دونوں بھائی تیرنا سیکھتے تھے اُس زمانے میں بھی میں چالیس آدمی والد کے ساتھ ہوتے تھے انھیں دنوں میں نواب اکبر خاں اور چند اور رئیس زادے بھی تیرنا سیکھتے تھے۔ زینۃ المساجد کے پاس نواب احمد بخش خاں کے باغ کے نیچے جہنا بہتی تھی۔ وہاں سے تیرنا شروع ہوتا تھا۔ مغرب کے وقت سب تیراک زینۃ المساجد میں جمع ہو جاتے تھے اور مغرب کی نماز جماعت سے پڑھ کر اپنے

اپنے گھر چلے آتے تھے۔ ہیں ان جلسوں میں اکثر شریک ہوتا تھا تیسرا انداز کی صحبتیں بھی سہیلہ کے ماموں نواب ذین العابدین خاں کے مکان پر ہوتی تھیں۔ وہ کہتے تھے کہ ”مجھے اپنے ماموں اور والد کے شوق کا وہ دمانہ جب کہ نہایت دھوم دھام سے تیسرا انداز ہوتی تھی۔ یاد نہیں۔ مگر جب دوبارہ تیسرا انداز کا چرچا ہوا وہ بخوبی یاد ہے۔ اُس زمانے میں دریا کا جانا موقوف ہو گیا تھا۔ ظہر کی نماز کے بعد تیسرا انداز شروع ہوتی تھی۔ نواب فتح اللہ بیگ خاں، نواب سید عظمت اللہ خاں نواب براہیم علی خاں اور چند شاہزادے اور رئیس اور شوقین اس جلسہ میں شریک ہوتے تھے۔ نواب شمس الدین خاں رئیس فیروز پور بھر کہ جب دلی میں ہوتے تھے تو وہ بھی آتے تھے۔ میں نے بھی اس زمانے میں تیسرا انداز سیکھی اور مجھ کو خاصی مشق ہو گئی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک دفعہ میرا نشانہ جو توڑے میں نہایت صفائی اور خوبی سے جا کر بیٹھا تو والد بہت خوش ہوئے اور کہا ”مچھلی کے جائے کو کون تیسرا سکاٹھانے“ یہ جلسہ برسوں تک رہا پھر موقوف ہو گیا۔ اہل اللہ اور مقدس لوگوں کی عظمت کا خیال بچپن سے سرسید کے دل میں بٹھایا گیا تھا۔ وہ اپنے والد کے ساتھ اکثر شاہ غلام علی صاحب کی خدمت میں جاتے تھے اور شاہ صاحب سے ان کی عقیدت کا رنگ اپنی آنکھ سے دیکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ”مرزا صاحب کے عرس میں شاہ صاحب ایک روپیہ ان کے سزار پر چڑھایا کرتے تھے اور اُس روپیہ کے لینے کا حق میرے والد کے سوا اور کسی کو نہ تھا۔ ایک دفعہ عرس کی تاریخ سے کچھ پہلے ایک مرید نے شاہ صاحب سے اجازت لے لی کہ اب کی بار نذر کاروپیہ مجھے عنایت ہو۔ میرے والد کو بھی خبر ہو گئی۔ جب شاہ صاحب نے روپیہ چڑھانے کا ارادہ کیا تو والدہ نے عرض کی کہ حضرت! میرے اور میری اولاد کے جتنے جی آپ نذر کاروپیہ لینے کی اوروں کو اجازت دیتے ہیں! شاہ صاحب نے فرمایا نہیں نہیں تمہارے سوا کوئی نہیں لے سکتا۔ میں اس

وقت صغیر سن تھا جب شاہ صاحب نے روپیہ چڑھایا والد نے مجھ سے کہا جاؤ
روپیہ اٹھا لو میں نے آگے بڑھ کر روپیہ اٹھایا :

دلی سے سات کوس مغلیوں کے جاٹوں کا گانو ہے۔ وہاں سرسید کے والد
کی کچھ ملک بطور معافی کے تھی۔ اگر کبھی فصل کے موقع پر ان کے والد مغلیوں جاتے
تو ان کو بھی اکثر اپنے ساتھ لے جاتے اور ایک ایک ہفتہ گانو میں رہتے۔ سرسید
کہتے تھے کہ اس عمر میں گانو میں جا کر رہنا، جھگی میں پھرتا، عمدہ دودھ اور وہی
اور تازہ تازہ گھی اور جاتینوں کے ہاتھ کی پکی ہوئی باجڑ یا مکئی کی روٹیاں کھانا
نہایت ہی مزہ دیتا تھا :

سرسید کے والد کو اکبر شاہ کے زمانے میں برسوں تاریخ جلوس کے جشن پر
پانچ پارچہ اونٹین رقوم جو اہر خلعت عطا ہوتا تھا مگر اخیر میں جیسا کہ اوپر ذکر کیا
گیا انھوں نے دربار کا جانا کم کر دیا تھا اور اپنا خلعت سرسید کو باوجودیکہ ان
کی عمر کم تھی، دلوانا شروع کر دیا تھا۔

سرسید کہتے تھے کہ " ایک بار خلعت ملنے کی تاریخ پر ایسا اتفاق ہوا کہ
والد بہت سویرے اٹھ کر قلعہ چلے گئے اور میں بہت دن چڑھے اٹھا۔ ہر چند
بہت جلد گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچا مگر پھر بھی دیر ہو گئی۔ جب لال پردہ
کے قریب پہنچا تو قاعدہ کے موافق اول دربار میں جا کر آداب بجالانے کا وقت
نہیں رہا تھا۔ دروغہ نے کہا کہ بس اب خلعت پہنکر ایک ہی دفعہ دربار میں جانا
جب خلعت پہنکر میں نے دربار میں جانا چاہا تو دربار پر فاسٹ ہو چکا تھا اور
بادشاہ تخت پر سے اٹھ کر ہوا دار پر سوار ہو چکے تھے۔ بادشاہ نے مجھے دیکھ کر
والد سے جو اس وقت ہوا دار کے پاس ہی تھے، پوچھا کہ "تمہارا بیٹا ہے" انھوں
نے کہا "حضور کا خانہ نادر" بادشاہ چپکے ہو رہے لوگوں نے جانا کہ بس اب محل

میں چلے جائیں گے۔ مگر جب تسبیح خانہ میں پہنچے تو وہاں ٹھہر گئے تسبیح خانہ میں بھی ایک چہو تیرا بتا ہوا تھا جہاں کبھی کبھی دربار کیا کرتے تھے۔ اُس چہو ترے پر بیٹھ گئے اور جواہر خانے کے دروغہ کو کشتی جو اہر حاضر کرنے کا حکم ہوا، میں بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ بادشاہ نے مجھے اپنے سامنے بلایا اور کہاں عنایت سے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ دیر کیوں کی؟ حاضرین نے کہا۔ عرض کرو کہ تقصیر ہوئی۔ مگر میں چپکا کھڑا رہا۔ جب حضور نے دوبارہ پوچھا تو میں نے عرض کیا کہ سو گیا تھا۔ بادشاہ مسکرائے اور فرمایا بہت سویرے اٹھا کرو اور ہاتھ چھوڑ دینے لوگوں نے کہا آداب بجالاؤ۔ میں آداب بجالایا۔ بادشاہ نے جواہرات کی معمولی رقمیں اپنے ہاتھ سے پتھرائیں۔ میں نے نذر دی اور بادشاہ اٹھ کر خاصی ڈیوڑھی سے محل میں چلے گئے تمام درباری میرے والد کو بادشاہ کی اس عنایت پر مبارک سلامت کہنے لگے۔ سرسید کہتے تھے کہ ”اس زمانہ میں میری عمر آٹھ نو برس کی ہوگی۔ تقریباً انھیں دنوں میں راجہ رام موہن رائے جو برہمن سماج کے بانی تھے، اُن کو اکبر شاہ نے کلکتہ سے بلایا تھا تاکہ اضافہ پنشن بادشاہی کے لیے اُن کو لندن بھیجا جائے چنانچہ وہ بادشاہ کی طرف سے لندن بھیجے گئے اور ۱۸۳۱ء میں وہاں پہنچے۔“ سرسید نے لندن جانے سے پہلے اُن کو متعدد دفعہ دربار شاہی میں دیکھا تھا۔

سرسید کی تعلیم

سرسید کہتے تھے کہ ”مجھ کو اپنی بسم اللہ کی تقریب بخوبی یاد ہے۔ سہ پہر کا وقت تھا اور آدمی کثرت سے جمع تھے خصوصاً حضرت شاہ غلام علی صاحب بھی تشریف رکھتے تھے مجھ کو لا کر حضرت کے سامنے بٹھا دیا تھا۔ میں اس مجمع کو دیکھ کر ہٹکا دکھتا ہوا گیا۔ میرے سامنے تختی رکھی گئی اور غالباً شاہ صاحب نے

فرمایا کہ پڑھو بسم اللہ الرحمن الرحیم مگر میں کچھ نہ بولا اور حضرت صاحب کی طرف دیکھا رہا انہوں نے اٹھا کر مجھے اپنی گود میں اٹھایا اور فرمایا کہ ہمارے پاس بیٹھ کر پڑھیں گے اور بسم اللہ پڑھ کر افراد کی اول کی آیتیں مالمہ یعلّمہ تک پڑھیں میں بھی اُن کے ساتھ ساتھ پڑھتا گیا۔ سرستید نے جب یہ ذکر کیا تو بطور فخر کے اپنا یہ فارسی شعر جو خاص اسی موقع کے لیے انہوں نے کبھی کہا تھا پڑھا۔

” یہ مکتب رستم و آموختم اسرارہ نیز دانی

رفیض نقشبند وقت و جان جان جانانی “

سرستید کہتے تھے کہ ”شاہ صاحب اپنی خانقاہ سے کبھی نہیں اٹھتے تھے اور کسی کے ہاں نہیں جاتے تھے إلا ماشاء اللہ صرف میرے والد پر جو غایت درجہ کی شفقت تھی اس لیے کبھی کبھی ہمارے گھر قدم رنجہ فرماتے تھے۔“

بسم اللہ ہونے کے بعد سرستید نے قرآن مجید پڑھنا شروع کیا۔ اُن کی ٹھیاں میں قدیم سے کوئی نہ کوئی انسانی نوکر رہتی تھی سرستید نے اتنی ہی سے جو ایک اثراوت گھر کی پردہ نشین بی بی تھی، سارا قرآن ناظران پڑھا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ میرا قرآن ختم ہونے پر بدیہ کی مجلس جو زمانہ میں ہوئی تھی وہ اس قدر دلچسپ اور عجیب تھی کہ پھر کسی ایسی مجلس میں وہ کیفیت میں نے نہیں دیکھی۔“ قرآن پڑھنے کے بعد وہ باہر مکتب میں پڑھنے لگے۔ مولوی حمید الدین ایک ذی علم اور بزرگ آدمی اُن کے نانا کے ہاں نوکر تھے۔ جنہوں نے اُن کے ماموں کو پڑھایا تھا۔ اُن سے معمولی کتابیں کریمیا خاتن باری آمد نامہ وغیرہ پڑھیں، جب مولوی حمید الدین کا انتقال ہو گیا تو اور لوگ پڑھانے پر لو کہہ رہے تھے۔ انہوں نے فارسی میں گلستاں، بوستاں اور ایسی ہی ایک آدھ اور کتاب سے زیادہ نہیں پڑھا۔ پھر عربی پڑھنی شروع کی، عربی میں شرح ملاء، شرح تہذیب، ینبذی، مختصر معانی اور سطول ما انا قلت

تک پڑھی مگر طالبعلموں کی طرح نہیں بلکہ نہایت بے پروائی اور کم توہمی کے ساتھ۔ اس کے بعد اُن کو اپنے خاندانی علم یعنی ریاضی پڑھنے کا شوق ہوا، جس میں اُن کی تخیال کے لوگ دلی میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے ماموں نواب زین العابدین خاں سے حساب کی معمولی درسی کتابیں، تحریر اقلیدس کے چند مقالے ہیئت میں شرح چہشتی تک اور ایک آدھ رسالہ متوسطات کا (جو مجلسی سے پہلے پڑھاٹے جاتے ہیں)، پڑھا۔ مگر تمام رسالے متوسطات کے نہیں پڑھے اور نہ مجلسی کے پڑھنے کی نسبت پہنچی کیونکہ آلات رصد کا زیادہ شوق ہو گیا تھا۔ چنانچہ آلات رصد برجنیدی اور چند رسالے مثل اعمال کرہ، اعمال اصطرلاب، رسالہ صنعت اصطرلاب، رابع مجیب، رابع مقنطر، ہلزدن، جریب الساعۃ، پرکار تقسیم، پرکار متناسبہ اپنے ماموں سے پڑھے۔ اُسی زمانے میں طب پڑھنے کا شوق ہو گیا۔ حکیم غلام حیدر خاں سے جو ایک خاندانی حکیم تھے، طب کی ابتدائی کتابیں مثل قانونچہ اور موجز وغیرہ پڑھنے کے بعد معالجات سرمدی، شرح اسباب اور نفیسی امراض عین تک پڑھی اور چھ ماہ تک اُن کے پاس مطب بھی کیا۔ پھر پڑھنا چھوڑ دیا۔ جب انھوں نے پڑھنا چھوڑا ہے اُس وقت اُن کی عمر اٹھارہ انیس برس کی تھی۔ اس کے بطور خود کتابوں کے مطالعہ کا برابر شوق رہا اور دلی میں جواہلِ علم اور فارسی دانی میں نام آور تھے جیسے صہبائی، غالب اور آرزو وغیرہ اُن سے ملنے کا اور علمی مجلسوں میں بیٹھنے کا اکثر موقع ملتا رہا۔ ۱۸۴۱ء میں جب کہ وہ فتح پور سیکری سے بدل کر دلی کی منصفی پر آئے اُس وقت جیسا کہ آگے نوکر کیا جانے گا، انھوں نے کسی قدر تحصیل علم میں ترقی کی۔

عنفوان شباب

سرستید کا عنفوان شباب نہایت زندہ دل اور رنگین صحبتوں میں گزرتا تھا۔ وہ راگ رنگ کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ باغوں کی سیر کو دوستوں کے ساتھ جاتے تھے اور وہاں راگ رنگ اور دعوتوں کے جلسوں میں شامل ہوتے تھے۔ ہولی کے جلسوں اور نمائشوں میں جاتے تھے۔ پھول والوں کی سیر میں خواجہ صاحب پہنچتے تھے اور وہاں کی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے۔ دلی میں بسنت کے میلے جو موسم بہار کے آغاز میں درگاہوں پر ہوتے تھے وہاں جاتے تھے، خود ان کے ناما خواجہ فرید کی قبر پر چونسٹھ کھبے میں جو بسنت کا میلہ ہوتا تھا اس میں وہ اپنے اور بھائیوں کے ساتھ منظم و مہتمم ہوتے تھے۔

اُس زمانے میں خواجہ محمد اشرف ایک بزرگ ولی میں تھے۔ ان کے گھر پر بسنت کا جلسہ ہوتا تھا۔ شہر کے خواص وہاں موسوم ہوتے تھے۔ نامی نامی طوائف زرد لباس پہنکر وہاں آتی تھیں۔ مکان میں بھی زرد فرش ہوتا تھا۔ دالان کے سلنے ایک چبوترہ تھا جس میں حوض تھا۔ اُس حوض میں زرد ہی پانی کے فوارے چھوڑتے تھے۔ صحن میں جو چین تھا اُس میں جھڑاں زرد پھول کھلے ہوئے ہوتے تھے اور طوائف باری باری بیٹھ کر گات تھیں۔ سرستید کہتے تھے کہ "میں ہمیشہ وہاں جاتا تھا اور اُس جلسے میں شریک ہوتا تھا۔"

خود سرستید کے ماموں نواب زین العابدین کے مکان پر بڑے بڑے نامی گویے دھرت اور خیال گانے والے جمع ہوتے تھے۔ میر ناصر احمد جودی میں مشہور بین بجائے والے تھے وہ آئے تھے۔ گانا ہوتا تھا اور میں کبھی بھی اس طرح خواجہ میر درد کے سجادہ نشین ہر مہینے کی چوبیسویں کو مات کے وقت ایک

درویشانہ جلسہ کیا کرتے تھے۔ اُس میں بھی بڑے بڑے نامی گوئیے آتے تھے۔ دھرت اور خیال گاتے تھے۔ اور میر ناصر احمد جو اسی خاندان میں بیعت تھے بین بجانے میں اپنا کمال دکھاتے تھے۔ ان سب جلسوں میں سرستید اکثر شریک ہوتے تھے۔

ایک اور جلسہ راتے پر ان کشن کے مکان پر ہوتا تھا جو ایک معزز رئیس اور نہایت و صندار تھے جتنا نامی ایک طوائف نہایت خوش آواز و دھرت اور خیال گاتے اندر بین بجانے میں مشہور تھی۔ وہ اپنا پیشہ چھوڑ کر راسخپران کشن کے گھر میں پڑ گئی تھی، اُس کی خاطر سے وہ برصغیر کی سترھویں کو ایک جلسہ کیا کرتے تھے۔ شہر کے رئیس جن سے اُن کی دوستی تھی، بلائے جاتے تھے۔ بڑے بڑے گوئیے، بہادر خاں متارن اور میر ناصر احمد سب جمع ہوتے تھے۔ سرستید کہتے تھے کہ "میرے ماموں نواب زین العابدین خاں ہمیشہ اس جلسہ میں جاتے تھے۔ میں بھی بلا رہا اُن کے ہمراہ گیا ہوں۔"

جب وہ نوکر ہو کر آگرہ گئے ہیں یہ وہ زمانہ ہے کہ صدر ولایت آگرہ میں موجود ہے اور وہاں منشی امیر علی خاں، مولوی غلام امام شہید، مولوی غلام جیلانی مولوی محمد شفیع اور اور بہت سے اشراف خاندانوں کے نامی و کیلیوں اور عہدیداروں کا مجمع ہے۔ یہ سب لوگ نہایت زندہ دل مرخج و سرنجان اور زندگی بے فکری و فارغ البالی کے ساتھ مہنسی اور خوشی میں گزارنے والے تھے۔ تاج گنج، اعتماد الدولہ اور نورافشاں میں وہ آئے دن عیش و نشاط کے جلسے کرتے تھے۔ سرستید نے بھی ان جلسوں کی کیفیتیں دیکھی تھیں اور اُن میں شریک ہوئے تھے۔

سرستید جیسے بڑھاپے میں بذلہ سنج تھے جوانی میں اُس سے بھی زیادہ

ظرافت اور حاضر جوابی اُن کی طبیعت میں تھی۔ دلی میں ایک مشہور طوائف شیریں جان نامی نہایت حسین تھی مگر سنا ہے کہ اُس کی ماں بجدی اور سانوسے رنگ کی تھی۔ ایک مجلس میں جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ مجرے کے لیے آئی تھی سرسید بھی موجود تھے اور وہیں اُن کے ایک قندھاری دوست بھی بیٹھے تھے۔ وہ اُس کی ماں کو دیکھ کر بولے "مادرش لبہا تلخ است" سرسید نے یہ مصرعہ پڑھا، اگرچہ تلخ است ولیکن بر شیریں وارو"

سرسید کا مذکورہ بالا جلسوں اور صحفتوں میں شریک ہونا آخر کار رنگ لائے بغیر نہ رہا۔ اگرچہ اُس وقت تک دلی کے مسلمانوں میں قدیم سوسائٹی کی بہت سی خوبیاں باقی تھیں لیکن چونکہ اُن کے اقبال کا خاتمہ ہو چکا تھا اس لیے اُن کی سوسائٹی میں اُن خرابیوں کی آہستہ آہستہ بنیاد پڑتی جاتی تھی جن کو نزل اور ادب کا پیش خمیہ سمجھنا چاہیے۔ طبیعتیں عموماً عیش و نشاط اور راگ رنگ کی طرف مائل ہوتی جاتی تھیں بے فکر امیر زادے عباسی اور لہو و لعب کی مثالیں قائم کرتے جاتے تھے اور خرابیوں کو دیکھ کر خرابوں سے رنگ پکڑتے جاتے تھے۔ اگرچہ سرسید شرہ یا اٹھارہ برس کی عمر میں متاہل ہو گئے تھے پھر بھی وہ اس متعدی مرض کے اثر سے اپنے تنہیں نہ بچا سکے۔ لیکن جیسا کہ معتبر ذریعوں سے معلوم ہوا ہے، یا وجود غایت و لبثگی کے جو جنون سے کسی طرح کم نہ تھی سرسید نے جس حیرت انگیز طریقہ سے اپنے تنہیں اس دلدل سے نکالا وہ درحقیقت ان کی زندگی کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے جس کو اُن کی اخلاقی طاقت کا سب سے پہلا کرشمہ سمجھنا چاہیے۔ گویا یہ شعر اُس وقت اُن کے حسبِ حال تھا۔

ہزار و ام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں

جسے غور ہو آئے کرے شکار مجھے

مولانا جلال الدین رومی کے سامنے ایک ناپید کی اس طرح تعریف کی گئی کہ اُس نے تمام عمر میں کسی بُرے کام کا ارتکاب نہیں کیا، مولانا نے یہ سن کر فرمایا، کاش کر دے وگرنہ شتہ - یعنی بہ نسبت اس کے کہ آدمی عمر بھر کوئی بُرا کام نہ کرے اور ایک حالت پر ٹھہرا رہے، یہ بہت بہتر ہے کہ وہ بُرے کام کا ارتکاب کر کے حالت موجودہ سے ترقی کر جائے، مولانا کا یہ ارشاد جیسا سرسید کے حال پر منطبق ہوتا ہے اُس سے بہتر شاید ہی کوئی اس کا مصداق ہو سکے۔

منجملہ دیگر اسباب کے جو اس تبدیلی حالت کے باعث ہوئے سب سے بڑا سبب سرسید کے بڑے بھائی کا قبل از وقت انتقال کرنا تھا۔ دونوں بھائیوں میں محبت اور اتحاد اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ شہر میں اُس کی نیکروی باقی تھی سرسید کے بھائی کا یہ قول تھا کہ "کیسی ہی عیش و نشاط کی مجلس ہو مگر سپید وہاں نہ ہوتو مجھ کو وہ مجلس جہنم معلوم ہوتی ہے" ایسا ہی حال سرسید کا اپنے بھائی کے ساتھ تھا۔ چنانچہ بھائی کے مرتے ہی ان کا دل رنگین صحبتوں سے بالکل اچاٹ ہو گیا، لباس اور وضع جو اس وقت بانکپن سمجھا جاتا تھا ایک قلم ترک کر دیا، سر گھٹوایا، ڈاڑھی چھوڑ دی، پانچے منتشر کر لیے، کرتا پہن لیا، رنگین طبع نوجوانوں کی صحبت رفتہ رفتہ کم ہونے لگی اور روز بروز مولودیت کا رنگ چڑھنے لگا کہ اُس وقت قوم میں یہی اعلیٰ درجہ ترقی انسانی کا سمجھا جاتا تھا اور اگر غور کر کے دیکھا جائے تو اصلی ترقی تک پہنچنے کے لیے اس مرحلے کا طے کرنا نہایت ضرور ہے جیسا کہ کہا گیا ہے۔

حور و جنت جلوہ بر زانہ کند در راہ دوست

اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

سرسید نے بھی اپنی ایک تحریر میں اُس نوجوانی کی لغزش کی طرف اشارہ کیا

ہے وہ قوم کی غفلت و بدستی کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں " ہم بھی اسی رنگ میں مست تھے، ایسی گہری نیند سوتے تھے کہ فرشتوں کے بھی اٹھائے نہ اُٹھتے تھے۔ کیا کیا خیالات ہماری قوم کے ہیں جو ہم میں مد تھے اور کونسی کالی گھٹائیں ہماری قوم پر چھا رہی ہیں جو ہم پر چھائی ہوئی نہ تھیں۔ جب رند تھے تو فریاد سے بڑھ کر تھے جب زیادہ خشک تھے تو نہایت ہی اکھڑتے جو صوفی تھے تو رومی سے بڑتر تھے اور اپنی قوم کے غمخوار "۔

مگر سرسید کے بعض نہایت ثقہ رشتہ داروں سے سنا گیا ہے کہ انھوں نے جو کچھ اس غفلت کے زمانے میں کیا اُس سے معدودے چند کے سوا کوئی متنفس واقف نہیں ہوا۔ وہ خود اسی معاملہ کے متعلق اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں: " وہ ایک عجیب قسم کا زمانہ تھا۔ اُس زمانے کے اشرف خاندانوں کے نوجوان جو کچھ کرتے تھے ایسی طرح پر کرتے تھے کہ کوئی اُس سے واقف نہ ہوتا تھا اور پردہ ڈھکا رہتا تھا۔ کوئی حرکت عام طور پر بر ملا ہونے نہیں پاتی تھی۔ اُس زمانے کے اشرف نوجوانوں کا عمل درآمد اس مقولہ پر تھا کہ " اپنے جسم کے زخم کو ڈھانکے رکھو تاکہ لوگ اسے دیکھ کر نفرت نہ کریں "۔ یہ ایک ایسی اچھی نصیحت ہے کہ گوا انسان سے کوئی بُرائی ہو مگر اُس بُرائی کا بُرا ہونا دل سے نہیں جانا اور انسان کے لیے یہی راستہ بُرائی سے بچنے کا ہے۔

۱۸۳۸ء سے ۱۸۵۷ء تک

ملازمت، تالیف رسائل مذہبی تاریخی و علمی، خطاب بادشاہی، ترتیب آثار
الصنادید، ترتیب تاریخ ضلع بجنور، تصحیح و تکمیل آئین اکبری

ملازمت

۱۸۳۸ء میں جب کہ سرسید کے والد کا انتقال ہوا ان کی عمر کچھ کم بائیس سال
کی تھی قلعہ سے ان کے والد کو کسی جگہ سے تنخواہ ملتی تھی۔ چونکہ ان کے والد اور صاحب
سوپن لال میں ان بن تھی اور ان کی زندگی ہی میں ان کی تنخواہ میں کات پھانس ہونے
لگی تھی اب انتقال کے بعد قلعہ کی آمدنی میں سے صرف کچھ قدر قلیل تو سرسید کی
والدہ کے نام جاری رہا باقی سب تنخواہیں بند ہو گئیں اور چند ملکین جو معافی کی
تھیں وہ بھی یہ سبب حین حیات ہونے کے ضبط ہو گئیں۔ اس لئے سرسید
کو گورنمنٹ کی نوکری کا خیال پیدا ہوا۔ ہر چند ان کے رشتہ دار قلعہ سے قطع تعلق
کرنے پر راضی نہ تھے مگر انھوں نے قلعہ کا سہارا ایک قلم چھوڑ کر گورنمنٹ انگریزی
کی نوکری اختیار کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا، اس وقت وہ عدالت کی کارروائیوں
اور انگریزی قوانین سے محض ناواقف تھے۔ سب سے پہلے انھوں نے عدالت کی کارروائی
سے اطلاع حاصل کرنی چاہی۔ ان کے خالو مولوی خلیل اللہ خاں اس وقت وہی
میں صدر امین تھے۔ ان سے درخواست کی کہ وہ اپنی کچہری میں ان کو کام سیکھنے

کی اجازت دیں انھوں نے خوشی سے اجازت دیدی اور سرسید نے وہاں کام سیکھنا شروع کیا۔ چند مہینے اُن کو کام سیکھنے گزرے تھے کہ مولوی غلیل اللہ نے اُن کو زرداری کے خفیہ مقدمات کا جو کہ فیصلہ کے لیے صدر ایجنسی میں آتے تھے اپنی کچہری میں سررشتہ دار مقرر کر دیا۔ سرسید کو اس کام پر کچھ بہت دن نہ گزرے تھے کہ مسٹر رابرٹ ہملٹن (جو آخر کو سر رابرٹ ہملٹن ہوئے) دلی میں حج ہو کر آئے۔ سرسید کو وہ پہلے سے جانتے تھے اس لیے یہ اُن سے ملنے کو گئے اور نوکری کی درخواست کی انھوں نے اُن کو عدالت سٹیشن کا سررشتہ دار مقرر کرنا چاہا لیکن انھوں نے اُس کام کو مشکل جان کر انکار کیا۔ ہر چند صاحب حج نے بہت اصرار اور دلہی کی کہ کچھ تردد کی بات نہیں ہے ہم تم سے یہ سہولیت کام لیں گے اور سب ایک بات بناتے رہیں گے مگر سرسید نے کہا کہ جس کام کی میں اپنے میں قیامت نہیں پاتا اُس کو کیونکر قبول کر سکتا ہوں۔ غرض کہ بدستور صدر ایجنسی میں کام کرتے رہے۔ اتفاق سے انھیں دونوں میں مسٹر ہملٹن آگرہ کے کمشنر ہو گئے اور چلتے وقت سرسید کو ایک چھٹی کے ذریعہ سے اپنے جانشین مسٹر لینڈزی کے سپرد کر گئے۔ لیکن ابھی مسٹر لینڈزی سرسید کو کوئی عہدہ دینے نہیں پائے تھے کہ مسٹر رابرٹ ہملٹن نے اُن کو آگرہ میں بلا لیا اور فروری ۱۸۴۹ء میں کمشنری کے دفتر میں جو عہدہ نائب منشی کا خالی ہوا اُس پر مقرر کر دیا۔

یہاں سرسید نے بہت جلد قوانین مال سے واقفیت حاصل کر لی۔ اُس وقت کمشنری آگرہ کے ماتحت چند ضلعوں میں بندوبست کا کام جاری تھا اور بندوبست ہی کے متعلق بہت سا کام کمشنری میں تھا۔ سرسید نے ترتیب دفتر کا ایک دستور العمل بنایا جس کے موافق تمام دفتر کمشنری کا مرتب کیا گیا۔

انھیں دونوں میں انھوں نے فارسی زبان میں ایک فہرست بعد نقشہ کے

مرتب کی تھی جس کا نام جام جم رکھا تھا اور جو ۱۸۴۲ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔
 اس میں امیر تمپور صاحبقران سے لے کر ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ تک مختلف
 خاندانوں کے ۴۳ بادشاہوں کا حال مختصر طور پر سترہ سترہ خانوں میں قلمبند کیا ہے
 اسی زمانہ میں انھوں نے قوانین دیوانی متعلقہ منصفی کا ایک خلاصہ
 اس غرض سے تیار کیا کہ وہ عہدہ منصفی ملنے کا ایک ذریعہ ہو جب وہ خلاصہ
 تیار ہو چکا تو صاحب کشنر نے اس کو گورنمنٹ میں پیش کیا اور سرسید کے
 لیے عہدہ منصفی کی سفارش کی۔ گورنمنٹ نے اس پر یہ حکم دیا کہ جہاں منصفی خالی
 ہو سید احمد خاں کو اس پر مقرر کیا جائے۔ لیکن ابھی ان کو یہ عہدہ ملنے نہ پایا تھا
 کہ عہدہ منصفی کے لیے قواعد امتحان جاری ہو گئے۔ صاحب کشنر نے ان کو
 امتحان دینے کی ہدایت کی۔ انھوں نے خود بھی امتحان کی تیاری کی اور اپنے بڑے
 بھائی سید محمد خاں اور ماموں زاد بھائی حاتم علی خاں کو بھی امتحان دینے پر آمادہ کیا
 سید محمد خاں نے پہلی دفعہ قانون کی طرف کم توجہ کی تھی اس لیے وہ دوسرے
 سال امتحان میں پاموٹے مگر سرسید اور حاتم علی خاں نے پہلی ہی بار امتحان دیکر
 ڈپلویا حاصل کر لیا۔

امتحان کے بعد سرسید نے وہ خلاصہ چھاپ دیا اور اپنے بھائی کا نام بھی
 اس میں شامل کر کے اس کا نام انتخاب الاخوان رکھا جس کو اس زمانے کے بعض
 ظریف دونوں بھائیوں کے اتحاد کی وجہ سے دم الاخوان کہتے تھے۔ خان بہادر
 منشی غلام نبی خاں اور میرے بھائی مرحومین کہتے تھے کہ یہ انتخاب منصفی کے
 امیدواروں کے لیے ایسا مفید نکلا کہ چند روز میں تمام صوبہ میں شائع ہو گیا۔ لوگوں
 کو اس سے بہت فائدہ پہنچا اور بہت سے امیدوار اسی کی بدولت منصف
 ہو گئے۔ ۱۸۴۴ء میں انجن اسلامپٹ لاہور نے جو سرسید کو ایڈریس دی تھی

اس میں بھی سرسید کے اس احسان کا ذکر کیا تھا۔

دسمبر ۱۸۴۱ء میں مین پوری کی منصفی خالی ہوئی اور ۲۴ دسمبر کو وہ مین پوری کے منصف مقرر ہو گئے مگر ۱۰ جنوری ۱۸۴۳ء کو مین پوری سے تبدیل ہو کر فتحپور سیکری میں آگئے یہ آگرہ کے قریب ہندوستان کا ایک تاریخی شہر ہے جلال الدین کے مرشد شاہ سلیم چشتی اسی شہر میں رہتے تھے اور اسی وجہ سے مدت تک یہ شہر اکبر کا دارالسلطنت رہا ہے اور یہاں کی قدیم شاہی عمارتیں اب تک اُس زمانے کی یاد گار ہیں۔ سرسید اس شہر میں چار برس تک منصف رہے فتحپور میں جہاں اکبر کی خواہگاہ تھی حسن اتفاق سے وہی مالعیٹیان مکان سرسید کو رہنے کے لیے ملا تھا۔ یہ چاروں برس اُسی مکان میں گذرے۔

رسائل مذہبی وغیرہ

اس زمانہ میں سرسید نے تین رسالے تالیف یا طبع کرائے ہیں :

- ۱۔ جلاء القلوب بذكر المحبوب مؤلفہ ۱۲۵۱ھ صریح مختصر رسالہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت، وفات، معجزات اور دیگر حالات کے بیان میں اس لیے لکھا تھا کہ مولود کی مجلسوں میں جتنے رسالے شائع تھے ان میں صحیح روایتیں بہت کم تھیں۔ سرسید نے اس رسالہ میں اُس زمانہ کے خیالات کے موافق محض صحیح روایتوں پر اکتفا کیا تھا۔
- ۲۔ شحفۃ حتم مؤلفہ ۱۲۶۰ھ یہ ترجمہ ہے تحفۃ اشاعہ صریح کے باب دوم اور باب دوازدهم کا۔ باب دوم میں وہ مطاعن جو شیعہ صدیق اکبرؑ پر کرتے ہیں صحیح

۱۔ اس ترجمہ کے سوا کبھی سرسید نے کوئی کتاب یا رسالہ یا آرٹیکل ایسا نہیں لکھا جس سے شیعوں پر

اعتراض کرنا یا انکے اعتراض کا جواب دینا مقصود ہو۔ ۱۲۔

اُن کے جوابات کے مذکور ہیں، اور باب دوازدهم میں تو لا اور تبرا کا بیان ہے۔
 ۳۔ تسہیل فی جرثقیل مطبوعہ ۱۸۴۲ء یہ اردو ترجمہ سبوح علی نام ایک عالم کے
 ترجمہ فارسی موسوم بہ معیار العقول کا جو پوزر مینی کے عربی رسالہ سے فارسی میں
 ترجمہ کیا گیا تھا۔ اس رسالہ میں مصنف نے جرثقیل کے پانچ اصول بیان کیے
 ہیں۔ یعنی بھاری چیزوں کے اٹھانے، سخت چیزوں کے چیرنے اور جن چیزوں
 کا دانا یا پنچوڑا ناوشوار ہو اُن کے دبانے یا پنچوڑنے کے لیے پانچ کلیں بتائی ہیں۔
 اور اُن کے بنانے اور استعمال کرنے کا طریقہ اور مختلف ترکیبیں بیان کی ہیں۔

خطاب بادشاہی

اسی زمانے میں بہادر شاہ نے سرسید کو اُن کا موروثی خطاب عنایت
 کیا۔ ۱۸۴۲ء میں جب وہ عین پوری سے تبدیل ہو کر فتحپور میں آئے تو چند روز
 کے لیے تقریب رخصتہ با تعطیل دلی آئے تھے اُس زمانہ میں حکیم احسن اللہ
 خاں بادشاہ کے ہاں نیابت کا کام کرتے تھے انھوں نے بادشاہ سے سرسید
 کی تقریب کی کہ اُن کے دادا کا خطاب اُن کو ملنا چاہیے۔ بادشاہ نے منظور
 کر لیا۔ اگرچہ سرسید کے دادا کا خطاب صرف جواد الدولہ تھا اور یہی خطاب
 لکھ کر حکیم احسن اللہ خاں نے پیش کیا تھا۔ مگر بادشاہ نے اُس میں عارف جنگ
 کا لفظ اپنی طرف سے اضافہ کر کے جواد الدولہ سید احمد خاں عارف جنگ کا
 خطاب سرسید کو عنایت کیا اور خطاب ملنے کی تمام رسمیں حسب قاعدہ ادا کی گئیں
 ۱۸۔ فروری ۱۸۴۶ء کو سرسید فتحپور سیکری سے واپس تبدیل ہو گئے انھیں
 دنوں میں اُن کے بڑے بھائی کا عین عالم شباب میں انتقال ہوا تھا اور اُن
 کی والدہ پر یہ صدمہ نہایت سخت گذرا تھا۔ اس لیے انھوں نے خود درخواست

کر کے اپنی بدلی کرائی تھی۔ ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۳ء تک جب تک کہ وہ مستقل صدر امین مقرر نہیں ہوئے دلی ہی میں رہے۔ اس عرصہ میں صرف دو دفعہ یعنی ایک بار ۱۸۵۰ء میں اور دوسری بار ۱۸۵۳ء میں قائم مقام صدر امین مقرر ہو کر رہتک جانے کا اتفاق ہوا۔

جس وقت وہ فتحپور سے بد لکھ دلی میں آئے تھے اس وقت ان کی عمر اسی بیس کی تھی۔ یہاں آ کر ان کو یہ خیال ہوا کہ جو کتابیں ابتدا میں نہایت کم توجہی اور بے پروائی سے پڑھی تھیں اور اب بالکل نیا نیا ہو گئی تھیں ان کو از سر نو غور اور توجہ سے پڑھیے۔ مولوی نوازش علی مرحوم جو دلی میں مشہور واعظ تھے اور تمام دسی کتابیں پڑھانے تھے ان سے کچھ پھل پڑھائی کو تازہ کیا اور کچھ فقہ میں مثل قدوری، و شرح وقایہ اور اصول فقہ میں شاشی، نورالانوار اور ایک آدھ اور کتاب پڑھی۔ مولوی فیض الحسن مرحوم سے مقامات حریری کے چند مقامے اور سب سے معلقہ کے چند قصیدے پڑھے اور مولانا مخصوص اللہ سے جو شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے اور شاہ رفیع الدین کے خلف الصدق تھے حدیث پڑھنی شروع کی۔ مشکوٰۃ اور ایک حصہ جامع ترمذی کا اور کسی قدر اجزا صحیح مسلم کے پڑھے اور پھر قرآن مجید کی سندلی۔ بس اس سے زیادہ جیسا کہ سر سید خود اقرار کرتے تھے استاد سے انھوں نے کچھ نہیں پڑھا۔

آثار الصنادید

اُسی زمانے میں جب کہ وہ دلی میں منصف تھے ان کو عمارات شہر اور نواح شہر کی تحقیقات کا خیال ہوا۔ وہ کہتے تھے کہ "میں اپنی کل تنخواہ والدہ کو دے دیتا تھا۔ وہ اس میں سے صرف پانچ روپے مہینہ اوپر کے خرچ کے لیے مجھ

دیدتی تھیں۔ باقی میرے تمام اخراجات ان کے ذمہ تھے۔ جو کچھ اوہ بنا دیتی تھی
 مہین لیتا تھا اور جیسا کھانا وہ کھلا دیتی تھیں کھالیتا تھا: اس کا سبب یہ تھا کہ
 ان کی آمدنی گھر کے اخراجات کو مشکل سے مکتفی ہوتی تھی۔ ان کے بڑے
 بھائی کا انتقال ہو چکا تھا جس سے سو روپیہ ماہوار کی آمدنی کم ہو گئی تھی بلکہ
 کی تنخواہیں تقریباً کل بند ہو گئی تھیں۔ باپ کی ملک بھی بسبب جین حیات
 ہونے کے ضبط ہو گئی تھی۔ کراہی کی آمدنی بہت قلیل تھی۔ صرف سرسید کی
 تنخواہ کے سو روپے ماہوار تھے اور سارے کہنے کا خرچ تھا۔ سرسید ابتدا
 سے نہایت فراخ حوصلہ اور کشادہ دل تھے۔ خرچ کی تنگی کے سبب اکثر منقبض
 رہتے تھے۔ لہذا ان کو یہ خیال ہوا کہ کسی تدبیر سے یہ تنگی رفع ہو۔ سید الاخبار جو
 ان کے بھائی کا جاری کیا ہوا اخبار تھا کچھ تو اس کو ترقی دینی چاہی اور کچھ عمارت
 دہلی کے حالات ایک کتاب کی صورت میں جمع کر کے شائع کرنے کا ارادہ کیا۔

سید الاخبار کا اہتمام اگرچہ برائے نام ایک اور شخص کے سپرد کر رکھا تھا مگر
 زیادہ تر سرسید خود اس میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ لیکن یہ اخبار ایک مدت جاری
 رہ کر بند ہو گیا۔ مگر عمارتوں کی تحقیقات نہایت محنت اور عجلت کے ساتھ
 برابر جاری رہی۔ سرسید ہمیشہ تعطیلوں میں عمارت بیرون شہر کی تحقیقات کے
 لیے شہر کے باہر جاتے تھے۔ اور جب کئی دن کی تعطیل ہوتی تھی تو رات کو بھی اکثر
 باہر رہتے تھے۔ ان کے ساتھ اکثر ان کے دوست اور مہدم مولانا امام بخش صہبائی
 مرحوم ہوتے تھے۔

باہر کی عمارتوں کی تحقیقات کرنی ایک نہایت مشکل کام تھا۔ بیسیوں عمارتیں
 ٹوٹ پھوٹ کر گھنڈہ ہو گئی تھیں۔ اکثر عمارتوں کے کتبے پڑھے نہ جاتے تھے
 بہت سے کتبوں سے ضروری حالات معلوم نہ ہو سکتے تھے۔ اکثر کتبے ایسے

خطوں میں تھے جن سے کوئی واقف نہ تھا۔ بعض قدیم عمارتوں کے ضروری حصے
 معدوم ہو گئے تھے اور جو متفرق و پراگندہ اجزا باقی رہ گئے تھے ان سے
 کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ یہ عمارت کیوں بنائی گئی تھی اور اس سے کیا مقصود تھا
 کتبوں میں جن بانیوں کے نام لکھے تھے ان کا مفصل حال دریافت کرنے کے
 لیے تاریخوں کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت تھی۔ بعض علمی عمارتوں کی حالت
 ایسی متغیر ہو گئی تھی کہ ان کی ماہیت معلوم ہونی مشکل تھی۔ پھر اکثر عمارتوں
 کے عرض و طول و ارتفاع کی پیمائش کرنی، ہر ایک عمارت کی صورت حال قلمبند
 کرنی، کتبوں کے چربے اٹارنے اور ہر ایک کتبے کو بعینہ اُس کے اصلی خط میں دکھانا
 ہر ٹوٹی بھوٹی عمارت کا نقشہ جوں کا توں مصور سے کھوانا اور اس طرح کچھ اوپر
 سوا سو عمارتوں کی تحقیقات سے عہدہ براہ ہونا، فی الحقیقت نہایت دشوار کام
 تھا۔ سر سید کہتے تھے کہ "قطب صاحب کی لاشہ کے بعض کتبے جو زیادہ بلند
 ہونے کے سبب پڑھے نہ جا سکتے تھے ان کے پڑھنے کو ایک چھینیکا دو بلیوں
 کے زچ میں ہر ایک کتبے کے محاذی بندھوا لیا جاتا تھا اور میں خود اوپر چڑھ کر اور
 چھینیکے میں بیٹھ کر ہر کتبے کا چر با اٹارتا تھا جس وقت میں چھینیکے میں بیٹھتا تھا تو
 مولانا صہبائی فرط محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے اور خوف کے مارے
 ان کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔" سر سید کی آئندہ ترقیات کی گویا یہ پہلی سیڑھی
 تھی اور ان کی یہ حالت بالکل الونام کے اس شعر کی مصداق تھی۔

وَيَصْعَدُ مَسْحَتِي يَطْلُبُ الْوَمْرِي بَانَ لَهُ حَاجَةٌ فِي السَّمَاءِ

(یعنی وہ ایسے شوق سے اوپر چڑھ رہا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں اس کو آسمان پر کچھ کام ہے)
 باوجود اس قدر مشکلات کے آثار الصنادید کا پہلا ڈیٹیشن ڈیڑھ برس
 کے اندر اندہ چھپ کر تیار ہو گیا۔ اس ڈیٹیشن میں چار باب تھے۔ پہلا باب عمارت

بیردن شہر کے جیان میں دوسرا باب لال قلعہ اور اس کی عمارتوں کے بیان میں۔
تیسرا باب خاص شہر شاہجہاں آباد کی عمارتوں وغیرہ کے بیان میں چونکہ باب
دلی کے مشہور اور نامور لوگوں کے ذکر میں جو سرسید سے کچھ پہلے یا ان کے زمانہ
میں موجود تھے۔ پہلے باب میں تقریباً ۱۳۰ عمارتوں کا بیان ہے جن میں ہندو
اور مسلمان دونوں کی عمارتیں شامل ہیں اور چہند کے سوا باقی ہر عمارت کا کتبہ
اور نقشہ اس کے ساتھ دیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں ۳۲ عمارتوں کا بیان اور
اس کے نقشے اور کتبے مندرج ہیں۔ تیسرے باب میں تقریباً ۷۰ حویلیوں، مسجدوں
مستدروں، بازاروں، ہاؤسیوں، اور کتھوں وغیرہ کا بیان ہے۔ چوتھے باب میں
اول کسی قدر ان شہروں، قلعوں اور محلوں وغیرہ کا بیان ہے جو مسلمانوں کی بکری سے
لے کر آخر تک وقتاً فوقتاً اس سرزمین میں آباد ہوئے۔ اس کے بعد جہاں کی آب
وہوا اور زبان اردو کا ذکر ہے۔ پھر مشاہیر اہل دہلی کا حال لکھا ہے جس میں ایک
سویس مشائخ، علما، فقرا، مجاذیب، اطباء، قراء، شعرا، خوشنویس، مصور، موسیقی
داں وغیرہ کا بیان ہے۔ اگرچہ اس اڈیشن کی عبارت قدیم طرز کی رنگینی اور
مبالغہ اور تکلفات باروہ کے سبب آج کل کے مذاق کے موافق بہت پھکی
اور بے مزہ ہو گئی تھی اور اس کے سوا اس میں اور بھی بہت سی کسریاں اور فرد
گناہتیں رہ گئی تھیں مگر معنوں کے لحاظ سے نہایت عبرت خیز تھی۔ اول
کے تین باب دیکھ کر سرزمین دہلی کی قدیم شان و شوکت اور عظمت کی تصویر
آنکھوں کے آگے پھر جاتی ہے اور تھوڑی دیر کو دنیا سے دل سرد ہو جاتا ہے۔
اور سچے باب سے دلی کا اخیر جھکڑا آنکھوں کے رو بہ آ جاتا ہے اور تعجب ہوتا
ہے کہ جس شہر میں بچا س حاکم بر سر پہلے قوم کے اس قدر اہل اللہ اہل علم اور
اہل ہنر موجود تھے آج وہاں چاروں طرف سناٹا نظر آتا ہے۔

الغرض یہ اڈیشن ۱۸۴۷ء میں چھپکر شائع ہوا۔ اسی زمانے میں مسٹر رابرٹس کلکٹرو مجسٹریٹ بنا جہاں آباد ولایت جاتے تھے۔ وہ ایک نسخہ آثارالصنادید کا ساتھ لے گئے اور وہاں جا کر اس کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں پیش کیا۔ ممبران سوسائٹی نے اس کو بہت پسند کیا اور کورٹ آف ڈائریکٹرز کے بعض ممبروں نے مسٹر رابرٹس سے کہا کہ اگر اس کتاب کا ترجمہ انگریزی میں ہو جائے تو بہت بہتر ہے۔ جب مسٹر رابرٹس ولایت سے واپس آئے تو انھوں نے سرسید کی شرکت سے اس کا انگریزی میں ترجمہ کرنا چاہا۔ اس وقت سرسید کو یہ خیال ہوا کہ جو کسریں پہلے اڈیشن میں رہ گئی ہیں ان کی درستی اور اصلاح کی جائے۔ چنانچہ انھوں نے کتاب پر نظر ثانی کر کے اس کو از سر نو مرتب کیا۔ جو کچھ ترمیم یا اصلاح یا اضافہ انھوں نے پہلے اڈیشن میں کیا ہے اس کا مفصل ذکر طبع ثانی کے دیباچہ میں مندرج ہے۔ بڑی خوبی اس نئے اڈیشن میں یہ ہے کہ اس کی عبارت میں بہ نسبت پہلے اڈیشن کے نہایت سادگی ہے اور اس کا بیان ایشیائی مبالغوں اور تکلفات بارود سے بالکل پاک ہے۔ اس اڈیشن کے لیے سرسید نے نقشے بھی از سر نو کمال اہتمام سے نہایت عمدہ تیار کرائے تھے۔ مگر ابھی چھپنے نہ پائے تھے کہ غدر ہو گیا اور وہ سب نقشے تلف ہو گئے۔ کچھ نقشے جو اب ملے ہیں وہ محمد ن ایگلو اور ٹیل کالج کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ البتہ چوتھا باب جس میں دلی کے مشاہیر کا حال لکھا گیا تھا وہ اس اڈیشن میں نہیں ہے اس ترمیم و اصلاح کے باعث دراصل مسٹر اور ڈیٹا مس ہوئے تھے جو اس وقت دلی میں سیشن جج تھے ان کو پرانی چیزوں کی تحقیقات کا نہایت شوق تھا انھیں کے کہنے سے سرسید نے آثارالصنادید کو از سر نو مرتب کیا تھا۔

یہ اڈیشن ۱۸۵۷ء میں چھپکر تیار ہو گیا تھا مگر نہ اس اڈیشن سے اور

نہ پہلے اڈیشن سے سرسید کو جیسا کہ خیال تھا، کچھ فائدہ ہوا۔ دوسرے اڈیشن کے تقریباً تمام نسخے غد میں تلف ہو گئے۔ اور پہلے اڈیشن میں بھی ایک شخص کی بد عہدی کے سبب جو اس کے چھاپنے کا ذمہ دار ہوا تھا، سراسر نقصان رہا۔

مسٹر رابرٹس کلکٹر و مجسٹریٹ دہلی نے سرسید کی شرکت سے اس کا ترجمہ کرنا شروع کیا تھا مگر ابھی بہت کچھ ترجمہ کرنا باقی تھا کہ مسٹر رابرٹس کی دلی سے تبدیلی ہو گئی۔ پھر معلوم نہیں کہ وہ ترجمہ پورا ہوا یا نہیں اور کسی نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا یا نہیں۔ لیکن فرانس کے مشہور اور فیڈلسٹ موسیو گارساں دتاسی نے ۱۸۶۱ء میں اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کر کے شہر کیا جس کی ایک جلد سرسید کو بھی بھیجی تھی۔ اسی ترجمہ کو دیکھ کر لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے سرسید کو سوسائٹی نہ کور کا آنریری ممبر مقرر کیا تھا۔ چنانچہ ۱۸۶۳ء میں اول مسٹر برین ہولڈ راست سکریٹری سوسائٹی موصوف کی چھٹی مورخہ ۲۰ جون ۱۸۶۳ء سرسید کے نام اس معنون کی پہنچی کہ "یورپ میں آپ کی کتاب کی بہت قدر کی گئی ہے اور یہ اتفاق رائے چند ممبران سوسائٹی آپ اس سوسائٹی کے آنریری ممبر مقرر ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد جو ڈپلوما سوسائٹی نے سرسید کو بھیجا اس کا ترجمہ ذیل میں لکھا جاتا ہے۔

لندن ۲۲ جولائی ۱۸۶۳ء

گریٹ برٹن اور آسٹریلیہ کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے ڈیرسر پرسی ہرموسٹ اگسٹنٹ مجسٹری و کٹوریا آج کی تاریخ سید احمد خاں کو اس سوسائٹی کی آنریری ممبری کے ساتھ نامزد کیا جس کی سند میں یہ ڈپلوما ان کو ارسال کیا جاتا ہے۔

دستخط اڈورڈ کول ہروک پریسیڈنٹ

دستخط ایچ رالفن ڈائریکٹر

دستخط برین ہولڈ راست سکریٹری

رسائل مذہبی وغیرہ

اسی زمانے میں جب کہ وہ دہلی میں منصف تھے آٹھ الصنادید کے علاوہ انھوں نے اور بھی کئی رسالے لکھے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

۱- فوائد الافکار فی اعمال الفرہار مترجمہ ۱۸۴۶ء یہ رسالہ ترجمہ ہے اُن فارسی مسودات کا جو سرستید کے نانا نواب و پیر الدولہ نے پرکار متناسبہ کے اعمال پر جو انھوں نے خود سوچ سوچ کر نکلے تھے، فارسی میں قلمبند کیے تھے۔ یہ مسودات سرستید کے ہاتھ آ گئے تھے۔ انھوں نے دو انگریزی عالموں کے کہنے سے ان مسودات کا ترجمہ اُردو میں کیا اور اُس میں مثالیں اپنی طرف سے اضافہ کیں۔

۲- قول متین و البطلان حرکت زمین مورخہ ۱۸۴۹ء اس رسالہ میں قدیم خیالات کے موافق سرستید نے زمین کی حرکت کو جس کا اب تمام یورپ قائل ہے غلط ثابت کرنا چاہا تھا۔ لیکن اب مدت سے حرکت زمین کا انکار نہیں کرتے تھے بلکہ اُس کو یقینی جانتے تھے۔

۳- کلمۃ الحق مؤلفہ ۱۸۴۹ء یہ رسالہ پیری مریدی اور بیعت کے طریقہ مرحومہ کے برخلاف لکھا ہے۔

۴- راہ سنت و رد بدعت مؤلفہ ۱۸۵۰ء یہ رسالہ وہابیت کے جوش کے زمانہ میں اہل بدعت کے برخلاف متبعین سنت کی تائید میں لکھا ہے۔

۵- تمیقہ در بیان مسئلہ تصور شیخ مرقومہ ۱۸۵۲ء۔ یہ رسالہ فارسی زبان میں، بطور ایک فرضی یا واقعی مکتوب کے لکھا ہے جس میں تصور شیخ مصطلح مشائخ نقشبندیہ کو وسیلۂ محبت خدا و محبت رسول و انبوی رحمت الہی بتایا ہے۔

۶- سلسلۃ الملوک مرتبہ ۱۸۵۴ء یہ ایک مختصر مگر مفید اور صحیح فہرست اُن

راجاؤں اور بادشاہوں کی بے جو دہلی میں پانچہزار برس سے نوبت بہ نوبت فرمانروا ہوتے چلے آئے اُس میں راجہ بیڈھشٹر سے لیکر ملکہ معظمہ قیصر، ہند تک ۲۰۲ فرما نرواؤں کا نام، ہاپ کا نام، سنہ جلوس، دارالسلطنت اور یہ کہ اُس کا عہد کس زمانے میں تھا، نہایت تحقیق اور جانفشانی سے لکھا ہے۔ اصل میں یہ وہی نہرست ہے۔ جو آثار الصنادید کے دوسرے ادیشن میں پہلے باب کے ساتھ اضافہ کی گئی ہے۔ اسی کو کسی قدر اصلاح کے بعد علیحدہ چھاپ کر اُس کا نام سلسلۃ الملوک رکھ دیا ہے۔

۷۔ آغاز کیمیائے سعادت کے چند اسباق کا ترجمہ مرقومہ ۱۸۵۲ء۔ بس اس کے سوا دلی کی مسکنی کے زمانہ میں سرسید نے اور کوئی کتاب یا رسالہ نہیں لکھا۔

دلی سے بجنور کو تبدیل ہونا

سرسید دلی میں جب کہ آثار الصنادید کو ترتیب دے رہے تھے، درجہ اول کے منصف ہو گئے تھے اور اب اُن کا نمبر صدر امینی کا تھا۔ لیکن کچھ تو اس وجہ سے کہ اُس وقت دلی میں ہر قسم کے اہل کمال اور اہل علم موجود تھے اور مسلمانوں کی اس سوسائٹی میں کسی قدر جان باقی تھی اور کچھ عورتوں کی تحقیقات کے ذوق و شوق میں، وہ دلی سے باہر جانا پسند نہیں کرتے تھے ایک آدھ بار جو اُن کو قائم مقام صدر امین مقرر کر کے کہیں باہر بھیجا چاہا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ رتبہ میں جو وہ قائم مقام صدر امین ہو کر گئے اس کا سبب یہ تھا کہ وہ چند روز کے لیے ایک خاص کام پر بھیجے گئے تھے۔ ۱۸۵۴ء میں جب کہ آثار الصنادید کا دوسرا ادیشن بھی نکال چکے تھے، اتفاق سے مسٹر ڈورڈ ٹامس جو دلی میں چارہ چکے تھے اور جن کے ایسا ہے آثار الصنادید کی دوبارہ اصلاح کی گئی تھی، کہیں سے آگرہ میں وارد ہوئے اور صدر بورڈ کے حکام سے ملنے کو یورڈ میں چلے گئے اُس وقت بجنور کی صدر امین

خالی تھی اور صدر امینی کے امیدواروں کی فہرست بورڈ میں پیش تھی۔ طامس صاحب نے سرسید کا نام یاد دلایا۔ بورڈ کے ممبروں نے کہا کہ وہ دلی سے باہر جانا نہیں چاہتے اس لیے اُن کا نام امیدواروں کی فہرست سے خارج کر دیا گیا ہے۔ طامس صاحب نے کہا کہ وہ قدیم عمارت دہلی کی تحقیقات میں مصروف تھے سو وہ کام ختم ہو گیا ہے۔ اب اُن کو دلی سے باہر جانے میں کچھ عذر نہ ہو گا۔ اور ایک چھٹی سرسید کو لکھی کہ تم کو بجنور میں صدر امینی پر بھیجنے کی تجویز ہو گئی ہے اب تم ہرگز انکار نہ کرنا۔ اس لیے سرسید کو لاچار دلی چھوڑنی پڑی۔ چنانچہ ۱۳ جنوری ۱۸۵۵ء کو وہ مستقل صدر امین مقرر ہو کر دلی سے بجنور کو تبدیل ہو گئے۔ بجنور میں سوادو بہس اُن کو گندے تھے کہ غدر ہو گیا۔ اس تھوڑے سے عرصہ میں انھوں نے اپنے فرائض منصبی کے علاوہ فرصت کے وقتوں میں دو کام نہایت سخت محنت کے کیے جو ذکر کے قابل ہیں۔ ایک ضلع بجنور کی تاریخ کا مرتب کرنا، دوسرے امین اکبری کی تصحیح اور ترمیم

ضلع بجنور کی تاریخ

جس زمانے میں سرسید بجنور کو تبدیل ہو کر گئے انھیں دنوں میں ایک سرکلر محکمہ صدر بورڈ سے تمام صاحبان ضلع کے نام اس مضمون کا جاری ہوا تھا کہ جس ضلع کا بندوبست ختم ہو جائے اُس ضلع کی ایک مفصل تاریخ لکھوائی جائے۔ یہ سرکلر پہلے سے صاحب کلکٹر کے دفتر میں آیا ہوا تھا مگر ابھی تک اُس پر کچھ عملدرآمد نہ ہوا تھا۔ ایک روز صاحب کلکٹر نے سرسید سے اُس کا ذکر کیا، انھوں نے کہا اس ضلع کی تاریخ میں لکھوں گا، صاحب کلکٹر مثبت خوش ہوئے اور محکمہ بندوبست میں حکم بھیج دیا کہ جس پر گز یا گانو کے کاغذات صدر امین صاحب طلب کریں فوراً ان کے پاس بھیج دیے جائیں اور اسی طرح تمام تحصیلداروں کو ہدایت کی گئی کہ

جس قانون گویا پیٹنری کو وہ بلائیں یا جو کاغذات وہ منگوائیں ان کے حکم کی تعمیل کی جائے۔ سرسید نے یہ تاریخ بھی اپنی جہلی عادت کے موافق نہایت تحقیق اور کاوش اور محنت کے ساتھ لکھی۔ ان کا بیان ہے کہ ”گو اس تاریخ میں ضلع کے حالات کے سوا کوئی عام دلچسپی کی بات نہ تھی مگر اثنائے تحقیقات میں بعض قانون گویوں کے پاس اکبر اور عالمگیر کے زمانہ کے ایسے کاغذات ملے جن سے نہایت عمدہ نتیجے نکلتے تھے۔ ان سب کاغذات کی نقلیں اپنے اپنے موقع پر اس تاریخ میں درج تھیں۔ جب یہ تاریخ لکھی جا چکی تو صاحب کلکٹر نے اس کو ملاحظہ کے لیے صدر بورڈ میں بھیج دیا۔ ابھی وہ بورڈ سے واپس نہ آئی تھی کہ غدر ہو گیا اور آگرہ میں تمام دفتر سرکاری کے ساتھ وہ بھی ضائع ہو گئی۔ مسٹر شکسپیر کلکٹر ضلع بجنور اسی تاریخ کی نسبت اپنی چٹھی مورخہ ۵ جون ۱۸۵۰ء میں لکھتے ہیں کہ ”سید احمد خاں ان باتوں کی طرف بھی متوجہ ہوئے ہیں جو ان کے خاص کام سے علاوہ نہیں رکھتیں۔ پتا نچے انھوں نے اس ضلع کی تاریخ بھی بہت محنت کے ساتھ تیار کی تھی کہ غدر سے چند روز پہلے ہم نے یہ کتاب گورنمنٹ میں بھیجی تھی۔ اگر وہ اس وقت یہاں میرے پاس موجود ہوتی تو بہت بکار آمد ہوتی، مگر غالب ہے کہ آگرہ میں بیلاٹ غدر کے تلف ہو گئی۔“

اسی تاریخ میں سرسید نے ایک لمبی بحث سنہ فصلی کے متعلق لکھی تھی اور جو غلطی سنہ فصلی اور سنہ عملی میں فرق نہ کرنے اور دونوں کو ایک سمجھنے سے سرکاری دفاتروں میں ہمیشہ سے چلی آتی تھی اس کو نہایت وضاحت کے ساتھ گورنمنٹ پر ظاہر کیا تھا اور جو مشکلات کہ اس غلطی سے لازم آتی تھیں ان کو جنایا تھا۔ گو یقیناً نہیں کہا جاسکتا کہ گورنمنٹ نے سرسید کی اسی تخریر پر لحاظ کر کے اس غلطی کی اصلاح کی کیونکہ وہ تاریخ ۱۸۵۰ء کے ہنگامہ میں تلف ہو گئی تھی۔

مگر واقعہ یہ ہے کہ صدر بورڈ کا ایک سرکلر ۱۸۷۰ء میں اور دوسرا ۱۸۷۱ء میں منظوری گورنمنٹ جاری ہوا جس کی رو سے علاوہ سنہ فصلی اور سنہ حسابی کے ایک اور سنہ مالی کے نام سے مقرر کیا گیا جو بالکل سنہ عملی کے مطابق ہے اور جس سے وہ تمام مشکلات رفع ہو گئیں جو سرسید نے اپنی تاریخ میں جنائی تھیں۔ کچھ تعجب نہیں ہے۔ کہ جو کچھ سرسید نے تاریخ بجنور میں اس امر کے متعلق لکھا تھا وہ بورڈ کے کسی ممبر کے ذہن میں محفوظ رہا اور غدر کے دو تین برس بعد اسی بنا پر سنہ مالی مقرر کیا گیا ہو۔ سرسید نے اسی سنہ فصلی کے مضمون پر ۱۸۶۶ء میں ایک نہایت مفید اور مفصل لکچر سائٹفک سوسائٹی علیگری میں دیا تھا جو ۸-جون ۱۸۶۶ء کے اخبار میں درج ہے۔ اس لکچر میں انہوں نے تقریباً وہ تمام خیالات ظاہر کیے ہیں جو سنہ فصلی کے متعلق تاریخ بجنور میں تحریر کیے تھے۔

آئین اکبری کی تصحیح

جب سرسید دہلی میں منصف تھے تو حاجی قطب الدین مرحوم نے جو دہلی کے ایک مشہور تاجر تھے ان سے درخواست کی تھی کہ اگر آپ آئین اکبری پر ایک تفصیلی نظر ڈال کر اس کی تصحیح اور درستی کر دیں تو میں اُس کو چھپوادوں اور اُس کے معاوضہ میں آئین اکبری کے چھپے ہوئے نسخے قیمتی سولہ سو روپے کے آپ کی نقد کروں گا۔ سرسید نے منصفی دہلی کی حالت میں وہیں کے ایک تاجر سے ایسا معاہدہ کرنا جائز نہ سمجھا۔ مگر چونکہ ایسے مفید اور دشوار کاموں میں ان کا جی بہت لگتا تھا، بجنور پہنچ کر انہوں نے یہ کام شروع کیا۔

آئین اکبری اول تو زبان اور طرز بیان کے لحاظ سے ایک نئی طرح کی کتاب تھی دوسرے جس قسم کے مضامین اُس میں بیان کیے گئے ہیں۔ قاری لٹریچر

میں کبھی اُس قسم کے مضامین بیان نہیں ہوئے تھے اس لیے اُس کے پڑھنے سے جی الجھتا تھا۔ پھر آئین اکبری کے نسخے کاتبوں کے سہو و غلطی سے اکثر مسخ ہو گئے تھے اس لیے اس کا صحیح کرنا سخت دشوار تھا۔ ہر ستیڈ نے اول جہاں تک مل سکے اُس کے متعدد نسخے بہم پہنچائے۔ اس میں ایک آدھ نسخہ صحیح بھی مل گیا اور اس طرح غلط اور صحیح نسخوں کے باہم مقابلہ کرنے سے ایک نسخہ سب سے زیادہ صحیح تیار ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے فارسی، عربی، ترکی، ہندی اور سنسکرت کے اکثر غریب الفاظ کی شرح کی، جو اصطلاحیں اکبر کے زمانہ میں ہر ایک آئین کے متعلق مستعمل تھیں یا خود ابوالفضل نے اختراع کی تھیں ان کی جا بجا تشریح کی۔ اُس زمانے کے اوزان اور نقود کی اس زمانہ کے اوزان و نقود سے مطابقت کی، جن جدولوں میں مصنف نے کچھ خانے خالی چھوڑ دیئے تھے اور تمام نسخوں میں وہ خانے خالی پائے گئے۔ ان کو اور کتابوں سے تحقیق کر کے معمور کیا، کہیں کہیں جدولوں میں جو خود مصنف نے غلطی کی تھی اُس کو بہت کوشش سے تحقیق کر کے صحیح کیا۔ بعض جدولوں میں ہندسوں کی جگہ حرف لکھے ہوئے تھے ان کی قیمت ہندسوں میں بھی ظاہر کر دی۔ بعض جدولیں جو تمام نسخوں میں مختلف پائی گئیں، وہ آئین کے انگریزی ترجمہ کے مطابق جس میں ہر جدول نہایت صحت کے ساتھ لکھی گئی تھی کتاب میں داخل کریں۔ اکثر جدولوں میں ایک خانہ اپنی طرف سے آخر میں اس لیے اضافہ کیا کہ اُس سے پہلے خانے کا مفہوم ہر شخص باسانی سمجھ جائے۔ جہاں آئین میں سیکوں کا بیان ہے وہاں چند اوراق بطور حاشیہ کے اپنی طرف سے بڑھائے اور اکبر کے زمانے کے جس قدر سیکے ابوالفضل نے بیان کیے تھے ان میں سے ہر ایک سیکے کی دو دو تصویریں دے کر دونوں طرف جڑ عبارت یا الفاظ کندہ تھے ان کو دکھایا اور اکبر ہی کے زمانے کے آٹھ سیکے سونے اور

چاندی کے ان کے علاوہ اور نشان دینے اس کے سوا اور بہت سی باتیں مفید امانتہ کہیں۔
 پھر اصل آئین میں خال خال تصویریں تھیں، سرسید نے نہایت محنت و
 جانفشانی اور حسن اہتمام سے بے شمار تصویریں دلی کے لائق مصوروں سے کھچوا
 کہ کتاب میں اپنے اپنے موقع پر داخل کیں، مثلاً ٹکسال کے متعلق تقریباً پچاس
 پچھن تصویروں کے دو بڑے بڑے مرتعے کھچوانے جن میں مختلف کارگر اپنے
 اپنے آلات اور ظروف اور اوزار لیے ہوئے جدا جدا کام کر رہے ہیں۔ اسی
 طرح فلزات کے متعلق ترازوئے ہوائی ڈنرازوئے آبی کی تصویر، ٹسکار اور پورس
 کے موقع پر خمیدہ گاہ بادشاہی کی تصویر، آئین چراغ خانہ کے متعلق اکبر کی آئین
 پرستی اور اس کے تمام لوازمات کی تصویر، آئین شکوہ سلطنت کے متعلق تمام
 سامان توڑک و خدشام کی تصویریں، فیلیجانہ اور ہاتھیوں کی پوشش اور ہاتھیوں
 کی کشتی کی تصویریں، علیٰ ہذا القیاس تمام پھلدار اور پھولدار درختوں کی اور ہر
 ایک درخت کے ساتھ اس کی شاخ اور برگ و ثمر یا پھول اور پتے کی تصویریں
 اور اق گنجدہ قدیم اور گنجدہ مختصرہ اکبر کی تصویریں اور تمام ہتھیاروں اور زیوروں
 کی تصویریں اور ان کے سوا اور بہت سی تصویریں کھچوا کر کتاب میں شامل کیں
 چنانچہ مسٹریچ بلاک مین پرنسپل کلکتہ کالج نے جو ۱۸۷۳ء میں آئین کا از سر نو
 ترجمہ کر کے چھاپا ہے اس میں انھیں تصویروں کی نقل لی ہے جو سرسید نے فارسی
 آئین اکبری میں داخل کی تھیں۔

پہلی اور تیسری دو جلدیں اس طرح صحیح اور درست کہ کے مطبع میں چھپنے کو
 بھیج دی گئیں مگر دوسری جلد کی تصحیح میں یہ مشکل پیش آئی کہ ابوالفضل نے آئین
 خراج کے متعلق جو تمام ہندوستان کا محاصل لکھا تھا وہ حصہ تمام نسخوں میں
 مختلف پایا گیا اور کوئی ذریعہ اس کی تصحیح کا نہ تھا، اتفاق سے دلی میں سرسید

کے تانا نواب دبیر الدولہ کے وقت کی ایک کتاب تشکیل دی جس میں سلطنت مغلیہ کے کل بادشاہوں کے عہد کا محاصل نہایت مفصل اور صحیح طور پر واضح کیا اس کتاب سے تمام محاصل جو اکبر کے زمانہ کا تھا نقل کر کے دوسری جلد بھی مکمل کی گئی اور ایک مبادیہ چاہے جو گویا آئین اکبری پر ایک مفصل ریویو تھا، تحریر کر کے دوسری جلد کے ساتھ دلی میں چھپنے کو بھیجا۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ جلد ابھی چھپنے نہ پائی تھی کہ غدر ہو گیا اور اس کے جس قدر نمونے چھپ چکے تھے وہ اور تمام مسودہ اور دستاویز سب تلف ہو گئے۔ اب اس آئین اکبری کی جو سرسید نے صحیح کی تھی صرف پہلی اور تیسری دو جلد میں مطبوعہ ۱۲۷۲ھ ہجری کہیں کہیں پائی جاتی ہیں۔

دہلی کے جن نامور لوگوں کی تقریظیں آثار الصنادید کے آخر میں درج ہیں انہوں نے آئین اکبری پر بھی نظم یا نثر میں تقریظیں لکھی تھیں مگر آئین کے آخر میں صرف مولانا صہبائی کی تقریظ چھپی ہے۔ مرزا غالب کی تقریظ جو ایک چھوٹی سی فارسی ثنوی ہے وہ کلیات غالب میں موجود ہے مگر آئین اکبری میں سرسید نے اس کو قصداً نہیں چھپوایا۔ اس تقریظ میں مرزا نے یہ ظاہر کیا ہے کہ ابو الفضل کی کتاب اس قابل تھی کہ اسکی تصحیح میں اس قدر کوشش کی جائے چنانچہ کہتے ہیں۔

متر وہ باران را کہ این دیریں کتاب یافت از اقبال سید فتح باب دیدہ بیتا آمد و باز دوقی کہنگی پوشید تشریف نوی دی کہ در صح آئین مائے دست ننگ و عاریت والائے دست

اس کے بعد بہت سے اشعار اس مضمون کے لکھے ہیں کہ تعریف کے قابل

انگریزوں کے آئین و ایجاد و اختراع میں نہ کہ اکبر اور ابو الفضل کے۔ اور تمثیلاً

انگریزوں کے بہت سے ایجادات بیان کیے ہیں۔ جب یہ تقریظ مرزا نے

سرسید کو بھیجی انہوں نے اس کو مرزا کے پاس واپس بھیج دیا اور لکھا کہ ایسی تقریظ

مجھے درکار نہیں۔ ایک عربی تقریظ نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کی بھی ہے مگر وہ

(حاشیہ محلہ صفحہ پر)

بھی شاید دیر میں پہنچنے کے سبب چھپنے نہیں پائی۔ انہوں نے بھی اپنی تقریظ کے آخر میں ایک فارسی شعر ایسا لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں بھی آئین اکبری کی کچھ زیادہ وقعت نہ تھی۔

مگر اہل یورپ اس کتاب کو ہندوستان کی تاریخوں میں ایک بے نظیر کتاب سمجھتے ہیں۔ ۱۸۶۶ء سے اہل فرانس اور انگریز اس کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اس وقت سے ۱۹۱۰ء تک اس کے متعدد ترجمے اور خلاصے فریچ اور انگلٹس میں ہو چکے ہیں۔ بسٹراچی بلاک میں جنہوں نے ۱۸۷۳ء میں انگریزی میں نہایت احتیاط کے ساتھ اس کا ترجمہ کر کے شائع کیا تھا اس کی نسبت لکھتے ہیں کہ یہ کتاب مسلمانوں کی تاریخوں میں جو ہندوستان میں لکھی گئی ہیں اپنا نظیر نہیں رکھتی یہ فی الواقع اس سلطنت کی جو ۱۵۹۰ء کے قریب تھی۔ ایک ایڈمنسٹریشن رپورٹ اور نقشجات ہیں جن میں اکبر کے عہد کے وہ تمام حالات اور واقعات درج ہیں جن کے لیے ہم اس زمانے میں ایڈمنسٹریشن رپورٹوں، نقشوں اور گزٹیروں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

پس سرسید کا ایک ایسی نادرا وجود کتاب کی تصحیح و تہذیب میں کوشش

نے سرسید کہتے تھے کہ "جب میں مراد آباد میں تھا اس وقت مرزا صاحب نواب یوسف علیخان مرحوم سے ملنے کو راہ پو گئے تھے ان کے جائگی تو مجھے طبر نہیں ہوئی مگر جب دلی کو واپس جاتے تھے میں نے سنا کہ وہ مراد آباد میں سرانے میں آکر ٹھہرے ہیں میں فوراً سرانے میں پہنچا اور مرزا صاحب کو مع آسیاب اور تمام ہمارے بولکے اپنے مکان پر لے آیا ظاہر ہے کہ سرسید نے تقریظ کے چھپنے سے انکار کیا تھا وہ مرزا سے اور مرزا ان سے نہیں ملے تھے اور دونوں کو حجاب و انگیز ہو گیا تھا اور اسی لیے مرزا نے مراد آباد میں آنے کی ان کو اطلاع نہیں دی تھی، الغرض جب مرزا سرانے سے سرسید کے مکان پر پہنچے اور بالکی سے اترے تو ایک بونل ان کے ہاتھ میں تھی انہوں نے اس کو مکان میں لاکر ایسے موقع پر رکھ دیا جہاں ہر ایک آتے جاتے کی نگاہ پڑتی تھی سرسید نے کسی وقت اس کو وہاں سے اٹھا کر اسباب کی کوٹھڑی میں رکھ دیا۔"

بلخ کر کے اس کو از سر نو زندہ کرنا صرف یہی نہیں کہ وہ کوئی فضول کام نہ تھا بلکہ فی
 الحقیقہ سپاک پر ایک بہت بڑا احسان تھا اور مسلمانوں کے ایک نامور مصنف
 اور نامور بادشاہ کے کارنامہ کو دنیا کے سامنے ایک دلنشین صورت میں پیش کرنا تھا۔
 غدر سے پہلے صرف سواد و ہرس سرسید کا بجنور میں رہنا ہوا اسی قلیل عرصہ
 میں مذکورہ بالا کاموں کے سوا اور اپنے فرائض منصبی کے علاوہ اور بھی چھوٹے
 چھوٹے مفید کام کرتے رہے۔ چونکہ ان کی طبیعت کو تعمیر کے کام سے ایک خاص
 قسم کا رگاوڑ تھا اس لیے صاحب کلکٹر نے کیشی رناہ عام سا تمام کام ان کے سپرد
 کر دیا تھا۔ وہی اُس کی رپورٹ لکھتے تھے اور وہی ضروری کاموں کے لیے روپیہ
 منگوانے تھے اور سب ایک کام کی نگرانی کرتے تھے منجملہ اور کاموں کے ایک مفید
 کام انھوں نے یہ کیا کہ بجنور کی آبادی کے متعل شارع عام کے بچوں بیچ مدت
 سے ایک نہایت چوڑا چکلا گرٹھا پڑا ہوا تھا، اسی رستے سے تمام گاڑیاں، گھوڑے
 پیدل اور سوار گزرتے تھے، بعض اوقات گاڑیاں اٹک جاتی تھیں، بیلوں کو نقصان
 پہنچتے تھے، برسات میں پانی بھر جاتا تھا جس سے طرح طرح کی تکلیفیں لوگوں کو
 ہوتی تھیں، مدت سے یہ گرٹھا چلا آتا تھا مگر کسی کو کچھ خیال نہ تھا، سرسید نے
 خاص اپنے اہتمام سے وہاں ایک پل بندھوایا اور بجنور سے دارائنگر تک ایک
 سڑک بنوادی جس سے مسافروں کو بہت آسانی ہو گئی۔

۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۸ء تک

”ایامِ غدر کی خدمات اور واقعات، مراد آباد کی تبدیلی اور تاریخ
 کوشی بھنور کی اشاعت، مراد آباد میں مدرسہ قائم کرنا، رسالہ اسباب
 بغاوت لکھ کر اور چھپوا کر ولایت بھیجا۔ ملکہ معظمہ کے اشتہار کا شکریہ،
 ایک میگزین موسوم بہ ”دلائل محمد نرسا آف انڈیا“ اردو اور انگریزی
 میں نکالنا، تحقیق لفظ نصاریٰ پر ایک مختصر رسالہ لکھنا، انتظام قحط
 ضلع مراد آباد، تصحیح تاریخ فیروز شاہی تفسیر توریت و انجیل، بی بی
 کا انتقال، غازی پور کی تبدیلی، غازی پور ہی میں سائنٹفک سوسائٹی
 قائم کرنا، غازی پور میں مدرسہ قائم کرنا، علیگڑھ کی تبدیلی، برٹش انڈین
 ایجوکیشنل ایشن قائم کرنا، اضلاع شمال مغرب میں تعلیمی کمیٹیوں کا
 مقرر کرانا۔ سائنٹفک سوسائٹی اخبار کا علیگڑھ سے نکلنا، ورنیکلر
 یونیورسٹی کے لیے تحریک، ہنارس کی تبدیلی، اردو زبان اور فارسی
 خط کی حمایت، رسالہ طعام اہل کتاب، رسالہ علاج ہیضہ موجب
 اصول ہومیوپیتھک۔“

ایامِ غدر کا بیان

جس واقعہ نے ہندوستان کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کے نام پر ایک سیاہ

دھیابہ چھوڑا ہے اور جو ہندوستان کی قوموں کی قیمت کا فیصلہ کرنے والا اور سرسید کے خیالات میں ایک انقلاب عظیم پیدا کرنے والا تھا، وہ سرسید کو بجنور میں دیکھنا چاہتا، ان کو اس ضلع میں دو برس اور چار مہینے گزرے تھے کہ اسی ۱۸۵۷ء کو دہلی میں بغاوت ہوئی اور ۱۲۔ کو یہ خبر بجنور میں پہنچ گئی۔ وہاں اُس وقت بیس یورپین اور یوریشین عورتوں اور بچوں سمیت تھے۔ سرسید نے اس موقع پر اپنا پہلا فرض یہ قرار دے لیا تھا کہ جب تک دم میں دم باقی ہے ان بیس جانوں کے بچانے میں جہاں تک ممکن ہو کوشش کی جائے۔ جو واقعات اور مصائب وہاں پیش آئے وہ نہایت درد انگیز ہیں اور سرسید کی تاریخ سرکشی بجنور میں مفصل مذکور ہیں۔ ان کی تفصیل دوبارہ لکھتی گویا ان مصیبتوں کا پھر یاد دلانا اور رنج کو دوبالا کرنا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ سرسید نے اُس خطرناک موقع پر نہایت دلیری اور جوانمردی سے تمام مصیبت کے زمانے میں یورپین حاکموں کا جو وہاں موجود تھے، ساتھ دیا۔ ہر ایک نازک وقت میں ان کے ساتھ شریک اور گورنمنٹ کی ولاداری اور خیر خواہی میں شب و روز مستعد اور سرگرم رہے۔ جو لوگ گورنمنٹ کے خیر خواہ تھے اپنی مستعدی اور سرگرمی سے ان کے دل بڑھائے اور جن کی نیتوں میں نزلزل اور تذبذب پایا ان کو نیک صلاحیں دیں اور جہاں تک ممکن تھا ان کے خیالات کی اصلاح کی۔ اور جیسا کہ اُس زمانے کے دیکھنے والے بیان کرتے ہیں اور جیسا کہ خود یورپین افسروں نے اقرار کیا ہے صرف سرسید ہی کی حسن تدبیر دانائی اور نیک دلی سے تمام یورپین اور عیسائی مرد اور عورتیں اور بچے صحیح و سالم وہاں سے نکل کر رڑکی میں پہنچ گئے۔

مسٹر شکسپیئر جو اُس زمانے میں بجنور کے کلکٹر و مجسٹریٹ تھے، جو کہ سرسید

کو با اعتبار عہدے کے اُن سے کچھ تعلق نہ تھا مگر مسٹر شکسپیر سے اُن کی بہت راہ ورسم تھی جب بجنور میں بغاوت کے آثار نمودار ہونے لگے اور حالت خطرناک ہوئی تو مسٹر شکسپیر بہت گھبرائیں۔ سرسید کو جب یہ حال معلوم ہوا تو جا کر ان کی تشفی کی اور کہا کہ ”جب تک ہم زندہ ہیں آپ کو گھبرانا نہیں چاہیے۔ جب آپ دیکھیں کہ ہماری لاش کو ٹھی کے سامنے پڑی ہے اُس وقت گھبرانے کا سزا نفع نہیں؛ مسٹر شکسپیر ہمیشہ سرسید کی اس شریفانہ تقریر کے شکر گزار رہے۔“

سرسید کا یہ کہنا صرف زبانی نہ تھا بلکہ انہوں نے اپنے افعال سے اس قول کو سچ کر دکھایا تھا۔ وہ تمام رات سسج مع اور ہندوستانی افسروں کے صاحب کلکٹر کی کوٹھی پر پہرہ دیتے تھے اور ہر طرح عورتوں اور بچوں کی ڈھارس بندھواتے تھے ساری رات کرسیوں پر بیٹھے یا کوٹھی کے آگے ٹہلتے یا شہر میں گشت کرتے گذر جاتی تھی۔ یلٹن نمبر ۲۹ تلنگوں کی ایک کمپنی سہانہ پور سے بطور بدلی کے مراد آباد کو جاتی تھی۔ جب وہ بجنور میں پہنچی تو صوبہ دار اور کچھ تلنگے صاحب کلکٹر کی کوٹھی پر گئے سرسید سے کسی نے یہ کہہ دیا کہ یہ کمپنی بگڑ کر آئی ہے اور کچھ تلنگے اور صوبہ دار ابادہ نساہ کلکٹر کی کوٹھی پر گئے ہیں۔ سرسید کو یقین ہو گیا کہ انگریزوں کی خیر نہیں۔ وہ اسی وقت سسج ہو کر کوٹھی کو روانہ ہو گئے۔ اوسا نے صغیر سن بھتے لے کر جو تہا چچا کے پاس تھا۔ چلتے وقت اپنے آدمی کے سپرد کر گئے اور کہہ گئے کہ اگر میں مارا جاؤں تو لڑکے کو کسی اسن کی جگہ پہنچا دیجیو۔ مگر کوٹھی پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ کمپنی مذکورہ بدلی پر مراد آباد جاتی تھی

وہ رات جبکہ کلکٹر کی کوٹھی میں تمام یورپین اور یوریشین مرد عورتیں اور بچے جمع تھے اور ایک جماعت کثیر جو بظاہر ان کی حفاظت کے لیے فراہم ہوئی تھی ان کی نیتیں گڑبگڑ گئی تھیں اور کچھ فوج اور توپخانہ باغیوں کا ان کی کمک کے لیے مراد آباد سے منقریب آنے والا تھا نہایت سختی تھی، اُس روز سب کے مارے جانے میں کچھ شبہ نہ تھا۔ ایسے نازک وقت میں سرسید تنہا اُس خود سر جماعت کے مجمع میں گئے اور نواب محمود خاں سے جو ان کا سرغنہ تھا گفتگو کی اور کہا کہ چپنڈ انگریزوں کے مار ڈالنے سے کیا ہاتھ آئے گا! بہتر یہ ہے کہ ان کو صحیح و سالم یہاں سے جانے دو، اور تم ملک کے مالک ہو جاؤ، ایسے ٹیڑھے وقت میں سرسید کے ہوش و حواس بالکل بجا اور درست رہے اور محمود خاں سے ایسی عمدہ گفتگو کی اور اس معاملہ کے متعلق تمام نشیب و فراز ایسی خوبی سے سمجھائے کہ اس نے فوراً منظور کر لیا اور سب انگریزوں کو اسی رات اُس خوشخوار مجمع سے نکال کر رُٹکی روانہ کر دیا اس موقع پر کلکٹر کی طرف سے جو تحریر سرسید نے لکھ کر نواب محمود خاں کو دی تھی اگر وہ اُس کے موافق عمل درآمد کرتا تو اُس کو کسی طرح کا اندیشہ نہ تھا بلکہ انگریزی تسلط ہو جانے کے بعد ضرور اُس کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا جو اور خیر خواہوں کے ساتھ ہوا۔ مگر افسوس ہے کہ اُس نے انگریزوں کے چلے جانے کے بعد اس پر کچھ لحاظ نہ کیا انگریزوں کے رُٹکی روانہ ہو جانے کے بعد سرسید اور ان کے دوست میر تراز علی خاں جو اُس زمانے میں بجنور میں تحصیلدار تھے اسی رات کو بستی کو ملے جو بجنور سے چھ سات کوس ہے چلے گئے مگر نواب نے سوار بھیجا ان کو وہاں سے بلایا مجبوراً ان کو پھر بجنور میں آنا اور نواب سے ملنا پڑا اور ڈپٹی رحمت خاں بھی ہلدور سے آئے۔ نواب کی خواہش تھی کہ یہ لوگ جب مجھ سے ملنے آئیں تو تندر میں پیش کریں، مگر انھوں نے تندر میں پیش نہیں کیں، نواب نے مکتدہ ہو کر ان کو رخصت

کر دیا اور کہا کہ بدستور بجنور میں اپنا اپنا کام کرو۔ سرستید نے ولویانی کا کام اسی طرح
 جس طرح کہ انگریزوں کے سامنے کرتے تھے کرنا شروع کیا جو رو بکاریاں اور لوہے
 صاحب حج کے ہاں بھیجنے کے قابل ہوتی تھیں ان کی نسبت علی الاعلان کچھری میں
 یہ حکم تحریر کرتے رہے کہ بحضور صاحب حج بہادر بھیجی جائیں مطلب اس سے یہ
 تھا کہ عوام کو یہ خیال ہو کہ سرکار انگریزی کا تسلط اور عملداری بدستور قائم ہے۔ مگر
 محمود خاں کو یہ اسرنا گوار گذرتا تھا۔ محمود خاں نے پھر ایک روز راتنا کے وقت سرستید
 کو بلایا۔ اُس وقت نواب اور اس کا بھانجا جو اس کے مزاج پر بہت حاوی تھا دونوں
 موجود تھے۔ انہوں نے سرستید سے کہا کہ ہم چاہتے ہیں تم ہمارے ساتھ شریک
 ہو جاؤ۔ اور ہم سے اس بات پر حلف کر لو جو جاگیر چاہو نسل بعد نسل ہم سے ٹھیرا لو
 اور ہم سے حلف لے لو کہ ہم ہمیشہ وہ جاگیر بجاں رکھیں گے۔ سرستید کو اول تو جواب
 دینے میں تامل ہوا۔ مگر آخر کار ان سے صاف کہہ دیا کہ "ہیں اس بات پر بلاشبہ حلف
 کر سکتا ہوں کہ میں ہر حال میں تمہارا خیر خواہ رہوں گا اور کسی وقت تمہاری بدخواہی
 نہ کروں گا۔ لیکن اگر تمہارا ارادہ ملک گیری کا اور انگریزوں سے لڑنے کا ہے
 تو میں تمہارے ساتھ شریک نہیں ہوں۔" سرستید نے قسم یاد کر کے نواب سے
 کہا کہ "میں صرف تمہاری خیر خواہی کے لیے کہتا ہوں آپ اس ارادہ کو دل سے
 نکال ڈالیں۔ انگریزوں کی عملداری ہرگز نہیں جانے کی۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ تمام
 ہندوستان سے انگریز چلے جائیں گے تو بھی انگریزوں کے سوا ہندوستان میں
 کوئی عملداری نہ کر سکے گا۔ آپ سرکار کی اطاعت کو ہاتھ سے نہ دیں۔ اگر بالفرض
 انگریز جانتے رہے تو آپ نواب بنے بنائے ہیں آپ کی نوابی کوئی نہیں چھینتا
 اور اگر میرا خیال صحیح ہے تو آپ خیر خواہ سرکار بنے رہیں گے اور سرکار آپ کی
 نہایت فائدہ کرے گی۔ اگر آپ مجھ کو انتظام میں شریک کرنا چاہتے ہیں تو صاحب

کلکٹر سے اجازت منگالیجیے اور یہ اقرار کر لیجیے کہ کوئی کام جب تک کہ اُس کی منظوری صاحب کلکٹر سے نہ منگالیں ہرگز نہ کریں گے۔ مگر نواب نے اُس کو منظور نہیں کیا۔ بلکہ وہ ناراض ہوا اور چین بہ چین ہو کر سرسید کو رخصت کیا اور ہر طرح اُن کی اور اُن کے ساتھیوں کی بُرائی کے واسطے ہو گیا۔ جس مکان میں سرسید رہتے تھے اس کو بہ چیر چھین لیا اور اپنی فوج کے افسروں کو دے دیا۔ جو اسباب سرسید کا اس میں بند تھا وہ سب فوج کے افسروں نے لے لیا۔ اسی طرح میر تراب علی کا گھوڑا بہ چیر چھین لیا۔

انھیں دنوں میں ایک شخص میر خاں نامی مع جمعیت چاہ سو آدمی کے تگینے سے بجنور میں آیا اور سرسید میر تراب علی، ڈپٹی رحمت خاں کے قتل کے واسطے ہوا اُن کو یہ جبر و تکلم طلب کیا اور کہلا بھیجا کہ اگر حاضر نہ ہو گے تو بہتر نہ ہو گا۔ سرسید اور میر تراب علی اُس کے پاس گئے۔ منیر خاں نے سرسید سے مسئلہ جہاد کے بارے میں گفتگو کی۔ انھوں نے نہایت بخندگی سے اُس کو سمجھایا کہ شرع کے بموجب ہرگز جہاد نہیں ہے۔ اُس نے اُن کو تو رخصت کیا اور مولوی علیم اللہ ریش بجنور کے پاس خود جا کر یہی مسئلہ پوچھا۔ انھوں نے بڑی دلیری سے اُس کے ساتھ گفتگو کی اور بہت سی دلیلوں سے اُس کو فائل کیا کہ مذہب کی رو سے جہاد نہیں ہے۔ اُس روز مولوی علیم اللہ قتل ہوتے ہوئے تھے۔ دوسرے دن منیر خاں وہاں سے واپس چلا گیا اور وہاں جا کر دروائی میں مارا گیا۔

سرسید برابر اس فکر میں تھے کہ کسی طرح بجنور سے نکل کر میرٹھ پہنچ جائیں مگر کوئی موقع نہ ملتا تھا اسی عرصہ میں ہلدور کے چودھروں نے ایک انبوا کثیر جمع کر کے محمود خاں کی فوج پر حملہ کیا اور نواب شکست کھا کر بجنور سے نجیب آباد چلا گیا۔ سرسید نے اُس کی مفصل کیفیت اسپیشل کمشنر میرٹھ کو لکھ بھیجی وہاں

سے حکم آگیا کہ تم سرکار کی طرف سے صلح کا انتظام کرو اور ڈپٹی رحمت خاں اور میر
نواب علی کو اپنے ساتھ شریک کر لو۔ انھوں نے ایک مہینے تک بہت اچھا
انتظام رکھا۔ مگر باوجود سخت ممانعت اور روک تھام کے ہلدور کے چودھری
نے بگینے پر حملہ کر کے کچھ آدمی مار ڈالے اور کچھ محلے لوٹ لیے۔ اب نواب
محمود خاں کے گرد پھر ایک جمعیت کثیر جمع ہو گئی۔ نواب نے بیخبر پر حملہ کیا اور
چودھری شکست کھا کر بھاگے، چونکہ سرسید کو نواب کی طرف سے حدشہ ننھا وہ
بھی ہلدور چلے گئے مگر نواب نے ہلدور پر بھی حملہ کیا اور چودھریوں کو شکست
دے کر ہلدور کے مہنت سے مکانات جلا دیے۔ سرسید اور ڈپٹی رحمت خاں
رات کو ہلدور سے پیادہ پا اس ارادہ سے نکلے کہ میرٹھ چلے جائیں۔ رستے میں
موضع پلانہ کی سرحد پر دو ہزار گنوار مسخ ان کے لوٹنے اور مار ڈالنے کے ارادے
سے دوڑے۔ مگر بخشش نامی ایک پدھان نے ان کو بچایا۔ جب وہاں سے چاند
پور پہنچے تو کئی سزرا آدمیوں نے بندوقوں اور ہتھیاروں سے ان کو گھیر لیا۔ یہاں
تک کہ میر صادق علی خاں رئیس چاند پور وہاں پہنچے اور سرسید اور ڈپٹی رحمت
خاں کو اس انبوہ سے نکال کر اپنے مکان پر لے گئے۔ دوسرے روز میر صادق علی
نے خود ساتھ ہو کر ان کو موضع پھولہ تک پہنچا دیا۔ وہاں سے سرسید نے پچھڑاؤں
پہنچ کر بسبب علالت اور رستے کی کوفت کے چند روز مولوی محمود عالم کے مکان
پر جو ان کے دوست تھے، مقام کیا اور اپنی مفصل سرگذشت حکام انگریزی کو
لکھ بھیجی اور چند روز بعد خود بھی میرٹھ چلے گئے۔ جس وقت وہ میرٹھ ہی پہنچے ہیں
ان کے پاس چھ پیسے اور اس پھٹے ہوئے کڑتے کے سوا جو وہ پہنے ہوئے تھے۔
اور کچھ نہ تھا۔

میرٹھ میں ان کے پہنچنے اور بیمار ہونے کا حال سن کر مسٹر کری کرافٹ ولسن

جو کہ وہاں جج اور اسپیشل کمشنر تھے ان کے دیکھنے کو آنے اور سرسید سے کہا کہ
 ”تم ایسے نمک حلال نوکر ہو کہ ایسے نازک وقت میں تم نے سرکار کا ساتھ نہیں چھوڑا
 باوجودیکہ ضلع بجنور میں ہندو مسلمانوں میں کمال عداوت تھی، مگر جب تم کو اور ڈپٹی
 رحمت خاں کو ضلع سپرد کرنا چاہا تو تمہاری نیک خصالت اور اچھے چلن اور سرکار
 کی نہایت طرفداری کے سبب تمام ہندوؤں نے جو ضلع میں نامی چودھری اور بڑے
 رئیس تھے کمال خوشی اور آرزو سے تم مسلمانوں کا اپنے اوپر حاکم بننا قبول کیا
 بلکہ خود درخواست کی کہ تمہیں سب ہندوؤں پر ضلع میں حاکم بنا دئے جاؤ۔ سرکار
 نے بھی تم کو اپنا خیر خواہ اور نمک حلال نوکر جان کر کمال اعتماد کے ساتھ ضلع کی حکومت
 تم کو سپرد کی اور تم اسی طرح نمک حلال اور فادار سرکار کے رہے۔ اس کے منٹے
 میں اگر تمہاری ایک تصویر بنا کر پشتا پشت کی یادگاری اور تمہاری اولاد کی عزت
 اور فخر کے لیے رکھی جائے تو بھی کم ہے۔“

کچھ اوپر پانچ مہینے سرسید کو میرٹھ میں ٹھہرنا پڑا۔ میرٹھ میں ان کو معلوم ہوا
 کہ دلی میں سرکاری فوج کے سپاہیوں نے ان کا گھر اور تمام اسباب لوٹ لیا ہے۔
 جب دلی میں سرکاری فوج پھیلنی شروع ہوئی اور کشمیری دروازہ فتح ہو چکا تو شہر
 کے تمام زن و مرد شہر چھوڑ کر چل دیئے تھے اور سرسید کا کنبہ بھی جب کہ
 اٹن کے ماموں وحید الدین خاں اور ان کے ماموں نادر بھائی ہاشم علی خاں سپاہیوں
 کے ہاتھ سے مارے گئے۔ سلطان نظام الدین چلا گیا تھا۔ مگر ان کی والدہ اور خالہ
 دلی ہی میں رہیں۔ لیکن جب ان کا گھر سارا ٹٹ گیا تو وہ حویلی کو چھوڑ کر جلو خانہ کی
 ایک کوٹھڑی میں جہاں زمین نامی ایک لادریٹ بڑھیا رہتی تھی، چلی آئیں اور آٹھ دن
 نہایت تکلیف سے اس کو ٹھہری میں بسر کیے۔ اس عرصہ میں سرسید بھی وہاں
 پہنچ گئے۔ معلوم ہوا کہ تین ان سے ان کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ کسی

قدر گھوڑے کا دانہ مل گیا تھا اسی کو کھاتی رہیں۔ دودن سے پانی بھی ختم ہو چکا تھا اور پیاس کی نہایت تکلیف تھی۔ سر سید کہتے تھے کہ ”جب میں نے کوٹھڑی کا دروازہ کھٹکھٹایا اور آواز دی تو انھوں نے کوڑھکھوے اور پہلا لفظ جو ان کی زبان سے نکلا وہ یہ تھا کہ ”ہیں اتم یہاں کیوں چلے آئے! یہاں تو لوگوں کو مارے ڈالتے ہیں تم چلے جاؤ۔ ہم پر جو گڈرے گی گذر جائے گی۔“ میں نے کہا آپ خاطر جمع رکھیے میرے پاس حاکموں کی چٹھیاں ہیں اور میں ابھی قلعہ کے انگریزوں سے اولیٰ دلی کے گورنر سے مل کر آیا ہوں۔ تب ان کی خاطر جمع ہوئی جب مجھے معلوم ہوا کہ دودن سے پانی نہیں پیا تو پانی کی تلاش کو نکلا۔ کتھوں سپ کوئی ایسی چیز نہ ملی جس سے پانی نکالا جاسکے اور چاروں طرف ستائے کا عالم تھا میں سیدھا پھر قلعہ میں گیا اور وہاں سے ایک صراحی پانی کی لے کر چلا۔ جب اپنے گھر کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہی زمین بڑھا بڑھا پر بھیجا ہے اور اس کے ہاتھ میں مٹی کی صراحی اور آبخورہ ہے اور کسی قدر بدحواس ہے۔ وہ بھی پانی کی تلاش میں نکلی تھی۔ بھڑی دور چل کر بیٹھ گئی۔ پھر اٹھانہ گیا۔ میں نے اس کے آبخورہ میں پانی دیا اور کہا کہ پانی پی لے۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے آبخورہ کا پانی اپنی صراحی میں ڈالا اور کچھ گرا دیا اور گھر کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہا۔ مطلب یہ تھا کہ بیوی پیاسی ہیں ان کے لیے پانی لیجاؤں گی اور اسی لیے صراحی میں پانی ڈالا تھا۔ میں نے کہا میرے پاس پانی بہت ہے تو پانی پی لے۔ پھر آبخورہ میں پانی دیا وہ پانی پی کر بیٹھ گئی۔ میں دوڑا ہوا گھر کی طرف گیا اور والدہ اور خالہ کو تھوڑا پانی پینے کو دیا۔ انھوں نے خدا کا شکر کیا۔ میں گھر سے نکلا کہ سواری کا بندوبست کروں اور والدہ اور خالہ کو میرے لہجوں یا بھرا کر کیا دیکھتا ہوں کہ زمین مری پڑی ہے۔ پھر سارے شہر میں باوجودیکہ حکام نے بھی احکام جاری کیے کہیں سواری نہ ملی۔ آخر قلعہ کے حکام

نے اجازت دی کہ شکرم جو سرکاری ڈاک میرٹھ کو لیجاتی ہے وہ ان کو ملجائے ہیں وہ شکرم لے کر گھر آیا اور والدہ اور خالہ کو اُس میں بٹھا کر میرٹھ لے گیا۔

میرٹھ میں منشی الطاف حسین مرحوم سررشتہ دار کمشنری میرٹھ نے جو سرسید کے قدیم دوست تھے اُن کے رہنے کو ایک مکان خالی کر دیا۔ سرسید کی والدہ کو بھوک اور پیاس کی تکلیف سے صفا کاہنت غلبہ ہو گیا تھا۔ کوئی دوا یا غذا پختی نہ تھی۔ آخر کچھ دن بیمار رہ کر یکم ربیع الثانی ۱۲۷۲ھ کو میرٹھ ہی میں انتقال کیا۔ سرسید کہتے تھے کہ "اُن کے انتقال سے چند روز پہلے تمام کنبے کی عورتیں اور مرد اور بچے جو مختلف مقامات میں تھے سب اُن کے پاس میرٹھ میں جمع ہو گئے تھے۔ اس لیے وہ مرتے وقت بہت خوش تھیں۔"

الغرض ۱۶۔ فروری ۱۸۵۷ء کو سکٹری گورنمنٹ کی چٹھی مسٹر شکسپیر کے نام پہنچی کہ تم مع عملہ صنلع بجنور رٹ کی کو روانہ ہو جاؤ اور رٹ کی میں انتظام رہیں گے۔ اس لیے فوج کے لام باندھنے کا حکم بھیجا گیا۔ چنانچہ مسٹر شکسپیر اس فوج کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ سرسید اور تمام عملہ جو وہاں موجود تھا اور چند رئیسان صنلع بجنور سب اُن کے ہمراہ گئے۔

بجنور سے انگریزوں کے چلے جانے کے بعد جیسا کہ اوپر مذکور ہوا بہت لڑائیاں اور خانہ جنگیاں ہوئی تھیں۔ کبھی ہندوؤں نے مسلمانوں پر حملہ کیے اور کبھی مسلمانوں نے ہندوؤں پر اور آخر کو محمود خاں سب پر غالب آ گیا تھا، اس لیے کچھ ہندو رئیس نواب سے شکست کھا کر میرٹھ چلے آئے تھے اور کچھ نواب نے قید کر لیے تھے۔ پس جب انگریزی فوج رٹ کی میں پہنچ لی اور رہیں گے۔ پھر چٹائی کرنے کو تیار ہوئی تو وہاں یہ بحث پیش آئی کہ صنلع بجنور میں جو کہ رہیں گے اس سب سے پہلا صنلع ہے اور جہاں سب سے پہلے فوج جانے والی ہے۔

کون لوگ باغی تصور کیے جائیں مسلمانوں کی نسبت اس وقت نہ تو حکام ضلع کا خیال اچھا تھا اور نہ افسران فوج کا اور ہندو رئیس جنھوں نے مسلمانوں سے شکست پائی تھی اور جو اپنی باہمی خانہ جنگیوں کو سرکار کی خیر خواہی کے لباس میں ظاہر کرنا چاہتے تھے اور ان میں سے کسی قدر وہاں موجود بھی تھے، وہ چاہتے تھے کہ جو لوگ مسلمانوں کے ان حملوں میں شریک تھے جو انھوں نے ہندو رئیسوں پر کیے وہ سب باغی قرار دینے جائیں۔ اگر اس وقت یہی فیصلہ ہو جانا تو ضلع بجنور خاک سیاہ اور مسلمانوں سے خالی ہو جانا۔

سر سید نے مسٹر شکسپیئر اور بعض افسران فوج سے اس باب میں گفتگو کی اور کہا کہ "سرکار کے نزدیک باغی صرف وہی لوگ قرار پانے چاہیں جو اب سرکار سے مقابلہ کے ساتھ پیش آئیں۔ باقی جو لڑائیاں اور فسادات رعایا نے ایک دوسرے سے کیے قانون کی رو سے ان کی نسبت جو کچھ ہو ہو مگر ان کی وجہ سے کسی کو سرکار کے مقابلہ میں باغی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ میرے نزدیک ہر وقت داخل ہونے سرکاری فوج کے اگر کوئی مقابلہ نہ کرے اور سب لوگ مع نواب محمود خاں کے حاضر ہو جائیں تو ضلع بجنور کے کسی شخص کو باغی قرار دینا نہیں چاہیے۔ اس پر بہت بحث ہوئی اور آخر یہ بات قرار پا گئی کہ جو لوگ سرکاری فوج کے مقابلہ میں آئیں وہی باغی قرار دیے جائیں۔ لیکن بد نصیبی سے ام سوت نجیب آباد اور نگینے پھ احمد اللہ خاں اور ماڑے خاں وغیرہ نے خفیہ خفیہ مقابلہ کر کے ہزاروں کو لڑائی میں قتل کرایا اور تمام ضلع کی طرف سے سرکاری افسروں کو بدظن کر دیا۔

اگرچہ جو لوگ ضلع بجنور میں اپنی بغاوت کا پورا پورا ثبوت دے چکے تھے اور سرکار سے کھلم کھلا بے وفائی کر چکے تھے۔ سر سید نے ان کی حمایت ہرگز نہیں

کی لیکن جو لوگ کسی مجبوری یا دباؤ کے سبب باغیوں کے ساتھ ہو گئے تھے اور اس لیے مجرم ٹھہر گئے تھے، یا جنہوں نے آپس کی خانہ جنگیوں میں کسی گروہ کا ساتھ دیا تھا مگر وہ کسی گروہ کو سرکار کے برخلاف نہیں سمجھتے تھے، یا جن لوگوں نے سرسید کو ذاتی طور پر تکلیف پہنچائی تھی اور سرکار کے برخلاف کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ جہاں تک ممکن ہوا ان کی بریت میں کوشش کی اور ان کی صفائی کرائی۔ ایک تحریر یہ ہے جو نواب محسن الملک نے لکھوائی اور مولانا نذیر احمد لے جو خاص بجنور کے رئیس ہیں اپنے قلم سے لکھی اور جو کہ گویا ان دونوں نامور اور معزز شخصوں کے خیالات کا مجموعہ ہے اس میں سے ہم ذیل کا فقرہ نقل کرتے ہیں۔

”سید احمد خاں کو سرکار انگریزی کی طرف سے صلح بجنور کا نظم و نسق سپرد تھا اور وہاں کے بندو مسلمانون کی خانہ جنگیاں یاد گار غم ہیں۔ اس مہوم بے تمیزی میں خود سید احمد خاں کے ساتھ بھی لوگ نہایت درجہ کی گستاخی اور بے توقیری سے پیش آئے اور قریب تھا کہ ہلاک کریں عود تسلط کے بعد اس صلح کے تمام باشندوں کی جان سید احمد خاں کی مٹھی میں تھی اگر ان کے سے اختیارات کسی دوسرے کو ہوتے تو بجنور کے حصہ میں قیامت آگئی ہوتی۔ مگر یہ معاملہ فہم منصف مزاج، نرم دل، نیک طبیعت آدمی اس وقت بھی فرق کرتا تھا بغاوت اور خانہ جنگیوں میں بغاوت

۱۷ آئینہ حاجی اسماعیل خاں نے ۱۸۵۷ء میں سرسید کی یادگار قائم کرنے کیلئے ایک خط نواب محسن الملک کے نام جید آباد بھیجا تھا اس زمانے میں محسن الملک بیمار تھے انہوں نے شمس العلماء مولوی نذیر احمد سے اس کا جواب لکھوا کر بھیجا تھا جو بلیک وڈ گزٹ میں چھپ گیا تھا۔ اس تحریر میں سرسید کی نسبت دونوں کے خیالات مندرج ہیں ۱۲۔

اور جہالت میں، حملہ اور حفاظت میں اور سید احمد خاں کی بدولت بجنور ہی ایک ضلع
تھا جو عواقب و تبعاتِ غدر سے محفوظ رہا۔

سرستید کی رائے جو اُس وقت عام رعایا نے ضلع بجنور کی نسبت تھی اور
جس پر حکام ضلع کو پورا بھروسہ تھا وہ تاریخ سرکشی بجنور میں انھوں نے صاف
صاف لکھ دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "ضلع کے لوگوں کا میری رائے میں یہ
حال تھا کہ ان لڑائیوں میں نواب کے ساتھ ہو کر چودھریوں سے لڑنے کو سرکار
سے لڑنا یا برخلاف سرکار کے لڑائی کرنی نہیں سمجھتے تھے سب کے خیال میں
چودھریوں کا اور نواب کا مقابلہ تھا جس میں گویا سرکار کا بیچ میں سے علیحدہ
تھی اور اس میں بھی شک نہیں کہ جو لوگ چودھری صاحبوں کے ساتھ ان
لڑائیوں میں شریک تھے وہ اپنے تئیں چودھری صاحبوں کا حامی سمجھتے تھے
سرکار انگریزی سب کے دلوں سے الگ تھی۔ سرستید ہی کی رائے کا یہ
نتیجہ تھا کہ امن ہو جانے کے بعد ضلع کے عام باشندوں سے بہت کم مواخذہ
کیا گیا۔"

خدماتِ غدر کا صلہ

جو شخص سرستید کی طبیعت اور جبلت سے واقف ہو گا وہ اس بات کو
آسانی باور کرے گا کہ جو کچھ غدر کے زمانے میں گورنمنٹ کی خیر خواہی اور وفاداری

لے عواقب و تبعاتِ غدر سے وہ بہ نتائجِ مراد میں جو اکثر اضلاع ہندوستان میں انگریزی تسلط کے بعد
باشندگانِ اضلاع کو بھگتنے پڑے کیونکہ بجنور میں سولان لوگوں کے جو باہم خانہ جنگیوں میں یا
سرکاری فوج کے مقابلہ میں مارے گئے، فتح کے بعد فوراً بغاوت کے جرم میں سزا یا ب
ہونے پھر بہت ہی کم لوگوں سے تعرض کیا گیا۔ ۱۲۔

اُن سے ظہور میں آئی وہ کسی خلعت یا انعام وغیرہ کی توقع پر مبنی نہ تھی۔ وہ بڑا انعام اپنی خدمت کا یہی سمجھتے تھے کہ اُس نازک وقت میں اُن سے کوئی امر اخلاق اور شرافت اور اسلام کی ہدایت کے خلاف سرزد نہیں ہوا مگر گورنمنٹ نے خود انہی محمد آئی قند کی اور اُن کے صلہ میں ایک خلعت قیمتی ایک ہزار روپیہ کا اور دو سو روپیہ ماہوار کی پولیٹیکل پینشن دونوں تک مقررہ کی۔

میر صادق علی اور میر ستم علی رئیسان چاند پورہ ضلع بجنورہ کا تعلقہ اس جرم میں کہ اُن کی عرضی بادشاہ دہلی کے دفتر سے برآمد ہوئی تھی، سرکار نے ضبط کر لیا تھا۔ اور جس طرح کہ دیگر مجبور خواہان سرکار کو باغیوں کی ضبط شدہ جائدادیں دی گئی تھیں ہسٹر شکپیسر رپورٹ کرنی چاہتے تھے کہ منجملہ تعلقہ چاند پورہ کے ایک معقول جائداد سید احمد خاں کو بوجہ خدمات ایام غدر کے ملنی چاہیے۔ مگر جب انہوں نے سرسید سے اس بات میں استمزاج لیا تو انہوں نے اُس کے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے۔ ہسٹر شکپیسر نے اس قاعدے کے موافق کہ کسی کو اُس کی نصف تنخواہ سے زیادہ پینشن نہیں مل سکتی تھی ہسٹید سے کہا کہ نقد پینشن بہت قلیل مقرر ہوگی انہوں نے کہا جو کچھ سرکار عنایت کرے اس کا احسان ہے۔ مگر مجھ کو یہ جائداد یعنی ہرگز منظور نہیں۔ اس واقعہ کو اسی تحریر میں جو نواب محسن الملک کی طرف سے مولانا نذیر احمد نے حیدرآباد میں لکھی تھی۔ اس طرح بیان کیا ہے کہ "سید احمد خاں کو حین خدمات غدر کے صلہ میں ضلع بجنورہ کے ایک بڑے مسلمان رئیس باغی کا بڑا بھاری علاقہ سرکار نے دینا منظور کیا تھا، مگر سید احمد خاں نے صرف اسی وجہ سے اُس کے لینے سے انکار کیا کہ ایک مسلمان بھائی کے خون سے اپنی پیاس بجھانی اُن کو کسی طرح گوارا نہیں ہو سکتی تھی۔"

خود سرسید نے بھی اپنے ایک لکچر میں جو ۲۸ نومبر ۱۸۸۹ء کو ایجوکیشنل

کانفرنس کے جلسہ میں مدرتہ العلوم کے تاریخی حالات پر دیا تھا، اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ "غدر میں جو حال انگریزوں اور ان کے بچوں اور عورتوں پر گذرا اور جو حال ہماری قوم کا ہوا اور نامی نامی خاندان برباد و تباہ ہوئے ان دونوں واقعات کا ذکر دل کو شق کرنے والا ہے۔ غدر کے بعد نہ مجھ کو اپنا گھر کھلنے کا رنج تھا نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا۔ جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا اور ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پر گذرا اس کا رنج تھا۔ جب ہمارے دوست مرحوم مسٹر شکسپیئر نے جن کی مصیبتوں میں ہم اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک تھے، بعوض اُس وفاداری کے تعلقہ جہاں آباد جو سارا تہ کے ایک نامی خاندان کی ملکیت اور لاکھ روپیہ سے زیادہ مالیت کا تھا، مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی تالاق و نسیا میں نہ ہو گا کہ قوم پر تویہ بربادی ہو اور میں ان کی جائداد کے تعلقہ دار بنوں۔ میں نے اُس کے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے۔ اور درحقیقت یہ بالکل سچ بات تھی، میں اُس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پستیگی اور کچھ عزت پائے گی اور جو حال اُس وقت قوم کا تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا چند روز میں اسی خیال اور اسی غم میں رہا۔ آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھے بڑھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیئے جب میں سراد آباد میں آیا جو ایک بڑا غمگندہ بھاری قوم کے ریشیوں کی بربادی کا تھا اس غم کو کسی قدر اترتی ہوئی، مگر اُس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مردتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشہء عامیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں! اس

اے غدر کے بعد مر سید کا ارادہ مصمم ہو گیا تھا کہ نیشن نے کرم میں جا سکونت اختیار کریں ۱۲۔

کی مصیبت میں شریک رہنا چاہیے اور جو مصیبت پڑے اُس کے دور کرنے میں
سمت باندھنی تو می فرض ہے میں نے ارادہ ہجرت موقوف اور تو می ہمدردی
کو پسند کیا۔“

مراد آباد کی تبدیلی

اپریل ۱۸۵۸ء میں وہ بجنور سے صدر الصدوری کے عہدہ پر ترقی پا کر مراد آباد
گئے اور ۱۸۵۹ء میں وہیں جب کہ باغیوں کی جائداد مضبوط کے متعلق غدر داریاں
ہونے لگیں اور اُن کی سماعت اور تحقیقات کے لیے ایک اسپیشل کمیشن بھیجا
اُس میں دو یورپین ممبر ایک کسٹمر سیکرٹری، دوسرے جج مراد آباد اور ایک ہندوستانی
ممبر یعنی سر سید مقرر ہوئے۔ چنانچہ دو برس تک وہ اپنے عہدہ کے علاوہ یہ کام
بھی انجام دیتے رہے۔

گورنمنٹ نے یہ نہایت داناتی کی تھی کہ اکثر اضلاع میں مضبوط جائداد کی
تحقیقات کے لیے جو اسپیشل کمیشن مقرر کیے گئے تھے اُن میں یورپین افسروں
کے ساتھ ایک ایک ہندوستانی ممبر بھی شامل کر دیا تھا کیونکہ جائدادیں اکثر ادنیٰ
ادنیٰ شہ پر مضبوط ہو گئی تھیں اور انگریزی حکام نیچرل طور پر ہندوستانیوں کی طرف
سے عموماً بدگمان اور نہایت غیظ و غضب میں بھرے ہوئے تھے خصوصاً ضلع
مراد آباد پر گورنمنٹ کا سخت عتاب تھا اور انگریز افسروں کا یہاں اعتدال پر
رہنا دشوار تھا۔ اگرچہ سر سید نے اپنی زبان سے کمیشن مذکور کی کارروائی کے متعلق
کبھی ہمارے سامنے کچھ بیان نہیں کیا لیکن مراد آباد کے معتبر اشخاص سے سنا
گیا ہے کہ سر سید کی شرکت کے سبب یہاں کے کمیشن نے غدر واریوں کی تحقیقات
نہایت اعتدال اور انصاف کے ساتھ کی اور صوبہ شمال مغرب میں مضبوط شدہ

جاؤ اور جس قدر ضلع مراد آباد میں واگنڈا اشد ہوئی ایسی کسی ضلع میں نہیں ہوئی
ایک بہت بڑا فائدہ سرسید کے مراد آباد میں ہونے سے خاص کر مسلمانوں
کو یہ پہنچا کہ مولانا عالم علی مرحوم رئیس مراد آباد، جو وہ ہیکھنڈے کے ایک مشہور
عالم اور طبیب اور نامور محدث تھے انھوں نے چنہ یورپین عورتوں اور بچوں
کو باغیوں کے ظلم سے بچانے کے لیے اپنے مکان میں چھپایا تھا۔ مگر اتفاق سے
یاغی سپاہیوں کو خبر ہو گئی۔ اور انھوں نے مولوی صاحب کے مکان میں گھس
کر ان سب کو قتل کر ڈالا۔ مولانا موصوت اس خیال سے کہ یہ حادثہ عظیم ان کے
مکان میں گذرنا تھا اور ان کا کوئی عزیز یا رشتہ دار انی منظوروں کے ساتھ نہیں
مارا گیا تھا۔ سرکاری تسلط کے وقت مراد آباد سے کہیں چلے گئے تھے اور حکام
ضلع کو ان کی تلاش دہیش تھی۔ اور ان کی نسبت یہ گمان تھا کہ باغیوں کے ساتھ
ان کی ضرور سازش تھی ورنہ ان کے آدمی بھی مقتولوں کے ساتھ یقیناً مارے جاتے
مگر سرسید کو معلوم ہو گیا تھا کہ مولوی عالم علی محض بے قصور تھے اور انھوں نے
نہایت نیک نیتی سے یورپین عورتوں اور بچوں کو اپنے گھر میں رکھا تھا۔ وہ یہ
بھی جانتے تھے کہ باغیوں کو مولوی صاحب سے کوئی وجہ عدوت کی نہ تھی کہ وہ
ان کو یا ان کے رشتہ داروں کو بھی مار ڈالتے اور خود ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ باغی سپاہ
کا مقابلہ کرتے چنانچہ سرسید نے مولوی صاحب کی بریت کے لیے صاحب
ضلع سے باوجود کہ وہ نہایت افر و ختہ تھے۔ بڑی دلیری کے ساتھ گفتگو کی اور
یہ کہا کہ میں مولوی عالم علی کو آپ کے سامنے حاضر کر سکتا ہوں، لیکن جب تک
کہ آپ یہ وعدہ نہ کریں کہ ان سے کچھ سواخذہ نہ کیا جائے گا اس وقت تک میں
ان کے بلانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ آخر صاحب ضلع نے ان سے یہ وعدہ کر
لیا کہ ہم صاحبہ کی تحقیقات تو ضرور کریں گے، لیکن چونکہ تمہارے نزدیک وہ

بے قصور ہیں بعد مضابطہ کی کارروائی کے اُن کو بری کر دیا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ سرسید نے مولوی صاحب کو بلا کر عدالت میں پیش کر دیا اور مضابطہ کی کارروائی کے بعد وہ بالکل بری کر دیئے گئے۔

تاریخ سرکشی بجنور

مراد آباد ہی میں آکر سرسید نے تاریخ سرکشی بجنور چھاپکر شائع کی۔ اس تاریخ میں مئی ۱۸۵۷ء سے لے کر اپریل ۱۸۵۸ء تک کے حالات اور واقعات غدر جو ضلع بجنور میں گزرے یقیناً تاریخ نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ تمام خط کتابت جو کہ وہ حکام ضلع کے ساتھ رُڑکی میں کرتے تھے اور وہ تمام تحریریں جو انھوں نے نواب محمود خاں اور چودھریوں کے نام یا نواب اور چودھریوں نے اُن کے نام یا آپس میں ایک دوسرے کے نام بھیجیں اور اُس کے سوا اور بہت سی تحریرات جو اس معاملہ سے تعلق رکھتی تھیں، لفظ بہ لفظ اس کتاب میں درج ہیں۔ اُن میں سے بہت سی تحریریں اور اکثر یادداشتیں ایسی ہیں جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید ابتدا سے اخیر تک اس کتاب کے لیے میٹرل جمع کرتے رہے تھے۔ ایسی حالت میں جب کہ جانوں کے لالے پٹے ہوئے تھے، انگریزی عملداری بالکل اٹھ گئی تھی، لوگوں کے گھر بار لٹ رہے تھے اور خود سرسید نہایت خوف و ہراس کی حالت میں تھے، وہ ان کاغذات اور یادداشتوں کو بحفاظت رکھتے جاتے تھے، اس سے دو باتیں بخوبی ثابت ہوتی ہیں ایک یہ کہ انگریزی عملداری کے پھر قائم ہو جانے کا اُن کو کامل یقین تھا، دوسرے یہ کہ ضلع کی اُس خوفناک حالت میں بدحواسی یا خوف و ہراس نے اُن کی طبیعت میں مطلق راہ نہیں پائی۔ اس کتاب میں غدر کے زمانے کے حالات جو ضلع بجنور سے متعلق تھے۔

بلد رواد اور عایت اور بی کم و کاست کھٹے گئے ہیں جن مسلمانوں نے باوجود متواتر
 فہمائیتوں اور نصیحتوں اور تمام تشذیب و فزاز سمجھانے کے اور باوجود گورنمنٹ
 کے احسانات کے سرکار سے بیوفائی کی تھی اور اس سے مقابلہ کے ساتھ پیش
 آئے تھے ان کے حالات جوں کے توں بیان کر دیئے ہیں اور باوجودیکہ ہندو
 چودھریوں یا ان کے ساتھیوں کی طرف سے مسلمانوں پر سخت ظلم اور زیادتیاں
 ہوتی تھیں، اس پر بھی چونکہ وہ فی الواقع بغاوت کے الزام سے بری تھے اس لیے
 اس الزام سے ان کی تربیت کی ہے مگر جو کچھ انھوں نے مسلمانوں پر تشدد اور سختیاں
 کی تھیں، ان کو بھی اچھی طرح ظاہر کر دیا ہے۔ غرض کہ واقعات کے بیان کرنے میں
 مذہبی یا قومی تعصبات کو مطلق دخل نہیں دیا۔

مدرسہ مراد آباد

اس کے بعد انھوں نے ۱۸۵۹ء میں ایک فارسی مدرسہ مراد آباد میں قائم
 کیا جہاں اس سے پہلے کوئی مدرسہ نہ تھا، کچھ دنوں یہ مدرسہ بدستور اپنی حالت
 پر رہا مگر جب کہ اسٹریٹجی صاحب وہاں کلکٹر ہو کر آئے اور انھوں نے ایک
 تحصیل مدرسہ قائم کیا اسی تحصیل مدرسہ میں اس فارسی مدرسہ کے طلبہ بھی داخل ہو گئے

رائے درباب تعلیم

انہیں دنوں میں انھوں نے ایک رائے تعلیم کے باب میں اردو اور انگریزی
 دونوں زبانوں میں لکھ کر شائع کی جس میں گورنمنٹ کے انسپکٹر سکولوں پر سخت
 اعتراض تھا اور ہندوستانیوں کو انگریزی زبان میں تعلیم دینے کا سرکار کو مشورہ دیا
 تھا۔ ہم اس مضمون میں سے دو تین فقرے اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

”گذشتہ چند سالوں سے گورنمنٹ نے جو انتظام رعایا کے لئے
 ہندوستان کی تعلیم کا کیا ہے سب سے اول اس میں یہ بات قابل
 لحاظ کے ہے کہ آیا فی نفسہ وہ انتظام ایسا ہے نہیں! کہ رعایا کا اس
 سے ناراض ہونا اور خواہ مخواہ بدگمانی کرنا ضرور ہو۔ ہماری رائے یہ
 ہے کہ بلاشبہ ایسا ہی ہے۔ گورنمنٹ نے یہ خیال کیا کہ جب
 کسی قوم کی تربیت کا ارادہ کیا جائے۔ تو جو اس قوم کی زبان ہے اس
 میں اس کی تربیت ہو تو بہت آسان ہوگی اور دوسری زبان کے
 لغت اور محاورے سیکھنے میں جو وقت ضائع ہوتا ہے وہ بچے
 گا۔ لہذا ہر اس کی نظیریں بھی موجود تھیں کہیوں کہ تمام اہل یورپ اور اہل
 عرب نے اپنی ہی زبانوں میں علم سیکھے ہیں۔ مگر یہ رائے غلط تھی۔ کل
 زبانوں پر ایسا خیال کر لینا صحیح نہیں ہے۔ بلکہ ہم کو چاہیے کہ اس بات
 پر بھی غور کریں کہ جس زبان میں ہم کسی قوم کی تعلیم چاہتے ہیں آیا اس زبان
 کی حالت ایسی ہے یا نہیں کہ اس زبان میں تعلیم کا ہونا ممکن ہو۔“

”ہمیشہ تعلیم سے یہ مقصود رہا ہے کہ انسان میں ایک ملکہ اور
 اس کی عقل اور ذہن میں ایک جودت پیدا ہو تاکہ جو امور پیش آئیں
 ان کے سمجھنے کی، برائی بھلائی جاننے کی اور عجائب قدرت الہی پر فکر
 کرنے کی اس کو طاقت ہو، اس کے اخلاق درست ہوں، معاملات
 معاش کو نہایت صلاحیت سے انجام دے اور امور معاشرہ پر غور کرے
 گورنمنٹ کا یہ کہنا کہ ”ہم کو اس قدر تربیت سے کچھ علاقہ نہیں بلکہ ہم
 اسی قدر تعلیم کے خواہاں ہیں جو امور معاش سے علاقہ رکھتی ہے اور جو نہ
 ہے صرف جغرافیہ، حساب اور ہندسہ پر“ نہایت بیجا ہے۔“

”سررشتہ تعلیم جو چند سال سے جاری ہے وہ تربیت کے

لیے ناکافی ہی نہیں بلکہ خراب کرنے والا تربیت اہل ہند کا ہے
اردو زبان جس کے وسیلے سے اکثر جگہ تعلیم جاری ہے اُس

کی حالت ایسی نہیں ہے جس سے تعلیم ہونا ممکن ہو۔ کیونکہ جس زبان
میں ہم کسی قوم کی تعلیم کا ارادہ رکھتے ہیں اُس زبان کی نسبت ہم کو اول
یہ دیکھنا چاہیے کہ اُس میں علمی کتابیں کافی موجود ہیں یا نہیں؟ کیونکہ

اگر یہ نہ ہو تو تعلیم ممکن نہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ زبان فی نفسہ اس
قابل ہے یا نہیں کہ اُس میں علمی کتابیں تصنیف ہو سکیں؟ کیونکہ پہلی
بات کا تو علاج ہو سکتا ہے مگر دوسری بات لا علاج ہے۔ تیسرے

یہ کہ آیا وہ ایسی زبان ہے یا نہیں کہ اُس میں علوم پڑھنے سے جو مدت
طبع حدت ذہن، سلامت فکر، ملکہ عالی قوت، ناطقہ، پختگی، تقریر اور

ترتیب دلائل کا سلیقہ پیدا ہو سکے؛ ان تینوں باتوں میں سے اردو
زبان میں کوئی بات نہیں۔ پس گورنمنٹ پر واجب ہے کہ اس طریقہ

تعلیم کو جو درحقیقت تربیت انسان کو خراب کرنے والا اور خود
بخود لوگوں کے دلوں میں بدگمانی پیدا کرنے والا ہے۔ بالکل بدل

دے اور اُس زبان میں تربیت جاری کرے جس سے تربیت کا
جو اصل نتیجہ ہے وہ حاصل ہو۔

دوسری صاف رائے ہے کہ اگر گورنمنٹ اپنی شرکت ویسی

زبان میں تعلیم دینے سے بالکل اٹھا دے اور صرف انگریزی مدرسہ
اور اسکول جاری رکھے تو بلاشبہ یہ بدگمانی جو رعایا کو گورنمنٹ کی طرف

سے ہے جاتی رہے۔ صاف صاف لوگ جان لیں کہ سرکار انگریزی

زبان کے وسیلے سے تربیت کرتی ہے اور انگریزی زبان بلاشبہ ایسی ہے کہ انسان کی ہر قسم کی علمی ترقی اس میں ہو سکتی ہے۔

یہاں ان مفکروں کے نقل کرنے سے ہمارا صرف یہ مدعا ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ انگریزی زبان کی تعلیم کو دینی زبان کی تعلیم پر ترجیح دینے کی نسبت جو کچھ سرسید کی رائے اس زمانے میں تھی یہی رائے اب سے ۳۶ برس پہلے تھی۔ مگر ۳۶ برس کے تجربے سے ان کو اس قدر ضرور معلوم ہوا ہو گا کہ انگریزی زبان میں بھی ایسی تعلیم ہو سکتی ہے جو دینی زبان کی تعلیم سے بھی زیادہ نکمی فضول اور اصل یاقوت پیدا کرنے سے قاصر ہو۔

رسالہ اسباب بغاوت ہندوستان

مراد آباد ہی میں سرسید نے گورنمنٹ کی ملک کی اور خاص کر اپنی قوم کی وہ جلیل القدر خدمت انجام دی جو ان کے اور بڑے بڑے کاموں کی طرح ہمیشہ یادگار رہے گی۔ وہ بجنور میں مسلمانوں کی تباہی اپنی آنکھ سے دیکھ کر آئے تھے جب مراد آباد میں پہنچے تو ان کی تباہی ویرا بادی کا اور بھی زیادہ عبرت انگیز نقشہ ان کی نظر سے گذرا جس سے ایک اور چوٹ ان کے دل پر لگی۔ گورنمنٹ کا غصہ خاص کر مسلمانوں کے حال پر بدستور چلا جاتا تھا۔ ہندوستانی خیر خواہی سرکار کی آڑ میں مسلمانوں سے دل کھول کھول کر بدلے سہتھے اور اگلے پچھلے بغض نکال رہے تھے۔ مسلمانوں کو مجرم قرار دینے کے لیے کوئی ثبوت نہ کار نہ تھا۔ ان کا مسلمان ہونا ہی ان کے مجرم ٹھہرانے کے لیے کافی تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ بے قاعدہ رعایت یا سہمدہی کو نا سرکاری عہدیداروں کی قدرت سے باہر تھا۔ اس لیے سرسید اپنے منصب کے لحاظ سے کوئی سلوک ان کے ساتھ نہیں

کر سکتے تھے۔ اگرچہ ان کے مراد آباد میں آنے سے کسی قدر ان ناگفتہ بہ بے اعتمادیوں کا انسداد ہوا جو خاص مراد آباد میں بعض ناخدا تریس لوگ سرکار کی خیر خواہی کے پردے میں کرتے تھے کیونکہ حسن اتفاق سے انھیں دنوں میں اسٹریٹیجی صاحب مراد آباد کے کلکٹر و مجسٹریٹ مقرر ہو گئے تھے اور ان کو سرسید کی رائے اور مشورہ پر پورا اعتماد تھا۔ مگر سرسید اسی پر قانع نہ تھے بلکہ وہ اس فکر میں تھے کہ انگریزوں کے دل میں جو غلطی سے ایک عام بدگمانی تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے پیدا ہو گئی ہے وہ کس طرح رفع کی جائے۔

زمانہ نہایت نازک تھا، خیالات ظاہر کرنے کی آزادی مطلق نہ تھی، مارشل لا کا دور دورہ تھا اور حاکموں کی زبان ہی قانون تھی، جو شخص گورنمنٹ کا خیر خواہ اور وفادار تسلیم کر لیا گیا ہو اس کو ایسا کام کرنا جس سے اچھے دل سے ہوں اور بھی زیادہ دشوار تھا، گورنمنٹ نے مسلمانوں کو اپنا مخالف خیال کر لیا تھا اور ایسا خیال کرنے کے اسباب پہلے ہی سے موجود تھے، انگریز ہندوستانیوں کی فادت، طبیعت اور طرز خیالات سے ناواقف تھے، ملک کی حکومت انہوں نے مسلمانوں سے لی تھی اور انہیں کو وہ اپنا حریف اور سلطنت کا مدعی سمجھتے تھے اور بدقسمتی سے بقول سرسید کے جس بھری ہوئی مردہ کھال دلی میں موجود تھی، مسلمانوں کے مذہبی تعصبات کی شہرت تھی اور ان تمام باتوں کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ وہ انگریزوں کی غلط فہمی کے شکار ہو جائیں۔

سرسید کو اس بات کا دل سے یقین تھا کہ انگریزوں نے بغاوت کے سمجھنے میں غلطی کی ہے، وہ کہتے تھے کہ انگریزوں کا یہ سمجھنا کہ غدار ایک ملکی بغاوت تھی اور اس کی بنیاد انگلش گورنمنٹ کی حکومت اٹھا دینے کے لیے کسی سادشس پر تھی، محض غلط ہے، اور اسی غلطی کا نتیجہ تھا کہ وہ ملک کے

ساتھ اس طرح پیش آئے کہ جیسے باغی ملک کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔ ان کے نزدیک نہ یہ ملکی بغاوت تھی نہ کسی قسم کی سازش بلکہ صرف سپاہیوں کی عدول حکمی تھی وہ بھی نہ یہ ارادہ بغاوت کے بلکہ بسبب جہالت اور مذہبی توہمات کے۔ چنانچہ سرولیم گئے نے بھی جو غند کے بعد اٹھیا آفس میں انڈر سکرٹری تھے۔ نہایت انصاف سے اس ہنگامہ کو ”سیپاٹے وار“ سے تعبیر کیا ہے۔ نہ ملکی بغاوت سے اور لاہور لارنس نے بھی آخر کو نہیں فیصلہ کیا کہ صرف کارٹوس کے سبب سے سپاہیوں کا ایک ہنگامہ تھا نہ کوئی عام سازش تھی نہ ملکی بغاوت۔

اسی بنا پر انہوں نے مراد آباد میں آکر اسباب بغاوت ہند پر ایک رسالہ لکھا جس میں رعایا نے ہندوستان کو اور خاص کر مسلمانوں کو تین پر سارا پھوڑا انگریزوں کی بدگمانی کا تھا بغاوت کے الزام سے بری کیا ہے۔ اور اس خطرناک اور نازک وقت میں وہ تمام الزامات جو لوگوں کے خیال میں گورنمنٹ پر عائد ہوتے تھے نہایت دلیری اور آزادی کے ساتھ پوست کندہ بیان کیے ہیں۔ اور جو اسباب کو عموماً انگریزوں کے ذہن میں جاگزیں تھے ان کی تردید کی ہے اور ان کو غلط بتایا ہے۔

یہ رسالہ غالباً انہوں نے مراد آباد میں پہنچتے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے ختم ہونے کے بعد بغیر اس کے کہ اس کا انگریزی میں ترجمہ کر لیں اور وہاں اس کو مطبع مصلیٹ گزٹ آگرہ میں چھپنے کو بھیج دیا اور ۱۸۵۹ء میں اس کی پانسو جلدیں چھپ کر ان کے پاس پہنچ گئیں جب سرسید نے ان کو پارلیمنٹ اور گورنمنٹ انڈیا میں بھیجنے کا ارادہ کیا تو ان کے دوست مانع آئے اور ماسٹر راجندر کے چھوٹے بھائی رائے سنگھ واس جو اس وقت مراد آباد میں منصف اور سرسید کے نہایت دوست تھے، انہوں نے کہا کہ ان تمام کتابوں کو جلا دو اور ہرگز اپنی جان کو معرض خطر میں نہ ڈالو۔ سرسید نے کہا ”میں ان باتوں کو گورنمنٹ پر ظاہر کرنا ملک اور قوم اور خود گورنمنٹ کی خیر خواہی سمجھتا ہوں“

پس اگر ایک ایسے کام پر جو سلطنت اور رعایا دونوں کے لیے مفید ہو مجھ کو کچھ گزند بھی پہنچ جائے تو گوارا ہے۔ رائے شکر واس نے جب سرستید کی آمادگی بدرجہ غایت دیکھی اور ان کے سمجھانے کا کچھ اثر نہ ہوا تو وہ آبدیدہ ہو کر خاموش رہے۔ سرستید نے اول تو دو رکعتیں بطور نفل کے ادا کیں اور دعا مانگی اور اسی وقت کچھ کم پانسو جلدوں کا ایک پارسل ولایت کو روانہ کیا اور ایک جلد گورنمنٹ انڈیا میں بھیج دی اور کچھ جلدیں اپنے پاس رکھ لیں۔

گورنمنٹ انڈیا میں جب یہ کتاب پہنچی اور انگریزی میں ترجمہ ہو کر کونسل میں پیش ہوئی تو لارڈ وکینگنگ گورنر جنرل اور سر بارٹرفریڈ نے جو کونسل میں میر تھے اس کے مضمون کو محض خیر خواہی پر معمول کیا۔ مگر سٹر سسل بیڈن نے جو اس وقت فارن سکرٹری تھے اس کے خلاف بہت بڑی اسپیچ دی اور یہ طے ظاہر کی کہ "اس شخص نے نہایت یاغیانہ مضمون لکھا ہے، اس سے حسب ضابطہ باز پرس ہونی چاہیے اور جواب لینا چاہیے اور اگر کوئی معقول جواب نہ دے سکے تو سخت سزا دینی چاہیے۔" لیکن چونکہ اور کوئی ممبر ان کا ہم طے نہ تھا اس لیے ان کی اسپیچ سے کوئی مضرت نتیجہ پیدا نہیں ہوا۔ مگر ۱۸۷۱ء میں جب کہ لارڈ وکینگنگ نے فرخ آباد میں دربار کیا اور سرستید بھی اس دربار میں بلائے گئے تو وہاں ایک موقع پر سٹر سسل بیڈن فارن سکرٹری گورنمنٹ انڈیا سے مٹھ پھیر ہو گئی جب ان کو معلوم ہوا کہ سید احمد خاں یہی شخص ہے اور اسی نے اسباب بغاوت پر وہ مضمون لکھا ہے تو سرستید دوسرے روز علیحدہ مل کر اپنی نہایت رنجش ظاہر کی اور بہت دیر تک تلخ گفتگو ہوتی رہی۔ انھوں نے کہا کہ "اگر تم گورنمنٹ کی خیر خواہی کے لیے یہ مضمون لکھتے تو ہرگز اس کو چھپوا کر ملک میں شائع نہ کرتے بلکہ صرف گورنمنٹ پر اپنے یا رعایا کے خیالات ظاہر کرتے۔" سرستید نے کہا "میں نے اس کتاب کی کل پانسو جلدیں چھپوائی تھیں جن میں سے چند جلدیں میرے پاس موجود ہیں

اور ایک گورنمنٹ میں بھی ہے اور کچھ کم پانسو جلدی ولایت روانہ کی ہیں جن کی رسید میرے پاس موجود ہے میں جانتا تھا کہ آج کل بسبب غیظ و غضب کے حاکموں کی رائے صائب نہیں رہی اور اس لیے وہ سیدھی باتوں کو بھی الٹی سمجھتے ہیں، اس لیے جس طرح میں نے اُس کو ہندوستان میں شائع نہیں کیا اسی طرح انگریزوں کو بھی نہیں دکھایا، صرف ایک کتاب گورنمنٹ میں بھی ہے۔ اگر اس کے سوا ایک جلد بھی کہیں ہندوستان میں ملجائے تو میں فی جلد ایک ہزار روپیہ دوں گا، مسٹر بیڈن کو اس بات کا یقین نہ آیا اور انھوں نے کئی بار سرسید سے پوچھا کہ کیا فی الواقع اُس کا کوئی نسخہ ہندوستان میں شائع نہیں ہوا، جب اُن کا اطمینان ہو گیا پھر انھوں نے اُس کا کچھ ذکر نہیں کیا، اور اُس کے بعد ہمیشہ سرسید کے دوست اور حامی دہرے گارے۔

اس کتاب کے سرکاری طور پر متعدد ترجمے ہوئے، انڈیا آفس میں اس کا ترجمہ ہوا اور اُس پر متعدد دفعہ بحثیں ہوئیں، گورنمنٹ انڈیا میں بھی اُس کا ترجمہ کرایا گیا پارلیمنٹ کے بعض ممبروں نے بھی اس کا ترجمہ کیا، مگر کوئی ترجمہ پبلک میں شائع نہیں کیا گیا، لیکن اسی زمانے میں ایک مذہب حاکم نے اشاعت کی نظر سے اُس کا ترجمہ کرنا شروع کیا تھا جس کو کرنل گرہم نے جو سرسید کے بڑے دوست ہیں، لپڑا کیا اور ۱۸۴۳ء میں چھپ کر شائع ہوا، اس کتاب کی نسبت مدبران سلطنت وغیرہ کی رائیں اور جو نتائج اُس سے پیدا ہوئے وہ دوسرے حصہ میں لکھے جائیں گے، چونکہ یہ رسالہ آج تک عام طور پر شائع نہیں ہوا اور نہ اُمید ہے کہ آئندہ شائع ہو اس لیے ہم نے رسالہ کو بجنسہ بطور ضمیمہ کے کتاب کے آخر میں ملحق کر دیا ہے کیونکہ جس قدر اس تحریر سے

سرسید کا ایک عمدہ مدبر سلطنت اور ملک اور گورنمنٹ کا خیر خواہ ہونا ثابت ہوتا ہے اُس سے زیادہ گورنمنٹ کی حق پسندی، انصاف اور فراخ خوئی کا ثبوت ملتا ہے جس نے اُس غیظ و غضب اور تاراجی کے زلزلے میں نہایت ٹھنڈے دل

سے شکایتوں کو سنا، اُن پر غور کیا اور جو شکایتیں ادا اعتراض صحیح معلوم ہوئے اُن کا فوراً تدارک کیا۔

ملکہ معظمہ کے اشتہار کا شکریہ ادا کرنا

سرستید ابھی اپنی کتاب اسباب بغاوت ختم کرنے نہیں پائے تھے کہ ملکہ معظمہ کا اشتہار معافی اور امن وامان کا مشتہر ہوا۔ اس اشتہار کے مشتہر ہونے پر سرستید نے مراد آباد کے مسلمانوں کو مطلع کیا کہ ملکہ معظمہ کی اس عنایت و مہربانی کا شکریہ ادا کرنا لازم ہے۔ تمام مسلمانوں نے بہت خوشی سے قبول کیا اور اس غرض کے لیے سب کا ایک جگہ جمع ہونا قرار پایا۔ شہر کے متصل ایک مشہور درگاہ شاہ بلاتی صاحب کی جہاں اس کام کے لیے وہ جگہ تجویز ہوئی۔ شہر کے مسلمانوں نے آپس میں چپندہ کیا اور ۲۸ جولائی ۱۸۵۹ء کو قریب پندرہ ہزار مسلمانوں کے وہاں جمع ہونے، غریبوں اور مسکینوں کو عمدہ کھانا تقسیم کیا گیا، عصر کے وقت سب لوگوں نے شاہ بلاتی صاحب کی مسجد میں نماز پڑھی، نمازیوں کی اس قدر کثرت تھی کہ مسجد کے باہر میدان تک جملے تھیں کھڑی ہوئی تھیں۔

نمانہ کے بعد سرستید نے صحن مسجد میں ایک اونچی جگہ کھڑے ہو کر اردو زبان میں ایک مناجات پڑھی جس میں نہ شاندار الفاظ ہیں نہ رنگینی ہے نہ تضحیح ہے۔ محض سیدھے سادے الفاظ اور بے ساختہ جملے ہیں، مگر اُس کے ہر جملے اور ہر فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تباہی و بربادی نے اس شخص کے دل میں ایک عجیب بے چینی پیدا کر رکھی تھی جو کسی طرح کم نہ ہوتی تھی بلکہ روز بروز زیادہ ہوتی جاتی تھی اور گویا اس بات کی خبر دیتی تھی کہ وہ سرستید کو اخیر دم تک اس چھینک سے خالی نہ رہنے دے گی، بہم کو مناسب معلوم ہوتا

ہے کہ اُس مناجات کو بجنسہ اس مقام پر نقل کر دیا کیونکہ اُس کے الفاظ سے سہتید کے دل کی اصلی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔

مناجات

”اے خدا تو ہمارا حقیقی پروردگار ہے۔ اے خدا اصلی بادشاہت اور حقیقی سلطنت تجھی کو سزاوار ہے۔ اے خدا مالک الملک تو ہی ہے جس کو تو چاہتا ہے عزت دیتا ہے جس کو تو چاہتا ہے دولت دیتا ہے اے خدا سارا عالم اور تمام مخلوقات کی جانیں اور سب آدمیوں کے دل تیرے ہاتھ میں ہیں جس طرف تو چاہتا ہے اُن کو پھیرتا ہے اور جو چاہتا ہے سو کرتا ہے۔ تیرا کوئی کام حکمت اور رحمت سے خالی نہیں تیرے کام میں کسی کو چون و چرا کی قدرت نہیں۔ اے خدا ہم تیرے عاجز بندے سراسر تیرے گنہگار ہیں۔ اے خدا ہماری شامت اعمال نے ہم کو گناہ کے دریا میں سرتک ڈلو دیا ہے اے خدا ہم تیرے ہر وقت تقصیر وار ہیں۔ جب تک تیری مدد نہ ہو ایک دم گناہ سے پاک نہیں رہ سکتے۔ اے خدا تیرے سوا کوئی ہمارے گناہ بخٹسے والا نہیں اے خدا تیرے سوا ہم گناہ کے دریا میں ڈوبے ہوؤں کا کوئی ترانے والا نہیں۔ ہم نہایت عاجزی اور کمال انکسار سے اپنے گناہوں کی معافی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے تجھ سے چاہتے ہیں، اے خدا تیرے غضب سے تیری رحمت بوقت لے گئی ہے اپنی رحمت کاملہ سے ہمارے گناہ معاف کر، اے خدا جس طرح تیری حکمت سے میلا کپڑا میل سے پاک ہوتا ہے اسی طرح ہم کو ہمارے گناہوں کی

ناپاکی سے پاک کرانے خدا اپنی بے انتہا رحمت سے ہمارے دل کو
تمام بُرائیوں اور تمام ناپاک چیزوں سے جو دل کو ناپاک کرتی ہیں صاف
کرے۔ اے خدا ہمارے دل کے گناہوں کو مٹا اور ہماری روح کو روح القدس
کی تاثیر سے قوی کر تیرے سوا ہمارا حقیقی ماوا اور اصلی ملجا اور کوئی
نہیں آمین !

الہی ہمارے گناہ حد سے زیادہ ہو گئے تھے۔ الہی ہماری شامت
اعمال کی کچھ انتہا نہیں رہی تھی۔ اگرچہ ہم یقین کرتے ہیں کہ ہر ایک
کے اعمال کی سزا اور جزا کا ایک دن بیشک آنے والا ہے جس کا تو
نے اپنے سچے نبیوں کی کتابوں میں وعدہ کیا ہے اور اُس دن تیری رحمت
اور تیرے فضل کے سوا کسی کا چھٹکارا نہیں کیونکہ تیرے آگے سب
گنہگار ہیں، مگر ان پچھلے دوسروں میں جو تیری نگاہِ قہر آلود تیرے عاجز
بندوں کی طرف ہوتی وہ بیشک ہماری شامت اعمال کا ظاہری نتیجہ
تھا۔ الہی ہم اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہیں۔ الہی اپنے گناہوں کی
بتجھ سے معافی چاہتے ہیں۔ الہی تو ہمارے گناہ سب معاف کر۔ آمین !

الہی یہ پچھلا زمانہ تیری مخلوقات پر ایسا گذرا کہ انسان اور حیوان
تمام چیزند و پرند بلکہ شجر و حجر کسی کو چین اور آرام نہ تھا۔ کوئی شخص اپنی
جان و مال و آبرو پر مطمئن نہ تھا ان پچھلے فسادوں نے زمین و آسمان
کو گویا الٹ پلٹ کر دیا تھا۔ الہی تو نے اپنے فضل و کرم سے ان
تمام فسادوں اور آفتوں کو دور کیا۔ الہی تو نے پھر اپنے عاجز
بندوں پر رحم کیا اور جو امن و آسائش ان بد سجت برسوں سے پہلے
تو نے اپنے بندوں کو دی تھی پھر وہی امن و آسائش تو نے اپنے

بندوں کو نصیب کی۔ الہی تیرے اس رحم کا ہم دل سے شکر ادا کرتے
ہیں، الہی تو ہمارے اس شکرانہ کو جو تیری درگاہ کے لائق نہیں ہے
اپنے فضل و کرم سے قبول کر۔ آمین !

الہی تیرا ایک بہت بڑا احسان اپنے بندوں پر یہ ہے کہ اپنے
بندوں کو عادل اور منصف حاکموں کے سپرد کرے۔ سو برس تک
تو نے اپنے ان بندوں کو جن کو تو نے خطہ ہندوستان میں جگہ دی ہے
اسی طرح عادل اور منصف حاکموں کے ہاتھ میں ڈالا۔ پچھلے کم نجات
برسوں میں جو بسبب مہربانی نے ان حاکموں کے ہماری شامت اعمال
ہمارے پیش آئی اب تو نے اس کا عوض کیا اور پھر وہی عادل اور منصف
حاکم ہم پر مسلط کیے تیرے اس احسان کا ہم دل سے شکر ادا کرتے
ہیں۔ تو اپنے فضل و کرم سے اس کو قبول کر آمین !

الہی جو بھلائی کہ تیرے بندے کو کسی تیرے بندے سے پہنچتی
ہے وہ درحقیقت تیری ہی طرف سے ہے اور اس تیرے بندے
کا شکر ادا کرنا درحقیقت تیرا ہی شکر ادا کرنا ہے۔ سب کے دلوں
کا حال تجھ پر روشن ہے کیونکہ تو دانائے نہاں و آشکارا ہے۔ اہل ہند
جو اس اتفاقیہ آفت میں گرفتار ہو گئے تھے ان پر رحم کرنا تو نے ہی
ہمارے حکام کے دل میں ڈالا۔ تیرے ہی القاسے کوٹن و کٹوریہ دام
سلطنت ہانے پر رحم اشتهار معافی جاری کیا۔ ہم دل سے شکر ادا کرتے
ہیں اور اپنی جان سے ملکہ کو دعا دیتے ہیں۔ الہی تو ہماری اس دعا کو
قبول کر آمین ! الہی ہماری ملکہ و کٹوریہ ہوا۔ اور جہاں ہو۔ تمام اہل ہند
ناظم کشور ہند و السرائے لارڈ کیننگ دام اقبالہ کا یہ رحم اور احسان

کبھی دل سے نہ بھولیں گے جس نے تمام اصل حالات فساد پر غور کر کے اس پر رحم اشتهار کے جاری ہونے کی صلاح دی۔ اس کی مستحکم رائے کسی طرح اس معاملے میں منہیں ڈگمگائی جس سے تمام رعایا نے امن پایا۔ تمام اہل ہند اُس کے اس احسان کے بندے اور دل و جان سے اُس کو دعا دیتے ہیں۔ الٰہی تو ہماری دعا قبول کر۔ آمین! الٰہی دنیا ہو اور ہمارا واسعہ لارڈ کینگ ہو۔

الٰہی اہل ہند رحم کے اُس سے بہت زیادہ خواہشمند ہیں جتنا ایک پیاسا نہایت گرمی کی شدت اور آفتاب کی تیزی اور دھوپ کی تپش اور ریتے کے جھنگ میں پانی کی آرزو رکھتا ہے جس حاکم کو دیکھتے ہیں کہ اُس کی رحم کی نظر ہے اُس کو دل سے پیدا کرتے ہیں اور اُس کا دل سے شکر ادا کرتے ہیں۔ تمام اہل ہند جانتے ہیں کہ اصل حالات فساد پر غور کر کے نہایت رحم کی نگاہ سے اہل ہند کو مسٹر ریڈ ممبر بورڈ نے دیکھا ہے۔ اس لیے اُن کا شکر ادا کرتے ہیں اور دل سے اُن کو دعا دیتے ہیں۔ الٰہی تو ہماری اس دعا کو قبول کر۔ ہمارا مسٹر ریڈ ہمیشہ سلامت رہے۔

اب ہماری یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنے فضل و کرم سے امن و امان اور چین چان اور تمام رعایا سے ہند کو اطاعت و فرمانت سے سرخروئی دے اور ہمارے حکام اپنی رعایا اور خدا کے بندوں پر مہربان رہیں۔ آمین :

صلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین
واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

رسائل موسوم بہ لائل محمد نزاروف انڈیا

مراد آباد ہی میں سرسید نے خاصکر مسلمانوں کی بھلائی کے لیے ایک اور مفید کام کی بنیاد ڈالی۔ رسالہ اسباب بغاوت جیسا کہ اوپر مذکور ہوا انھوں نے محض گورنمنٹ ہند اور پارلیمنٹ کی اطلاع کے لیے لکھا تھا چنانچہ ایک مدت تک اس کے مضامین سے ہندوستان کے حکام اور افسر اور خود ہندوستان کے باشندے کیا ہندو اور کیا مسلمان مطلع نہیں ہوئے اور چونکہ اس پر مرتب ہوئے وہ پارلیمنٹ کے مباحثوں کے بعد آہستہ آہستہ بتدریج ظاہر ہوتے رہے اس لیے سرسید کے دل کی بے چینی اور درد میں کچھ افاقہ نہ ہوا۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ بغاوت پر جتنے آرٹیکل، رسالے اور کتابیں انگریز لکھتے تھے ان میں سے اکثر میں مسلمانوں کے برخلاف رائیں ظاہر کی جاتی تھیں ان کی بے چینی اور زیادہ ہوتی تھی مسلمانوں پر کہیں یہ الزام لگایا جاتا تھا کہ ان کو بالذات اپنے مذہب کے بموجب عیسائیوں سے عداوت ہے۔ کوئی یہ لکھتا تھا کہ شاہ نعمت اللہ ولی کی پیشین گوئی سے تمام مسلمانوں کو یقین تھا کہ اب عیسائیوں کی عملداری نہیں رہنے کی۔ اور سب سے بڑا اور عام الزام جو ان پر عائد کیا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے مذہب کی رو سے انگریزوں پر جہاد کرنا واجب تھا اور اسی لیے مسلمان سب سے زیادہ بغاوت کے مرتکب ہوئے۔

برخلاف اس کے سرسید نے نہایت تحقیقات اور چھان بین سے بے شائبہ شہادتیں اس بات کی بہم پہنچائی تھیں کہ جس قدر گورنمنٹ کی خیر خواہی میں جانناہزی اور جہاں نشاری کے کام مسلمانوں سے ظہور میں آئے وہ تمام ملک میں کسی قوم سے ظہور میں نہیں آئے۔ اور مذکورہ بالا نینوں الزام جو مسلمانوں پر لگائے جاتے تھے وہ

فی الواقع انگریزوں کی غلط فہمی پر مبنی تھے، اسی بنا پر انھوں نے ایک مبسوط کتاب لکھنے کا ارادہ کیا جو پارہ پارہ کر کے وقتاً فوقتاً اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں چھپوائی جائے اور ہندوستان اور انگلستان دونوں ملکوں میں شائع کی جائے۔

اس کتاب کا موضوع یہ قرار دیا تھا کہ اطراف ہندوستان میں جس قدر مسلمانوں نے گورنمنٹ کی خیر خواہیاں اور انگریزوں کی حمایت کے لیے جانیا زیاں کی ہیں ان میں سے ہر شخص کا حال مفصل اور مشرح نہایت صحت کے ساتھ قلمبند کیا جائے اور ہر شخص کے متعلق گورنمنٹ، حکام اور افسروں کی تمام چٹھیاں اور سرٹیفکیٹ ہم پہنچا کر اس کی سرگذشت کی ذیل میں نقل کی جائیں اور جو کچھ ان کی خدمات کے صلہ میں گورنمنٹ نے جاگیر یا پنشن یا انعام یا خلعت وغیرہ عنایت کیا ہو وہ سب بیان کیا جائے۔

ظاہر ہے کہ ایسی کتاب لکھنے کے لیے بے انتہا سامان اور میٹریل درکار تھا جس کا جمع کرنا وقت سے خالی نہ تھا، پھر اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے کی اجرت بھی اس زمانے میں نہایت گراں تھی اور ٹائپ کے چھاپہ کا خرچ بھی بہ نسبت پتھر کے چھاپہ کے بہت زیادہ تھا۔ اس لیے سرسید نے یہ قاعدہ قرار دیا تھا کہ جس خیر خواہ مسلمان کا حال جتنے صفحات پر چھپے اس قدر صفحات کے چھاپہ وغیرہ کی لاگت وہی شخص ادا کرے۔ مگر افسوس ہے کہ محدودے چند کے سوا کسی نے اس تدبیر کے پورا کرنے کی طرف توجہ نہ کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف تین نمبر بغیر ۲۷۳ صفحہ کے چھپ کر رہ گئے ۱۸۶۰ء میں یہ رسالہ جاری ہوا اور ۱۸۶۱ء میں بند ہو گیا۔

پہلے نمبر کو انھوں نے اس طرح شروع کیا ہے۔ ”سیح ہے انقلاب زمانہ ایک ایسا بڑا حادثہ ہے کہ آدمی کو نہایت زہوں و صدمانہ کر دیتا ہے۔ ایسے وقت

میں انسان کا فضل و کمال، عقل و منہر علم و عمل کچھ کام نہیں آتا۔ یہی وہ حادثہ ہے جس سے انسان کا باپ پٹ ہو جاتا ہے۔ کوئی کام اُس کا اعتبار کے لائق نہیں رہتا کسی شخص کو اس کی قدر و منزلت کا خیال نہیں رہتا جو کام انسان سے بڑا سرزد ہوتا ہے وہ تو بُرا ہی ہے مگر اس کجخت و فتنہ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اُس کا اچھا کام بھی بُرائی اور ظاہر داری پر محمول ہوتا ہے۔ ہر ایک قوم میں اچھے بُرے سب قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ یہ ایک مثل مشہور ہے کہ ”ایک پھلی سارے جل کو گندا کرے“۔ یہ خالص ایسے ہی بُرے وقت کے لیے کہی گئی ہے۔ اس کم بخت و فتنہ کا یہ خاصہ ہے کہ اگر ایک آدمی بھی بُرا کام کرے تو ساری قوم کی قوم رسوا اور بدنام ہو جاتی ہے گو اُس قوم میں صد ہا آدمیوں نے اچھے کام کیے ہوں مگر اُن خوبیوں پر کسی کو خیال نہیں ہوتا۔

”ہر خلوت اس کے جن لوگوں پر یہ بد بختی کے دن نہیں ہوتے اُن کا بُرا کام بھی آنکھوں میں نہیں کھٹکتا۔ اُن میں سے ہزاروں نے کیسے ہی بُرے کام کیے ہوں مگر اُن کی بُرائی پر کسی کو دھیان نہیں ہوتا یہ بد بختی کا زمانہ وہ ہے جو ۵۵۵ء و ۵۵۶ء میں ہندوستان کے مسلمانوں پر گذرا۔ کوئی آفت ایسی نہیں ہے جو اُس زمانے میں نہ ہوئی ہو اور یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے کی۔ گو وہ رام دین اور مانا دین ہی نے کی ہو۔ کوئی بلا آسمان پر سے نہیں چلی جس نے زمین پر پہنچنے سے پہلے، مسلمانوں کا گھر نہ ڈھونڈا ہو۔“

ہر بلائے کنز آسماں آید گر چہ بردگہرے قضا باشد
 ہر زمین نار سیدہ می پُرسد خانہ مسلمان کجا باشد

”اس گزشتہ زمانے کے حالات پر میں نے بھی بہت غور کیا اور جو اصلی

حالات مجھ کو معلوم ہوئے ہیں اُن پر میں یقین رکھتا ہوں اور اسی سبب سے میرا دل خوش ہے کہ بالفضل جو ایک غوغا مسلمانوں کی بُرائی اور مفسدہ اور بد ذاتی

کاچاروں طرف پھیل رہا ہے یہ بالکل مرٹ جائے گا، اگرچہ کچھ کچھ حالات فساد کے کھلتے چلے ہیں مگر روز بروز اور زیادہ کھلتے جائیں گے اور جب اصلی حال بالکل روشن ہو جائے گا تو جن لوگوں کی زبانیں مسلمانوں کی نسبت دراز ہو رہی ہیں سب بند ہو جائیں گی اور تحقیق ہو جائے گا کہ ہندوستان میں اگر کوئی قوم مذہب کی رو سے عیسائیوں سے محبت اور اخلاص اور ارتباط اور یکانگت کر سکتی ہے تو مسلمان ہی کر سکتے ہیں اور کوئی نہیں۔ مگر ان دنوں میں جو میری نگاہ سے انگریزی اخبارات کثرت سے گزرے اور جو کتابیں اس ہنگامہ کی بابت تصنیف ہوئیں وہ بھی میں نے دیکھیں تو ہر ایک میں یہی دیکھا کہ ہندوستان میں مفسد اور بد ذات کوئی نہیں مگر مسلمان! مسلمان! مسلمان! کوئی کانٹوں والی اور سخت اس زمانے میں نہیں آگا جس کی نسبت یہ نہ کہا گیا ہو کہ اُس کا بیج مسلمانوں نے بویا تھا اور کوئی آتشیں بولا نہیں اٹھا جو یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے اٹھایا تھا، مگر میں اُس کے برخلاف سمجھتا ہوں۔ میں نہیں دیکھتا کہ مسلمانوں کے سوا ایسا اور کوئی جو جس نے خاص سرکار کی خیر خواہی میں اپنی جان، مال، عزت، آبرو، کھوئی ہو، زبانی یا چیت کی خیر خواہیاں ملادینے اور چھوٹے بچے ایک دو پرچے لکھ بھیجنے بہت آسان ہیں مگر مسلمانوں کے سوا وہ کون شخص ہے جس نے صرف سرکار کی خیر خواہی میں اپنی اور اپنے کنبے کی جان دی ہو اور ہر وقت ہاتھ پاؤں اور دل و جان سے جاں نثاری کو حاضر رہا ہو؟

وہ جن مسلمانوں نے سرکار کی نیک حرامی اور بدخواہی کی ہیں ان کا طرفدار نہیں ہوں میں ان سے بہت زیادہ ناراض ہوں اور ان کو حد سے زیادہ براہبانتا ہوں کیونکہ یہ ہنگامہ ایسا تھا کہ مسلمانوں کو اپنے مذہب کی بموجب عیسائیوں کے ساتھ رہنا چاہیے تھا جو اہل کتاب اور ہمارے مذہبی بھائی بند ہیں، نبیوں پر

ایمان لائے ہیں، خدا کے دیئے ہوئے احکام اور خدا کی دی ہوئی کتاب اپنے پاس رکھتے ہیں جس کا تصدیق کرنا اور جس پر ایمان لانا ہمارا عین ایمان ہے۔ پس اس بنگلہ میں جہاں عیسائیوں کا خون گرتا وہیں مسلمانوں کا بھی خون گرتا چاہیے۔
 تمہارا پھر جس نے ایسا نہیں کیا اس نے علاوہ نمک حرامی اور گورنمنٹ کی ناشکری کے جو کسی حال میں رعیت کو جائز نہ تھی، اپنے مذہب کے بھی بڑے خلاف کیا۔ اس لیے بلاشبہ وہ اس لائق ہیں کہ زیادہ ان سے ناراض ہو جائے مگر عموماً اخباروں اور بغاوت کی کتابوں میں جو رائے ان کی نسبت چھاپی جاتی ہے اس میں اور میری رائے میں اتنا فرق ہے کہ جو تمہید اور جو بتا اور جو منشا کہ وہ لوگ ان کی نسبت لگاتے ہیں ان کو قبول نہیں کرتا اور کچھ شک نہیں کہ میں اپنی رائے کو بہت دستن اور انصاف سے کام میں لایا ہوں ۵

۵ اگرچہ چاروں طرف سے مسلمانوں پر یہ شور و غل مچ رہا ہے مگر مسلمانوں کو کسی طرح رنجیدہ خاطر ہونا نہیں چاہیے کیونکہ ہماری نہایت منصف اعلیٰ گورنمنٹ مسلمانوں کی طرف سے ہے۔ ہماری گورنمنٹ نے اصلی حالات و مناسبات پر بخوبی غور کیا ہے اور یقین ہے کہ ہماری گورنمنٹ کی ہرگز یہ رائے نہیں ہے جو تم اخباروں یا بغاوت کی کتابوں میں دیکھتے ہو۔ پس جب کہ مسلمانوں کی طرف خود گورنمنٹ سے تو پھر اس شور و غوغا کا ان کو کیا غم ہے۔

۵ نیگیویم وری گلشن گل و باغ و بہار از من

بہار از یار و باغ از یار و گل از یار از من

و ہم جو یہ بات لکھتے ہیں کہ ہماری منصف گورنمنٹ مسلمانوں کے ساتھ

ہے اس کی بہت روشن دلیل یہ ہے کہ ہماری قدر و ان گورنمنٹ نے خیر خواہ مسلمانوں کی کیسی قدر و منزلت اور عزت اور آبرو کی انعام و اکرام اور جاگیر

اور نیشن سے نہال کر دیا ہے، ترقی عہدہ اور افزوئی مراتب سے سرفراز کیا ہے
پھر کیا یہ ایسی بات نہیں ہے کہ مسلمان نازاں ہوں اور دل و جان سے اپنی گورنمنٹ
کے شکر گزار و ثنا خواں رہیں؟

”مگر میں دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں نے جو خیر خواہیاں کیں ان کا ذکر اخباروں
میں بہت کم چھپتا ہے اور نجات کی جو کتابیں چھپی ہیں ان میں تو اس کا ذکر ہی نہیں
اس لیے میں نے ارادہ کیا ہے کہ مسلمان خیر خواہوں کا تذکرہ اس رسالہ میں لکھنا
شروع کروں اور جن مسلمانوں نے علی الخصوص مسلمان بلا زمان گورنمنٹ نے
جو جو خیر خواہیاں گورنمنٹ کی کی ہیں ان کا بیان جہاں تک مجھ کو معلوم ہے لکھوں
اور جو العام و اکرام ہماری منصف و قدر دان گورنمنٹ نے بعض اس کے مسلمانوں
کو دیے وہ سب بیان کروں۔ تاکہ گورنمنٹ کی سخاوت اور منصفی اور قدر دانی
زیادہ تر مشہور ہو اور تمام رعایا اپنے ہم قوموں کے ساتھ گورنمنٹ کی سزاوت اور
سلوک اور رعایت اور قدر دانی دیکھ کر اس کی دل سے شکر گزار ہوں اور ہر ایک
کو یہ حوصلہ پیدا ہو کہ جس طرح ہمارے ہم قوموں نے گورنمنٹ کی رفاقت سے
عزت اور نیک نامی حاصل کی اسی طرح ہم بھی حاصل کریں اور یہ سبھی جان لیں کہ ہماری
گورنمنٹ ہمیشہ اپنی مطیع رعایا پر دل سے مہربان اور ان کی قدر و منزلت کرنے
کو تیار ہے۔“

”مگر چونکہ مسلمان خیر خواہ بہت کثرت سے ہیں اور ان کی رپورٹیں بھی بہت
لمبی لمبی ہیں اس لیے ان سب کا ایک کتاب میں جمع کرنا اور چھاپنا خالی از وقت
تہ تھا اس واسطے یہ سنجو بیڑی کی سب سے کہ مناسب مناسب وقت پر چند لوگوں کا
حال مختصر مختصر رسالوں میں چھاپا جائے۔“

”جو لوگ بسبب تعصب یا عدم واقفیت کے حالاتِ ملکی سے بیاجوہ

اصول سیاستِ مذہب کے ہیں اُن پر صحیح رائے نہ پہنچنے کے سبب میری رائے کے برخلاف ہیں وہ لوگ میری اس رائے کو ذبح کر کے لوٹنے کا الزام مجھ پر لگائیں گے۔ ہاں یہ بات تو مجھ پر ہی کی ہے کہ میری پیدائش ہندوستان میں ہوئی اور میں بلاشبہ مسلمان ہوں اور مسلمانوں ہی کا ذکر خیر اس کتاب میں لکھتا ہوں پھر نامنصفی سے جو کوئی چاہے یہ الزام مجھ پر لگائے، مگر جو لوگ انصاف دوست ہیں وہ خیال کرینگے کہ ان حالات و واقعات کی تحریر میں میں نے کسی جگہ انصاف کو ہاتھ سے نہیں دیا جس مسلمان کی خیر خواہی کا ذکر لکھا ہے اس کے ساتھ بجنسہ حکام متعہد کی رپورٹیں جو ان کے حق میں ہوئیں اور سائٹیفکٹ جو ان کو دیئے گئے اور گورنمنٹ سے جو اتعام و اکرام اُن کو ملے۔ وہ سب لفظ بہ لفظ اس میں مندرج ہیں جو میری اس تحریر پر گواہ عادل ہیں اور تمام منعصبوں کو الزام لگانے سے بند کرتے ہیں۔

اس کے بعد سرسید نے اول اس بات کا اقرار کیا ہے کہ میری خدمات بمقابلہ بڑے بڑے غیر خواہ مسلمانوں کے کچھ حقیقت نہیں رکھتیں اور اس لیے وہ ذکر کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ مگر صرف اس اُمید پر کہ جو انگریز مسلمانوں سے بدگمان ہیں۔ وہ مولف کو گورنمنٹ کا خیر خواہ سمجھ کر ان تحریرات کو توجہ کے قابل سمجھیں سب سے پہلے اپنا اور میرا رتبہ علی اور ڈپٹی رحمت خاں کا حال لکھا ہے اور تینوں رسالوں میں تقریباً سترہ یا اٹھارہ شخصوں کا نہایت مفصل حال درج کیا ہے جن میں سے بعضے خود بھی مدے گئے اور اُن کے ساتھ دس دس بارہ بارہ آدمی اُن کے کہنے کے بھی یا غیروں کے ہاتھ سے قتل ہوئے دوسرے رسالہ میں خیر خواہان سرکار کے ذکر کے علاوہ ایک لمبی بحث اُن تینوں الزاموں کے منقطع بھی کی ہے جو عموماً مسلمانوں اور اُن کے مذہب پر لگائے جاتے تھے اور قرآنِ حدیث اور فقہ کے حوالوں سے نہایت صفائی کے ساتھ ان کو غلط اور محض بے اصل و بے بنیاد ثابت کیا ہے۔

تفسیر رسالہ میں لانس لٹ اڈسین نام ایک قدیم عیسائی مصنف کی کتاب سے جو اُس نے ۱۷۹۷ء میں اسلام کے ابتدائی حالات پر لکھی تھی، ایک عہد نامہ نقل کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عیسائیوں کے ساتھ جو عہد و پیمان کیا تھا اُس میں ان کی قوم کو تقریباً مسلمانوں ہی کی برابر حقوق دیئے تھے اور مسلمانوں کو تاکید کی تھی کہ اُس پر ہمیشہ کاربند رہیں ورنہ وہ خدا سے منحرف سمجھے جائیں گے۔

افسوس ہے کہ یہ رسالہ مسلمانوں کی معمولی بے پروائی اور کم مہنتی سے صرف یقین نمبروں سے آگے نہ چل سکے، اگر یہ تذکرہ مکمل ہو جاتا تو مسلمانوں کے حق میں ایک نہایت مفید اور بکار آمد چیز ہوتی اور ان دعویوں کا ایک عملی اور قطعی ثبوت ہوتا جن کے ثابت کرنے کے لیے اصول اسلام کے موافق دلیلیں اور شہادیں پیش کرنے کی ضرورت ہوتی۔

تحقیق لفظ نصاریٰ

سرستید مراد آباد ہی میں تھے کہ ان کو معلوم ہوا کہ بعض اصلا ح میں مسلمانوں کی بعض تخریریں آیام غدر کی ایسی پیش ہوئیں جن میں انگریزوں کو لفظ نصاریٰ سے تعبیر کیا تھا، حکام نے اس لفظ کو بھی بغاوت کا لفظ سمجھا اور ان کے لکھنے والوں کو وہ سزائیں دی گئیں جو ان کی قسمت میں لکھی تھیں، اس وقت جیسا کہ سرستید نے لکھا ہے، مسلمانوں کی ہر ایک بات بُرے پہلو پر ڈھالی جاتی تھی۔ انگریزوں

۱۷۹۷ء کے چند سال بعد دہلی میں بھی ایک اسی قسم کا اشتباہ پیدا ہوا تھا، دہلی کالج کے ایک مسلمان پروفیسر کے ایک ایڈریس کے مسودہ میں عیسائی کی جگہ ترسا کا لفظ لکھا یا تھا جو فارسی میں رابب یعنی ملنگ کو کہتے ہیں کالج کے ایک یورپین افسر نے اس کو مختار کا لفظ سمجھا اور نہایت ناراضی ظاہر کی اور اس لفظ کو مسودہ میں سے کٹوا دیا۔ ۱۳۔

نے جو بعض مسلمانوں کی تحریروں میں اپنی نسبت نصاریٰ کا لفظ دیکھا تو انھوں نے یہ خیال کیا کہ جس طرح میری حضرت عیسیٰ کو تحدت سے ناصرہ کا رشتہ والا کہتے تھے اسی طرح مسلمانوں نے انگریزوں کو نصاریٰ کے لفظ سے یاد کیا ہے۔

سر سید نے اس غلطی کے رفع کرنے کو فوراً ایک مختصر رسالہ تحقیق لفظ نصاریٰ میں لکھا اور اُس کو اردو اور انگریزی میں چھپوا کر حکام اور گورنمنٹ کو اُس کے مضمون سے مطلع کیا۔ ہم کو اس کتاب کے لکھنے وقت وہ رسالہ دستیاب نہیں ہوا مگر جو کچھ سر سید نے زبانی بیان کیا اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ نصاریٰ کا لفظ ناصرہ سے مشتق نہیں بلکہ نصر سے مشتق ہے اور مسلمان اس وجہ سے کہ قرآن سے ایسا ہی ثابت ہوتا ہے۔ اُس کو نصر سے مشتق سمجھتے ہیں نہ ناصرہ سے کیونکہ قرآن میں صاف آیا ہے کہ جب حضرت عیسیٰ نے کہا "من انصاری الی اللہ" تو حواریوں نے کہا "سخن انصار اللہ" اور اسی لیے حواریوں کی پیروی کرنے والوں اور عیسیٰ پر ایمان لانے والوں کو اسی صفت کے ساتھ جس کو حواریوں نے ہامی بھری تھی، سومون کہا گیا ہے اور ان پر نصاریٰ کا اطلاق کیا گیا ہے۔ قرآن میں کہیں قریبہ ناصرہ کا ذکر نہیں آیا اور نہ کہیں حضرت عیسیٰ کو ناصرہ کہا گیا ہے اس کے سوا قرآن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عیسائی انحضرت کے زمانے میں خود اپنے نہیں نصاریٰ کہتے تھے جیسا کہ سورہ مادہ کی اس آیت میں بیان ہوا ہے۔ **وَلْيَتَذَكَّرْهُمْ مَوْذَعًا لِّذُنَّ اٰمَنُوۡا الَّذِيۡنَ قَالُوۡا اِنَّا نَصَارٰی** (یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو پائے گا اہل کتاب میں سب سے زیادہ مسلمانوں کو دوست اُن کو جن کا قول ہے کہ ہم نصاریٰ ہیں) جہاں تک کہ معلوم ہوا ہے اس رسالہ کی اشاعت کے بعد پھر کسی سے اس لفظ

پر مواخذہ نہیں ہوا۔ ہم نے سنا ہے کہ جب یہ رسالہ شائع ہوا تو کسی انگریزی اخبار میں یہ لکھا گیا تھا کہ سید احمد خاں کا بیان غلط ہے کیونکہ کسی شخص کو نصاریٰ کا لفظ کہنے

پر سزا نہیں ہوئی۔ اس پر ایک معزز یورپین افسر نے اُس کا جواب دیا اور یہ لکھا کہ خود ہمارے سامنے ایک شخص کو اسی جرم میں کانپور میں پھانسی دی گئی۔

انتظام قحط ضلع مراد آباد

۱۸۶۰ء میں جب کہ اضلاع شمال مغرب میں ایک عام قحط پڑا تھا اُس وقت سرستید مراد آباد ہی میں صدر الصدور تھے۔ مسٹر جان اسٹریچی نے جو اُس وقت وہاں کلکٹر تھے، اپنے ضلع کے قحط کا انتظام سرستید کے سپرد کر دیا تھا۔ اس موقع پر قطع نظریاقت اور سلیقہ انتظام کے جو انسانی ہمدردی سرستید سے ظہور میں آئی وہ ہندوستانیوں کے لیے ایک عمدہ مثال ہے۔ سرستید کے ایک قدیم دوست خود مراد آباد کے رہنے والے جو اُس وقت وہاں ملازم تھے اُن کا خیال ہے کہ سید احمد خاں کو جو اس قدر عزت اور نیکنامی تمام ہندوستان میں حاصل ہوئی۔ یہ اسی بھلائی اور نیکی کا ثمرہ ہے جو قحط کے انتظام میں اُن سے ظاہر ہوئی۔

محتاج خانہ کے حین انتظام کا یہ حال تھا کہ چودہ ہزار محتاجوں کو گھنٹہ بھر میں کھانا تقسیم ہو جاتا تھا۔ بیماریوں کے لیے شفا خانہ اور ڈاکٹر موجود تھا۔ بیماریوں کو پھیلنے سے روکا جاتا تھا۔ زچاؤں اور شیر خوار بچوں کو دودھ یا کھیر ملتی تھی۔ مسلمانوں کے لیے مسلمان اور ہندوؤں کے لیے ہندو کھانا پکاتے تھے جو ہندو اپنے سوا کسی کے ہاتھ کا پکا ہوا نہیں کھاتے تھے اُن کے لیے علیحدہ چوکے بنے ہوئے تھے۔ شہر کی سپردہ نشین اور عزت دار عورتیں جو محتاج خانہ میں نہیں آ سکتی تھیں اُن کے پاس سوت کاتنے کے لیے آٹھ آٹھ آنہ فی اسم اور ایک ایک چاری روٹی کے گالوں کی بیر محلوں کی سرمت بھیج دی جاتی تھی جب سوت کٹکرا جاتا تھا اور روٹی اور کاتنے کی اجرت بھیج دیتے تھے۔ سرستید کے مراد آبادی دوست بیان کرتے ہیں کہ اُس زمانے کی عورتیں

جو اہلک جلتی ہیں وہ سید احمد خاں کو اب تک دعائیں دیتی ہیں۔

سرسید صبح شام دونوں وقت بلا ناغہ محتاج خانہ میں خود جاتے تھے، ایک ایک بیمار کو دیکھتے تھے جن کنگلوں کی صورت اور حالت آنکھ سے دیکھی نہ جاسکتی تھی، جن کے دست جاری ہوتے تھے اور کپڑے بول و ببلاز میں لتھڑے ہوئے ہوتے تھے، ان کو سرسید خود اپنی گود میں اٹھا کر دوسری صاف جگہ احتیاط سے جا کر ٹاڈیتے تھے۔ ان کے کپڑے بدلواتے تھے ہر منڈواتے تھے، ہاتھ منہ دھلواتے تھے۔ دوا پلاتے تھے اور نہایت شفقت سے ان کے ساتھ پیش آتے تھے۔ راجہ جیکشن داس صاحب سی۔ ایس۔ آئی کی جو آخر کو سرسید کے نہایت گہرے دوست ہو گئے، اُس وقت تک ان سے ملاقات نہ تھی، ان کا بیان ہے کہ

”جب سرسید نے رسالہ ”لائل محمد نزاوت انڈیا“ نکالنا شروع

کیا تو اُس کے بعض فقروں سے مجھے خیال ہوا کہ سید احمد خاں نہایت متعصب آدمی ہیں اور ہندوؤں سے ان کو کچھ ہمدردی نہیں ہے، اُس وقت میرا مصمم ارادہ ہو گیا تھا کہ اسی طرح ایک رسالہ ہندو خیر خواہوں کے تذکرہ میں نکالا جائے۔ انھیں دنوں میں میرا سراو آباد جانا ہوا۔ محتاج خانہ راہ میں پڑتا تھا۔ وہاں سرسید سے مُڈ بھیڑ ہو گئی۔ میں نے ان فقروں کا ذکر کیا جن سے ان کے تعصب کا خیال پیدا ہوا تھا۔ انھوں نے معذرت کی اور اپنی قلم کی لغزش کا اقرار کیا خیر

یہ تو ایک اخلاقی جواب تھا، مگر جس شفقت اور ہمدردی سے وہ اُس وقت ہر مذہب اور ہر قوم کے محتاجوں کے ساتھ پیش آرہے۔ تھے اُس کو دیکھ کر میرا دل بالکل صاف ہو گیا اور مجھے حیرت ہو گئی کہ یہ شخص کیسی پاک طبیعت کا آدمی ہے؟ وہ دن ہے اور آج

کا دن اُن کے ساتھ میری محبت روز بروز بڑھتی گئی اور اب جو کچھ
میرا اور اُن کا معاملہ ہے وہ سب پر ظاہر ہے۔

محتاج خانہ میں شام کا کھانا سب محتاجوں کو دن چھینے سے پہلے بٹ جاتا تھا
مگر جو بھیلے مانس علانیہ محتاج خانہ میں آئے سے شرماتے تھے اُن کو عام اجازت
تھی کہ رات کو اندھیرے میں آ کر کھانا کھا جایا کریں۔ محتاجوں کے کھانے کے لیے
ہر ایک جنس عمدہ اول درجہ کی منگوائی جاتی تھی کھانے کے سوا ان کے لیے ضروری
کچھ بھی تیار کرایا جاتا تھا۔

باوجود ایسے اُبلے انتظام کے جس قدر کم روپیہ ضلع مراد آباد میں خرچ ہوا ایسا کسی ضلع میں
نہیں ہوا۔ سبب یہ تھا کہ جتنے آدمی عمدت اور مرد محتاج خانہ میں کام کے لائق تھے سب کام
لیا جاتا تھا۔ بان اور رستیاں بٹتے تھے، سوت کاتتے تھے، ہتھکوں پر کام کرتے
تھے اور طرح طرح کے کام جو اُن سے ہو سکتے تھے کرتے تھے اور اس طرح اُن
کے کام کی اجرت سے ہر روز ایک رقم کثیر جمع ہو جاتی تھی جو محتاج خانہ میں
صرف ہوتی تھی۔

محتاج خانہ کے علاوہ خود سرستید اپنی ذات سے اور نیران کی نیک لبالی
جو اُن سے بھی زیادہ خدائز میں تھیں۔ غریبوں اور محتاجوں کی خبر گیری کرنے
نھے۔ اُن کے مکان پر ہر روز ایک دیگ سالن کی اور روٹیاں محتاجوں کو
تقسیم ہوتی تھیں۔

جب اس محتاج خانہ کی رپورٹ اسٹریٹیجی صاحب نے گورنمنٹ میں بھیجی تو
یہ انتظام ایسا پسند آیا کہ اور اصلاح سے حکام کو بھی ایسا ہی انتظام کرنے کی ہدایت
ہوئی۔ اور اسٹریٹیجی صاحب کا نہایت شکر یہ اور تعریف کی گئی مگر اسٹریٹیجی صاحب
نے صاف لکھ بھیجا کہ یہ تمام کارروائی سید احمد خاں سبناج نے کی ہے۔ اگر

شکر یہ اور تعریف کا مستحق ہے تو سید احمد خاں ہے۔

سر سید کو جب اسٹریٹیجی صاحب نے قحط کا انتظام سپرد کیا تھا تو سر سید نے صاف کہہ دیا تھا کہ میں اس شرط پر انتظام کرتا ہوں کہ جتنے لاوارث بچے آئیں ان میں جتنے مسلمان ہوں گے وہ مسلمانوں کو اور جتنے ہندو ہوں گے وہ ہندوؤں کو سپرد کے جائیں گے چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ جتنے لاوارث بچے آئے وہ ہندو مسلمانوں کے سوا کسی مشنری کو نہیں لینے دیتے۔ مگر حسب ہدایت اسٹریٹیجی صاحب کے جو بچہ جس کے سپرد کرتے تھے اُس سے ایک اقرار نامہ لکھوا لیتے تھے۔ کہ ہم اس کو لوٹھی یا غلام نہیں بنانے کے، ہو شاید ہونے کے بعد جہاں اس کا ججا چاہے رہے اور جہاں چاہے چلا جائے۔

لیکن ہنوز قحط کا انتظام ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ جان اسٹریٹیجی سراو آباد سے بدل گئے اور مسٹر پاوان کی جگہ آنے مشنریوں نے اسٹریٹیجی صاحب کے سامنے تو دم نہیں مارا مگر ان کے جانے ہی مسٹر پاوان سے سر سید کی شکایت کی اور یہ چاہا کہ تمام لاوارث بچے جو ہندو مسلمانوں کو دیتے گئے ہیں وہ واپس لیے جائیں اس زمانے میں مسٹر الگزینڈر شکلیئر جو سر سید کے نہایت دوست تھے سراو آباد میں حج تھے انھوں نے سر سید کو ہر چند سمجھایا کہ جتنے رٹ کے اور لوٹکیاں خاص تمھارے سپرد کی گئی ہیں وہ تم سے نہیں لیجائیں گی مگر اور لوگوں پر اعتماد نہیں ہو سکتا کہ وہ ان کو لوٹھی غلام نہ بنائیں گے۔ مگر سر سید نے ہرگز نہ مانا اور یہ کہا کہ ”میں نے اسی شرط پر قحط کا انتظام اپنے ذمہ لیا تھا کہ لاوارث بچے مشنریوں کو نہیں دینے جائیں گے اور اسٹریٹیجی صاحب کو رٹ میں رپورٹ کر چکے ہیں کہ لاوارث بچوں کا اس طرح بندوبست کیا گیا ہے۔ پس اس کے خلاف کیونکر ہو سکتا ہے۔ مجھے جس طرح یہ گوارا نہیں کہ ایک سید کا بچہ مشنریوں کو دیا

جانے اسی طرح یہ بھی گوارا نہیں کہ ایک چھارہ کا بچہ اُن کو دیا جائے۔
 مسٹر پاور کو جب سرسید کی ناراضی کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے اس معاملہ
 پر غور کرنے کے لیے انگریزوں اور ہندوستانوں کی ایک کمیٹی مقرر کی چونکہ اُس
 زمانہ میں ہندوستانی عدسے زیادہ ڈرتے ہوئے اور سہمے ہوئے تھے اور انگریزوں
 کے خلاف کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ سرسید اور ایک دو اور ممبروں کے سوا
 تمام کمیٹی کا اتفاق ہو گیا کہ جتنے بچے ہندو مسلمانوں کے سپرد کیے گئے ہیں۔ وہ
 واپس لیے جائیں کیونکہ اُن پر ہرگز اعتماد نہیں کہ وہ اُن کو لونڈی غلام نہ بنا لیں
 گئے۔ آخر کلسر کمیٹی کی یہ رپورٹ منظور ہو گئی اور تمام لا وارث بچے ہندو مسلمانوں
 سے واپس لیکر مشنریوں کو دلا دیئے گئے سرسید کے ہاں بھی پانچ چار لڑکے
 اور لڑکیاں رہتی تھیں۔ اور اُن کی بی بی ان کو کمال شفقت سے رکھتی تھیں جس سبب
 نے پہلے اس کو کوئی ان سے مانگنے آئے فوراً اُن کو کلکٹر کے پاس بھیج دیا جاتے
 ہوئے وہ بچے نار و قطار روئے تھے اور ہرگز جانا نہیں چاہتے تھے مگر مجبور
 اُن کو بھیجا پڑا۔

سرسید کہتے تھے کہ اُس وقت میرا مصمم ارادہ ہو گیا تھا کہ جب کبھی موقع
 ملے تمام ہندو مسلمانوں سے چندہ کر کے صدر مقام میں ایک بہت بڑا یتیم خانہ
 قائم کیا جائے جہاں ہندوستان کے لا وارث بچوں کی پرورش ہو اور اُن کو تسلیم
 دیا جائے۔ لیکن آخر کو یقین ہو گیا کہ جب تک ہندوستان میں تعلیم عام نہ ہوگی
 ان خرابیوں کا کلی انسداد کسی طرح نہیں ہو سکتا۔

تصحیح تاریخ فیروز شاہی

مراد آباد ہی میں انھوں نے تاریخ فیروز شاہی ضیاء برنی کی تصحیح کی۔

ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کو اس نایاب کتاب کا چھاپنا منظور تھا۔ اس نے سرسید سے تاریخ مذکور کا ایک صحیح نسخہ نقل کے واسطے طلب کیا تھا۔ انہوں نے بہت جستجو سے اس کا ایک نسخہ اسی غرض کے لیے خریدا اور سوسائٹی سے وعدہ کر لیا کہ میں اپنا نسخہ صحیح کر کے بھیجوں گا۔ چنانچہ اس کی تصحیح کے لیے ایک نسخہ کتب خانہ شاہ دہلی، دوسرا وہ نسخہ جو مسٹر الیٹ نے تاریخ ہندوستان لکھتے وقت بہم پہنچایا تھا، تیسرا نسخہ مسٹر ڈورڈ ٹامس سے اور چوتھا بنارس سے بڑی تلاش اور تجسس سے بہم پہنچا کر اپنی کتاب صحیح کی جس سے یہ تاریخ ۱۸۶۲ء میں ایشیاٹک سوسائٹی نے چھاپ کر شائع کی۔

یہ ایک نہایت معتبر اور مستند تاریخ ہے جس کا مصنف ضیاء الدین برن یعنی بلند شہر، کاشمی و لاکھنؤ بڑا قاضی اور راست بیانی میں صریح المثل ہے۔ سرسید نے اس کی تصحیح کے وقت اس پر ایک دیباچہ بھی لکھا تھا جس میں ان تمام تاریخوں کا جو شاہان ہند کے حال میں اس تاریخ سے پہلے اور خاص قیروز شاہ کے حال میں اس کے بعد لکھی گئی ہیں اور نیز ضیاء الدین برنی کا حال درج ہے۔ یہ دیباچہ سائنٹفک سوسائٹی اخبار کی پہلی جلد میں چھپا ہوا موجود ہے۔

تیسرے کلام

۱۸۵۷ء سے پہلے جب کہ دہلی و آگرہ وغیرہ میں مشنریوں کے کاروبار زیادہ پھیلنے لگے اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے جا بجا مباحثے ہونے لگے، اس وقت سرسید کو بھی یہ خیال ہوا تھا کہ اسلام کی حمایت میں مشنریوں کے اعتراضات کے جواب لکھے جائیں، چنانچہ غدر سے پہلے بجنور میں انہوں نے کچھ کچھ بطور بادداشت کے لکھا بھی تھا اور اپنے بھتیجے سید احمد خاں کو جو اس وقت صغیر سن

تھے، جو کچھ لکھتے تھے بطور سبق کے پڑھاتے جاتے تھے۔

واقعہً غدر ہو گیا اور وہ تمام یادداشتیں جاتی رہیں، غدر کے بعد جب اطمینان ہوا تو اس خیال نے دوسری صورت میں ظہور کیا جس کا ذکر دوسرے حصے میں کیا جائے گا۔ مگر ساتھ ہی یہ ذہن میں آیا کہ اس کام کے لیے اول عیسائی مذہب اور بائبل کی حقیقت اور اس کی تاریخ سے اور جو کچھ بائبل پر موافق یا مخالف لکھا گیا ہے اس سے واقفیت حاصل کرنی ضرور ہے۔ ان کو یہ بھی خیال تھا کہ اب تک جس قدر مباحثے یا مناظرے ہندوستان میں پادریوں کے ساتھ ہوئے ہیں وہ بغیر ان تمام باتوں کی واقفیت کے ہوئے ہیں۔ اعجاز عیسوی وغیرہ میں جو تخریف لفظی ہونے کا دعویٰ کیا گیا تھا اس سے سرسید کو اختلاف تھا۔ نسخ کے متعلق جو مسلمانوں اور عیسائیوں میں نزاع تھا اس کو وہ محض تبرع لفظی سمجھتے تھے بہت سی باتیں جو عیسائی لوگ بائبل سے اصول اسلام کے خلاف نکالتے تھے ان کو سرسید عیسائیوں کی غلط فہمی سے منسوب کرتے تھے۔

لیکن ان تمام باتوں کی تحقیقات اور تصفیہ کے لیے بہت کچھ سامان درکار تھا، اتفاق سے انھیں دنوں میں غدر کے زمانہ کی چھڑھی ہوئی تنخواہوں کا اور جو اسباب بجنور میں لٹ گیا تھا اس کے معاوضہ کا، بہت سارے روپیہ سرسید کو سرکار سے ملا۔ اول انھوں نے عیسائی مذہب کی تمام ضروری کتابیں، بائبل کی تفسیریں اور یونیٹیرین مذہب کی کتابیں خریدیں، اور تیسرا لادھوں کی کتابیں جو بائبل کے خلاف لکھی گئی تھیں وہ بھی بہم پہنچائیں، ایک انگریزی نواں کو جو ان کتابوں کے ضروری مقالات ترجمہ کر کے منسٹا تھا اور کتب احادیث و تفسیر وغیرہ سے سندیا بہم پہنچانے کے لیے ایک عربی دان عالم کو نوکر رکھا اور بائبل کے متعلق جو عام واقفیت اور اطلاع مذکورہ بالا ذریعوں سے حاصل ہوئی

اُس کو اول دس مقدموں اور دو تہمتوں میں بیان کیا۔ اس کے بعد بائبل کی تفسیر لکھنے اور قرآن و حدیث سے اُس کی تطبیق کرنے کا ارادہ کیا۔ مطلب یہ تھا کہ اصول اسلام اور اصول اہل کتاب میں جہاں تک ممکن ہو مطابقت ثابت کی جائے اور جہاں جہاں اختلاف پایا جائے وہاں اختلاف کی وجہ بیان کی جائے۔ اسلام کی نسبت جو بدگمانیاں عیسائیوں کو ہیں وہ رفع کی جائیں اور مسلمان جو موجودہ بائبل کو مطلقاً استناد کے قابل نہیں سمجھتے اور اُس میں تحریف لفظی کے قائل ہیں اس غلطی کو دور کیا جائے۔ ان کو بائبل اور اُس کی تفسیروں وغیرہ کے مطالعہ سے اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ بائبل کی تفسیر بالکل حدیث اور قرآن کے مطابق ہو سکتی ہے۔

یہ کام نہایت مشکل تھا اور سلف میں کسی نے کبھی ایسا ارادہ نہیں کیا تھا۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ نہ کسی کو پہلے اس زمانے کی کسی ضرورت پیش آئی تھیں اور نہ اگلے زمانے میں آج کل کا سامان اور میٹریل میسر آسکتا تھا یا اینہم یہ کام دشواریوں سے خالی نہ تھا۔ انھوں نے صرف اس تفسیر کے چھاپنے کو کئی ہزار روپیہ کا پریس رزک سے منگوا یا اور اردو ٹائپ کے علاوہ عبرانی اور انگریزی ٹائپ کے حروف بھی منگوائے۔ ابھی کام شروع ہونے نہیں پایا تھا کہ ان کی بدلی غازی پور کی گئی۔ وہ تمام سامان اپنے ساتھ غازی پور لے گئے اور وہاں اس کام میں نہایت سرگرمی اور توجہ کے ساتھ مصروف ہوئے۔

غازی پور میں انھوں نے سالم نام ایک یہودی کو نوکر رکھا اور اُس سے عبرانی پڑھنی شروع کی۔ غازی پور کے ضلع میں جو مولوی عنایت رسول صاحب چڑیا کوٹی ایک بہت بڑے عالم عربی اور عبرانی کے ہیں ان کی اعانت سے سرسید کے ارادے کو اور بھی زیادہ تقویت ہوئی۔ الغرض عہد عتیق میں سے

کتاب پیدائش کے گیارھویں باب تک اور عہد جدید میں سے انجیل منی کے پانچویں باب تک تفسیر اسی التزم کے ساتھ جس کا انھوں نے ارادہ کیا تھا، لکھی گئی اور ساتھ کے ساتھ چھپتی بھی گئی جو کچھ سرسید لکھتے تھے اس کا ترجمہ انگریزی میں ایک یورپین جس کو سورہ وپیہ ماہولہ تنخواہ دیتے تھے، ہر روز دو گھنٹے کرنا تھا۔ وہ ترجمہ بھی اردو کے ساتھ چھپتا تھا۔ ایک کالم میں عبرانی تورات کی عبارت عبری خط میں اور اُس کا ترجمہ اردو اور انگریزی ترجمہ اُس کے پیچھے لکھا جاتا تھا دوسرے کالم میں اسی مضمون کی کوئی آیت قرآنی یا حدیث اور اس کا ترجمہ اردو اور انگریزی اُس کے پیچھے لکھا جاتا تھا۔ اس کے بعد تفسیر لکھی جاتی تھی۔ اس کتاب میں تفسیر شروع کرنے سے پہلے سرسید نے دس مقدمے جن میں سے اکثر بہت طولانی ہیں، بڑی محنت اور تحقیق اور تلاش سے لکھے ہیں جن میں مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کے لیے نہایت عمدہ اور قیمتی اطلاعات مندرج ہیں۔ یہ مقدمے درحقیقت تمہید ہیں اُس مذہبی تشافر کے دور کرنے کی جو دونوں قوموں کے تعصب لاعلمی اور ایک دوسرے کے مذہب سے ناواقفیت کے سبب طرفین کے دلوں میں روز بروز بڑھتا جاتا تھا اور مستزلہ بنیاد کے ہیں ایک ایسی تفسیر کے لیے جو بائبل پر اصول اسلام کے موافق لکھی جائے۔

ان مقدموں میں دکھایا گیا ہے کہ اہل اسلام کے نزدیک بھی انبیاء کا مبعوث ہونا ویسا ہی ضروری ہے جیسا اہل کتاب کے نزدیک ضروری ہے اور اہل اسلام بھی تمام اگلے نبیوں اور ان کی کتابوں اور صحیفوں پر ایمان لانا ویسا ہی ضروریات دین سے سمجھتے ہیں جیسے اہل کتاب سمجھتے ہیں۔ یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ جن اگلی کتابوں اور صحیفوں کا ذکر قرآن میں آیا ہے یہی کتابیں آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود تھیں، اور آج ان کتابوں کے معتبر اور غیر معتبر ہونے کا عقلی معیار مسلمانوں کے نزدیک بھی وہی امر قرار پاسکتا ہے جو عیسائیوں کے ہاں قرار پایا ہے۔ نیز محققین و اکابر اہل اسلام مثل امام اسمعیل بخاری امام فخر الدین رازی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی وغیرہ کے اقوال سے یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ جس طرح عیسائی کتب مقدسہ میں تخریف لفظی کے قائل نہیں ہیں اسی طرح محققین اہل اسلام بھی اس کے قائل نہیں ہیں اور جس قسم کی تخریف کو عیسائی محققوں نے تسلیم کیا ہے صرف اسی قسم کی تخریف آیات قرآنی اور احادیث نبوی سے کتب مقدسہ میں پائی جاتی ہے پھر جس قدر کوششیں یہودی اور عیسائی عالموں اور نیرنگوں نے عہد عتیق اور عہد جدید کی حفاظت، تنقید اور نصیح میں ابتدا سے آج تک کی ہیں ان کی تمام سہٹری اور جو ناسخ ان کوششوں پر مرتب ہوئے وہ مفصل بیان کیے ہیں۔ پھر ترجموں کا حال اور یہ کہ اختلاف تراجم سے اصل بائبل کا محرف ہونا لازم نہیں آتا نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے، پھر نسخہ کی بابت جو نزاع مسلمانوں اور عیسائیوں میں تھا اس کو محض نزاع لفظی پر محمول کیا ہے اور اس طرح اس بون بعید کو جو علمائے فریقین کے تعصب یا لاعلمی و ناواقفیت سے اسلام اور اصلی عیسائیت کے اصول میں پایا جاتا تھا اس کو بہت کچھ رفع کیا ہے۔ اس کے بعد ایک دوسرا چہ عہد عتیق پر اور دوسرا کتاب پیدائش پر لکھا ہے پھر تفسیر شروع کی ہے۔

یہ تفسیر اس لحاظ سے کہ اس میں تخریف لفظی کا انکار کیا گیا تھا اور نیز اس لیے کہ سرسید سے پہلے کسی مسلمان نے اس کے کھنڈے پر توجہ نہیں کی، موجودہ علمائے اسلام کے خلاف تھی اور اس وجہ سے کہ وہ اسلام اور خالص عیسائیت میں اتحاد ثابت کرتی تھی اور موجودہ عیسائیت کو جس

کی بنیاد تشریح، کفارہ اور تکذیب غاتم النبیین پر ہے غلط تعبیراتی ہے۔ عیسائیوں کے برخلاف تھی، نیز اس کے لکھنے، ترتیب دینے اور چھپوانے میں بجا انتہا محنت اور روپیہ صرف ہوتا تھا اور کتاب کے بکنے کی بالکل امید نہ تھی۔ ان وجوہات سے وہ آگے نہ چل سکی۔ اگرچہ اس بات کا افسوس ہے کہ یہ تفسیر پوری نہ ہو سکی اور سرسید کا ایک نہایت مفید اور ضروری کام ادا ہوا رہ گیا مگر جو مقاصد اس تفسیر کے ذریعے سے بیان کرنے منظور تھے ان میں سے بعض اہم اور ضروری مقصد خطبات احمدیہ میں کمال شرح و بسط کے ساتھ بیان ہو گئے ہیں، جیسے ایسا نے سابقین کی پیشین گوئیاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت یا مسئلہ زواج یا مسئلہ طلاق وغیرہ۔

عیسائیوں کے ساتھ زبانی یا تحریری مباحثہ کرنے کا مخصوص طریقہ جو مسلمانوں میں غدر سے پہلے جاری تھا، اس کا نتیجہ اگرچہ ایک لحاظ سے مسلمانوں کے حق میں بہت اچھا ہوا کہ مسلمان اور قوموں کی طرح مشنریوں کے زیادہ شکار نہیں ہوئے، مگر عیسائیوں کے دل میں اسلام کی طرف سے کوئی عمدہ خیال پیدا نہ ہوا، وہ اسلام کو بدستور ظلم، خونریزی، تعصب اور دیگر برائیوں کا سرچشمہ سمجھتے رہے اور مسلمانوں کو عیسائیوں کا دشمن اور عیسائی قوم کی حکومت کا بدخواہ خیال کرتے رہے۔ پس جس طرح مسلمانوں کو مشن کی زد سے بچانے کے لیے مناظرہ کا طریقہ جاری رکھنا ضروری تھا اسی طرح یہ بھی ضروری تھا کہ مناظرہ کے مخصوص طریقہ کو چھوڑ کر راستی اور صلحت کا طریقہ اختیار کیا جائے اور عیسائیوں کو دکھایا جائے کہ دنیا میں اگر کوئی مذہب عیسائی مذہب کا دوست ہو سکتا ہے تو وہ صرف اسلام ہی ہو سکتا ہے اور بس ظاہر ہے کہ اس مطلب کے حاصل ہونے کے لیے کوئی طریقہ اس سے بہتر نہ تھا کہ

توریت اور انجیل کی تفسیر ایک مسلمان کے ہاتھ سے لکھی جائے اور جو امور
 فی الواقع دونوں مذہبوں میں مابہ الاجتماع یا مابہ الافراق ہیں ان کو اپنی اپنی جگہ
 صاف طور پر بیان کیا جائے اور اس طرح اس بیگانگی اور وحشت کو جو دونوں
 قوموں کی غلط فہمی سے پیدا ہو گئی ہے رفع کیا جائے۔ سید احمد خاں پہلے
 شخص ہیں جن کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا مگر چونکہ اس کا پورا کرنا بغیر قوم کی
 تائید کے ان کی طاقت اور بولتے سے باہر تھا۔ اس لیے وہ اپنے منصوبے
 کو پورا نہ کر سکے، مگر چونکہ ان کے زبردست ہاتھوں سے تیار ہو گیا ہے اس
 کے موافق اس تفسیر کا پورا کرنا اب ویسا مشکل نہیں رہا جیسا ابتدا میں نظر آتا تھا
 جان میولسن آرنلڈ نے اپنی کتاب قرآن اینڈ بائبل مطبوعہ ۱۸۶۶ء میں
 سرسید کی ایک چھٹی چھاپی ہے جو انھوں نے اپنی تفسیر کی پہلی جلد کے متعلق
 مصنف موصوف کی چھٹی کے جواب میں ان کے پاس بھیجی تھی۔ چونکہ اس چھٹی
 سے تفسیر مذکور کے لکھنے کا اصل منشا اور اس کی نسبت مسلمانوں اور عیسائیوں
 کے خیالات جو اس وقت تھے اور خود سرسید کا اپنے ارادہ پر ثابوت قدم رہنا
 اور لوگوں کی مخالفت کا کچھ خیال نہ کرنا، بخوبی واضح ہوتا ہے اس لیے یہاں
 اس کا نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔

وہ جان میولسن آرنلڈ کو لکھتے ہیں کہ ”بے شک آپ کا خیال صحیح ہے کہ
 کسی مسلمان نے آج تک بائبل مقدس کی تفسیر نہیں لکھی۔ خواہ کچھ ہی وجوہ
 ہوں جن کی وجہ سے ہمارے آبا و اجداد نے اس کام کو نہیں اٹھایا مگر جو سرکہ
 موجودہ زمانے کے ہندوستانی مسلمانوں کو اس کام سے مانع رہا ہے اور بہت
 کچھ مانع رہا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان عیسائی مذہب کی کتابوں کو ہمیشہ ایک بیچارہ
 اور لغو اور جھوٹ قصوں کا مجموعہ سمجھتے اور یقین کرتے رہے ہیں اور ان کے

اس مضر یقین کو اکثر اوقات بعض پادریوں کی ناعاقبت اندیشی اور بے سمجھی کے دلائل سے بہت قوت اور مدد ملی ہے ان دلائل سے بجز اس کے کہ جانہین ہیں ناپسندیدہ جھگڑا اور تعصب اور مخالفت اور دشمنی پیدا ہو اور دونوں کے دل بڑے ہوں، اور کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوتا۔

وہ جب کہ فریقین کی یہ حالت ہو تو آپ آسانی خیال کر سکتے ہیں اور نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اگر کوئی مسلمان ایسی تصنیف کرے جس کا مقصد انجیل مقدس کی تفسیر لکھنا، اس کی تائید کرنا اور اس کو آسمانی کتاب ماننا ہو تو اس کی حالت اور منزلت اس کے ہم مذہب لوگوں میں کیا ہوگی؛ بلاشبہ اس سے سب لوگ متنفر ہوں گے اور اس کو برا کہیں گے یہی حالت میری ہوئی، اس کام کے شروع میں میرے ساتھ بھی یہی برتاؤ ہوا، مگر میں نے ان کی بے جا تضحیک، بے بنیاد دھمکیوں اور اسی قسم کی زیادتیوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا، اور اس بات کے کہنے میں جس کو میں حق سمجھتا تھا، کسی چیز سے اندیشہ نہیں کیا، جو انعام کہ مجھ کو عیسائیوں سے میرے کام کے آغاز میں ملا وہ بھی اس سے کم نہ تھا جو میرے ہم مذہبوں نے مجھ کو دیا، مگر خدا کا شکر ہے کہ میری تفسیر کا اول حصہ چھپنے کے بعد مسلمانوں کو معلوم ہو گیا کہ جو کچھ میں انجیل کی تائید میں لکھتا تھا وہ خود قرآن پاک اور دیگر مستند کتابوں کی بنا پر تھا، بہت سے میری تعریف کرنے لگے اور انجیل مقدس پر اعتقاد رکھنے اور اس کا ادب کرنے میں میرے ہم خیال ہو گئے، اور بہت سے توہمات اور خیالات فاسدہ جو ان کو انجیل کی بابت مدتوں سے تھے کم ہو گئے جیسا کہ آپ کو ذیل کے فقرات سے معلوم ہو گا جن کو میں ایک بڑے مولوی نے

کے خط سے جو میرے نام تھا، نقل کرتا ہوں" میں نے آپ کی تفسیر کو بڑھاؤ میں بر ملا اقرار کرتا ہوں کہ بلاشک وہ بے مثل کتاب ہے اور مذہب اسلام کی تائید اور حمایت کرتی ہے۔ خدا کا شکر ہے اور بے حد شکر ہے کہ اس زمانے میں آپ ایک ایسے شخص ہیں جو راہِ راست کی رہنمائی کرتے ہیں۔ آپ کی تصنیف ہر سہ تشبہ کو ٹپھی جاتی ہے اور اس کے قابل تعریف فقروں کو پڑھنے سے خدا کا شکر اور آپ کے واسطے دعا دل سے نکلتی ہے۔"

"یا بٹل مقدس میں بعض مقامات ایسے ہیں جن کی وجہ سے مسلمان اس سے بہت بد اعتقاد ہو گئے ہیں۔ مثلاً امیرِ ایم علیہ السلام کی طرف مصر میں جھوٹ بولنے کی نسبت کرنا، عیسائی مفسروں نے ان مقامات کی پوری تفسیر نہیں لکھی لیکن میں برخلاف ان کے کہتا ہوں کہ خود یا بٹل سے ان فقروں کے یہ معنی نہیں نکلتے جو عموماً مانے جاتے ہیں اس بنا پر مجھ کو امید ہے کہ سیری تفسیر کا دوسرا حصہ پھیننے کے بعد مسلمانوں کا تعصب یا بٹل کے ساتھ بہت کم ہو جائے گا۔"

"با اینہم مجھ کو یقین ہے کہ میری زندگی میں تمام مسلمانوں کی گلابیوں اور نفرت سے مجھے نجات ملے گی۔ عیسائی بھی میری تفسیر سے خوش نہیں ہو سکتے کیونکہ جس طرح میں انجیل کی تعلیم کو صحیح اور درست سمجھتا ہوں اسی طرح تثلیث کے مسئلہ کا قائل نہیں ہوں اس لیے کہ میں انجیل میں اس مسئلہ کی تائید یا وجود نہیں پاتا ہوں۔ مجھ کو یقین ہے کہ مذہبِ اسلام صحیح ہے اور اس کی صحت اور وجود دونوں انجیل سے ثابت ہیں۔ اس لیے مجھے کچھ پروا نہیں کہ میں کسی گروہ کے لوگوں کو خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائی خوش کروں، میں حق پر ہوں

۱۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو کام سرسید نے اس تفسیر لکھنے کے بعد عام مسلمانوں کے خیالات کے برخلاف کیے، وہ سب نے پہلے ہی سے ان کے مضمون خاطر تھے ۱۲۔

اور اُس خدا کو خوش کرنا چاہتا ہوں جس کے روبرو سب کو ایک دن جاننا ہے۔ البتہ میری یہ خواہش رہی ہے کہ مسلمان اور عیسائیوں میں محبت پیدا ہو کیونکہ قرآن مجید کے موافق اگر کوئی فرقہ ہمارا دوست ہو سکتا ہے تو وہ عیسائی ہیں۔ میری یہ خواہش اُن چند رسالوں کے پڑھنے سے آپ پر بخوبی ظاہر ہو جائے گی جو میں نے اس باب میں لکھے ہیں اور جن کو اب آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ میں نے آپ کے نام اپنی تفسیر کا پہلا حصہ بھی روانہ کیا ہے جس کا قبول کرنا میری عزت افزائی کا باعث ہو گا۔ دوسرا حصہ جب تیار ہو جائے گا آپ کی خدمت میں ارسال ہو گا۔

”یقیناً میں بھی ہائیل کا اتنا ہی طرفدار اور موید ہوں جس قدر کہ آپ ہیں۔ میرا قصد ہے کہ میں ڈاکٹر کلنز کے اعتراضات کا یعنی تفسیر کے مناسب حصوں میں بہت اُن کا موقع آئے جواب دوں۔“

جان میولسن آرنلڈ سرسٹیک کی یہ چٹھی اپنی کتاب میں نقل کر کے اُس پر یہ ریمارک کرتے ہیں کہ ”اگر یہ خیالات عام ہو جائیں اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں میں پھیلنے جاتے ہیں تو اُن کی وجہ سے وہ نہ صرف وفادار ہو جائیں گے بلکہ رفتہ رفتہ وہ دشمنی جو اسلام کے پھیلنے سے قوموں میں ہو گئی ہے، دور ہو جائے گی یہ تفسیر جو انجیل کو بجائے لغو سمجھنے کے، جیسا کہ اب تک خیال تھا واجب التعلیم بیان کرتی ہے۔ اور اُس کا ثبوت خود قرآن سے دیتی ہے۔ اس قابل ہے کہ اُس کا ترجمہ مسلمانوں کی ہر زبان میں اور بالخصوص عربی میں ہو کیونکہ مسلمانوں کے واسطے اس سے زیادہ مفید اور کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ وہ انجیل کو اُسی عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں جس نگاہ سے کہ وہ قرآن پاک کو دیکھتے ہیں۔“

اس کے بعد جان میلسن آرٹلڈ نے ایک ایسا فقرہ لکھا ہے جس پر بے اختیار مہنسی آتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "اگر یہ کام مسلمانوں ہی کے ہاتھ سے ہو جائے تو پھر عیسائیوں کو یہ ثابت کرنا کچھ دشوار نہ ہوگا کہ اگر انجیل صحیح ہے تو (نعوذ باللہ) قرآن ضرور جھوٹ ہے۔" معلوم نہیں کہ یہ نتیجہ انہوں نے کہا سے نکالا؟ اگر وہ ذرا غور اور اسمان نظر کو کام فرماتے تو یہ نتیجہ ہرگز نہ نکالتے بلکہ یہ کہتے کہ اگر انجیل اور قرآن میں مطابقت ثابت ہوگئی تو مسلمانوں کو یہ ثابت کرنا دشوار نہ ہوگا کہ اگر انجیل صحیح ہے تو موجودہ عیسائی مذہب بالکل غلط اور انجیل کے برخلاف ہے۔ سولہ برس کا عرصہ ہوا کہ مصر میں ایک عیسائی عالم نے جس کا نام کرسٹوفر جیبارہ ہے اور جدوہاں کے مشہور عیسائی اخبار شہادۃ الحق کا ایڈیٹر ہے، مذاہب ثلاثہ یعنی یہودیت، عیسائیت اور اسلام کی آسمانی کتابوں پر غور کر کے یہ رائے قرار دی تھی کہ فی الحقیقہ تینوں مذہبوں اور تینوں کتابوں کی توفیق اور تطبیق ہو سکتی ہے اور ان میں کوئی اصلی اور حقیقی اختلاف نہیں ہے چنانچہ اس نے اسی موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام وحدۃ

الادیان و وحدۃ الایمان فی التورۃ والا انجیل و القرآن ہے۔ اس کتاب میں اس نے تینوں فرقوں کے مذہبی عقائد میں توفیق و تطبیق کی ہے اور اس کی رائے ہے کہ عموماً اختلاف غلط فہمی سے ہوا ہے۔ اس نے اس کتاب میں بھی لکھا ہے کہ تثلیث کا مسئلہ بائبل میں کہیں نہیں ہے، اس لیے عیسائیوں کی برٹ و ہرمی ہے کہ مسلمانوں کے عمدہ عقیدہ توحید کو نہ مانیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن اور بائبل کی مطابقت کا پہلا نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ عیسائی مذہب کا جس کی بنیاد تثلیث پر ہے بالکل خاتمہ ہو جائے۔

آج کل ایک اور اخبار موسوم بہ اتحاد اسلامی موسیو کلا میل ایک فرینچ

بیرسٹرنے مصر میں جاری کیا ہے جس کا ایک کالم عربی میں اور دوسرا اسی مضمون کا
فرینچ میں ہوتا ہے اور جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ عیسائیوں اور مسلمانوں میں جو
مذہبی اور پولیٹیکل غلط فہمیاں مدت سے چلی آتی ہیں اور جنہوں نے ان کے سوشل
اور پولیٹیکل تعلقات میں تلخی پیدا کر دی ہے ان کو رفع کیا جائے اور اسی لیے اس
نے اخبار مذکور ایسی دو زبانوں میں شائع کیا ہے جو تقریباً دنیا کے تمام حصوں میں
کم و بیش بولی یا سمجھی جاتی ہیں۔ پس جو ضرورت کہ اس فرانسیسی عالم کو اب محسوس
ہوئی ہے اس کو سرسید نے اب سے ۳۵ برس پہلے بخوبی ذہن نشین کر لیا تھا۔ اور
یہ بات ایک ہندوستانی مسلمان نے جس نے ایک قدیم اسلامی دارالافتاء
کی سوسائٹی میں نٹو و نما اور سپرانے اسکول میں تعلیم پائی ہو، کچھ کم تعجب انگیز نہیں
فرانس کا مشہور اور نیشنلسٹ گارساں دناسی جس نے اردو لٹریچر کی تحقیقات
میں عمر صرف کی تھی، وہ ۱۸۸۳ء کے لکچر میں سرسید کی اس تفسیر کی نسبت لکھتا
ہے: "ایک نئی کتاب جس کی طرف میں توجہ دلاتا ہوں وہ سید احمد خاں کی
تصنیف ہے جو زمانہ حال کے ہندوستانی مصنفوں میں سب سے زیادہ
مشہور مصنف ہے۔ یہی وہ مصنف ہے جس کی کتاب آثارالصنادید کا میں نے
پیرس کے ایشیاٹک جرنل میں ترجمہ کیا تھا۔ میں نے اس کتاب (یعنی تیسرا کلام)
کے عنقریب چھپنے کے پہلے خبر دی تھی اور اب میں خوشی سے اطلاع دیتا
ہوں کہ اس کا پہلا حصہ چھپ گیا ہے جس کا ایک کاپی میرے پاس موجود ہے
جو مصنف نے مہربانی کر کے مجھے ہدیہ بھیجی ہے۔ اس کتاب سے صرف
یہی نہیں پایا جاتا کہ سید احمد خاں کو قرآن شریف اور سہاری کتب مقدمہ کا
پورا پورا علم ہے بلکہ بہت سی ایشیائی تصنیفات اور طرقہ تدریس کہ بہت سی
یورڈین تہمانیف سے ان کو پوری پوری واقفیت ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔

کہ ان سب کو اٹھوں نے غور و غوض کے ساتھ مطالعہ کیا ہے مگر تعجب کی بات ہے کہ اس قدر یورپ کی تصانیف تک ان کو کس طرح رسائی حاصل ہوئی حقیقت میں یہ کتاب وسیع علم کا نتیجہ ہے اور میں اپنے تئیں مبارکباد دیتا ہوں کہ یہ کتاب اس زبان میں لکھی گئی ہے جس کا سکھانا میرا فرض ہے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ یہ پہلا ہی موقع ہے کہ کسی مسلمان نے نہ صرف اردو میں بلکہ ایشیا کی کسی زبان میں اس موضوع پر ایسی مبسوط اور مکمل بحث کی ہو۔

بی بی کا انتقال

۱۳۶۸ھ ہجری مطابق ۱۸۶۱ء میں سرسید کی بی بی کا انتقال ہوا آباد ہی میں ہو گیا جنھوں نے سید عابد اور سید محمود دو بیٹے اور ایک بیٹی صغیر سن چھوڑی تھی۔ اس وقت سرسید کی عمر چوبیس برس کی تھی اور قوائے جسمانی نہایت عمدہ تھی۔ ان کے دوست نہایت اصرار کرتے تھے کہ دوسری شادی کہ لو اور نینر تقاضائے سن بھی یہی تھا مگر جو تعلق کہ ان کو بی بی کے ساتھ ان کی زندگی میں تھا اس کے نباہ کا خیال اور صغیر سن اولاد کی پرورش کا خیال اور سب سے زیادہ وہ بڑے بڑے ارادے جن کی دھن اس زمانے میں ان کو لگی ہوئی تھی اس امر سے مانع رہے اور اپنی تمام باقی زندگی محض تہجد میں کمال سعادت و پارسائی کے ساتھ گزار دی اور اپنے تمام قوائے اور اپنی عمر کا افضل ترین حصہ قومی خدمات کے لیے وقف کر دیا۔

غازی پور کی بدلی اور اول و ہاں سائنٹفک سوسائٹی قائم کرنا

۱۲ مئی ۱۸۶۳ء کو سرسید کی تبدیلی مراد آباد سے غازی پور کو ہو گئی، ہم اوپر لکھ رہے ہیں یہ شخص پیرس کی یونیورسٹی میں اردو لٹریچر کا پروفیسر تھا اور ہمیشہ اس سبکدست پر لکھ دیا کرتا تھا:

آئے ہیں کہ انتظام قحط کے بعد ان کو ایک بہت بڑا یتیم خانہ کھولنے کا خیال ہوا تھا اور قحط سے پہلے وہ متعدد تدبیریں ملک اور قوم کی بھلائی کی کر چکے تھے مگر بہت جلد یہ سب خیالات ان کے دل سے محو ہو گئے، ان کو سچستہ یقین ہو گیا کہ جب تک ہندوستان میں عام طور پر علم کی روشنی نہ پھیلے گی اس وقت تک ہندوستانیوں کی بھلائی کی تمام تدبیریں بیکار اور فضول ہیں، باوجودیکہ وہ خانہ پورہ میں سرکاری کاموں کے علاوہ بہت سا وقت تبیینِ اکلام کی ترتیب اور اس کے چھپوانے کے اہتمام میں جو نہایت سخت کام تھا، صرف کرتے تھے۔ اسی حالت میں انھوں نے ایک اور تدبیر اپنے ہوطنوں کی بھلائی کی سوچی، انھوں نے خیال کیا کہ ملک میں علوم جدیدہ کی عام اشاعت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ علمی کتابیں ویسی زبان میں ترجمہ نہ کی جائیں انھوں نے اس بات کو انگریزی تعلیم کے پھیلانے سے بھی زیادہ ضروری اور مقدم سمجھا، کیونکہ مسلمان انگریزی پڑھنے کو گناہ سمجھتے تھے اور مسلمانوں کے سوا اور قوموں کے لیے بھی کوئی ایسی ترغیب نہ تھی جس سے وہ انگریزی تعلیم کی طرف مائل ہوں۔ تمام عدالتوں میں ویسی زبان مروج تھی، اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں کے لیے جو اس وقت تک ہندوستانیوں کو مل سکتے تھے مشرقی زبانوں کی تعلیم کافی تھی جن اعلیٰ عہدوں کے لیے انگریزی تعلیم کی ضرورت تھی اگرچہ ملکہ معظزہ کے اشتہار میں ان کے ملنے کی ہندوستانیوں کو امید دلائی گئی تھی مگر ابھی تک عملی طور پر ان وعدوں کا چنداں ظہور نہ ہوا تھا۔

سر سید کو یہ خیال ہوا کہ مسلمان جو انگریزی تعلیم سے نفرت اور وحشت

کرتے ہیں اور ہندو جو انگریزی تعلیم کو معض لاکری کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ دونوں کے دل میں انگریزی تعلیم کا نقش جمانے کے لیے ضروری ہے کہ کچھ علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائی جائیں تاکہ مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کی وقعت ان کے دل میں پیدا ہو۔ اس کے علاوہ ان کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں میں جوں اور ربط و اتحاد پیدا ہو جس کا نہ ہونا انگریزوں اور ہندوستانیوں کے حق میں نہایت مضر ثابت ہو چکا تھا اور یہ تمام مقصد بغیر اس کے کہ ایک سوسائٹی قائم کی جائے جس کے ممبر انگریز اور ہندوستانی ہوں اور جو سائنس اور انجمنش لٹریچر کی کتابیں اردو میں ترجمہ کرا سکے، کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔

۱۸۹۳ء میں انھوں نے ایک تحریر اس عنوان سے کہ "اتھاس ہندوستان ساکنان ہندوستان در باب ترقی تعلیم اہل ہند" چھاپ کر مشہر کی جس کا خلاصہ مضمون یہ تھا کہ ہندوستان میں علم کے پھیلانے اور ترقی دینے کے لیے ایک مجلس مقرر کرنی چاہیے جو اپنے قدیم مصنفوں کی عمدہ کتابیں اور انگریزی کی مضید کتابیں اردو میں ترجمہ کرا کے چھاپے۔ اس کے بعد وہ عملی طور پر لوگوں کو ادھر ماٹل کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ غرض کہ اسی سبب میں سائنٹفک سوسائٹی غازیپور میں قائم ہو گئی، تمام قواعد منضبط کیے گئے۔ ڈیوک اوف آر گائل جہاں اس وقت وزیر ہند تھے انھوں نے سوسائٹی کا پٹیرن ہونا منظور کیا اور ڈیرینڈ صاحب لفٹنٹ گورنر شمال مغرب اور مکلوڈ صاحب لفٹنٹ گورنر پنجاب و ایس پیٹرن قرار پاسے، اور دوسرا دراز صولوں کے بہت سے رئیس اور ذی عزت ہندو اور مسلمانوں نے اس کی ممبری قبول کی اور غازیپور میں ترجمہ کا کام باقاعدہ طور پر شروع ہو گیا۔

سرسید نے جو اس سوسائٹی کے آنریری سکریٹری قرار پائے تھے اور حقیقت وہی اس کا ہیولی اور وہی اُس کی صورت تھے، سوسائٹی کے اعراض اور مقاصد مشتمل کرنے اور اس کے ساتھ پبلک کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے کلکتہ کا سفر اختیار کیا اور ۶ اکتوبر ۱۸۸۳ء کو مجلس مذاکرہ علیہ میں ایک لمبا لکچر فارسی زبان میں سوسائٹی کے مقاصد پر دیا جو ان کی اردو اسپچوں اور لکچروں کے ساتھ چھپ گیا ہے اور کلکتہ سے آتے جاتے جس شہر میں ان کا گزر ہوا وہاں سوسائٹی کا چہرہ چا گیا۔

غازی پور میں مدرسہ قائم کرنا

اسی سنہ میں انھوں نے غازی پور میں ایک مدرسہ قائم کرنے کی فکر کی، اگرچہ ضلع غازی پور کے اکثر ہندو مسلمان رئیسوں کی خودیہ خواہش تھی کہ غازی پور میں ایک مدرسہ قائم ہوا، لیکن اول تو کوئی شخص ایسا نہ تھا کہ مدرسہ کے انتظام اور حفاظت زرچندہ کی طرف سے لوگوں کو مطمئن کرے دوسرے مسلمانوں عموماً انگریزی کے نام سے بدکتے تھے سرسید نے ان دونوں مشکوں کو حل کیا اور تھوڑا تھوڑا چنندہ جمع ہونے لگا، اس مدرسہ کی عمارت اور اس کے قیام کے لیے اسی ہزار کا تخمینہ ہوا تھا، جب چندہ کی مقدار سترہ ہزار تک پہنچ گئی تو اول مدرسہ کے لیے ایک مکان بنا تجویز ہوا اور ۱۸۶۴ء میں ایک عام مجمع میں جس میں ہندوستانی اور تمام ضلع کے حکام شریک تھے، اس کی بنیاد کا پتھر رکھا گیا اور تعمیر شروع ہو گئی۔

اس موقع پر سرسید نے ایک لمبی اسپچ دی تھی جو ان کی اسپچوں اور لکچروں کے ساتھ چھپ گئی ہے یہاں ہم صرف وہ جملے جو بنیاد کا پتھر رکھے جانے کے بعد ان کی زبان سے نکلے تھے، نقل کرتے ہیں، "اے خدا کے

بند و خدا کی مناجات کرو۔ خدا کے نام کی مدح کرو۔ خدا کا نام اس دم سے لے کر
 مبارک ہوئے۔ آفتاب کے مطلع سے لے کر اس کے مغرب تک خدا کا نام
 ممدوح ہو۔ ہمارا خدا غریبوں کو خاک سے اٹھاتا ہے۔ محتاجوں کو کوڑے پر
 سے اٹھا کر بلند کرتا ہے۔ ہم کو اپنے خدا سے محبت رکھنی چاہیے۔ اس نے
 ہماری آواز سنی۔ اُس نے ہماری غریبی اور درماندگی پر نظر کی سو جب تک ہم
 جیتے ہیں ہمارا بدن اور ہماری جان اور ہمارا دل اور مرنے کے بعد ہماری روح
 خدا کی ستائش کرے گی۔“

” اے خدا ہم میں روز بروز علم کی کمی اور جہالت کی تاریکی کی ترقی ہوتی جاتی
 تھی، تو نے ہمارے دلوں کو پھیرا کہ ہم علم کی روشنی پھیلانے پر مستعد ہوئے
 بے شک سب کے دل تیری انگلیوں میں ہیں جس طرف تو چاہتا ہے پھیرتا ہے
 ہم سب تیرا شکر کرتے ہیں کہ تو نے ہمارے دلوں کو ایسے کاموں کی طرف
 پھیرا جو صرف ہمارے ہی لیے مفید نہیں بلکہ ہمارے بعد جو بہت سی نسلیں آنے
 والی ہیں اُن کے لیے ایک روشنی ہے، تیرے سوا کسی کا مقدر نہ تھا کہ ہمارے
 دلوں کو جو تمام تر گنہوں اور بُرائیوں میں پھنسے ہوئے ہیں ایسے نیک کام کی
 طرف پھیرتا اے خدا تو خوب جانتا ہے کہ یہ مدرسہ جس کا پتھر آج ہم نے تیرے
 نام پر رکھا ہے، تیری غریب مخلوق کے فائدے کے لیے رکھا ہے، تو اپنے
 فضل سے اپنے نام پر اس کو قبول کر اور جیسا کہ تو نے خوبی سے اس کا آغاز
 کیا ہے اسی طرح بخیر اس کا انجام کر۔ *وَبِنَا قَبْلُ مَنَا اِنَّكَ اَنْتَ السَّامِعُ الْعَلِيمُ۔*

یہ مدرسہ بھی مثل مدرسۃ العلوم کے محض قومی چندہ سے سیلف ہیلتھ کے
 اصول پر قائم کیا گیا تھا اور اُس کی ابتدا ڈاکٹر وائٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ
 اس کو ایک بڑا کالج بنانے کا ارادہ تھا۔ راجہ ہر دیو نرائین سنگھ اُس کے پٹرن

اور وزیر قرار دیئے گئے تھے۔ متعدد کمیٹیاں اُس کے انتظام کے لیے قرار پائی تھیں۔ انگریزی، اردو، فارسی، عربی اور سنسکرت پانچ زبانوں کی تعلیم کا اس میں انتظام کیا گیا تھا۔ اگر سرسید کا چند سال وہاں اور قیام ہوتا تو کچھ عجیب نہیں کہ وہ کالج کے درجہ تک پہنچ جاتا۔ مگر اسی سال یعنی ۱۸۶۴ء ہی میں اُن کی تبدیلی علیگرہ کی ہو گئی یا اینہد اُس کی بنیاد ایسے مستحکم اصول پر رکھی گئی تھی کہ وہ مدرسہ آج تک وکٹوریہ اسکول کے نام سے غازی پور میں جاری ہے اور ہائی اسکول تک کی پڑھائی اسی میں برابر ہوتی ہے۔

غازی پور سے علیگرہ تبدیل ہونا

۱۸۶۴ء میں سرسید غازی پور سے تبدیل ہو کر علیگرہ میں جس کی عزت اور شہرت خدا تعالیٰ نے ان کی ذات سے وابستہ کی تھی، آگئے۔ چونکہ غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کا ان کی غیبت میں چلنا ناممکن تھا۔ اس لیے سوسائٹی کا تمام سامان اور اثاثات وہ اپنے ساتھ علیگرہ میں لے آئے اور مسٹر ولیم جنکس بریلی جو اُس زمانہ میں علیگرہ کے جج تھے سوسائٹی کے پریسڈنٹ قرار پائے۔ اُن کی توجہ سے سوسائٹی کے کاروبار کو نہایت ترقی ہوئی، ہندوستانی اور یورپین ممبروں کی تعداد بہت بڑھ گئی اور سوسائٹی کے لیے ایک مستقل مکان بننے کی تجویز ہوئی جو اس وقت تک ایک عالیشان عمارت و لکشاچن اور وسیع احاطہ کی صورت میں موجود ہے اور تقریباً تیس ہزار کی لاگت سے خاص سرسید کے اہتمام اور نگرانی میں تیار ہوا ہے۔ اس کی بنیاد کا پتھر آرمیبل ڈائمنڈ لفٹنٹ گورنر اضلاع شمال مغرب کے ہاتھ سے رکھوایا گیا تھا چنانچہ دو کتے ہزار آرمیبل مسٹر بریلی جج علیگرہ کے نام کے اُس کے سب سے بڑے

ہال میں اب تک لگے ہوئے ہیں۔

۱۳۔ فروری ۱۸۶۶ء کو مسٹر ولیمس کسٹنر قسمت میرٹھ کے ہاتھ سے اُس کے افتتاح کی رسم ادا ہوئی۔ صاحب فمدوح نے افتتاح کے وقت جو تقریر کی تھی اُس کے چند جملے یہاں نقل کیے جاتے ہیں انہوں نے کہا کہ سید احمد خاں کے اس کام کی عظمت میں مبالغہ کرنا فضول ہے، تم سب صاحبوں کو معلوم ہے کہ یہ انھیں کا کام ہے اور وہی اس جلسہ کے بڑی ترقی دینے والے ہیں اور اس عمدہ عمارت کے جس کے کھولنے کے لیے ہم سب جمع ہوئے ہیں وہی بانی ہیں..... اخیر کلام میرا یہ ہے کہ سید احمد خاں نے جو محبت لوگوں کے ساتھ ظاہر کی ہے سب کے دلوں پر اُس کا اثر ضرور ہوگا۔ خدا کرے کہ یہ انسٹیٹیوٹ اس بات کا سبب ہو کہ ہم سب ہندوستانی اور انگریز ایسے بھلے کاموں میں دل سے شریک ہوا کریں اور یہی سید احمد خاں کی بڑی خواہش ہے۔ پس آؤ ہم سب اُن کی مدد کریں اور اُن کا شکر بھی ادا کریں اے خدا! اس انسٹیٹیوٹ کو سرسبز کر۔

اس مکان میں ہر مہینے متعدد جلسے ہوتے تھے اور مختلف مضامین پر جن کے لوگوں کو نئی نئی اطلاعات حاصل ہوتی تھیں، پکچر دیے جاتے تھے، ٹاکس کلکلی ہر مہینے ایک لکچر نچرل سائنس پر دیتے تھے اور علمی آلات سے جو کہ سوسائٹی میں موجود تھے حاضرین کو تجربے دکھانے تھے، مترجم، سرلوی، پریسمین چپراسی اور مالی وغیرہ تقریباً پانسو روپیہ ماہوار کے تنخواہ دار سوسائٹی میں ملازم تھے۔ چند برس کے عرصہ میں بہت مفید کتابیں سوسائٹی نے انگریزی سے ترجمہ کر کے چھاپیں مثلاً الفنسٹن کی تاریخ ہندوستان، رولن کی تاریخ مصر قدیم، تاریخ

۱۔ عمدہ ترجمہ ۲۲۵ روپیہ ماہوار اور عمدہ مطبع ۳۳۲ روپیہ ماہوار پاتا تھا اور رستی دا نظام مکان سوسائٹی

کیلے ۱۰ روپیہ ماہوار مقرر تھا، سوسائٹی اخبار مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۷۶ء جلد ۱۲ (۲)

یونان قدیم، اسکاٹ برن کا رسالہ علم قلاحت، بیلجیئم کا رسالہ سیاست مدن، ہرجان میلکم کی تاریخ ایران، ریورنڈ اکیسوس کی تاریخ چین کا فارسی ترجمہ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے سوا اخبار بھی مدت تک بہت کثرت سے اس سوسائٹی میں آتے رہے چنانچہ ۱۸۶۶ء میں ۱۸ اخبار اور بیگزین انگریزی اور ۲۶ اخبار اردو، فارسی، عربی، اور سنسکرت کے ہندوستان اور ممالک غیر سے یہاں آتے تھے۔

سر سید نے قطع نظر اپنی ذاتی کوشش اور محنت کے جس پر فی الحقیقہ سوسائٹی کا دار و مدار تھا اور علاوہ ڈونیشن اور سالانہ چندہ کے اور طرح طرح سے سوسائٹی کو فائدہ پہنچایا۔ اپنا ذاتی پرس جو انہوں نے آٹھ ہزار روپیہ خرچ کر کے تبیین الکلام کے چھاپنے کو خرید لیا تھا اور سوسائٹی کی تمام روٹیاں اور تمام انگریزی اور اردو کاغذات اسے اسی پر لیس میں پھپھتے تھے، جب تبیین الکلام کی چھپائی موقوف ہو گئی تو کل سامان پر لیس کا ایک عام جلسہ میں سوسائٹی کو مفت دیدیا چنانچہ جارج ہنری لارنس نے جو اس جلسہ میں چیئرمین تھے سر سید کی نسبت یہ الفاظ کہے کہ، "اگرچہ سوسائٹی سید احمد خاں کی فیاضی کی پہلے ہی سے مقروض ہے مگر اب اس احسان کو اس عالیشان عیلتے نے اور زیادہ کر دیا ہے، نواب سکندر بیگ صاحب مرحومہ رمیہ بھوپال نے جب یہ سنا کہ سید احمد خاں کی کوشش سے ہندوستانیوں کی بھلائی کے لیے یہ سوسائٹی قائم ہوتی ہے تو جون ۱۸۶۶ء میں انہوں نے بطور اظہارِ خیر خودی کے ایک الماس کی انگوٹھی قیمت ایک ہزار روپیہ خاص سر سید کے واسطے بھیجی، سر سید نے جلسہ عام میں وہ انگوٹھی سوسائٹی کے اخراجات کے لیے سوسائٹی کو دیدی، اس کے سوا انہوں نے محض سوسائٹی کی امداد کے لیے فوجداری اور کلکٹری کے محنتوں کو قانون پر لکچر دینا اختیار کیا اور جو نہیں ان سے وصول ہوتی رہی وہ سوسائٹی

کی نذر کرتے رہے۔

۳۰ دسمبر ۱۸۶۵ء کو انھوں نے سوسائٹی کی طرف سے گورنمنٹ شمال مغرب میں یہ درخواست بھیجی کہ سوسائٹی کا ارادہ ہے کہ اضلاع شمال مغرب کے طریقہ رشتہ کاری پر کتابیں تالیف کرے۔ اگر گورنمنٹ کچھ سالانہ امداد کرتی رہے تو سوسائٹی اس کے معاوضہ میں کتابیں دیا کرے گی اور کتابوں کا تالیف کرنا سرسید نے خود اپنے ذمے لیا۔ چنانچہ گورنمنٹ نے اگست ۱۸۶۵ء میں سوسائٹی سے پانسو روپیہ سالانہ کی کتابیں خریدنی منظور کر لیں۔ مگر یہ کتابیں لکھی نہیں گئیں، صرف مضامین کی طواری فہرست جو سرسید نے سوسائٹی میں پیش کی تھی وہ سوسائٹی اخبار کے پرچہ نمبر ۳۲ جلد اول میں درج ہے۔ اس فہرست کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک نہایت مشکل کام تھا اور اگر سرسید اس کے سرانجام دینے میں مصروف ہو جاتے تو ان کو مدت تک کسی اور کام کی فرصت نہ ملتی۔

برٹش انڈین ایسوسی ایشن

۱۰۔ مئی ۱۸۶۶ء کو سرسید کی تحریک سے بہت سے رئیس ضلع علیگڑھ اور اُس کے نواح کے اور چند یوروثین افسر سوسائٹی کے مکان میں جمع ہوئے اور سرسید نے ایک لمبی اسپچ کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ ”ہندوستانوں کو گورنمنٹ سے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے پارلیمنٹ سے تعلق پیدا کرنا چاہیے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی عداوت میں ٹبری وقت ہندوستان کو یہ تھی کہ اُس کے تقریباً تمام معاملات صرف کورٹ اور ڈائریکٹریٹ کے ہاتھ میں تھے اور پارلیمنٹ سے بہت ہی کم تصفیہ پاتے تھے۔ مگر اب حکومت ہندوستان

کی ملکہ معظمہ نے اپنے ہاتھ میں لی ہے اور اب ہندوستان کے امور ات کو زیادہ تر پارلیمنٹ سے تعلق رہے گا۔ پس اس غرض کے لیے کہ پارلیمنٹ کے ممبر ہمارے حالات اور معاملات سے بخوبی واقفیت حاصل کریں۔ ہم کو ایسی تدبیر کرنی چاہیے جس سے ہم اپنے صحیح حالات اور مناسب خواہشوں سے ان کو مطلع کر سکیں اور جس طرح ان انگریزوں نے جو ہندوستان میں رہتے ہیں ایک ایسوسی ایشن انگلستان میں قائم کرنی چاہی ہے اسی طرح ہم بھی تمام اضلاع شمال مغرب کی طرف سے ایک ایسوسی ایشن اپنے ملک میں قائم کریں اور اس کے ذریعے سے اپنے تمام مطالب اور مقاصد گورنمنٹ اور پارلیمنٹ تک پہنچائیں۔

اس تجویز کو تمام حاضرین نے پسند کیا اور اسی وقت نو معزز ہندو اور مسلمان اس کے ممبر مقرر ہوئے اور اس جماعت کا نام ”علیگرہ برٹش انڈین ایسوسی ایشن رکھا گیا۔“

اس ایسوسی ایشن نے چند مفید کام جب تک کہ سرسید علیگرہ میں رہے انجام دیے۔ مدت تک اس کی خط و کتابت انگلستان کی ایٹ انڈیا ایسوسی ایشن کے ساتھ رہی۔ اس نے گورنمنٹ ہند کو ایک نہایت مفصل عرضداشت بھیج کر مسافران ریل کی ان تکلیفوں کے تدارک کی طرف متوجہ کیا جو ابتدا میں ان کو سد سے زیادہ اٹھانی پڑتی تھیں۔ چنانچہ اس عرضداشت پر بہت سی شکایتیں رفع کی گئیں۔ نیز اس نے گورنمنٹ کو اس طرف توجہ دلائی کہ جس قانون کی رو سے کتابوں کی روانگی کا محصول دو چاند کیا گیا ہے اس سے ہندوستان کی علمی ترقی کو سد پہنچتا ہے اس لیے ایک آٹھ فی دس تولہ محصول جو بک پیکٹوں پر لیا جاتا ہے بجائے اس کے آدھا آٹھ فی دس تولہ مقرر کیا جانے۔ اسی طرح

اور بعض مفید تحریکیں اُس کی طرف سے ہوئیں مگر ۱۸۶۷ء میں جب سرسید کی تبدیلی بنارس کو ہوگئی اسی وقت اس الیورسی ایشن کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔

اصلاح شمال مغرب میں تعلیمی کمیٹیاں قائم ہوتی

۱۸۶۷ء ہی میں سرسید کی تحریک سے زمینداران علیگر ٹھہ نے ایک درخواست گورنمنٹ میں بھیجی کہ جب کہ علاوہ جمع مالگزاری کے ایک روپیہ واسطے خرچ تعلیم کے ہم سے لیا جاتا ہے تو قرین انصاف یہ ہے کہ انتظام اور نگرانی اور اخراجات میں ہم لوگوں کو بھی دخل دیا جائے اور ہر ضلع میں ایک تعلیمی کمیٹی قائم ہو جس میں حکام ضلع اور افسران سررشتہ تعلیم کے علاوہ ضلع کے رئیس اور زمیندار بھی شامل ہوں۔ نواب لغٹنٹ گورنر نے اول امتیازاً ضلع علیگر ٹھہ اور اٹارہ میں تعلیمی کمیٹیوں کا مقرر ہونا منظور کیا اور آخر کار تمام اصلاح شمال مغرب میں تعلیمی کمیٹیاں مقرر ہو گئیں۔

پھر جب معلوم ہوا کہ کمیٹیوں میں ہندوستانی ممبروں کا عدم اور وجود برابر ہے اور یورپین حکاموں اور افسروں کے سامنے وہ آزادی اور دلیری سے کہیں ان کے خلاف دم نہیں مار سکتے تو ۱۸۶۲ء میں سرسید نے ایک یادداشت لکھی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ”جس غرض سے کمیٹیاں قائم ہوئی تھیں وہ ان کے قیام سے پوری نہیں ہوئی کیونکہ یورپین ممبر ہندوستانی ممبروں کو ایک مخالف فریق سمجھتے ہیں جن کو شکست دینا وہ اپنا قدرتی حق جانتے ہیں اور ہندوستانی ممبر کمیٹی میں ان موم کی صورتوں کی مانند معلوم ہوتے ہیں جو میڈم ٹساد کی نمائش گاہ میں تھیں۔“

اگرچہ ۱۸۶۷ء میں ایجوکیشنل کمیٹیوں کے قواعد ترمیم ہو کر اس سرلوہ جاری

کیے گئے مگر چونکہ اُن سے بھی ہندوستانیوں کی مداخلت، کو کچھ وسعت نہ ہوئی تو سرسید نے ۱۸۸۶ء میں ایجوکیشن کمیشن کے سامنے اُن شکایتوں کا پتھر اُتار دیا اور کہا کہ جن مقاصد کے واسطے کمیٹیوں کے تقرر کی ضرورت تھی وہ حاصل نہ ہوئی اور اپنی رائے کے موافق کمیشن میں بہت سی ایسی اصلاحیں پیش کیں جن سے وہ نیکر تعلیم کے موجودہ انتظام کی اصلاح کی جاسکے۔

سائنٹفک سوسائٹی سے اخبار نکالنا

۱۸۶۶ء ہی میں سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی سے اخبار نکالا جو آخر کو علیگڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے نام سے اُن کے آخر دم تک جاری رہا۔ یہ اخبار پہلے ہفتہ وار نکلتا تھا پھر ہفتہ میں دو بار نکلتے لگا۔ اس اخبار کا اڈیٹوریل اہتمام ابتدا سے آخر تک سوائے اُن ایام کے جب کہ سرسید علیگڑھ میں نہیں رہے انھیں کے ہاتھ میں رہا۔ گو ایک مدت سے بسبب اس کے کہ مدرسہ کا کام حد سے زیادہ بڑھ گیا تھا اور سرسید کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اُن کو اس میں کسی بڑے آرٹیکل کے لکھنے کا موقع کم ملتا تھا۔ مگر تعلیم کے متعلق یا خاص اپنے کالج کے متعلق یا جب کبھی ملک یا قوم میں کوئی مہتمم بالشان واقعہ پیش آتا تھا وہ ہمیشہ اُس میں کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔

اولیٰ اول سرسید زیادہ تر اُس میں پوٹیکل معاملات پر مضمین اور نوٹ لکھتے تھے اس لیے اُس کی ابتدائی جلدوں کو اُن کے پوٹیکل ورکس کا ایک مجموعہ کہا جاسکتا ہے۔ اس اخبار کی ٹری خصوصیت یہ تھی کہ اس کا ایک کالم انگریزی میں اور ایک اردو میں ہوتا تھا اور بعض مضامین اردو میں لگے اور انگریزی میں لگے چھاپے جاتے تھے اس لیے اُس سے انگریز اور ہندوستانی یکساں

فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ اس کا خاص مقصد گورنمنٹ اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کے حالات اور معاملات اور خیالات سے آگاہ کرنا اور ہندوستانیوں کو انگریزی طرز حکومت سے آشنا کرنا اور ان میں پولیٹیکل خیالات اور قابلیت اور مذاق پیدا کرنا تھا۔ اس کی ابتدائی جلدوں کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزی خیالات کو ہندوستانی لباس میں اور ہندوستانی خیالات کو انگریزی لباس میں ظاہر کر کے دونوں قوموں کو ملانا چاہتا ہے۔ اگر سب سے زیادہ غلطی ہو تو آج تک کوئی پرچہ ہندوستان میں اس اخیار کے سوا ایسا نہیں نکلا جس سے یہ دونوں مقصد پورے ہو سکیں۔

اس میں سوشل، اخلاقی، علمی اور پولیٹیکل ہر قسم کے مضامین برابر چھپتے تھے، جب تک سرسید کی توجہ دوسری جانب مائل نہیں ہوتی علاوہ ان لیڈنگ آرٹیکلز کے جو وہ خود لکھتے تھے، انگریزی اخباروں سے عمدہ عمدہ آرٹیکلز جو معاملات ہندوستان سے علاقہ رکھتے تھے برابر ترجمہ ہو کر اس میں چھاپے جاتے تھے، ہندوستان کے طریق معاشرت، یا تعلیم، یا کس علمی یا تاریخی تحقیقات کے متعلق جتنے کچھ سوشل میں دیئے جاتے تھے وہ سب اس کے ذریعے سے شائع ہوتے تھے۔

اگرچہ یہ اخبار ملک کی سوشل اصلاح کا ہمیشہ ایک عمدہ آلہ رہا ہے اور اول اول کئی سال تک جس قدر زمانہ حال کی نئی اطلاعات اس کی بدولت ہندوستانیوں کو حاصل ہوتی رہی ہیں ان کے لحاظ سے یہ کہنا کچھ میبالغہ نہیں ہے کہ کم سے کم شمالی ہندوستان میں عام خیالات کی تبدیلی اور معلومات کی ترقی اسی پرچہ کے اجرا سے شروع ہوئی ہے، مگر اس کے ساتھ ہی پولیٹیکل معاملات میں جو وقعت اور اعتبار اس پرچے نے گورنمنٹ اور حکام کی نظر میں حاصل کیا وہ آج تک

کبھی ویسی اخبار نے حاصل نہیں کیا۔

جو مالٹاؤس نے اپنے لیے اختیار کیا تھا اُس کو ہمیشہ نصب العین رکھا۔ وہ ہمیشہ رعیت کو آزادی اور اطاعت سکھاتا تھا اور اُن کی خیر خواہی اور وفاداری کے خیالات گورنمنٹ پر ظاہر کرتا تھا۔ اُس کی آواز ہمارے عام ویسی اخباروں کی طرح کوئی معمولی آواز نہ تھی، بلکہ جن معاملات پر وہ بحث کرتا تھا اور دخل دیتا تھا ہمیشہ اُس کی آواز پر کان لگانے جاتے تھے اور اُس کو غور سے سُننا جاتا تھا۔ اور اس کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ اُس کا لکھنے والا اور انتہام کرنے والا سید احمد خاں تھا۔ گورنمنٹ اور حکام اس بات کو تسلیم کیے ہوئے تھے کہ علیگرہ کا اخبار تمام ہندوستان کے تعلیم یافتہ اور سمجھ دار مسلمانوں کے خیالات کا ارگن ہے۔ کتاب "پریز اوپ دی انڈین اسپائر" کا مصنف اپنی کتاب میں ایک خاص موقع پر لکھتا ہے کہ "علیگرہ انسٹیٹیوٹ گزٹ سے جو مسلمانوں کا خاص آلہ ہے اگر پچھلے دو سال کے مضامین جمع کیے جائیں تو ہندوستان کے قابل اور معزز مسلمانوں کی رائے کا ۱۰ گروہ وہ تعداد میں کم ہیں، ایک عجیب اور مفید مجموعہ نسبت جنگ روم و روس اور روس و افغانستان اور روس و ہندوستان کے بنجائے گا۔" اسی کتاب میں علیگرہ گزٹ کی وقعت اور اعتبار کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ "علیگرہ گزٹ جس کے ایڈیٹر سید احمد خاں تھے اور اب بھی وہی معلوم ہوتے ہیں، شمالی ہندوستان میں سب سے عمدہ اخبار ہے" اس کے بعد اخبار کے بعض مضامین کا خلاصہ لکھ کر خاص ملکی معاملات پر مسلمانوں کی رائے کا موازنہ کیا ہے۔

جس قدر مضامین ۱۸۶۶ء سے اخیر تک اس اخبار میں خاص سرسید کے قلم سے لکھے ہوئے نکلے اگر اُن کو ایک جگہ قلم ہم کیا جائے تو بلا سبب لقمہ چند ضخیم

جلدیں مرتب ہو سکتی ہیں۔

ایک خاص وصف جو اس اخبار کے ساتھ مخصوص تھا اور جو اس کو ہندوستانیوں کے عام انگریزی اور ویسی اخباروں سے ممتاز بھیراتا تھا۔ وہ یہ تھا کہ اُس نے اپنی طرز تحریر میں یہ خلافت اپنے تمام ہمعصروں کے کبھی کسی قوم یا فرقہ یا کسی خاص شخص کی دلائل و دلائل کو روا نہیں رکھی، اُس نے اپنے گاہکوں کو خوش کرنے کے لیے جو ہمیشہ نوک جھوک اور چھٹیر چھاڑنے سے خوش ہوتے ہیں، سنجیدگی اور نشت کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اُس نے ہندوستان کی کسی قوم کی نسبت دوستی اور خیر خواہی کے خلاف کبھی ایک حرف نہیں لکھا کبھی کسی غیر قوم کے عہدہ دار کی ترقی سے ناراضگی یا ناخوشی ظاہر نہیں کی، کبھی کسی ہندو یا مسلمان ریاست یا اُس کے اہل کاروں پر زہر نہیں اگلا، ہندو مسلمانوں کے مذہب یا جھگڑوں سے وہ ہمیشہ بے تعلق رہا اور اگر کبھی کچھ بولا تو دونوں کو صلح و عاشقی کی نصیحت کی، وہ جس طرح اپنی قوم کے اکابر اور نامور لوگوں کے مرنے پر افسوس کرتا رہا اسی طرح غیر قوموں کے مشہور اور نامور لوگوں کی وفات پر ہمیشہ اُس میں دردِ ناک اور افسوسناک مضمون نکلتے رہے، باوجودیکہ وہ گورنمنٹ اور اُس کے مدبروں پر کٹر نکتہ چینی کرتا تھا مگر اعتدال اور ادب اور تعظیم کو جو ایک محکوم قوم کا زیور ہے اُس نے ہمیشہ ملحوظ رکھا اُس نے یہ خلافت اپنے ہمعصروں کے جن کی زبانِ درازی سے اول لارڈ لٹن کے زمانے میں اور اب لارڈ ایلیگن کے عہد میں اُن کی آزادی چھین لی گئی، اپنے معتدل رویہ سے سب پر ظاہر کر دیا کہ سچی آزادی اپنی آزادی کو ہمیشہ کے لیے برقرار رکھنا ہے نہ اپنی بے اعتدالیوں کی بدولت اُس کو اپنے ہاتھ سے کھو بیٹھنا۔

ایک اور خصوصیت اس اخبار کی اس کی باقاعدگی جو اکثر ویسی اخباروں

میں مفقود ہے اور اُس کی خبروں کا نہایت معتبر ذریعوں سے لیا جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ بے اصل قصوں اور بے سرو پا خبروں سے متراویکھا گیا۔ اُس کی خبروں کا ماخذ ہمیشہ معتبر اور مستند انگریزی اخبار رہے۔ کبھی کوئی خبر کسی نامعتبر کاغذ سے (الاماشاد اللہ) اُس میں نہیں لی گئی۔ دنیا کے ہر ایک بڑے واقعہ کی نسبت شروع سے اخیر تک اس میں تمام خبریں مسلسل اور ترتیب وار درج جوئی تھیں جن سے اُس واقعہ کی ایک مختصر ہٹری بقید تاریخ مرتب ہو سکتی تھی۔ اُس کی باقاعدگی کا یہ حال تھا کہ وہ بتیس برس برابر جاری رہا اس عرصہ میں شاید ہی کوئی نمبر ایسا ہو گا جو اپنی تاریخ معین پر نہ نکلا ہو۔ باوجودیکہ چنندہ کی آمدنی سوسائٹی میں مدت سے بالکل نہیں رہی تھی اور اس لیے کچھ برسوں میں وہ کئی ہزار کی مقرض ہو گئی تھی۔ مگر سرسید نے جس طرح بوسکا اخبار کو کبھی بند ہونے نہیں دیا۔

بنارس کی تبدیلی

۱۵ اگست ۱۸۵۷ء کو سرسید عہدہ جج سماں کاڈکورٹ پر ترقی پا کر علیگڑھ سے بنارس چلے گئے یہاں سے چلتے وقت وہ تمام کاروبار سوسائٹی کے راجہ جیکشن واس سی۔ ایس۔ آئی کو جو کہ وہ اُس وقت علیگڑھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے، سپرد کر گئے۔ انھوں نے نہایت توجہ اور دلسوزی سے سوسائٹی کے کام انجام دیئے اور سوسائٹی کی جو عمارتیں سرسید کے زمانے میں پوری نہیں ہوئی تھیں ان کو پورا کیا۔

سرسید بنارس میں بھی سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ کو برابر تفویض دیتے رہے اور ان کے مفید آرٹیکل اور مضامین اسی طرح سوسائٹی کے

اخیلہ میں برابر چھپتے رہے۔ اگرچہ سرسید کا تعلق ملازمت کے اخیر زمانہ یعنی جولائی ۱۸۶۶ء تک بنارس کے ساتھ رہا لیکن چونکہ وہ یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو بنارس سے ولایت چلے گئے تھے، اس لیے پہلی بار بنارس میں ان کا قیام ایک برس اور ساڑھے سات مہینے سے زیادہ نہیں ہوا۔ ان کے اس قلیل زمانے کے بھی چند کام ذکر کے قابل ہیں۔

دہلیکمر یونیورسٹی کے لیے تحریک

یکم اگست ۱۸۶۶ء کو جب کہ سرسید علیگڑھ ہی میں تھے انھوں نے ایک درخواست برٹش انڈین ایجوکیشنل ایٹن اعلیٰ شمال مغرب کی طرف سے دائر کرنے و گورنر جنرل کشور ہند کی خدمت میں بھیجی تھی جس کا خلاصہ یہ تھا۔

۱۔ یہ کہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا ایک ایسا سررشتہ قائم کیا جائے جس میں برٹش بڑے علوم و فنون کی تعلیم ویسی زبان میں ہوا کرے۔

۲۔ یہ کہ ویسی زبان میں انھیں مضمونوں کا سالانہ امتحان ہوا کرے جس میں کہ اب طلبہ کلکتہ یونیورسٹی میں انگریزی میں امتحان دیتے ہیں۔

۳۔ جو سندیں انگریزی خواں طلبہ کو اب علم کی مختلف شاخوں میں بجلد وی تحصیل لیاقت عطا ہوتی ہیں وہی سندیں ان طلبہ کو عطا ہوا کریں جو انھیں مضمونوں کا ویسی زبان میں امتحان دے کر کامیاب ہوں۔

۴۔ یہ کہ یا تو ایک اُردو فیکلٹی کلکتہ یونیورسٹی میں قائم کی جائے یا شمال مغرب کی اضلاع میں ایک جدا یونیورسٹی ویسی زبان کی قائم ہو۔ اس درخواست میں یہ بھی لکھا تھا کہ اس غرض کے لیے انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرنے کا کام جہاں تک ممکن ہوگا سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ انجام دے گی۔

اس درخواست پر گورنمنٹ ہند نے بڑی توجیہ ظاہر کی چنانچہ جو چٹھی سکرٹری گورنمنٹ ہند کی مورخہ ۵ ستمبر ۱۹۴۷ء سرٹید کے نام بمقام بنارس موصول ہوئی اُس میں لکھا تھا کہ "نواب گورنر جنرل اور تمام لوکل گورنمنٹیں نہایت خوشی سے اُن تمام کوششوں کی قدر کریں گے جو ایسی سوسائٹیاں جیسی کہ آپ کی سوسائٹی ہے یا خاص خاص آدمی اُن مقصد یعنی انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے اور ترقی دینے کے لیے کریں گے جو آپ کی سوسائٹی کو اور گورنمنٹ کو برابر منظور نظر ہے۔" اس چٹھی میں یہ بھی لکھا تھا کہ "ہمارا مقصد صرف یہی نہیں ہے کہ فقط یونیورسٹی کے کورس کی کتابیں ویسی زبان میں ترجمہ ہو جائیں بلکہ علوم و فنون کے وسیع دائرہ میں طلبہ کو مستعد اور تیار کرنا چاہتے ہیں اور چونکہ اس مطلب کے لیے کافی ذخیرہ ویسی زبان میں اب تک موجود نہیں ہے اس لیے کچھ عرصہ تک ہندوستان کے باشندوں کو انگریزی زبان کے ذریعہ سے یہ بات حاصل کرنی ہوگی۔" اسی چٹھی میں یہ بھی لکھا تھا کہ "نواب گورنر جنرل بہادر یہ اجلاس کو نسل اُن تدبیروں سے خاص رضامندی ظاہر کرتے ہیں جو علیگڑھ کی سائنٹفک سوسائٹی نے یورپ کے علوم و فنون کو ویسی زبان میں ترجمہ کرنے کے لیے اختیار کی ہیں۔"

اس چٹھی کے آنے سے بڑے بڑے لائق تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے ترجمہ کرنے کی ہامی بھری تھی جن میں تین نامور آدمی دلی کے بھی تھے، پاسٹر پیارے لال، سلوی ذکا، اللہ اور شہت دھرم نرائن، اور جب ان لوگوں کی آمادگی گورنمنٹ ہند کو معلوم ہوئی تو اُس نے اس بات پر اپنی رضامندی ظاہر کی، اس کے بعد وزیر ہند کی چٹھی مورخہ ۲۱ جنوری ۱۹۴۷ء بنام گورنر جنرل کشور ہند صادر ہوئی جس میں ایسوسی ایشن کی تجویزوں سے پسندیدگی ظاہر کی گئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس یونیورسٹی کا چرچا شمالی ہندوستان کے تعلیم یافتہ

گروہ میں بہت پھیل گیا تھا اور وہ لوگ اُس کو بہت پسند کرتے تھے۔ چنانچہ اپریل ۱۹۱۸ء میں اسی یونیورسٹی کے متعلق دہلی سوسائٹی میں جبکہ ڈائریکٹر سر رشتہ تعلیم پنجاب بھی وہاں موجود تھے ایک مباحثہ ہوا اور گورنمنٹ پنجاب میں اس مضمون کا ایک سیمینار بھی گیا کہ ”یونیورسٹی لاہور میں اور ترجمہ کرنے اور کتابیں بنانے کے لیے ایک کمیٹی دہلی میں قائم کی جائے اور اگر دونوں صوبوں کے لیے ایک یونیورسٹی قائم کی جائے تو اس کا مقام دلی ہونا چاہیے“

اول اول سر سید بہت سرگرمی کے ساتھ اپنی عادت کے موافق اس یونیورسٹی کے قیام کی تدبیروں میں مصروف رہے۔ گورنمنٹ ہند میں انہوں نے اطلاع دی کہ ”ترجمہ کا بوجھ سوسائٹی اپنے اوپر گوارا کرتی ہے مگر گورنمنٹ سے یہ درخواست کرنی ہے کہ جو روپیہ وہ اشاعت و تعلیم کی غرض سے ہندوستان میں خرچ کرتی ہے، اُس میں سے اگر کسی قدر مناسب ہوا کرے تو سوسائٹی کی اعانت اور تقویت کرے“ یہ بھی لکھا کہ ”سوسائٹی صرف یونیورسٹی کے کورس کا ترجمہ کرنا نہیں بلکہ علوم و فنون کے دائرہ کو قراخ کرنا چاہتی ہے اور امیدوار ہے کہ اگر کاپی رائٹ کا ایکٹ ۲۰-۱۹۱۱ء سوسائٹی کے مقصد میں خارج ہوا تو اُس قانون کی ترمیم کی جائے اور اگر نہ ہو تو اُس کی تشریح کی جائے“

مگر معلوم ہوتا ہے کہ گورنمنٹ کا ارادہ کلکتہ یونیورسٹی توڑ کر اُس کی جگہ ڈرنیکل یونیورسٹی قائم کرنے کا تھا اور انگریزی کو صرف بطور سکنڈ لینگویج کے تعلیم میں رکھنا چاہتی تھی چنانچہ سر سید نے بنارس انسٹیٹیوٹ کے ایک جلسہ میں جو اسی معاملہ پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوا تھا یہ تقریر کی تھی کہ ”سنٹر کمین ڈائریکٹر سر رشتہ تعلیم اضلاع شمال مغرب، نے ایسوسی ایشن کا مطلب غلط سمجھا ہے۔

ایسوسی ایشن کی ہرگز یہ رائے نہیں ہے کہ انگریزی صرف بطور ایک زبان

کے سکھائی جائے اور اُس کو اعلیٰ تعلیم و تربیت کا ذریعہ نہ گردانا جائے بلکہ اُس کی یہ خواہش ہے کہ انگریزی تعلیم کا طریقہ بدستور جاری رہے مگر اُس کے ساتھ ایک اور سریشٹہ قائم کیا جائے جس سے انگریزی علوم و فنون اور خیالات ویسی زبان کے ذریعہ سے یہ کثرت عام ہندوستانیوں میں پھیلائے جائیں۔ پس یا تو کلکتہ یونیورسٹی میں ایک شعبہ قائم ہو یا ایک جداگانہ ورنیکلر یونیورسٹی خاص ان اضلاع میں قائم ہو۔ اس کے بعد اپریل ۱۸۶۵ء میں جبکہ نواب لٹننٹ گورنر بھی بنارس انسٹیٹیوٹ میں موجود تھے سرسید نے پھر اسی تقریر کا اعادہ کیا اور کہا کہ "مجوزہ ورنیکلر یونیورسٹی کے حامی انگریزی تعلیم کا تنزل ہرگز نہیں چاہتے بلکہ اس بات کی فکر ہے کہ ہند کے کروہ ہاؤسیوں کو تعلیم کا فائدہ کیونکر پہنچے۔"

غالباً زیادہ تر اسی وجہ سے کہ گورنمنٹ کا ارادہ انگریزی تعلیم کو گھٹا دینے کا تھا سرسید نے ورنیکلر یونیورسٹی کا خیال چھوڑ دیا ہو گا۔ مگر اس کے سوا خود ورنیکلر یونیورسٹی کے قائم کرنے میں بعض مشکلات ایسی تھیں جن کا حل کرنا نہایت دشوار تھا۔ چنانچہ سرسید نے اسی باب میں جب سٹریٹریمن انسپکٹر مدارس حلقہ راولپنڈی سے ملائے دریافت کی تو انھوں نے اُس کے جواب میں ایک مفصل تحریر بھیجی جس میں ترجمہ کرنے کی اصلی اور حقیقی مشکلات نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کی تھیں۔ اس تحریر سے بھی ضرور اُن کے ارادوں میں تزلزل واقع ہوا ہو گا پھر انھیں دنوں میں اُن کو سفر انگلستان کا خیال پیدا ہو گیا جس میں طرح طرح کی مشکلات حاصل تھیں اور اُن کا حل کرنا بجائے خود ایک بہت بڑا کام تھا۔ ان وجوہ سے سرسید اور اُن کے ساتھ جتنے آئین کہنے والے تھے سب ورنیکلر یونیورسٹی کے خیال سے دست بردار ہو گئے جو موانع اس یونیورسٹی کے قائم ہونے میں پیش آئے اگر اُن میں سے کوئی اس پر پیش نہ آتا تو بھی یہ ہیل منڈ سے چڑھتی نظر

نہیں آتی تھی، ہندوستانیوں کے اختلافات ضرور اس میں رخنہ ڈالتے دہلی سوسائٹی کے ممبر یہ چاہتے تھے کہ یونیورسٹی کا مقام دلی ہو ناچاہیے اور سائنٹفک سوسائٹی اور بنارس انسٹیٹیوٹ کی ضروریہ خواہش ہوتی کہ اُس کا مقام شمال مغربی اضلاع کا کوئی شہر ہو، اس کے سوا اردو زبان کے مخالفوں نے اخباروں میں اس بات کی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھی کہ اس یونیورسٹی میں مسلمانوں کے لیے اردو زبان اور ہندوؤں کے لیے ہندی زبان مخصوص کی جائے۔ اور باوجود تسلیم کرتے اس بات کے کہ ہندی زبان سر دست ترجمہ کی قابلیت نہیں رکھتی اس امر پر زور دیا جاتا تھا کہ اُس کی ترقی میں کوشش کر کے اُس کو ترجمہ کے لائق بنایا جائے۔ اگر یہ اصرار زیادہ بڑھتا اور ضرور بڑھتا تو گورنمنٹ آخر کار یہ فیصلہ کرتی کہ کیوں اندھانہ نیوٹا اور کیوں دو بلائے۔

سوسائٹی کی امداد کی ایک خاص تدبیر

۱۸۶۴ء ہی میں سر پید بتقریب تعطیل و سہرہ بنارس سے علیگڑھ میں آئے اور ضلع علیگڑھ کے اکثر زمینداروں پر اس بات کو ظاہر کیا کہ اب تک سوسائٹی کی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے، کوئی ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ اُس کی آمدنی مستقل ہو جائے۔ بہت سے زمینداروں نے یہ تجویز کی کہ اس ضلع کے تمام دیہات سے کم از کم ایک روپیہ سالانہ ہمسٹیہ کے لیے سوسائٹی کے قیام کے واسطے مقرر کیا جائے اور اس کی شرائط واجب العبرض میں برداشت بندوبست کے درج ہو جائیں، تاکہ نسلاً بعد نسل ہمارے وارثوں میں سے کوئی کچھ عذر نہ کرنے پائے چنانچہ ۱۲- اکتوبر ۱۸۶۴ء کو سوسائٹی کے جلسہ میں سر پید نے یہ تجویز پیش کی اور ایک فہرست زمینداران درخواست دہندہ کی

مح ان کی سررضیوں کے اور مع تفصیل ۱۳۳ دیہات کے جارج ہنری لائسنس کلکٹر ضلع علیگڑھ کی خدمت میں اپنی چٹھی کے ذریعہ سے بھیج دی تاکہ وہ اس کی تصدیق کر کے گورنمنٹ میں رپورٹ کر سید اور صاحب کلکٹر نے وہ تمام کاغذات گورنمنٹ میں اپنی رپورٹ کے ذریعہ سے روانہ کر دیے۔ اس کا نتیجہ سوا اس کے اور کچھ معلوم نہیں ہوا کہ اس کے جواب میں جو چٹھی سپرائیٹری گورنمنٹ اٹھ یا سو رخصہ ۱۸۔ اکتوبر ۱۸۶۷ء بنام سر سید کے موصول ہوئی اس میں حضورہ وائسرائے کی طرف سے رضامندی ظاہر کی گئی تھی۔

ہومیوپیتھک علاج کی حمایت

غالباً بنارس ہی میں پہنچ کر ان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ہومیوپیتھک علاج کے طریقہ سے بہتر کوئی طریقہ علاج کا عمدہ اور بے خطر نہیں ہے۔ اور جیسا کہ ان کی طبیعت کا خاصہ تھا کہ جو بات یا جو کام یا جو شخص ملک کے لیے مفید سمجھی اس کے پورا کرنے میں ہمت نہ مصروف ہو گئے، انھوں نے ہومیوپیتھک علاج کی حمایت کرنے اور تقویت دینے کا ارادہ کیا۔ اسی ۱۸۶۷ء میں انھوں نے ایک کمیٹی قائم کی جس کا مقصد ہومیوپیتھک طبابت کا ہندوستان میں پھیلانا اور سندھوستانوں کو اس کی طرف مائل کرنا تھا۔ اس کمیٹی کے پریزیڈنٹ مہاراجہ بنارس اور سکریٹری سر سید قرار پائے اور کمیٹی کی تجویز سے ۲۵۔ ستمبر ۱۸۶۷ء کو بنارس میں ایک شفاخانہ بنام ”ہومیوپیتھک ڈسپنسری اینڈ ہسپتال“ کھولا گیا۔ سر سید نے ہر طریقہ سے جو ان کے اختیار میں تھا لوگوں کو اس کی طرف توجہ دلائی۔ انھوں نے بعض اپنے دوستوں کو جو کسی سرمن مزمین میں مبتلا تھے بنارس میں بلانے کے لیے خط لکھے اور جو وہاں نہ پہنچ سکے ان کے لیے دوائیں بھیجوائیں۔ اس

طرح اُس شفاخانہ کا چرچا چند روز میں نزدیک و دور ہو گیا۔ پالیونیئر کے پرچہ مورخہ ۴ دسمبر ۱۸۶۷ء میں اس شفاخانہ کی نسبت یہ چھپا تھا کہ ”پہلے ہی مہینے میں پاتسو سولہ بیمار معالجہ کے لیے ہوسپتال میں آئے، حالانکہ اس سے پہلے کوئی اس طریقہ علاج سے مطلق واقف نہ تھا“ ۱۷۔ دسمبر ۱۸۶۷ء کو سزید نے ایک طول طویل لکچر ہوسپتال کے طبابت کی تاریخ اور اس کے اصول پر اور اس بات پر کہ یہ طریقہ علاج تمام طریقہ سے زیادہ مفید اور بے خطر ہے کمیٹی کے عام جلسہ میں دیا اور ۱۸۷۸ء میں ایک رسالہ ہیفیضہ کے علاج پر بموجب اصول ہوسپتال کے لکھا۔ یہ لکچر اور یہ رسالہ سوسائٹی اخبار کی جلدوں میں چھپا ہوا موجود ہے۔

اُردو زبان اور فارسی خط کی حمایت

سرستید ہمیشہ سے جیسا کہ ان کی مذکورہ بالا ملکی خدمات سے ظاہر ہوتا ہے اس اصول کے پابند تھے کہ ہندوستان کی بھلائی بغیر اس کے کہ ہندو مسلمان بطور ایک قوم کے بل جُلیں کر رہیں کسی طرح ممکن نہیں چنانچہ ان کے تمام پچھلے کاموں میں اس اصول کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے، مگر بد قسمتی سے ایسے اسباب جمع ہو گئے تھے کہ دونوں قوموں کا منتفق رہنا ممکن نہ تھا۔ انگریزی مدارس کی تسلیم میں جس سے زیادہ تر ہندو استفیہ ہوتے تھے تاریخ ہندوستان کی وہ کتابیں یا ان کے ترجمے داخل تھے جو نہایت تعصب آمیز طریقہ پر لکھی گئی تھیں اور جن میں مسلمانوں کی بُرائیاں اور خالمانہ کاروائیاں دانستہ یا نادانستہ نہایت تفصیل کے ساتھ درج کی گئی تھیں، اس تعلیم کا ضروری نتیجہ یہ تھا کہ ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے نفرت اور ناگواری کا تخم جم جائے اور وہ رفتہ رفتہ ایک نہایت گھنا اور عظیم الشان درخت کا تخم جم جائے اور وہ رفتہ رفتہ ایک نہایت گھنا اور عظیم الشان درخت

مہو جانے چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جو روابط دوستی اور اتحاد بلکہ یگانگت کے قدیم ہندو مسلمانوں میں تھے وہ تسلیم یافتہ ہندوؤں میں بالکل باقی نہ رہے اور اس کا ظہور آج ہر شخص علانیہ تمام ہندوستان میں اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہے۔

اس کے سوا مسلمانوں کا وقار جو ہندوستان کی قوموں کے دل میں مدت سے چلا آتا تھا وہ باقی نہ رہا تھا اور نہ رہ سکتا تھا، جو عزت اور جاہ و منصب اور امور سلطنت میں شرکت تعلیم کی بدولت ہندوؤں نے حاصل کی تھی مسلمان اپنے غرور اور تعصب یا غفلت و بے پروائی یا افلاس کے سبب اس سے محروم تھے، اور واقعہ ۱۸۵۷ء نے ان کو اور بھی مٹا دیا تھا۔ ان تمام باتوں کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ غالب پارٹی اپنے نئے اقتدار کا جو اس نے مدت کے بعد حاصل کیا تھا اور جس میں بہت کچھ چاؤ اور منگیں بھری ہوئی تھیں، مغلوب پارٹی پر امتحان کرے اور اگر کوئی اور جیلہ ہاتھ نہ آئے تو ایسی بہانے سے کہ دریا میں خاک کیوں اُڑاتے ہو اس سے دست و گریبان ہو جائے، اردو زبان جو درحقیقت ہندی بھاشا کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے اور جس میں عربی و فارسی کے صرف کسی قدر اسما اس سے زیادہ شامل نہیں ہیں جتنا کہ آٹے میں نمک ہوتا ہے اس کو ہمارے ہموطن بھائیوں نے صرف اس بنا پر مٹانا چاہا کہ اس کی ترقی کا بنیاد مسلمانوں کے عہد میں پڑی تھی۔

چنانچہ ۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سربراہ آوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور فارسی خط کے موقوف کرانے میں کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔

سرسید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جبکہ مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو

مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ "انھیں دنوں میں جب کہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا ایک روز سٹرکسپیر سے جو اُس وقت بنارس میں کمشنر تھے میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے۔ آخر انھوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے، اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے میں نے کہا اب مجھ کو یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد اُن لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔ انھوں نے کہا اگر آپ کی یہ پیشین گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہے۔ میں نے کہا مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔"

غرض کہ ہندوؤں کی ایک قومی مجلس میں جو اُس وقت باہر فتح نرائن سنگھ کے مکان پر بنارس میں قائم تھی اس بات کی چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ جا بجا اُس کے لیے کمیٹیاں، مجالس اور سبھاؤں مختلف ناموں سے قائم ہوئیں اور ایک صدر مجلس آلم آباد میں قائم کی گئی جس کے ماتحت تمام مذکورہ بالا مجالس اور سبھاؤں تھیں یہاں یہ فکریں ہو رہی تھیں کہ انھیں دنوں میں لفٹنٹ گورنر بنگال بھاگلپور کی سائٹنگ سوسائٹی میں آئے اور سوسائٹی کی طرف سے اُن کو ایڈریس ایسی اُردو میں دیا گیا جس میں عدالت آرائی کی غرض سے عربی اور فارسی کے الفاظ کثرت سے کئے گئے تھے اور اس کا سمجھنا ایک ایسے یورپین حاکم کو جو ہمیشہ بنگال میں رہا ہو اسان نہ تھا۔ مہار کے تعلیم یافتہ ہندو پہلے ہی سے تحریک کر رہے تھے کہ جس

طرح بنگالہ میں ہنگلہ زبان اور بنگلہ خط عدالتوں میں جاری ہو گیا ہے اسی طرح
صوبہ بہار میں بہاری زبان اور کیتھی حرف جاری کیے جائیں۔ چونکہ ہیرا نرا پڈریس کے
مہیت ہی کم الفاظ سمجھے تھے، انھوں نے کہا کہ جس زبان میں یہ ایڈریس پڑھا گیا
ہے یہ سرگز ملکی زبان نہیں ہے اور یہ زبان بہار میں جاری نہیں رہ سکتی چنانچہ
انھوں نے چند روز بعد حکم دیدیا کہ بہار کی تمام عدالتوں میں کیتھی حرف اور
جو زبان کیتھی حرفوں میں لکھی جاتی ہے جاری ہو، ہر چند مسلمانوں نے اور بہت
سے قدیم وضع کے ہندوؤں نے بھی کوشش کی کہ وہ حکم ملتوی رہے مگر کچھ فائدہ نہ ہوا
اس واقعہ سے شمال مغربی اضلاع کے ہندوؤں کا زیادہ حوصلہ بڑھا اور
ان کی کوششیں زیادہ تیزی کے ساتھ ہوتے لگیں۔ آلہ آباد کی صدر مجلس میں
چند جلسے اس مسئلہ کی تحریک کے لیے منعقد ہوئے اور آخر کار مجلس کے
سکرٹری بابو سردار پرشاد سنڈیاں نے اس باب میں سرسید سے خط و کتابت
شروع کی۔ سکرٹری کی متعدد چٹھیاں آئیں اور سرسید لہور اختلاف رائے کے
برایک کا جواب دیتے رہے اور یہ مباحثہ اخباروں میں مشتمل ہوتا رہا۔ آخر
سرسید نے اس کمیٹی کی صریح مخالفت کی اور سوسائٹی اخبار میں متعدد آرٹیکل
شائع کیے۔ آلہ آباد کمیٹی نے بھی کئی درخواستیں اور بڑے بڑے محضر جن پر مشتمل
ہندوؤں کے دستخط تھے گورنمنٹ میں بھیجی بنا گیا ہے کہ مسٹر کمین ڈائرکٹر
سررشتہ تعلیم نے بھی اس کمیٹی کی تائید کی مگر کمیٹی کو کامیابی نہ ہوئی۔ اور
غالباً سر جان اسٹریچی کی گورنمنٹ میں یہ تحریک اس بنا پر نامنظور ہو گئی کہ فارسی
خط اور اردو زبان کی اشاعت بہ نسبت ناگری اور بھاشا کے مہیت زیادہ تھی۔
۱۸۸۲ء میں جبکہ سرسید وائسرائے کی نیسیلیٹو کونسل میں ممبر تھے ایجوکیشن
کیشن میں ہندوؤں کو اردو کی مخالفت کا پھر موقع ملا۔ اس دفعہ پہلے سے بھی

زیادہ زور شور کے ساتھ شمال مغربی اضلاع اور پنجاب کے ہندوؤں نے اردو زبان اور فارسی خط کی مخالفت میں کوشش کی تھی۔ دونوں صوبوں میں بے شمار سبھاؤں اور انجمنوں کی طرف سے بڑے بڑے طوفانی محضر اور مہموریل کمیشن میں پیش کیے گئے۔ چنانچہ سرستید کے بعض مسلمان دوستوں نے بھی پنجاب میں انجمن حمایت اردو قائم کی اور مہموریل اور محضر کمیشن میں بھیجی۔ مگر کمیشن نے دونوں پارٹیوں کی درخواست پر کچھ رائے نہیں دی۔ ہم نے سنا ہے کہ سرستید نے ایک باقاعدہ طریقہ سے کمیشن پر یہ ظاہر کر دیا تھا کہ یہ مسئلہ ایجوکیشن کمیشن سے کچھ علاقہ نہیں رکھتا۔ بلکہ ایک ہیٹ ٹیرا پولیٹکل مسئلہ ہے جس کے ساتھ گورنمنٹ کے مصالح ملکی وابستہ ہیں۔ پس اس کی بحث ایجوکیشن کمیشن سے کچھ علاقہ نہیں رکھتی۔

اس کے بعد مارچ ۱۹۰۱ء میں جس کی ستائیسویں کو سرستید نے دنیا سے رحلت کی۔ حضرت سرانیٹونی مکڈائل لفٹنٹ گورنر اضلاع شمال مغرب وادوہ کی خدمت میں دونوں صوبوں کے بڑے بڑے معزز اہل سربراہ اور وہ ہندوؤں نے پھر ایک مہموریل اس غرض سے گزارا کہ تمام سرکاری عدالتوں اور کچھ لوگوں میں بجائے اردو زبان اور فارسی خط کے ہندی بھاشا اور ناگری خط جاری کیا جائے۔ اگرچہ سرستید پر اس زمانہ میں ہجوم رنج و الم کے سبب ایسا سکتا کا سا عالم طاری تھا کہ وہ بالکل نقش دیوار بن گئے تھے مگر اسی حالت میں انہوں نے اس مضمون پر ایک آرٹیکل لکھا جو ۱۹ مارچ کے انسٹیٹیوٹ گزٹ میں سرستید کی وفات سے نو دن پہلے شائع ہوا۔ اور جو کمیٹی مسلمانوں نے الہ آباد میں اردو کی حمایت کے لیے قائم کی تھی اس کو اس باب میں بندر بعبہ تخریر کے کچھ مشورے دیے اور لکھا کہ اگرچہ مجھ سے اب کچھ نہیں ہو سکتا لیکن جہاں تک ممکن ہو گا میں ہر قسم کی مدد دینے کو موجود ہوں۔ ان کو یقین ہو گیا

تھا کہ ہندوؤں کا یہ کام درحقیقت محض قومی تعصب پر مبنی ہے اس لیے وہ اپنے ہندو دوستوں کی ناامنی کی مطلق پرواہ نہ کرتے تھے۔ جس طرح وہ ہندوستانوں کے انگریزی لباس اور انگریزی طرز معیشت پر انگریزوں کے اعتراضات کو ہمیشہ اُن کی تنگدلی اور غرور پر مہمول کرتے تھے اور کبھی اُن کے اعتراضوں کا جواب دینے سے نہ چوکتے تھے، اسی طرح انھوں نے اردو زبان کی مخالفت پر کبھی سکوت اختیار نہیں کیا یہاں تک کہ مرتے مرتے بھی وہ اس ڈیوٹی کو ادا کیے بغیر نہیں رہے۔ وہ اپنے آئینہ کے شروع میں لکھتے ہیں کہ ”غالباً اس وقت اُن کے (یعنی ہندوؤں کے) اس جوش کے اُٹھنے کا سبب یہ ہے کہ اس صوبہ کے ہزار لفظنٹ گورنر بہادر اس زمانہ میں جب کہ صوبہ بہار میں کیتی صوف اور بہاری زبان یعنی اردو زبان اور فارسی خط کے جاری ہونے لگی، کلکٹر و مجسٹریٹ اور معاون اس تجویز کے تھے۔ پس ان صوبوں میں بھی ہندی و ناگری حروف جاری ہونے میں تامل نہ فرمائیں گے اور شاید یہ غلط خیال بھی اس پُرانے مردہ مضمون کے اُٹھانے کا باعث ہوا ہو کہ ان دنوں میں گورنمنٹ کی نظر عنایت مسلمانوں کی نسبت کم ہے اور وہ اُن کو ناشکر سمجھتی ہے۔“ اس کے بعد انھوں نے میوریل کے خلاف اردو زبان اور فارسی خط کی ترمیم پر دلیلیا پیش کیں ہیں۔ اگرچہ اس وقت ہزار نے کہہ کر اس کی زبان میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں سمجھی مگر جو کچھ انھوں نے میوریل کے جواب میں فرمایا اُس سے صاف پایا جاتا ہے کہ آئینہ ایسی تبدیلی ہونی ممکن ہے۔

اس بات کا کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ ہندوستان میں کوئی زبان اردو سے بڑھ کر عام زبان ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ اگرچہ ملک کے بعض حصوں میں یہ نسبت بعض کے کم بولی جاتی ہے مگر ایسا کوئی حصہ نہیں جہاں

اُردو کے بولنے اور سمجھنے والے نہ ہوں، خود گورنمنٹ اس بات کو تسلیم کر چکی ہے کہ ہندوستان کی قومی زبان اُردو ہے اور اسی بنا پر ۱۸۴۵ء میں سرکاری دفتروں اور عدالتوں کی زبان اُردو قرار دی گئی۔ اگر اور صوبوں کی نسبت کسی کو کچھ نا اہل بھی ہو تو شمال مغربی اضلاع کی نسبت کسی کو بھی نا اہل نہیں ہو سکتا کہ میاں کی قومی زبان اُردو ہے۔ یہ صوبہ اُن دو شہروں سے گھرا ہوا ہے جو اُردو زبان کے سرچشمے سمجھے جاتے ہیں، یعنی دلی اور لکھنؤ۔ اس صوبہ کے ہندو عموماً اُردو سے ایسے ہی مانوس ہیں جیسے مسلمان۔ مگر حضرت تعصب وہ ذات شریف ہیں جن کا مقولہ ہے کہ ”من لجنم لیکن نختہ یاراں تباہ گرد فرانس کے مشہور اور فیلسفٹ گارساں و تاسی جنوں نے اُردو زبان کی تحقیقات میں اپنی عمر صرف کی ہے وہ اسی متنازع فیہ مسئلہ کی نسبت اپنے ایک لکچر میں لکھتے ہیں کہ ”ہندو اپنے تعصب کی وجہ سے ہر ایک ایسے امر کے مزاحم ہوتے ہیں جو اُن کو مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلائے۔“ اسپین والوں نے بھی مسلمانوں کے زوال سلطنت کے بعد اسی طرح مسلمانوں کی نشانیاں مٹائی تھیں مگر انہوں نے اپنی حکومت کے زمانہ میں ایسا کیا تھا اور ہمارے ہموطن بھائی محکوم ہونے کی حالت میں ایسے ارادے رکھتے ہیں۔ لیکن ہم کو اطمینان رکھنا چاہیے کیونکہ جس تعلیم نے ہمارے ہندو نوجوانوں کو مسلمانوں سے تعصب اور نفرت کرتا سکھایا ہے وہی آگے چل کر اُن کو یہ سبق دے گی کہ جب تک ہندو مسلمان مل جل کر نہ رہیں گے اور ایک دوسرے کے مصالح کو ملحوظ نہ رکھیں گے تب تک برٹش انڈیا میں اصلی عزت حاصل نہیں کر سکتے۔

رسالہ احکام طعام اہل کتاب

۱۸۶۶ء میں سرسید کے پاس ایک سوال بطور استفتاء کے آیا تھا کہ مسلمانوں کو انگریزوں کے ساتھ بشرطیکہ کھانے پر کوئی حرام چیز نہ ہو کھانا پینا درست ہے یا نہیں؟ سرسید نے اس کا جواب آیات و احادیث کے حوالہ سے لکھ دیا کہ جائز ہے۔ اور ہندوستان کے سوا تمام دنیا کے مسلمان انگریزوں کے ساتھ برابر کھاتے پیتے ہیں۔ یہ جواب ۱۴ ستمبر ۱۸۶۶ء کے سوسائٹی کے اخبار میں چھپا۔ اس پر ایک سید صاحب نے اڈیٹر کے نام کھنوسے ایک چٹھی لکھی اور سرسید کے جواب پر نہایت خوشی ظاہر کی اور لکھا کہ ”میں اس دن کے دیکھنے کا نہایت مشتاق ہوں جب یہ سنوں کہ سید احمد خاں نے اپنے قول کے موافق عمل بھی کیا۔“ اس کے جواب میں سرسید نے لکھا کہ ”میں نے اسلام کو ماں باپ کی تقلید سے نہیں بلکہ بقدر اپنی طاقت کے خود تحقیق کر کے تمام مذاہب معلوم سے اعلیٰ اور عمدہ اور سچا یقین کیا ہے۔ اور اسی سچے مذہب کے مجھے سکھایا ہے سچ کہنا اور سچ کرتا۔ نہایت کمینہ وہ آدمی ہے جو کہتا کچھ ہو کر تاکچھ ہو۔ اور اس سے بھی زیادہ کمینہ وہ شخص ہے جو شریعت کے حکم سے واقف ہو اور پھر رسم و رواج کی شرم سے یا لوگوں کے لعن و طعن کے ڈر سے اس کے کرنے میں تامل کرے۔ اسی لیے میں کسی انگریز کے ساتھ کھانے پینے میں بشرطیکہ شراب اور سوسر یا اور کوئی حرام چیز نہ ہو، کچھ تامل نہیں کرتا میرے انگریز دوست سیرے ہاں مہمان ہوتے ہیں اور میں ان کے ہاں مہمان ہوتا ہوں اور ہم اور وہ ایک میز اور ایک دسترخوان پر کھاتے ہیں جس چیر میں ہم کو خدا سے شرم نہیں اس میں دنیا کے لوگوں سے کیا ڈر ہے؟“

معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ سے بہت پہلے سرسید نے انگریزوں کے ساتھ کھانے پینے کا پرہیز چھوڑ دیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ”بجنور فتح ہونے کے بعد میں اور مسٹر پامر مجسٹریٹ ضلع بجنور نجیب آباد سے بجنور کو آتے تھے رستے میں ایک جگہ ہم دونوں اترے اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ مسٹر پامر نے مجھ سے پوچھا کہ چائے پیو گے؟ میں نے کہا یہاں چائے کہاں؟ انھوں نے کہا کہ ہمارے ساتھ بنی ہوئی بوتلیں میں موجود ہے۔ میں نے کہا بہت بہتر غرض کہ ہم نے چائے پی اور ایک آدھ توں کھایا۔ وہاں سے چل کر گینے میں مقام ہوا۔ عصر کے وقت سب لوگ جماعت سے نماز پڑھ رہے تھے۔ میں بھی جا کر جماعت میں شریک ہو گیا۔ نماز کے بعد لوگوں نے مولوی قادر علی تحصیلدار سے جو نماز میں شریک تھے، پوچھا کہ صدر امین نے تو انگریز کے ہاں کی بنی ہوئی چائے پی ہے اور توں کھائے ہیں پھر یہ نماز میں کیونکر شریک ہوئے؟ جب مجھے معلوم ہوا تو میں نے ان کو سمجھایا کہ قرآن مجید کی رو سے انگریزوں کے ہاں کا کھانا اور ان کے ساتھ کھانا درست ہے۔ ان لوگوں نے میری اس روشنی کی تقریر کو نہایت تعجب سے سنا۔ پھر ایک روز بجنور میں رات کو مسٹر پامر کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہ کھانے پر جانے والے تھے انھوں نے کہا کہ تم بھی کھانا یہیں کھا لو۔ اور خانساں کو اشارہ کیا کہ میرے سامنے بھی رکابی رکھا دے۔ خانساں کو اس بات سے ایسا تعجب ہوا کہ کئی دفعہ اشارہ کرنے پر بھی نہ سمجھا کہ آج مسلمان انگریز کے ساتھ کھانا کھائے گا۔“

اگرچہ سرسید انگریزوں کے ساتھ مدت سے کھانے پینے لگے تھے۔ لیکن ابھی تک ان کو مسلمانوں میں اس خیال کے زیادہ پھیلنے کا کچھ خیال نہیں تھا۔ مگر جب انھوں نے دیکھا کہ رسم و رواج کی قیدیں ایک آدمی کے

اٹھا دینے سے نہیں اٹھتیں اور مسلمانوں کا انگریزوں سے خوف اور وحشت کرنا اور انگریزوں کا مسلمانوں سے بدگمان اور متنفر رہنا اُس وقت تک موقوف نہ ہو گا جب تک کہ دونوں قوموں میں میل جول اور ریلط ضبط نہ ہو اور ہر ایک قوم کو دوسری قوم کے اصلی خیالات بلا واسطہ معلوم کرنے کا معلوم نہ ملے، اس لیے انھوں نے ایک مبسوط اور مفصل تحریر ۱۸۶۹ء میں بنام ”رسالہ احکام طعام اہل کتاب“ بنا جس میں کچھ کرشائع کی جس میں آیات قرآنی اور احادیث نبوی اور روایات معتبری سے اور خاص کر شاہ عبدالعزیز کے فتوے سے جس پر تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو اعتبار ہے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ مسلمانوں کو انگریزوں کے ہاں خود اُن کے ساتھ انھیں کے ہاتھ کا پکا ہوا انھیں کے تبرنوں میں اور انھیں کا ذبیحہ جس طرح کہ انھوں نے کیا ہو کھانا درست ہے، صرف سوڑا شراب اور حرام چیزوں سے پرہیز کرنا لازم ہے۔

اس رسالہ میں اُن تمام شبہات کا جواب جو ہندوستان کے علمائے اسلام موافقت اہل کتاب پر کرتے تھے اور جن شبہات کی وجہ سے مسلمانوں کو انگریزوں کے ہاں کی ہر ایک کھانے پینے کی چیز اور اُنکے ساتھ کھانا کھانے سے اجتناب تھا، نہایت شافی طور پر جو ایک منصف مزاج آدمی کی تسلی کیلئے کافی دوائی ہے کھا ہے۔ جب یہ رسالہ چھپا تو اول اول بہت شور و غل ہوا۔ سرسید کو کر شان کہا گیا، اُنکے ساتھ کھانا کھانے سے احتراز کیا گیا اُنکے رسالہ کے جواب لکھے گئے، بعضوں نے اس باب میں کوشش کی کہ سرسید کے ساتھ سب مسلمان کھانا پینا چھوڑ دیں مگر قبول سرسید کے وہ سب باتیں ایسی تھیں جیسے آندھی کا ایک گولہ اٹھا اور خاک اڑا کر چلا گیا پھر مطلع صاف ہو گیا، اب وہی لوگ جو سخت معترض تھے خود انگریزوں کے ہاں جا کر اور اُن کو اپنے ہاں بلا کر ساتھ کھانے کو اپنا فخر سمجھتے ہیں، البتہ جن لوگوں کی انگریزوں تک رسائی نہیں وہ اپنے تہرے اور طہارت پر بدستور قائم ہیں۔

چوتھا باب

۱۸۶۹ء سے ۱۸۷۰ء تک

”و سفر انگلستان، سفر نامہ، لندن کے عہدے سے ملنا، جلسہ سمنوین
 سوسائٹی آف سول انجینئرس میں شریک ہونا، سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب
 اور تمغہ ملنا، ملکہ معظّمہ کی لوی میں شریک ہونا، پرنس آف ویلز کی
 لوی میں بلایا جانا، ایتھینیم کلب کی ممبری، کیمبرج یونیورسٹی میں جا کر
 وہاں کے طریقہ تعلیم و تربیت پر غور کرنا، تعلیم ہندوستان پر پمفلٹ
 لکھنا، خطبات احمدیہ لکھ کر شائع کرنا، جان ڈیون پورٹ کی کتاب
 چھپوا کر شائع کرنا“

سر سید نے غرضتہ کے بعد جتنا دو باتوں کو مسلمانوں کی آئندہ بہبودی کے
 لیے ضروری سمجھا تھا ان کے لیے انگلستان کا سفر کرنا نہایت ضروری تھا ان کا یہ خیال تھا
 کہ جب تک مسلمانوں میں مغربی تعلیم نہ پھیلے گی اور جب تک مسلمانوں اور انگریزوں
 میں موائت اور میل جول پیدا نہ ہوگا اس وقت تک مسلمانوں کا پنپنا اور ہندوستان
 میں عزت سے رہنا دشوار ہے۔ گو وہ اب تک ان دو تدبیروں میں برابر سرگرم رہتے
 مگر جس حد تک وہ اپنا منصوبہ پورا کرنا چاہتے تھے اس کے لحاظ سے ان کو ولایت
 کا سفر کرنا ضروری معلوم ہوا۔ اس کے علاوہ سر ولیم میور کی کتاب ”لائف آف
 محمدؐ“ کا جواب لکھنے کے لیے جس کا ان کو حسد سے زیادہ خیال تھا، بہت سی

ایسی کتابوں اور نوشتوں کی ضرورت تھی جو ہندوستان میں نایاب تھیں اور صرف برٹش میوزیم یا انڈیا اوفس کے کتب خانوں میں مل سکتی ہیں۔

مگر اُس وقت ولایت جانا آسان نہ تھا۔ اول تو ایک ایسا شخص جس کی آمدنی ہمیشہ خرچ سے شرمندہ ہے، اس کو ولایت جانا اور وہاں جا کر اپنے تمام مفاد پر سے کرنے کے لیے ایک مدت تک قیام کرنا سخت مشکل تھا۔ پھر جیسا کہ آج کل ہندوستانی مسافروں کا انگلستان تک برابر تاشا بندھا ہوا ہے اُس زمانے میں یہ حال نہ تھا۔ ہندوستانی اس دور و دراز سفر سے بچکچا تے تھے۔ اور بیٹی و بنگال کے متعدد آدمیوں کے سوا کسی نے یہ سفر اختیار نہیں کیا تھا۔ حسن اتفاق سے انھیں دنوں میں گورنمنٹ ہند نے ہندوستانیوں کو تعلیم کی غرض سے ولایت بھیجنے کے لیے علاوہ تین ہزار روپیہ خرچ آمدورفت کے چھ چھ ہزار سالانہ کی نو سالہ شپیں چند صوبوں کے واسطے منظور کی تھیں۔ خوش قسمتی سے گورنمنٹ اضلاع شمال مغرب نے اپنے صوبہ کی سکالر شپ کے سید محمود کو انتخاب کیا۔ اگرچہ یہ روپیہ صرف سید محمود کے بھیجنے کے لیے بھی کافی نہ تھا، مگر گورنمنٹ کی اس امداد سے سرتیڈ کے اسادہ کو بہت آفونیت ہوئی، انھوں نے فوراً ولایت جانے کی دل میں ٹھان لی۔ جس نیت اور جس ارادہ سے انھوں نے سید محمود کے ساتھ خود ولایت جانے کا ارادہ کیا تھا وہ کسی قدر ان کی درخواستِ رخصت سے جو ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کے سوسائٹی اخبار میں چھپی تھی، معلوم ہوتی ہے۔ درخواست کا مضمون یہ ہے۔

”یہ اہل پنجابی میرے ذہن نشین ہے کہ ہندوستان کی

غلاج و بہبودی کو کامل ترقی دینے اور گورنمنٹ انگریزی کے مطالب

کو جس کی ملازمت کا فخر مجھ کو حاصل ہے پنجابی اشوکام دیپا بیداری

تجسس کے واسطے اس کے سرا اور کسی امر کی ضرورت نہیں ہے کہ اہل یورپ اور ہندوستان کے درمیان رابطہ و ضبط کو ترقی دیا جائے پس اس مقصد کی تکمیل کے واسطے ہندوستانیوں کو میری رائے میں یورپ کے سفر کی ترغیب دینی چاہیے تاکہ وہ مغربی ملکوں کی شانستگی کے عجیب و غریب نتیجوں اور اُس کی ترقی کو بحشم خود مشاہدہ کریں اور اس بات کا اندازہ کر سکیں کہ انگلستان کے لوگ کیسے دولت مند، طاقت ور اور دانا ہیں اور اُن مفید اور عمدہ باتوں کو ہندوستان کی بھلائی کے واسطے سیکھیں جو اُس امر کے نتیجے ہیں کہ تجارت کے باب میں انگلستان کے باشندے کیسے مستعد ہیں اور کارخانوں اور کاشتکاری اور شفاخانوں اور خیرات اور اُس کے شہروں کی صفائی اور اُس کی دولت اور علم سے روز بروز زیادہ کام لیا جاتا ہے۔“

”پس اس خواہش سے میں یہ بات چاہتا ہوں کہ خود انگلستان جا کر اپنے بہوطنوں کے لیے ایک نظیر قائم کروں۔ مجھ کو یقین ہے کہ صرف مجھ کو ہی اس سفر سے فائدہ نہ ہوگا بلکہ امید ہے کہ اپنے سفر کے نتیجوں سے اُن کو مطلع کر کے اُن کو بھی فائدہ پہنچا سکوں اور اس طرح پر جو عمدہ باتیں میں نے سیکھی ہیں اُن کو بھی سکھاؤں اور اُن کو بھی اپنی پیروی کی ترغیب دوں۔“

مولوی سید مہدی علی خاں اپنی ایک نثر میں لکھتے ہیں کہ ”جب سید احمد خاں لندن جاتے کہ تھے تو مالی مشکلات اس قسم کی تھیں کہ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس ارادہ کو پورا نہ کر سکتا۔ انہوں نے اپنے کتب خانہ کو بیچا، گھر اور کوٹھی کو

رہن رکھا اور سفر کی تیاری کی انہوں نے بارہا مجھ سے اس بارہ میں پیشتر ذکر کیا تھا کہ میرا مقصود پورا نہیں ہو سکتا جب تک میں ہدایت خود اصول و طرز تعلیم سے واقفیت حاصل نہ کر لوں۔“

العرض یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو وہ بنارس سے ولایت کو روانہ ہوئے۔ ان کے ساتھ دو توں بیٹے سید حامد مرحوم اور سید محمود اور تیسرے مرزا خداداد بیگ اور چوتھا اُن کا قدیم خدمتگار، جھجو، بیچلہ آدمی تھے۔ بنارس سے لندن تک پہنچنے کے حالات انہوں نے بطور ایک سفر نامہ کے نہایت عمدگی سے بیان کیے ہیں جو سوسائٹی اخبار اور تہذیب الاخلاق میں چھپ گئے ہیں۔

سفر نامہ

اس سفر نامہ میں ہر ایک دلچسپ حال جو اشنائے راہ میں اُن کو پیش آیا ہے، قلبند کیا ہے اور سفر کی ضروریات جو ہر مسافر کو پیش آتی ہیں مفصل بیان کی ہیں اور وقتاً فوقتاً جو خیالات اپنے خاص مقصد یعنی وطن کی بھلائی کے اُن کے دل میں گذرے ہیں اُن کو ہر موقع پر ظاہر کیا ہے۔ جابجا ایشیا اور یورپ کی سوشل اور سول حالتوں کا مقابلہ کیا ہے۔ یورپ کے عجائبات ایسے طور پر بیان کیے ہیں جس سے پڑھنے والوں کو یورپ کے سفر کی ترغیب ہو۔

جس دُھن میں سرستبد نے یہ سفر اختیار کیا تھا اُس کا ثبوت اس سفر نامہ میں نہایت وضاحت کے ساتھ ملتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ سفر نامہ لکھنے والا وطن اور قوم کی خیر خواہی اور ہمدردی میں شور بول رہے بیٹھی میں پہنچ کر کہیں وہ میمنند مسلمانوں کے اخلاق، نام و نمود پر مرنے، جھوٹی شہنجا کرنے، مفید تعلیم پر متوجہ نہ ہونے اور گھروں پر مدرس نوکر رکھنے پر افسوس کرتا ہے اور

پارسیوں کی عمدہ حالت سے اُن کا مقابلہ کرتا ہے۔ کہیں پارسیوں کے صاف اُردو لہجے پر حیران ہوتا ہے اور اُن لوگوں پر تعجب کرتا ہے جو اُردو کو ہندوستان کی قومی زبان نہیں مانتے۔ کہیں گجراتی زبان کی کچھ عبارت نقل کرتا ہے اور بتانا ہے کہ اُس میں بھی فارسی اور عربی الفاظ ملے ہوئے ہیں اور پھر سوال کرتا ہے کہ الہ آباد ایسٹیشن کون سی زبان سے فارسی و عربی الفاظ نکال کر قدیم بھاشا جاری کرے گی؟ مصر کی ریل کی تعریف کر کے افسوس کرتا ہے کہ ریل کا تمام سامان فرانس اور انگلستان کا بنا ہوا ہے، مصریوں کی چیز بتائی ہوئی نہیں۔ مسٹر وینس فٹز پیٹرک سے جہاز میں ملتا ہے اور پنجاب کی طرز حکومت کے ذکر میں اُس کو ایک ڈسپاک گورنمنٹ کا نمونہ بتلاتا ہے اور دلی کو فالونی اصلاح میں سے نکال کر پنجاب میں داخل کرتے کو عدس کی سنزاول میں سے ایک سزا قرار دیتا ہے۔ فرانس کے نامور انجینیر ایم۔ دی سپس سے جس نے تہر سو بیڑ نکالی ہے۔ جہاز میں ملنے پر بے انتہا خوشی اور فخر ظاہر کرتا ہے اور اس بات کا ذکر کرتا ہے کہ جب انگریزوں نے اس کو ایڈریس دیتے وقت کہا کہ اس نہر کا نام نہر سپس رکھنا زریا ہے تو ایم۔ دی سپس نے جواب دیا کہ میرا فخر اس میں ہے کہ اس کا نام نہر فرانس رکھا جائے۔ وہاں اُس کی وطن پرستی پر ہزار ہزار آفریں کرتا ہے اور اپنی قوم پر تضریر کہ اُن کا کام سوائے حسد، بغض، تشخص اور چھوٹی شیخی کرنے کے کچھ نہیں اور اسی لیے وہ بد بختی اور ذلت میں گرفتار ہیں۔ اس بات پر افسوس کرتا ہے کہ جس آبنائے پر محب وطن "گیری بالڈی" کا گھر ہے وہاں سے جہاز رات کو گذرا اور اُس پھونس کے جھونپڑے کی جو شہنشاہوں کے مصلوں سے زیادہ ادب اور تعظیم کے قابل ہے۔ زیارت میسر نہ آئی۔ پیرس کی عمارتوں کی خوبی کا ذکر کرتے وقت

روضہ تاج گنج اور قطب کی لٹ کو یاد کرتا اور اُس پر فخر کرتا ہے۔ وارسیل کے شہنشاہی محل میں حوض اور نہریں اور فوارے اور درختوں کی سوز و نیت دیکھ کر قلعہ دہلی کی نہر مار پیچ اور منہاب باغ کا حوض جس کے کناروں سے کبھی تین سو ساٹھ فوارے چھوڑتے تھے اور ساون بھادوں کی کیفیت یاد کرتا ہے وارسیل میں تصویروں کا عالم دیکھ کر حیران ہوتا ہے۔ مگر الجزائر کے محاربات کی تصویروں میں ایک مرقع دیکھ کر اس کے دل پر سخت چوٹ لگتی ہے جس کی وجہ سے وہ فرانس اور اُس کی بہادری و سولیزیشن کو قابلِ نفیر سمجھتا ہے۔ اُس نے ایک تصویر دیکھی ہے کہ سید عبدالقادر جزائری کی عورتیں گرفتار ہیں، فرانسیسی سپاہیوں نے اُن کے اونٹ بٹھا کر کجاوہ کو گرا دیا ہے اور عورتیں اُس میں سے نکل چکی ہیں اور اُن کے بدن پر سے کپڑا ہٹ گیا ہے۔ سپاہی سنگینیں اٹھائے ہوئے اور اُن کی نوکیں عورتوں کی طرف کیے ہوئے کہ گویا اب ماریں گے۔ اردگرد کھڑے ہیں۔ اس تصویر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ایک غیرت مند مسلمان کے لیے اُن عورتوں کا ایسی بیکسی کے عالم میں دیکھنا، آنکھوں سے خون ٹپکانے کے لیے کافی ہے اور کہتا ہے کہ اس تصویر کو فرینچ سپاہ کی بہادری کی یادگار سمجھنا اور عورت کا کپڑا تصویر میں بدن پر سے ہٹا ہونا، فرانس کے لیے قابلِ شرم ہے اور اُس کی شائستگی کو دھبا لگاتا ہے۔ پھر کہتا ہے کہ "اس تصویر سے امام عبدالقادر کی حقارت نہیں ہوتی بلکہ اُس کی ویسی ہی عزت و دل میں پیدا ہوتی ہے جیسی الجزائر کی بادشاہت کے زمانہ میں تھی۔ وہ بیس برس تک تن تنہا فرانس جیسی سلطنت سے نہایت بہادری اور سچائی سے بغیر دغا اور فریب کے لڑتا رہا اور شکست کے بعد جن شرطوں پر صلح کی اُن کو اخیر عمر تک نباہ دیا۔" پھر ایک دوسرے موقع کی تصویر

دیکھتا ہے جس میں نپولین امام عبدالقادر کو قید سے چھوڑ رہا ہے اور اس کی ماں سے جو باہر پھرنے کا پورا پردہ دار لباس پہنے کھڑی ہے، مصافحہ کر رہا ہے۔ اس تصویر کو دیکھ کر نپولین کی فیاضی، دانائی اور سمیت کی تعریف کرتا ہے اس کے بعد وہ لندن پہنچتا ہے اور اپنے سفر نامہ کے خاتمہ پر ہندوستان کے تمام سنی شیعہ اور ہندوؤں کو آگاہ کرتا ہے کہ سب ہندوستانی اپنے اپنے مذہب کی پابندی کے ساتھ یہ سفر طے کر سکتے ہیں، پھر اپنے جان پہچان انگریزوں کی ملاقات کا ذکر کرنے کے بعد کلفٹن کے لشکروں پل کے بننے کی تاریخ بیان کرتا ہے۔ جو مدت سے ناتمام پڑا تھا اور جس کو سول انجینیرس انسٹیٹیوٹ کے ممبروں نے ایک ممبر کی بدنامی کے خیال سے یا ہم اتفاق کر کے اپنی فیاضی سے بنا دیا۔ پھر اپنے ہم وطنوں کی طرف مخاطب ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے ہم وطنو! بتاؤ کہ انسان یہ لوگ ہیں یا ہم جو حیوانوں کی طرح اپنی خود غرضیوں میں مبتلا ہیں اور اپنے ہر ایک کام کا بندوبست گورنمنٹ سے چاہتے ہیں کہ ہمارے لڑکوں کو بھی وہی پڑھائے ہماری مذہبی تعلیم کا بھی وہی انتظام کرے۔ پھر ایک رصد گاہ کا ذکر لکھ کر کہ ایک عورت اس کا تمام کام انجام دیتی ہے اپنے ملک کے مدعیان علم و فلسفہ و منطق کو شرمندہ کرتا ہے۔

یہ سفر نامہ نہایت دلچسپ طریقہ سے لکھا شروع ہوا تھا، مگر جوپ اس کے کچھ حصے ہندوستان میں شائع ہوئے تو مسلمانوں کی طرف سے اس پر اعتراضوں کی بوجھاڑ پڑنی شروع ہوئی اور سرسید کو بھی لندن ہی میں لوگوں کی مخالفت کا حال معلوم ہوا۔ ابھی حضرت کے کان ایسی مخالف صدوں سے زیادہ آشنا نہ تھے، اس لیے انہوں نے ناراض ہو کر سفر نامہ لکھا سو تو

کر دیا، مگر زمانہ بہ آواز بلند کہہ رہا تھا۔
 ابتلائے عشق ہے دوتا ہے کیا آگے آگے دیکھنا ہوتا ہے کیا

لندن کے عائد سے ملنا

الغرض سرسید بمبئی سے چوبیس دن میں لندن پہنچے اور میکن برگ اسکوائر
 میں ایک مکان کرایہ پر لے کر ٹھہرے اور اپنے تمام دوستوں اور آشناؤں سے
 ملے۔ لارڈ لارنس سب سے زیادہ مہربانی مروت اور خلق سے ان کے ساتھ
 پیش آئے، جیسے کہ وہ ہمیشہ ہندوستان کے مسافروں کے ساتھ پیش آتے
 تھے۔ وہ ہندوستان میں سرسید اور ان کے خاندان کو اچھی طرح جانتے تھے۔
 اور ان کی خدمات سے آگاہ تھے۔ لندن میں وہ اکثر ان کو اپنے گھر ڈنر پر بلاتے
 تھے اور مہینے میں ایک بار ہمیشہ ان سے ملنے کو آتے تھے۔ انہوں نے ہی سرسید
 کو لندن کے اکثر امرا و مشاہیر سے ملوایا تھا، لارڈ اسٹینلی اور الیڈرلی
 جو قسطنطنیہ میں بطور سفیر انگریزی کے رہتے تھے وہ بھی جب لندن میں آئے
 تھے تو سرسید سے ملتے رہتے تھے۔ سر جان دلیم کے انڈسٹری وزیر ہند
 کے ساتھ بھی سرسید کو زیادہ خصوصیت ہو گئی تھی۔ ملکہ معظمہ کے سدھی ڈیوک
 آف آرگائل جو اس وقت وزیر ہند تھے اور سائمنٹک سوسائٹی علیگرہ
 کے پٹرن بھی تھے وہ بھی سرسید سے بڑے اخلاق اور تپاک کے ساتھ
 ملتے رہے اور اپنے بیٹے مارکوٹس آف لارن سے بھی جو ملکہ معظمہ کے داماد
 ہیں ان کو ملایا۔

جلسہ سول انجینئرس سوسائٹی میں شریک ہونا

سر سید نے پورے سترہ مہینے لندن میں قیام کیا اور شب و روز ان کاموں میں جوں کے لیے یہ سفر اختیار کیا تھا مصروف رہے۔ با اینہم ان کو اکثر خاص خاص تقریبوں میں بلایا جاتا تھا اور ان کی عزت افزائی کی جاتی تھی۔ ۲۳ جون ۱۸۶۹ء کو وہ لارڈ لارنس کے ہاں ایک بہت بڑے ڈنر پر بلائے گئے اور ۱۳ جولائی کو سمٹونین سوسائٹی اور سول انجینئرس کے ایک عظیم الشان جلسہ میں اور اس کے بعد جو اسی کے متعلق گریچ میں ڈنر ہوا اس میں شریک ہوئے۔ اس جلسہ کی کیفیت ڈبلیو نیوز مورخہ ۲۱ جولائی میں مفصل درج ہوئی تھی۔ خلاصہ یہ ہے کہ مسٹر پین نے جو سوسائٹی مذکورہ کے پریسیڈنٹ تھے، سر سید کو اس جلسہ میں شریک ہونے کے لیے مدعو کیا تھا اور لکھا تھا کہ آپ وقت متعین پر میرے اسٹیمر میں جو پارلیمنٹ ہوس کے سامنے موجود ہو گا، آئیں۔ مگر خود لارڈ لارنس سر سید کے مکان پر آئے اور ان کو اپنے ساتھ سوار کرا کے لے گئے۔ سید حامد اور سید محمود بھی ساتھ تھے، اسٹیمر میں جا کر حاضری کھائی اور ٹیمپز کے کنارے پر جو بڑے بڑے کارخانے تھے دیکھے۔ پھر خاص اجازت سے ایک جنگلی جہاز اور اس میں توپیں بھرنے اور چلانے کا تماشا دیکھا۔ وہاں سے گریچ میں جا کر ڈنر کھایا، اس ڈنر میں کئی ڈیوک اور بہت سے لارڈ اور بڑے بڑے انجینئرس شریک تھے۔ کھانے میں طرفہ بات جیسا کہ ڈنر مذکور کی مینیولہ

لے مینیو ایک خوبصورت چھپا ہوا کاغذ ہوتا ہے جس پر ڈنر کے تمام کھانوں کی تفصیل ہوتی ہے اور کھانے کے وقت ہر ایک مہمان کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔ اس ڈنر کا مینیو سر سید کے کاغذات میں اب تک موجود ہے جس میں تیس کھانوں کے نام لکھے ہیں ۱۲۔

میں مندرج ہے۔ یہ تھی کہ نہیں طرح کے کھانے صرف دریائی پیداوار اور دریائی جانوروں سے تیار کیے ہوئے تھے؛ خشکی کی پیداوار سے کوئی چیز میسر نہ تھی تمام انجینیروں نے جو اس جلسہ میں شریک تھے کھانے کے بعد سوچیں دیں اور سال گذشتہ کی مختلف ترقیات کا اجرا انجینرنگ میں ہوئیں ذکر کیا۔ سب کے بعد پریسیڈنٹ نے پیج دی اور آخر میں لارڈ لارنس اور سر سید کا ذکر کر کے ان کے شامل ہونے پر فخر ظاہر کیا اس کے شکریہ میں لارڈ لارنس نے تقریر کی اور سر سید کے پاس ایک ترجمان کو اس غرض سے بٹھا دیا تھا کہ جلسہ کی تمام کارروائی کو ان کو اردو میں سمجھاتا جائے، لارڈ لارنس کے بعد سر سید اٹھے۔ ایک ایسے جلسے میں جہاں انگلستان کے نامور انجینر جمع ہوں اور جلسہ کا موضوع انجینرنگ کے سوا اور کوئی مضمون نہ ہو، سر سید کو گفتگو کرنا نہایت دشوار تھا، باوجود اس کے ڈیلی نیوز نے اسی زمانہ میں لکھا تھا کہ سید احمد خاں کی اسپچ شاندار اور دلچسپ تھی، پریسیڈنٹ نے لارڈ لارنس کو سیویر آف انڈیا کہا تھا، سر سید نے ان کو فادر آف انڈیا کہا کر یا دیا، سر سید کی اسپچ کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوستان میں انگریزی سلطنت کا رعب و داب اور دبدبہ پیدا ہونے کے بہت سے فریضے ہیں، مثلاً تعلیم، ہتھیار اور عدل و انصاف وغیرہ، مگر یہ سب چیزیں ایسی ہیں جن سے صرف انہیں لوگوں کے دل میں اس کی وقعت پیدا ہوتی ہے جن کو ان سے کام پٹا ہے یا جن کو ان سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا ہے، لیکن وہ چیز جس نے خاص و عام سب کے دل میں انگلش گورنمنٹ کی عظمت پیدا کی ہے وہ فن انجینری کے نتائج ہیں، جیسے ریل، بڑے بڑے دریاؤں کے پل، نہریں اور بڑے بڑے پہاڑی چھتے جن میں سے ریل گذرتی ہے، ان چیزوں کو ہر شخص دیکھتا ہے اور اس کے دل میں خود بخود انگریزی

سلطنت کا رعب و داب اور اس کی بڑائی پیدا ہوتی ہے۔ اس پر جلسہ میں نہایت زور سے چیز زوی گئیں اور جب لارڈ ڈلارنس نے اس کو انگریزی میں ترجمہ کر کے سنایا تو پہلے سے بھی زیادہ چیز کا غل ہوا۔ سرستید کہتے ہیں کہ میرا ارادہ اسپرچ کرنے کا پہلے سے نہ تھا مگر چونکہ میری نسبت ایسے الفاظ کہے گئے تھے جن کا شکریہ ادا کرنا ضرور تھا اس لیے مجھ کو بھی کھڑا ہونا پڑا۔

خطاب اور تمغہ ملنا

۲۶ اگست ۱۸۶۹ء کو انڈیا اوفس میں ڈیوک آف آرگائل کے ہاتھ سے ان کو سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب اور تمغہ ملا۔ اس کی تحریک لارڈ ڈلارنس نے کی تھی۔ تاریخ معین پر سرستید انڈیا آفس میں گئے، وہاں سر جان ڈبلیو کے انڈر سکریٹری وزیر ہند آئے اور سرسید سے ہاتھ ملا کر ان کو اپنے ہمراہ اس کمرے میں لے گئے جہاں ڈیوک آف آرگائل ان کے منتظر تھے۔ ڈیوک کھڑے ہو کر چند قدم آگے بڑھے اور سرستید سے ہاتھ ملا کر پھر اپنے بیٹے مارکونس آف لارن سے ملاقات کرائی اور تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد تمغہ اپنے ہاتھ سے پھرایا اور مبارک باد کہہ کر سرسید کو رخصت کیا، اسی روز چار اور شخصوں کو بھی یہی تمغہ ملنے والا تھا، جب سب کو تمغے مل چکے تو ڈیوک موصوف نے سرسید کو کھانے پر بلایا جہاں بہت سے معزز لوگ اور پارلیمنٹ کے ممبر آئے تھے۔ سرسید کو اس موقع پر ڈیوک کے برابر بائیں جانب جگہ دی گئی تھی۔ لطیفہ جس زمانہ میں سرسید کو ولایت میں سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب ملا اس کے کچھ دنوں بعد راجہ جیکین داس صاحب کو یہی خطاب ہندوستان میں بمقام علیگڑھ ملا تھا اور اس کے تمام مراسم سوسائٹی کے بڑے ہال میں آئے تھے

جب جلسہ برخواست ہوا اور راجہ صاحب کے تمام دوست اُن کو مبارکباد دینے لگے، سوسائٹی کا ایک ملازم ہر ایک کی زبان سے سی۔ ایس۔ آئی کا لفظ سننا تنہا اور نہایت تعجب کرتا تھا۔ باہر آ کر اور نوکروں سے کہنے لگا ارے یارو عجب تماشا ہے سید احمد خاں تو خیر! لندن گئے ننھے وہاں جا کر عیسائی ہوئے کسی نے جانا کس نے نہ جانا، ان راجہ صاحب کو کیا ہوا تھا۔ کہ یہ ہندوستان ہی میں بھرے جلسہ کے اندر عیسائی بن گئے۔ لوگوں کی زبان سے جو بار بار سی۔ ایس۔ آئی کا لفظ نکلتا تھا وہ اس کو عیسائی سمجھتا تھا۔

ملکہ معظمہ کی لوی وغیرہ میں بلایا جانا

۶ نومبر ۱۹۶۹ء کو ملکہ معظمہ کے ہاتھ سے بلیک فرائزر راج، ہا بھورن اور ایڈرکٹ کے افتتاح کا جلسہ ہونے والا تھا، جلسہ کی انتظامی کمیٹی نے سرسید کو بھی خاص طور پر وہاں مدعو کیا تھا۔ سرسید کہتے ہیں کہ یہ جلسہ نہایت شان و شوکت کا تھا۔

پھر ۱۱ مارچ ۱۹۷۰ء کو ملکہ معظمہ کی لوی میں اُن کو بلایا گیا۔ سرسید کہتے ہیں کہ حسب معمول لوی کے محل میں مجھ کو اور درباریوں کے ساتھ بٹھا دیا گیا تھا۔ جب ملکہ معظمہ تشریف لائیں تو میں نے بھی مثل تمام درباریوں کے اپنے نمبر پر سامنے جا کر سلام کیا۔ سلام کرنے کا دستور یہ ہے کہ ملکہ معظمہ سے ہاتھ ملا کر اور بایاں گھٹنا ٹیک کر حضور ممدوحہ کے ہاتھ پر بوسہ دیتے ہیں۔ جب تک تمام درباریوں کا اس طرح سلام نہیں ہو لیتا اُس وقت تک ملکہ کھڑی رہتی ہیں۔

پرنس آوف ویلز کی لوی میں بلایا جانا

اس کے بعد شہنشاہ کو پرنس آوف ویلز کی لوی میں ان کو شریک کیا گیا۔ یہ لوی صرف فوجی افسروں کے لیے تھی، کسی سویلین کو اس میں شریک ہونے کی اجازت نہ تھی، مگر چونکہ سر سید ولایت سے جلد واپس آنے والے تھے اور ممکن تھا کہ ان کو پھر پرنس آوف ویلز کی کسی لوی میں شریک ہونے کا موقع ملے، اس لیے ان کو خاص اجازت لوی میں شریک ہونے کی مل گئی تھی۔

تھینیم کلب کی ممبری

لندن کی علمی مجلسوں میں بھی سر سید شریک ہوتے رہے۔ لندن جانے سے پہلے جیسا کہ دوسرے باب میں ذکر ہو چکا ہے وہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے فیلو مقرر ہو چکے تھے۔ جب لندن میں گئے تو اس کے کئی اجلاسوں میں شریک ہوئے وہ کہتے ہیں کہ چارلس ڈکنس کی آخری ریڈنگ پر بھی میں وہاں موجود تھا، لیکن سب سے بڑا امتیاز جو ان کو لندن میں ایک علمی حیثیت سے ملا وہ تھینیم کلب کا آئری میمبر مقرر ہونا تھا۔ یہ کلب لندن میں سب سے زیادہ نامی اور معزز ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی کلب مغر زخیال نہیں کیا جاتا۔ کوئی شخص جو مشہور مصنف یا کسی دوسرے کمال علمی میں ممتاز نہ ہو وہ اس کلب میں ممبر نہیں ہو سکتا۔ اس کے ممبروں کی تعداد بارہ سو تک محدود ہے۔ سیکڑوں آدمی درخواستیں دے دیکر یہاں کی ممبری کے امیدوار رہتے ہیں سر سید کہتے تھے کہ ۱۸۶۰ء میں جب کہ میں وہاں موجود تھا تین ہزار سے زیادہ امیدواروں کا نام درج رجسٹر تھا اور دس دس بارہ بارہ برس امیدواری پر

گزر گئے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جو شخص اس کلب کا ممبر مقرر ہوتا ہے اُس کے دوست اس کو مبارکباد کی چٹھیاں لکھتے ہیں اور اس کو ایسا فخر ہوتا ہے کہ ویسا فخر اکثر خطابوں کے ملنے پر بھی نہیں ہوتا۔

غرض کہ سر سید فاضل قاعدے سے جو نامور اور مشہور باکمال لوگوں کے لیے مقرر ہے دو دفعہ ایچیفینیم کلب کے آئزبری ممبر مقرر ہوئے اور جب تک لندن میں رہے اُس کے ممبر رہے اس کلب کی ممبری کی تحریک مسٹر اڈورڈ ٹامس نے کی تھی جو سر سید کی منفی کے زمانہ میں دلی کے جج تھے اور جنہوں نے اُن کو آثار الصنادید کے دوبارہ لکھنے اور ترمیم کرنے کی صلاح دی تھی۔

کیمبرج یونیورسٹی میں جانا

آثار الصنادید کا مترجم گارساں و تاسی جو فرانس کے مشہور مستشرقین میں سے تھا وہ بھی لندن ہی میں سر سید سے خط کتابت اور شوقِ ملاقات رکھتا تھا۔ مگر یہ تمام اعزاز و اقیانہ اور خاطر و مدارات جن کا ہندوستان سے لے جاتے وقت سر سید کو سان گمان بھی نہ تھا۔ یہ سب ضمنی اور غیر متوقع امور تھے۔ اُن کے اصلی مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد انگلستان کے طریقہ تعلیم کو دیکھنا اور اُس پر غور کرنا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس غرض سے کیمبرج یونیورسٹی کو خود جا کر دیکھا اور ٹری سے ٹری اور چھوٹی سے چھوٹی چیز پر جو یونیورسٹی سے علاقہ رکھتی تھی غور کی اور اس کا تمام نقشہ ذہن نشین کر لیا۔ پھر ملک کی عام تعلیمی حالت کا اندازہ کیا، تعلیم نسواں کو غور کی نگاہ سے دیکھا اور تعلیم کے مختلف

طریقوں میں سے جو طریقہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کے مناسب سمجھا
اُس کو نگاہ میں رکھا۔ اگرچہ انگریزی زبان کی ناواقفیت کی وجہ سے ضرور ہے کہ
اُن کو ہر ایک بات کے سمجھنے اور دریافت کرنے میں سخت دقتیں اٹھانی
پڑی ہوگی، اور شاید اُن کو پوری واقفیت حاصل نہ ہو سکی ہو، مگر جو نتیجے اس
ادھوری واقفیت سے ہندوستان میں ظاہر ہوئے وہ بلکہ اُن کا عشر عشر
آج تک اُن ہندوستانیوں کی پوری واقفیت سے بھی ظہور میں نہیں آیا جو
ولایت سے اعلیٰ درجہ کی تعلیم پا کر آئے ہیں۔

انگلستان کی تعلیم و ترقی پر غور کرنا

انگلستان کے طریقہ تعلیم پر غور کرنے کے بعد سرسید نے لندن ہی
میں ایک پمفلٹ انگریزی میں شائع کیا جس میں ہندوستان کے طریقہ تعلیم کے
نقصانات تفصیل کے ساتھ ظاہر کیے تھے۔ تعلیم کے سوا یورپ کی عام شائستگی
اور طرز تمدن اور حسن معاشرت اور ہر قسم کی ترقیات کے اسباب جیسا کہ اُن
کی تحریروں سے ثابت ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیے اور جہاں تک ممکن تھا اپنی
معلومات کو وسعت دی۔ یورپ کے طریق معاشرت کو دیکھا۔ وہاں کے
اسرا کے محل اور مکانات اور طرز ماند و بود پر نظر کی۔ عجائب خانوں اور کتب
خانوں میں علوم اور تحقیقات کے ذخیرے ملاحظہ کیے۔ انجینیری کے عجائبات
جہازوں کی تیاری، توپوں کا ڈھلنا، سمندری تار کا بٹنا، انجینروں اور عالموں کی
سوسائٹیاں، عام کارگیروں اور اہل حرفہ کے کام اور عموماً اہل انگلستان
کے علمی ذوق و شوق اور علمی ترقیات کو دیکھا جس سرگرمی کے ساتھ
اہل مذہب، مذہب کی حمایت کرتے ہیں اور باوجود اس کے نہایت بے تعصبی

سے غیر مذہب والوں کے ساتھ پیش آتے ہیں اور جو اخلاق کہ وہ پڑوسیموں اور مہانوں کے ساتھ برتتے ہیں، یہ سب کچھ دیکھا۔ اُن کے عیبوں سے قطع نظر کی اور ان کی خوبیوں کو چُٹنا اور یہ سب کچھ ایک تماشائی کی طرح سیر تماشے اور دل لگی کے طور پر نہیں بلکہ ایک وطن دوست کی طرح دلسوزی، غیرت اور عبرت کی نگاہ سے دیکھا اور انگلستان کی حالت کو اپنے ملک کی حالت سے مقابلہ کر کے اپنے درد کو بڑھایا اور اُس درد کو دوسروں کے دلوں میں درد پیدا کرنے کا ایک ذریعہ بنایا۔ وہ مولوی سید مہدی علی خاں کو ایک خط میں ولایت سے لکھتے ہیں "میرے ایک معزز دوست نے ایک بہت بڑے جلسہ میں جہاں نہایت تکلف کی پوشاک پہننے کئی سو مرد اور لیس ڈیاں خوبصورت، خوش کلام اور قابل جمع تھیں، پوچھا کہ "کہو لندن بہشت ہے۔ اور حوروں کا ہونا کسچ ہے یا نہیں؟ مگر ہماری قسمت میں وہی جلتا ہے یہاں کا حال دیکھو دیکھو اپنے ملک اور قوم کی حماقت، بیجا تعصب، موجودہ تنسزل اور آئندہ ذلت کے خیال سے زنج و غم زیادہ بڑھ گیا ہے اور کوئی تدبیر اپنے ہوطنوں کے ہوشیار کرنے کی نہیں معلوم ہوتی۔"

اُن کا ارادہ تھا کہ انگلستان اور ہندوستان کی حالت میں جو زمین و آسمان کا فرق ہے اُس کو اپنے سفر نامہ میں مفصل بیان کر کے اہل وطن کو خبردار کریں مگر اہل وطن نے اُس کو بر داشت نہ کیا۔ وہ اپنی پستی کی درد انگیز داستان نہ سن سکے اور اس لیے جو سلسلہ سرسید نے اپنے سفر کے حالات کا لکھنا شروع کیا تھا، وہ منقطع ہو گیا۔ با اینہم وہ وقتاً فوقتاً اپنے سفر کے حبابہ جتہ حالات لکھنے سے دست بردار نہیں ہوئے اور جب کبھی موقع ملا انہوں نے کوئی نہ کوئی بات اہل وطن کے کان میں ڈال دی۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو انہوں نے ایک لمبی نثریہ سوسائٹی اخبار میں چھپنے کو بھیجی جس میں چھ مہینے کے حالات مختصر طور پر بیان کیے تھے اور یورپ کی ترقی اور اپنے ملک کے اویار اور منزل کی مثالیں پیش کر کے اہل وطن کو غیرت دلائی تھی جب اس نثریہ کا نتیجہ بھی سوا اس کے کہ لوگ برا فرختہ ہوں اور برا بھلا کہیں، کچھ حاصل نہ ہوا تو ۲۲ مارچ ۱۹۷۰ء کو ایک دوسری نثریہ بعنوان "عذرا طرف گنہگار سید احمد" ہندوستان میں بھیجی۔ پھر ایک اور نثریہ بعنوان "عزداشت سید احمد خدمت اہل وطن" اخبار میں چھپنے کے لیے روانہ کی۔ ان تمام نثریوں کے دیکھنے سے نجومی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُس زمانے میں سر سید کو اہل وطن کی بھلائی کا کس قدر خیال تھا۔ گو ان نثریوں سے قوم و ملک کے کان پر جوں نہیں چلی، مگر درحقیقت یہ سب تمہیدیں تھیں ان کارروائیوں کی جو آخر کار ہندوستان میں پہنچ کر سر سید کے ہاتھ سے ظہور میں آنے والی تھیں۔

خطبات احمدیہ کا لکھنا اور چھپوانا

ان سب باتوں کے سوا سر سید کا سب سے زیادہ ضروری اور اہم مقصد ولایت کے سفر سے ایک ایسی کتاب کا لکھنا اور انگریزی میں اُس کا ترجمہ کرنا تھا جس سے اسلام کی اصلیت عیسائی قوموں پر ظاہر ہو اور جو غلطیاں اکثر عیسائی مصنفوں نے اور خاص کر سر ولیم میور نے اپنی کتاب "لائف آف محمد" میں اسلام کی حقیقت اور بانی اسلام کے کیرکٹر ظاہر کرنے میں دانستہ یا نادانستہ کی ہیں ان کو رفع کیا جائے۔ سر ولیم میور کی کتاب کی نسبت اکثر انگریزوں کا یہ خیال تھا کہ اسلام کے متعلق

جو ٹھیک اطلاقیں سرولیم نے اہل یورپ کو دی ہیں وہ پہلے کسی دوسرے ذریعہ سے اُن کو حاصل نہیں ہوئی تھیں۔ مگر درحقیقت یہ کتاب صرف عیسائیوں ہی کو اسلام اور بانی اسلام کی طرف سے گمراہ کرنے والی نہ تھی بلکہ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کو بھی اسلام کی طرف سے شک میں ڈالنے والی تھی۔

اس کتاب کے مضامین کی تفصیل اور جو وقتیں سرستید کو اس کے لکھنے اور چھپوانے میں پیش آئیں اور جس جوش اور اُتک سے انہوں نے یہ کتاب لکھی اور جو رائیں انگریزوں نے اُس پر دیں، یہ سب امور ہم دوسرے حصہ میں بیان کریں گے۔ یہاں صرف اس قدر لکھتے ہیں کہ ولایت میں سرستید نے کتاب کی لاگت بڑھ جانے کے خوف سے صرف اپنی یادداشتوں کا خلاصہ انگریزی میں ترجمہ کہہ کے چھپوایا تھا مگر ہندوستان میں پہنچنے کے بہت بعد انہوں نے اُس کو اُردو میں بھی اپنی پوری یادداشتوں سے از سر نو مرتب کر کے تصانیف احمدیہ کے ساتھ بڑی تفصیح پر شائب میں چھپوایا تھا جس میں ہر ایک مضمون بہ نسبت انگریزی کے زیادہ وسعت کے ساتھ بیان ہوا ہے مگر چونکہ اس کی جلدیں بہت ہی کم چھپوائی گئی تھیں اس لیے اُس کی زیادہ اشاعت نہیں ہو سکی۔ خطبات احمدیہ لکھنے کے سوا انہوں نے ولایت ہی میں اور بھی اسلام کی بعض خدمتیں انجام دی ہیں جن کا ذکر دوسرے حصہ میں کیا جائے گا۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سرستید نے جس تحریر کے ذریعہ سے ولایت جاننے کے لیے گورنمنٹ سے اجازت چاہی تھی، جو کچھ اس تحریر میں لکھا تھا، اُس سے بہت زیادہ اپنے ارا دوں کو پورا کر کے دکھایا، وہ لندن سے نہایت

قیمتی اطلاعاتیں سیکر ہندوستان میں آئے جن سے انھوں نے ملک اور قوم کو بے انتہا فائدہ پہنچایا۔ شمالی ہندوستان میں ان سے پہلے ظاہر کسی ہندو یا مسلمان نے اپنی اولاد کو تعلیم کے لیے ولایت نہیں بھیجا تھا۔ غالباً سید محمود شمالی ہندوستان میں پہلے شخص ہیں جو ولایت سے بیرسٹری کا ڈپلوما لے کر آئے محض انھیں کی ریس سے اس ملک کے ہندو مسلمانوں کو اپنی اولاد کے ولایت بھیجنے کا حوصلہ پیدا ہوا اور انھیں کی دیکھا دیکھی ولایت جانے والے ویسی طالب علموں کا ہندوستان سے انگلستان تک تانتا بندھ گیا۔ جس زمانہ میں سرسید ولایت گئے ہیں انھیں دنوں میں سائنٹفک سوسائٹی اخبار علیگڑھ میں چھپا تھا کہ "سید احمد خاں کے ولایت جانے سے ہندوستانوں کے واسطے ایک عمدہ مثال قابل تقلید قائم ہو گئی ہے چنانچہ کلکتہ کے ایک نوجوان مسلمان سید امیر علی (جو اب آئرہیل سید امیر علی سی۔ ایس آئی بیرسٹریٹ لا اور جج ہائی کورٹ کلکتہ ہیں) لندن روانہ ہوئے ہیں اور بہت سے ولایت جانے کو تیار ہو رہے ہیں۔" سید امیر علی نے صرف ولایت کا سفر کرنے ہی میں سرسید کی تقلید نہیں کی بلکہ اسلام کی خدمت کرنے میں اور اس کی عوہبیاں یورپین قوموں پر ظاہر کرنے میں بھی انھوں نے سرسید کا پورا پورا اتباع کیا ہے۔ ان کی دو باوقعت کتابیں "لائف اوف محمد" اور "اسپرٹ اوف اسلام" جو انگریزی میں شائع ہو چکی ہیں اس دعوے کی شاہد ہیں۔

نواب حسن الملک اپنی ایک نثر پر میں آئرہیل حاجی اسماعیل خاں کو لکھتے ہیں کہ "سید احمد خاں ولایت گئے، مگر اس مطلب سے کہ اپنی آنکھ سے اُس قوم کو جو اس وقت تمام اقوام روٹے بین پر شرف رکھتی ہے انھیں کے گھروں میں اور انھیں کے ملک میں دیکھیں اور جو کچھ وہاں دیکھا ہے۔"

واپس آکر اپنی قوم میں پھیلائیں۔ لوگ ولایت میں جا کر تماشہ گاہ، تھیٹر، پارک میوزیم اور عمارات کی سیر کرتے ہیں۔ اور یہ حامی دین اسلام کتب خانہ میں بیٹھا ہوا خطبات احمدیہ کی تصنیف میں منہمک تھا اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے انتظام پر غور کر رہا تھا۔ اس شخص کا ولایت جانا قوم کے واسطے تھا، رہنا قوم کے واسطے اور واپس آنا قوم کے واسطے۔

الغرض سرسید ایک سال اور پانچ مہینے لندن میں قیام کرنے کے بعد ۴ ستمبر ۱۸۵۸ء کو مع سید حامد مرحوم کے لندن سے ہندوستان کو روانہ ہوئے۔ ان کی روانگی کے بعد ایک سلباً مضمون ہندوستان کے ایک مسلمان مقیم لندن سید عبد اللہ نام نے اخبار ہوم ورڈ میل مورخہ ۲۶ ستمبر ۱۸۵۸ء میں سرسید کی نسبت چھپوایا تھا جو سوسائٹی اخبار مورخہ ۱۱ نومبر ۱۸۵۸ء میں بھی نقل کیا گیا تھا۔ اس مضمون میں سے چند فقرے مختلف مقامات سے لکھے جاتے ہیں "جن انگریزوں سے یہاں یعنی انگلستان میں ان کی ملاقات ہوئی ان پر ان کی عام بیباقت کا اور اس بات کا کہ جن شخصوں نے ان سے ہندوستان کی بابت گفتگو کی ان سب کو ہر ایک امر سے بخوبی آگاہ کر دیا، بہت عمدہ اثر ہوا، یہاں کے بہت سے مدیران سلطنت کی رائے ہے کہ، اگر ہم ایک ایسے لائق اور واقف کار ہندوستانی مسلمان سے جیسے کہ سید احمد خاں ہیں، نہ ملتے تو ہندوستانیوں کی بیباقت کی نسبت ہماری رائے ہمیشہ ضعیف اور لودھی (پورا) ہوتی۔" - اس مضمون کے لکھنے سے سیرمی یہ عرض ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ جو ہندوستانی تربیت یافتہ اور مہذب ہوتا ہے اس کی اہل یورپ کیسی بڑی قدر و منزلت کرتے ہیں۔... سید احمد خاں

کی بدولت اس بات کا ثبوت حاصل ہونے سے بڑی خوشی حاصل ہوتی ہے کہ اس ملک میں ہندوستان کے ایک شریف آدمی کی بڑی قدر و منزلت ہوتی ہے اور اعلیٰ درجہ کے انگریز اس سے بڑی محبت اور تواضع اور تکریم سے پیش آتے ہیں۔“

۱۸۶۰ء سے ۱۸۶۸ء تک

ولایت سے واپس آنا۔ تہذیب الاخلاق جاری کرنا۔ کمیٹی
 خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان۔ کمیٹی خزانہ البصاعة ڈاکٹر ہنٹر کی
 کتاب پر ریویو، ابتدائی مدرسہ علیگڑھ میں قائم کرنا۔ کالج فوڈیشن
 سٹون۔ چندہ وصول کرنیکی تدبیریں۔ عمارت کالج۔ کالج کلاس قائم
 ہوئی۔ تفسیر القرآن۔

ولایت سے ہندوستان میں واپس آنا

۲ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو سر سید مع سید حامد مرحوم کے ولایت سے بلٹی پہنچے
 اور اسی مہینے میں بنارس پہنچ کر اپنے عہدہ کا چارج لیا۔ یہاں آنے ہی انہوں
 نے اس بڑے کام کی بنیاد ڈالنی شروع کی جس کے لیے درحقیقت ولایت کا
 سفر اختیار کیا تھا، مسلمانوں کی تعلیم کا منصوبہ جو انہوں نے ولایت جانے سے
 بہت پہلے باندھا تھا اس کے پورا کرنے میں ظاہراً ان کو دوست مزاحمتیں نظر
 آتی تھیں۔ اول مسلمانوں کے مذہبی اوہام، انگریزی تعلیم سے ان کی نفرت اور ایجوکیشن
 کے مفہوم سے ناواقفیت۔ اس مزاحمت کے دور کرنے کے لیے انہوں نے
 ولایت پہنچتے ہی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھی۔ سفر کے حالات اور متعدد ڈریسنگ

جو انھوں نے لندن سے لکھکر بھیجے اور سوسائٹی اخبار میں شائع ہوئے اُن میں طرح طرح سے مسلمانوں کو غیرت دلائی تھی اور جا بجا اُن کے تنزل پر افسوس ظاہر کیا تھا اور انگریزی تعلیم کی ضرورت بیان کی تھی لیکن ان تحریروں کا اثر مسلمانوں پر کچھ نہیں ہوا۔ دوسری مزاحمت اُن کو یہ معلوم ہوتی تھی کہ اُن کا ارادہ جیسا کہ آگے مفصل بیان کیا جائے گا کافی الواقع ہندوستان میں پہنچ کر ایک محض یونیورسٹی قائم کرنے کا تھا، کیونکہ ہندوستان کی موجودہ یونیورسٹیوں کے نظام تعلیم سے ہندوستانوں میں حقیقی بیاقت پیدا ہونے کی اُن کو ہرگز امید نہ تھی۔ اس لیے ضرور تھا کہ گورنمنٹ کے طریقہ تعلیم کو مسلمانوں کے لیے ناکافی اور ہندوستان کے ایجوکیشنل سسٹم کو غیر مفید قرار دیا جائے۔ چنانچہ اسی بنا پر انھوں نے ولایت میں ایک پمفلٹ انگریزی زبان میں شائع کیا تھا جس کا عنوان ”ہندوستان کے موجودہ نظام تعلیمی پر اعتراضات تھا مگر چونکہ اُس میں سرستید نے اپنی ذاتی رائے لکھی تھی اس لیے اُس سے بھی کسی نتیجہ کے پیدا ہونے کی امید نہ تھی۔ ان دونوں رکاوٹوں کے دور کرنے کے لیے انھوں نے ہندوستان میں پہنچ کر دو برس بڑے کام ایک ساتھ شروع کیے۔

تہذیب الاخلاق

اول مسلمانوں کے مذہبی خیالات کی اصلاح اور اُن کو ترقی کی طرف مائل کرنے کے لیے پریچہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ انھوں نے اس پریچہ کے نکلانے کا ارادہ ولایت ہی میں کر لیا تھا کیونکہ تہذیب الاخلاق کی پیشانی پر جو اس کا نام اور بیل چھپتی تھی اُس کا ٹائپ وہ لندن سے بنا کر اپنے

ساتھ لائے تھے۔ الغرض سرسید اور ان کے دوستوں کی ایک کمیٹی قائم ہوئی جس کے ہر ایک ممبر سے تہذیب الاخلاق کے اخراجات کے لیے ساڑھے روپیہ سالانہ اور عام خریداریوں سے ساڑھے چار روپیہ سالانہ لینا قرار پایا تھا۔ یکم شوال ۱۲۸۶ھ ہجری مطابق ۲۲ دسمبر ۱۸۶۸ء کو اس کا اول نمبر شائع ہوا اور پہلی بار شوال ۱۲۸۷ھ سے رمضان ۱۲۹۳ھ یعنی پورے چھ برس تک ہر نمبر نکلتا رہا اور ہمیشہ اُس کے اڈیٹر اور منیجر خود سرسید رہے چونکہ یہ پرچہ کوئی تجارتی عبارت نہ تھا بلکہ محض قوم کی بھلائی کے لیے جاری کیا گیا تھا، اس لیے جو کچھ آمدنی ہوتی تھی وہ اُس کی ترقی میں صرف کی جاتی تھی۔ اُس کی اخیر جلدوں میں ہر نمبر کی پیشانی پر بطور مالو کے یہ عربی فقرہ لکھا جاتا تھا سُبَّانَ لِلَّهِ مِنَ الدُّمَيَّانِ فَمَنْ يَسْعَ فِي اعْزَازِ قَوْمِهِ اِنَّمَا يَسْعَى فِي اعْزَازِ دِيَارِهِ

تہذیب الاخلاق ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے تقریباً ویسا ہی پرچہ تھا جیسے اسٹیل اور اولسن نے دو میگزین یعنی ٹیلر اور اسپیکٹیر نوٹ بہ نوبت لندن میں نکالے تھے اور ۱۸۶۹ء سے ۱۸۷۳ء تک جاری رہے۔ ان دونوں پرچوں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ان سے انگریزوں کے اخلاق عادات رسم و رواج اور قومی خیالات پر بہت بڑا اثر ہوا تھا۔ اگرچہ اُس وقت انگلستان کی حالت کیا باغیہ علوم و فنون اور کیا باعتبار اخلاق و معاشرت کے آج کل کی حالت سے کچھ نسبت نہ رکھتی تھی مگر مذہبی خیالات اس عام رفتار پیش کی بدولت جو لو تھمرا اور کالون نے کی، بہت کچھ اصلاح پا چکے تھے۔ اس لیے ان دونوں پرچوں میں مذہبی چھیڑ چھاڑ بہت کم ہوتی تھی اور اسی وجہ سے وہاں ان پرچوں کی کچھ مخالفت نہیں ہوئی۔ لیکن تہذیب الاخلاق کا حال ایسا نہ تھا اس میں مذہبی بحث کرنی لازم آتی تھی، کیونکہ جو باتیں مسلمانوں کی دنیوی ترقی کی مانع تھیں وہ زیادہ تر مذہبی خیالات پر مبنی تھیں، اگرچہ اس پرچہ

میں مضمون لکھنے والے بہت سے لوگ تھے مگر سب سے زیادہ سرگرم خود سرسید، پھر مولوی سید مہدی علی خاں اور پھر مولوی چراغ علی تھے۔ سرسید مذہب کے سوا اخلاق و معاشرت و تمدن پر بھی اکثر مضامین لکھتے تھے مگر پچھلے دونوں شخص زیادہ تر مذہب پر لکھنے والے تھے۔

اس پرچہ کے دوہی نمبر نکلنے پائے تھے کہ چاروں طرف سے اُس کی مخالفت ہونی شروع ہوئی اور ساتھ ہی اس مدرسہ سے بھی جس کو سرسید قائم کرنا چاہتے تھے عموماً سو وطن پیدا ہونے لگا۔ بہت سے اخباروں میں مخالفانہ مضمون چھپنے لگے اور چین پرچے جن میں سے کانپور کا نورالافاق اور نورالانوار زیادہ مشہور تھے، تہذیب الاخلاق کے نوٹ پر جاری کیے گئے بحالہ اشاعت السنۃ جو خاص اہل حدیث کی تائید کے لیے جاری ہوا تھا اُس میں بھی تہذیب الاخلاق کے برخلاف مضمون نکلنے لگے اور سرسید کا تکفیر کے فتوے جا بجا لکھے جانے لگے۔ یہاں تک کہ اُن کے ساتھ اُن کے دوست اور اسمعان و انصار بھی نیچری بلکہ کرسٹیان کہلانے لگے لطیفہ۔ جب محسن الملک سید مہدی علی خاں کے چند مضمون نہایت دھوم دھام سے اس پرچہ میں شائع ہوئے تو کسی سُنی صاحب نے اُن کے چپا سے جن کا تمام خاندان محسن الملک کے سوا آشنا عسری ہے، جا کر کہا کہ آپ کے بے رونے کا مقام ہے کہ مہدی علی خاں کرسٹیان ہو گئے انھوں نے نہایت سادگی سے جواب دیا کہ میاں اب تم کو رو نا چاہیے، ہم تو اُسی دن رو چکے تھے جب اُس نے باپ داوا کا طریقہ چھوڑ کر تمہارا طریقہ اختیار کیا تھا۔

با اینہم تہذیب الاخلاق کے جاری ہونے سے رفتہ رفتہ ایک معتدبہ گروہ مسلمانوں میں ایسا بھی پیدا ہو گیا جو اس پرچہ کا ویسا ہی دلدادہ

تھا جیسے انگلستان وائے ٹیلر اور اسپیکٹر کے دلدراہ تھے۔ وہ اس کے مضامین پر وجود کرتے تھے اور تاریخ معین پر اس کے انتظار میں ہمنہن چشم رہتے تھے۔ اور اس کے مخالفوں کو تعجب سے دیکھتے تھے جو نتائج اس پر جس سے مسلمانوں کے حق میں پیدا ہوئے ان کو دوسرے حصہ میں بیان کیا جائے گا یہاں صرف اس قدر لکھا جاتا ہے کہ اگر سرسید یہ پرچہ جاری نہ کرتے اور مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح کا خیال چھوڑ دیتے بلکہ صرف ان کی تعلیم کا انتظام کرتے تو ظاہر ان کی مخالفت کم ہوتی بلکہ شاید نہ ہوتی، مگر اس کے ساتھ ہی اعانت اور امداد بھی کم ہوتی اور جو تحریک چند سال میں مسلمانوں میں پیدا ہو گئی اس کا صدیوں تک کہیں نام و نشان نہ ہوتا۔

اس پرچہ کی تمام تر کوشش اس بات میں تھی کہ جو خیالات مسلمانوں کی ترقی اور تمدن کے مذہبی مانع سمجھے جاتے ہیں اور درحقیقت مذہب کے کچھ علاقہ نہیں رکھتے ان کو جہاں تک ہو سکے رفع کیا جائے اور اسلام پرچہ عیسائیوں کا یہ اعتراض ہے کہ وہ ترقی اور تمدن کا دشمن ہے، اس غلطی کا اصل منشا ظاہر کیا جائے اس کے سوا یورپ کی سولیزیشن کے اصول و فروع سے اور ان اسباب سے جو یورپ کی ترقی کے باعث ہوئے ہیں قوم کو آگاہ کیا جائے۔ یہود اور مسخر رسوں سے ان کو نفرت دلائی جائے اخلاقی وعادات میں جو سبب قومی تنزل کے خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں وہ بیان کی جائیں، علوم قدیمہ کی عظمت جو لوگوں کے دلوں میں حد سے زیادہ بیٹھی ہوئی ہے جہاں تک اس میں غلطی ہو اس کو ظاہر کیا جائے علوم جدیدہ جن سے نفرت کیجاتی ہے ان کی اصل اور واقعی خوبیاں اور جو بد یہی نتائج دنیا میں ان سے پیدا ہوئے ہیں جتائے جائیں اور بجائے نفرت کے ان کی طرف رغبت دلائی

جائے۔ اسلام میں مخالفوں نے جو باتیں تاریخی اور علمی تحقیقات کے خلاف بیان کی ہیں ان کو تاریخ اور علم کے ساتھ منطبق کیا جائے یا اسلام کا دامن ان سے پاک ثابت کیا جائے۔ مسلمانوں کے دلوں میں ان کے اکابر و اسلاف کی عظمت کا خیال پیدا کیا جائے، ان کی قدیم علمی اور عملی ترقیات ان کو یاد دلاتی جائیں اور اس طرح قوم کے مردہ دلوں کو زندہ کرنے میں کوشش کی جائے۔ ان تمام اغراض و مقاصد کے پورا کرنے کے لیے سرسید اور ان کے دوستوں نے صرف اپنی رائے اور اجتہاد ہی سے کام نہیں لیا بلکہ جو کچھ مذہب کے متعلق لکھا وہ زیادہ تر قوم کے محققین کی تصنیفات سے استناد کر کے لکھا اور اخلاق و معاشرت و ترقی و تمدن کے متعلق یورپ کے مصنفین کے خیالات بھی جہاں تک ہو سکا اپنی زبان میں بیان کیے۔

چونکہ یہ پرچہ اسلام کو ایسی صورت میں ظاہر کرتا تھا جو مسلمانوں کے عام خیالات کے برخلاف تھی اور ان کے کان میں وہ صدائیں پہنچاتا تھا جو انہوں نے پہلے کبھی نہ سنی تھیں، اس لیے اول اول لوگ اس سے بہت بھڑکے، مگر رفتہ رفتہ مسلمانوں کے محدود دائرے میں اس کا اثر پھیل گیا۔ ان پڑھ مسلمان جن کی تعداد ہمیشہ ایک گری ہوئی قوم میں پڑھے لکھوں کی نسبت بہت زیادہ ہوتی ہے، وہ تو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ تہذیب الاخلاق کس جانور کا نام ہے۔ مولویوں اور واعظوں پر بھی اس کا منتر نہیں چل سکتا تھا کیونکہ وہ اس کو نہ صرف مذہب کے حق میں بلکہ شاید اپنے حق میں بھی مضر جانتے تھے۔ اُسرا تک اس کی رسائی ہوئی سخت دشوار تھی کیونکہ ان کو مسلمانوں کے تنزل کا یقین دلانا ایسا ہی مشکل تھا جیسا کہ مرغابی کو طوفان سے خوف دلانا۔ اسی لیے تہذیب الاخلاق کا اثر

صرف متوسط درجہ کے لوگوں میں محدود رہا جو نہ محض جاہل تھے اور نہ حجامع علوم عقلیہ و نقلیہ اور مقدور کے لحاظ سے نہ نہایت پست حالت میں تھے اور نہ اعلیٰ درجہ میں۔ پھر خاص کر ولی اور لکھنؤ اور ان کے نواح میں جہاں مسلمانوں کی قدیم شائستگی کے کچھ دھندے نشان باقی تھے اس کا اثر بہت کم ہوا۔ باوجود اس کے چونکہ اُس کی آواز زمانہ کی گونج کے موافق تھی اُس نے توقع سے بہت زیادہ کامیابی حاصل کی۔

زیادہ تر اُس کے مقبول ہونے کا سبب یہ تھا کہ اُس کے مضامین کا جہز و انظم سرسید کی دلنشین تحریریں اور سید مہدی علی خاں کے دلکش اور مہکل تھے۔ سرسید کی تحریر کی نسبت یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ اُس کے دیکھنے کے بعد آدمی اپنے عقیدے پر قائم نہیں رہ سکتا۔ سید مہدی علی خاں کی تحریروں پر بھی لوگ سر دھنتے تھے۔ اس کے سوا اُس میں ہر ایک بات نرمی اور سنجیدگی سے برخلاف اس قدیم و آزار طریقہ کے جو مسلمانوں کے مناظرات و مجاہدات میں جاری تھا، بیان کی جاتی تھی۔ کسی شخص کی طرف روئے سخن بہت کم ہوتا تھا۔ بلکہ ہمیشہ قوم کی عام حالت پر بطور دلنویسی کے نہ بطور طعن و تعریف کے گفتگو کی جاتی تھی۔ اُس میں ظرافت بھی ہوتی تھی، مگر نہ ایسی کہ کسی کو ناگوار گدھے اُس میں مخالفوں کے اعتراضات کے جواب نہایت ضرورت کے سوا کبھی نہ دیے جاتے تھے اور اس لیے مناظرہ کے بے مزہ رد و بدل اور جواب رد جواب و کتبہ جواب و حد جواب کے ناگوار تسلسل سے وہ بالکل پاک تھا کیونکہ اُس کے جاری کرنے سے صرف یہ مقصود تھا کہ جوابات سچ معلوم ہو وہ لوگوں کے کان میں ڈال دی جائے نہ یہ کہ اُن سے نہبردستی سنوائی جائے۔

تہذیب الاخلاق میں عام خبریں درج نہیں ہوتی تھیں مگر مدرسۃ العلوم کے متعلق کیٹیگی خزانۃ البضاعتہ کی رودادیں اور تمام حالات اُس میں گنتی برس تک برابر چھپتی رہیں، اس لیے مدرسۃ العلوم کو اُس سے بہت تقویت پہنچی اور تو اس کے مضامین لوگوں کے خیالات میں انقلاب پیدا کر رہے تھے اور ادھر چپندہ کی روز افزوں ترقی، بائیان کالج کی سرگرمی اور سرسید کی کوششوں کے عملی نتائج اُس کے ذریعہ سے دریافت ہوتے تھے اور اس لیے روز بروز مدرسۃ العلوم کی عظمت کا خیال لوگوں کے دلوں میں زیادہ ہوتا تھا۔

۱۸۶۶ء میں جب سرسید نیشنل لیجر علیگڑھ میں آگئے تو ان کو جبہ تن مدرسہ کی تکمیل، اُس کی عمارتیں تیار کرنے اور ہر طرح سے کالج کی زمین کو آباد و سرسبز کرنے کی طرف متوجہ ہونا پڑا اس کے سوا ان کے وہ دوست جو تہذیب الاخلاق کے سرگرم معاون تھے وہ زیادہ اہم کاموں میں مصروف ہو گئے۔ نیز تہذیب الاخلاق اپنا کام بہت کچھ کر چکا تھا اور مسلمانوں میں جس قدر کہ اُبال آنے کی قابلیت تھی اُس قدر اُبال پیدا کر چکا تھا۔ ان تمام وجوہات سے اُس کو بند کرنا پڑا اور یکم رمضان ۱۲۹۳ھ کے پرچہ پر اس کا خاتمہ ہو گیا چھ برس کے عرصہ میں ۲۲۶ مضمون تہذیب الاخلاق میں چھپے جن میں سے چھوٹے بڑے ۱۱۲ مضمون صرف سرسید کے لکھے ہوئے ہیں اور باقی اور لوگوں کے۔

جن لوگوں کو تہذیب الاخلاق کا چکا لگ گیا تھا ان کو اس کا بند ہونا شاق گذرا اور ان کی طرف سے برابر تحریکیں ہوتی رہیں کہ اُس کو پھر جاری کیا جائے، آخر جمادی الاولیٰ ۱۲۹۶ھ میں دوسری بار جاری کیا گیا جو دد برس پانچ مہینے جاری

رہ کر بند ہو گیا، اس دفعہ چونکہ سرسید کی توجہ زیادہ تر تفسیر لکھنے کی طرف
مصرف رہی اور ان کے سرگرم معاونوں کو اس مدد دینے کی فرصت یا
موقع نہ تھا اس لیے اس میں پہلے کی نسبت عمدہ مضامین کم نکلے۔ اب کی بار
کل ۶۷ مضمون چھپے جن کے لکھنے والے مختلف آٹھ شخص تھے۔ ان میں سے
۲۳ مضمون سرسید کے اور باقی اور لوگوں کے تھے۔ سوال ۳۱۱۔ ہجری میں
سرسید نے لواب محسن الملک کی تحریک سے اس کو کیمپر جاری کیا مگر اس دفعہ
اس کا دار و مدار بالکل سرسید کی ذات پر رہا اور لوگوں نے اس میں بہت
مدد دی آخر تین برس جاری رہ کر بند ہو گیا۔

کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان

تہذیب الاخلاق ہی کے ساتھ سرسید نے دوسرا کام یہ کیا کہ مسلمانوں
کی ترقی تسلیم پر غور کرنے کے لیے انھوں نے بنارس ہی میں ایک دوسری کمیٹی
قائم کی۔ وہ لندن ہی سے ایک اشتہار تدار ترقی تعلیم مسلمانان کی نسبت اُرو
اور انگریزی میں چھپوا کر اپنے آنے سے پہلے مولوی سید مہدی علی خاں کے پاس
جو اُس زمانے میں مرزا پور میں تحصیلدار تھے اشاعت کی غرض سے بھیج چکے تھے
مگر انھوں نے اس کی تمام کاپیاں ایک صندوق میں ڈالیں اور معمولی اشتہاروں کی
طرح اس کی اشاعت کو محض بے سوخیال کیا۔ جب سرسید ولایت سے واپس
آئے اور مولوی صاحب سے ملے تو انھوں نے تمام اشتہار سرسید کے سامنے
رکھ دیے اور یہ کہا کہ ہر شخص سپہ احمد خاں نہیں ہے جو اس کام کو کر سکے۔ اب
سرسید نے خود اس کام کو شروع کیا۔ وہی اشتہار جس کا عنوان یہ تھا "التماس
نجدت اہل اسلام و حکام ہند و ریاب ترقی تعلیم مسلمانان ہندوستان جہاں

جہاں مناسب سمجھا بھیجا اور اخبار کے ذریعہ سے بھی اُس کو شائع کیا، خلاصہ اس اہتمام کا یہ تھا کہ ”انگریزی حکومت سے جو تعلیم کے فائدے لوگ عام طور پر اٹھا رہے ہیں اور مسلمان اُن سے مستفید نہیں ہوتے، اس کے اسباب دریافت کرنے کی طرف خود مسلمانوں کو متوجہ ہونا چاہیے کیونکہ جو اسباب اور لوگوں نے اب تک بیان کیے ہیں اُن پر کافی مہر و سائیں ہو سکتا اور بالیقین نہیں کہا جاسکتا کہ وہ حقیقت وہی اصلی اسباب ہیں۔ نیز یہ کہ اس بیماری کی اصلی جڑ دریافت کرنی گورنمنٹ کو بھی ضرور ہے، پس مناسب ہے کہ ایک انعامی انتہاء جاری کیا جائے اور مسلمانوں کو اس مسئلہ پر مضامین لکھنے کی ترغیب دی جائے اور اس کام کے لیے مسلمانوں اور انگریزوں سے چندہ جمع کیا جائے، جب چندہ بقدر ضرورت جمع ہو جائے اُس وقت چندہ و سہندگان میں سے ممبر منتخب کر کے ایک کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان منعقد کی جائے۔“

اس چندہ میں سب سے پہلے سرستید نے ایک رقم اپنی طرف سے پیش کی اور بانفاق مولوی مہدی علی خاں کے چندہ جمع کرنا شروع کیا، دسمبر ۱۸۷۰ء میں یہ اٹھتارہ جاری ہوا تھا اسی مہینے میں ایک ہزار ایک سو دو روپیہ جمع ہو گیا اور اس کے بعد رفتہ رفتہ جمع ہوتا رہا، نواب کلب علی خاں مرحوم رئیس، رامپور، کنور وزیر علی خاں مرحوم رئیس، دانپور ضلع بلت شہر اور سردیم ریورٹمنٹ گورنر شمال مغرب نے اس کام کی طرف خاص توجہ ظاہر کی تھی۔ الغرض۔

۲۶ دسمبر کو بمقام بنارس ”کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان ہندوستان“ منعقد ہو گئی جس کے سکریٹری سرستید قرار پائے، اس کمیٹی کا کام یہ تھا کہ وہ جہاں ہو سکے اس بات کے دریافت کرنے میں کوشش کرے کہ سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں مسلمان طالب علم کس لیے کم پڑھتے ہیں، علوم

تقدیمہ ان میں کیوں گھٹ گئے اور علوم جدیدہ کیوں نہیں رواج پاتے۔ اور جب یہ مواقع ٹھیک ٹھیک دریافت ہو جائیں تو ان کے رفع کرنے کی تدبیریں دریافت کرے اور ان تدبیروں پر عمل درآمد کرنے میں کوشش کرے۔ نواب محسن الملک کا بیان ہے کہ ”جس تاریخ کمیٹی مذکور کے انعقاد کے لیے جلسہ قرار پایا تھا اس سے ایک روز پہلے میں پہنچ گیا تھا۔ رات کو سرستید نے میرا پتنگ بھی اپنے ہی کمرے میں بھجوایا تھا۔ گیارہ بارہ بجے تک مسلمانوں کی تعلیم کے منعلق باتیں ہوتی رہیں، اس کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔ وہ بجے کے قریب جو آنکھ کھلی تو میں نے سرستید کو ان کے پتنگ پر نہ پایا۔ میں ان کے دیکھنے کو کمرے سے باہر نکلا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ برآمدے میں ٹہل رہے ہیں اور نادرہ قطار روتے جاتے ہیں، میں نے گھبرا کر پوچھا کہ کیا خدا نخواستہ کہیں سے کوئی افسوسناک خبر آئی ہے؟ یہ سن کر اور زیادہ رونے لگے اور کہا کہ ”اس سے زیادہ اور کیا مصیبت ہو سکتی ہے کہ مسلمان بگڑ گئے اور بگڑتے جاتے ہیں۔ اور کوئی صورت ان کی بھلائی کی نظر نہیں آتی۔ یہ پھر آپ ہی کہنے لگے۔ کہ ”جو جلسہ کل ہونے والا ہے مجھے امید نہیں کہ اس سے کوئی عمدہ نتیجہ پیدا ہو ساری رات اسی ادھیڑ بن میں گذر گئی ہے کہ دیکھیے کل کے جلسہ کا کیا انجام ہوتا ہے اور کسی کے کان پر جوں چلتی ہے یا نہیں۔“ نواب محسن الملک کہتے ہیں کہ ”سرستید کی یہ حالت دیکھ کر جو کیفیت میرے دل پر گزری اس کو بیان نہیں کر سکتا اور جو عظمت اس شخص کی اس دن میرے دل میں بٹھی ہوئی ہے اس کو میں ہی جانتا ہوں۔“

اسی تاریخ انعامی اشتہار جس میں تین انعام پانسو تین سو ڈیڑھ سو روپے کے مقرر ہوئے تھے جاری کیا گیا اور میعاد معین تک ۳۳ مضمون مختلف لوگوں

کے لکھے ہوئے سکریٹری کے پاس پہنچے۔ مولوی ہدی علی خاں کا معنون سب سے عمدہ تھا مگر ان کی خواہش سے وہ انعام کی فہرست سے خارج رکھا گیا اور پہلا مولوی سید اشرف علی ایم اے کو جو اُس زمانے میں بنارس کالج کے طالب علم تھے، دوسرا نواب انصاری جنگ مولوی مشتاق حسین کو اور تیسرا مولوی علی اللہ کو ملا۔ سر سید نے ان مضامین سے ایک عمدہ رپورٹ اربو و انگریزی میں تیار کی جس میں تمام رسالوں کا خلاصہ کر کے ان سے مفصلہ ذیل نتائج استخراج کیے تھے:

- ۱- ہندوستان کے سمجھ دار مسلمان اس تعصبات کو جو پرانے خیال کے مسلمان انگریزی تعلیم کی نسبت رکھتے ہیں لغو اور مسلمانوں کے حق میں مہربانانہ ہیں۔
- ۲- مسلمانوں کی تعداد سرکاری مدارس میں بمقابلہ ہندو طالب علموں کے جتنی ہونی چاہیے اس سے بہت کم ہے۔
- ۳- جن خیالات سے مسلمان سرکاری مدارس میں اپنی اولاد کو نہیں بھیجتے ان میں سے کچھ نا واجب اور اکثر واجب ہیں اور سرکاری طریقہ تعلیم مسلمانوں کی ضرورتوں کے لیے کافی نہیں ہے۔
- ۴- اگر گورنمنٹ مسلمانوں کے لیے اپنے طریقہ تعلیم میں کچھ تبدیلی بھی کر دے تو بھی ان کی تمام ضرورتیں رفع نہیں ہو سکتیں۔
- ۵- مسلمانوں کو اپنے علوم قدیمہ کے محفوظ رکھنے، علوم جدیدہ سے مستفید ہونے اور اپنی تمام ضرورتوں کے موافق اپنی اولاد کو تعلیم و تربیت کرنے کے لیے اس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ اپنی تعلیم کا فکر آپ کریں اسی رپورٹ میں مجوزہ کالج کی سکیم اور طریقہ تعلیم بھی مندرج تھا جو سر سید نے کیشی کے سامنے پیش کیا۔

مسلمانوں کی ترقی کے مواقع جو سرسید نے اس رپورٹ میں تمام رسالوں سے استنباط کر کے لکھے تھے اُن کی نسبت شمس العلماء مولوی محمد ذکاء اللہ اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں کہ ”ایجوکیشن کمیشن نے بھی ۱۸۸۳ء میں تمام ہندوستان کے معتبر گواہوں کی شہادت کے بعد مسلمانوں کی تعلیم کے وہی موانع تسلیم کیے ہیں جو سرسید نے ۱۸۶۳ء میں اپنی رپورٹ میں درج کیے تھے۔“

اس رپورٹ کی ایک ایک جلد گورنمنٹ ہند اور تمام لوکل گورنمنٹوں میں بھی بھیجی گئی تھی۔ چنانچہ مدراس، بنگال اور بمبئی کی لوکل گورنمنٹوں نے مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق جو جو تدبیریں اور کارروائیاں اب تک کی تھیں اُن کے تمام کاغذات سکرٹری کے پاس بھیج دیے اور گورنمنٹ شمال مغرب نے اس رپورٹ کی کچھ جلدیں تعلیمی کمیٹیوں کو تقسیم کرنے کی غرض سے طلب کیں اور یہ وعدہ کیا کہ اگر کمیٹی کی کوشش سے کالج مجوزہ قائم ہو گیا تو گورنمنٹ علوم دنیوی کی تعلیم کے لیے بموجب قواعد گرانٹ ان ایڈ کے اس مدرسہ کو مدد دے گی۔ اس کے بعد سکرٹری گورنمنٹ ہند کی چھٹی مورخہ ۹ اگست ۱۸۸۲ء اس مضمون کی پہنچی کہ ”نواب گورنر جنرل بہادر بہ اجلاس کونسل کو تجویز مندرجہ رپورٹ کمیٹی خواستگار ترقی کی اطلاع سے جوابت قائم کرنے ایگلو اور نٹیل کالج کے ہے۔ نہایت خوشی ہوئی ہے اور وہ دل سے امید رکھتے ہیں کہ اس تجویز میں جیسی کامیابی ہونی چاہیے ویسی ہی ہوگی۔ شمال مغربی اضلاع کے مسلمانوں کی یہ تدبیر اس بات کی مستحق ہے کہ جہاں تک ممکن ہو گورنمنٹ اس میں مدد دے اور سید احمد خاں بہادر اور اُن صاحبوں کی کوششیں جو اس عمدہ کام میں اُن کے شریک ہیں نہایت تحسین و آفرین کے قابل ہیں۔“ ان دونوں چھٹیوں کے آنے

سے کمیٹی کو حسد سے زیادہ تقویت ہوئی۔

کمیٹی خزانۃ البضاعۃ

ایک دوسری کمیٹی اس غرض سے کہ قیام مدرسہ مجوزہ کے لیے وقتاً فوقتاً چندہ وصول کرتی رہے مقرر کی گئی جس کا نام ”کمیٹی خزانۃ البضاعۃ تاسیس مدرسۃ المسلمین“ رکھا گیا اور اس کے لائف سکریٹری سر سید قرار پائے اور یہ ٹھہرا کہ جب تک مدرسہ قائم کرنے کے لیے لائق سرمایہ جمع نہ ہو جائے تب تک اس کمیٹی کا مقام وہیں رہے جہاں لائف سکریٹری کا قیام ہو چنانچہ جب تک مدرسہ علیگرہ میں قائم نہ ہو گیا تب تک کمیٹی مذکورہ کا دفتر بنارس ہی میں رہا جہاں سر سید حج سال کا نہ کورٹ تھے۔

جولائی ۱۸۸۷ء میں سر سید نے کمیٹی خواستگار تعلیم کی طرف سے ایک اشتہار جاری کیا جس میں مسلمانوں سے پوچھا گیا تھا کہ مدرسۃ العلوم کو نئے شہر میں قائم کیا جائے۔ اس اشتہار کے جاری کرنے کی یہ ضرورت تھی کہ بعضے لوگ جو پراسیوری نوٹ خریدنے کے برخلاف تھے چندہ اس شرط سے دیتے تھے کہ بیمارے روپیہ سے جائیداد خریدی جائے۔ پس تا وقتیکہ مدرسہ کے لیے کوئی جگہ قرار نہ پائے جائیداد نہیں خریدی جاسکتی تھی کیونکہ جائیداد کا مقام مدرسہ کے قریب خریدنا ضروری تھا۔ اس اشتہار پر مختلف راہیں لوگوں نے ظاہر کیں مگر سب سے زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی جنہوں نے علیگرہ کو ترجیح دی تھی ان کو معلوم تھا کہ سر سید نے مدت سے ارادہ کر رکھا ہے کہ پنشن لینے کے بعد دلی کی سکونت ترک کر کے علیگرہ میں پودو باش اختیار کریں۔ کیونکہ غدر کے بعد دلی کے مسلمانوں کی جو حالت ہو گئی

تھی وہ ان سے دیکھی نہیں جاسکتی تھی۔ ان کو پنجاب کی طرز حکومت پر بھی اعتراض تھا۔ چنانچہ انھوں نے پنجاب کے ایک جلیل القدر حاکم سے صاف کہہ دیا تھا کہ دلی کو شمال مغربی اضلاع سے نکال کر پنجاب میں داخل کرنا انھیں سسٹروں میں سے ایک سزا ہے جو فتح دہلی کے بعد اہل دہلی کو دی گئیں۔ اس کے سوا مسلمانوں کی تعلیم کا جو اعلیٰ مضمویہ سرسید نے باندھا تھا اس کا دلی میں پورا ہونا ممکن معلوم ہوتا تھا۔

کیٹی کو سب سے زیادہ تقویت اس بات سے ہوئی کہ لاہور تھر بروک وائسرائے و گورنر جنرل ہند نے بعض شرائط کے ساتھ مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کی شاخ میں اسکالرشپ دینے کے لیے دس ہزار روپیہ اپنی جیب خاص سے دینے کا وعدہ فرمایا اور سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر اضلاع شمال مغرب نے ایک ہزار روپیہ کا چنڈہ اور اسی طرح مسٹر اسپنکی جج ہائی کورٹ الہ آباد نے ایک معقول رقم دینے کے لیے عنایت کی۔ ان عطیوں نے سرسید کی کوششوں میں جان ڈال دی اور کیٹی کی ڈھارس سی بندھ گئی۔ جب اس طرح سے چنڈہ میں ترقی ہونے لگی تو سرسید نے کیٹی میں تحریک کی کہ کیٹی خزانہ البضاعت کی بموجب ایکٹ ۲۱ ۱۸۶۰ء کے رجسٹری ہو جانی چاہیے۔ ورنہ تمام جائیداد اور پراپرٹی نوٹ سکریٹری کے یعنی میرے نام سے خریدے جائیں گے اور میرے اور میرے وارثوں کے نام منتقل ہو سکیں گے۔ چنانچہ کیٹی مذکورہ کی رجسٹری حسب ضابطہ عمل میں آئی اور تمام مسلمانوں کو چھاپے کے ذریعہ مطلع کیا گیا کہ جو سرمایہ مدرسہ العلوم کے لیے جمع ہوا ہے یا آئندہ جمع ہوگا اس کی حفاظت کے لیے یہ انتظام کیا گیا ہے۔

فروری ۱۸۶۳ء میں سرسید محمود نے ایک اسکیم انتظام و سلسلہ تعلیم

کی جو ولایت کے اسکولوں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کا انتظام اور طریقہ تعلیم دیکھ کر مرتب کی تھی مجوزہ کالج کے لیے پیش کی، موجودہ ممبروں نے اس کو پسند کیا اور منظوری کے لیے اس کی کاپیاں چھپ کر تمام ممبروں کے پاس بھیجی گئیں اور نیر لوکل گورنمنٹس اور گورنمنٹ ہند میں بھی اس کی نقلیں ارسال کی گئیں تاکہ اگر گورنمنٹ اس اسکیم کو پسند کرے تو گرانٹ ان لیڈ سے حسب وعدہ امداد کرے، نیر ایک استفتاء مع اس اسکیم کے علمائے وقت کے پاس بھیجا گیا جس میں ان سے پوچھا گیا تھا کہ جس مدرسہ میں اس اسکیم کے موافق تعلیم دی جائے گی اس میں چندہ دینا جائز ہے یا نہیں۔

جب یہ استفتاء شائع ہوا تو کانپور سے مولوی امداد العلی نے جو اس وقت وہاں ڈپٹی کلکٹر تھے ایک دوسرا استفتاء شائع کیا جس میں بنارس کے استفتاء کو غلط اور دھوکا دینے والا بتایا تھا اور لکھا تھا کہ جو لوگ مدرسہ العلوم قائم کرنا چاہتے ہیں وہ درحقیقت مسلمان نہیں ہیں، یہ پہلی مخالفت تھی جو علانیہ مدرسہ العلوم کے ساتھ کی گئی، اس کے بعد دھڑا دھڑ مخالفین ہونی شروع ہوئیں، بعض نے مشہور کیا کہ مدرسہ میں سید احمد خاں کا بت اور ان کے معاونوں کی تصویریں قد آدم ہا نصف قد آدم رکھی جائیں گی، بعض کہتے تھے کہ وہاں شیعوں کے مذہب کی کتابیں بھی پڑھائی جائیں گی اور اس باطل کی اعانت کی جائے گی، بعض کہتے تھے کہ جس شخص کے ایسے اور ایسے عقائد و اقوال ہوں اس کے قائم کیے ہوئے مدرسہ میں چندہ دینا یا اس میں اپنی اولاد کو تسلیم دلوانا مسلمان کا کام نہیں، بعض کا یہ اعتراض تھا کہ جو روپیہ چندہ سے جمع ہوگا وہ سود میں لگایا جائے گا اور اس کے پرایسری نوٹ خریدے جائیں گے اور مدرسہ میں لڑکوں کو انگریزی لباس پہننا پڑے

کا بعض کہتے تھے کہ یہ تمام شور و غل سید احمد خاں کے دم تک ہے اس کے بعد کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو اس کام کو سرانجام کر سکے اور یہ ایک ایسی بات تھی جس کو سن کر سمجھ وار آدمیوں کے دل بھی افسردہ ہو جاتے تھے۔ یہ تمام باتیں اخباروں میں شائع ہوئی تھیں، چند ویسی اخبار ہمیشہ سرسید اور مدرسہ العلوم کے خلاف مضمون لکھتے تھے، ایک آدھ مضمون انڈین آبزروور میں بھی مدرسہ کے خلاف نہایت سخت لکھا گیا تھا، مگر آدھ اخبار، پنجابی اخبار، اردو گائیڈ، پٹیالہ اخبار اور انگریزی اخباروں میں پاپوئیر ہمیشہ مدرسہ کی تائید کرتے تھے۔

جب اس قسم کی مخالفتیں ہونے لگیں اور اتفاق سے انھیں ایام میں چندہ کی آمد بھی سست پڑ گئی تو سرسید کے دوست مایوس ہونے لگے، انھوں نے دوستوں کی ہمت بندھوانے اور مسلمانوں کے دل سے غلط خیالات اور مخالفوں کے اعتراض رفع کرنے کے لیے ایک نہایت مفصل مضمون تہذیب الاخلاقی میں چھاپا اور دیگر اخبارات سے بھی اس کے شائع کرنے کی درخواست کی، اس کے اخیر کے چند فقرے ہم یہاں نقل کرتے ہیں، اب وہ وقت نہیں رہا کہ صرف کاغذ کے گھوڑے دوڑانے سے کام چلے بلکہ ہماری کمیٹی کے ممبروں کو خود شہر بہ شہر اور ضلع بہ ضلع دورہ کرنے، اسپیشل سٹاف اور لوگوں کے دلوں کو جوش میں لانے کا وقت ہے، اس کام کے لیے علاوہ فرصت کے روپیہ بھی درکار ہے کہ بدوں خرچ کے دورہ نہیں ہو سکتا، کمیٹی کی تھیلی میں جو گیا پھر نہیں نکلتا، اس دورہ کرنے کا وقت، اس کی محنت اور اس کا خرچ سب ہم کو اپنی گرہ سے کرنا ہے، اگر خدا کی مرضی ہے تو ہم سب کچھ کریں گے، اگر زندہ ہیں اور خدا کو بھی منظور ہے تو اپنے مخالفوں کو دکھائیں گے کہ خدا نے کیا کیا اور

اگر اس میں آنکھ بند ہو گئی اور لحد میں جا سوائے تو یہ امید رکھیں گے کہ ترمیم
از غیب برود آید و کارے بکند۔“

اب سرستینے چندہ جمع کرنے کے لیے زیادہ کوشش کرنی شروع
کی جہاں جہاں ان کے دوست اور مددگار تھے وہاں اس غرض کے لیے سب
کمیٹیاں قائم کیں، جیسے مرزا پور، علیگرہ، کانگرہ، پٹیالہ وغیرہ۔ اور خود سرستینے
مع اپنے اکثر دوستوں کے اسی مطلب کے لیے پٹنہ، لاہور، گورکھپور وغیرہ کا
سفر کیا اور ہر ایک مقام پر نہایت زبردست اسپینچیں اور لکچر دیے۔ تمام
سب کمیٹیوں نے تو قح سے زیادہ چندہ جمع کیا اور سرستید کے ہر ایک سفر میں
معتدبہ کامیابی ہوئی۔ انھیں دنوں میں سرستید نے ایک سرکلر بحیثیت سکریٹری
ہونے کے انگلستان کو بھی روانہ کیا تھا جس میں اپنے یوروپین دوستوں سے
درخواست کی تھی کہ وہاں بھی مدرسۃ العلوم کے لیے چندہ جمع کرنے کے واسطے
ایک کمیٹی قائم کی جائے اور لارڈ لارنس سابق گورنر جنرل ہندوستان، لارڈ
اسٹینلی اور ایڈمرلٹی، سر بارٹل فریڈ، سر چارلس ٹریویلیٹین اور اڈورڈ ٹاماس
کے نام پر اپنیٹ چھٹیاں روانہ کی تھیں کہ اس کمیٹی کے قائم کرنے کی
طرف متوجہ ہوں مگر جہاں تک ہم کو معلوم ہے اس تحریک کا کوئی نتیجہ ظاہر
نہیں ہوا۔ اس مقام پر ایک لطیفہ ذکر کرنے کے لائق ہے۔

جب دوسری بار سید محمود تقریباً انگلستان کو گئے اور کمبرج میں اپنے
دوستوں سے ملے تو معلوم ہوا کہ یونیورسٹی کا سرمایہ بہت بڑھ گیا ہے اور آج
کل یہ ارادہ ہو رہا ہے کہ چرچ منغلقتہ ٹرینی کالج کو منہدم کر کے ایک نہایت
عظیم الشان عمارت از سر نو بنائی جائے اور دس لاکھ روپیہ اس میں صرف
کیا جائے سید محمود نے اپنے دوست سے پرسبیل تذکرہ یہ کہا کہ اچھی خاصی

عمارت کو توڑ کر اس میں روپیہ ضائع کرنے سے کیا فائدہ ہے؛ اگر یونیورسٹی کا سرمایہ اس کی ضرورتوں سے زیادہ بڑھ گیا ہے تو دو چار لاکھ روپیہ مدرسہ العلوم ہی کی امداد کے لیے دیدیں۔ ان کے دوست نے کہا کہ ہندوستان میں کتنے مسلمان رہتے ہیں؛ سید محمود نے کہا چھ کروڑ۔ وہ سنکر نہایت متعجب ہوا اور یہ کہا کہ ”جس قوم کے لوگ ایسے لپست بہت اور کم حوصلہ ہیں کہ چھ کروڑ آدمی اپنی اولاد کی تسلیم کے لیے ایک مدرسہ قائم نہیں کر سکتے ان کی اعانت کرنی گناہ ہے ان کو تباہ ہونے دو۔“

ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو

۱۸۶۱ء میں ڈاکٹر ہنٹر نے جو ہندوستان کے مدبران سلطنت میں شمار ہوتے ہیں ایک کتاب ہندوستان کے مسلمانوں کے مذہبی خیالات پر لکھ کر شائع کی جس کا نام ”اور اٹھ میں مسلمانز“ تھا اس کتاب میں انھوں نے اپنی دانست میں یہ ثابت کیا تھا کہ مسلمان ایک ایسی قوم ہے جو گورنمنٹ سے لڑنا اور جہاد کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتی ہے اور گورنمنٹ کی کسی طرح خیر خواہ نہیں بن سکتی۔ نیز وہاں بیت اور بغاوت مترادف الفاظ ہیں، پس گورنمنٹ کو ان کی طرف سے مظہم اور بے فکر نہیں رہنا چاہیے۔ اس کتاب کے عنوان کی عبادت یہ تھی، ”کیا ہمارے ہندوستان کے مسلمانوں پر از روئے ایمان کے ملکہ معظمہ سے بغاوت کرنا فرض ہے؟ آگے چل کر انھوں نے ایک مقام پر لکھا تھا کہ ”اس بیان سے معلوم ہوا کہ تمام مسلمان اپنے بغاوت سکھانے والے پیغمبر کی زیر آئینہ نصیحتوں کو نہایت ذوق و شوق سے سنتے ہیں اور ایسے بہت تھوڑے ہیں جو اپنی تیزی طبعیت سے اپنی

شریعت کا کچھ اور مطلب ٹھہرا کر بغاوت کے برٹے فرض سے بچ جاتے ہیں۔ پھر اس کے بعد لکھا تھا کہ ”ہندوستان کے مسلمان اب بھی ہندوستان میں گورنمنٹ انگریزی کے لیے موجب خطر ہیں جیسے کہ ایک مدت سے موجب خطر چلے آتے ہیں۔“ پس اگرچہ ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی کتاب کے شروع میں یہ ظاہر کیا تھا کہ ”اس کتاب کے مطالب صرف بنگالہ کے مسلمانوں سے متعلق ہیں کیونکہ میں صرف انھیں سے زیادہ واقف ہوں۔“ لیکن جو لکھے ان کی کتاب کے اوپر نقل کئے گئے ان سے صاف پایا جاتا ہے کہ انھوں نے تمام ہندوستان کے مسلمانوں سے گورنمنٹ کو بدگمان اور غیر مطمئن کرنا چاہا تھا۔

جس زمانہ میں ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب شائع ہوئی یہ وہ زمانہ ہے کہ شاہ کا بنگالہ انگریزوں کو بھی تک فراموش نہیں ہوا تھا، دوسرے بنگالہ کے دہائیوں کے مقدمات کا سلسلہ جاری تھا، تیسرے انھیں دنوں میں مسٹر نارین چیف جسٹس بنگالہ کا ایک مسلمان کے ہاتھ سے قتل ہونا اس پر اور طرہ ہو گیا تھا، ایسے وقت میں بخوبی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر ہنٹر جیسے معزز شخص کی کتاب نے انگریزوں کے دل پر کیا اثر کیا ہوگا اور مسلمانوں کی طرف سے ان کی بدگمانی کو کس حد تک پہنچا دیا ہوگا۔

سر سید اپنے ریویو میں لکھتے ہیں کہ ”میں نے یہ سمجھ کر کہ یہ کتاب ایسے شخص کی لکھی ہوئی ہے جو مسلمانوں کا بڑا دوست ہے، نہایت شوق سے دیکھنی شروع کی تھی، مگر افسوس ہے کہ مجھ کو اس کے پڑھنے سے بڑی مایوسی ہوئی اور بے اختیار منہ سے نکلا کہ خدا مجھ کو میرے دوستوں سے بچائے۔“ انھوں نے اس ریویو میں بہت صاف اور روشن شہادتوں سے ڈاکٹر ہنٹر

کی غلطیاں ظاہر کی ہیں اور وہابیوں کی مختصر تاریخ اول سے آخر تک اور وہابیوں کے اصول شرح بیان کیے ہیں، اور صاف اقرار کیا ہے کہ میں خود وہابی ہوں اور وہابی ہونا جرم نہیں ہے بلکہ گورنمنٹ کی بدخواہی اور بغاوت جرم ہے۔ جو شخص اس جرم کا مرتکب ہو گا خواہ وہ وہابی ہو یا عیسائی، ہندو ہو یا مسلمان یا اور کوئی مذہب والا بلا خیال مذہب کے مجرم قرار پائے گا، انھوں نے جہاد کے مسئلہ کی حقیقت اور جو غلط فہمیاں اس کی نسبت تھیں ان کو اچھی طرح ظاہر کیا ہے اور بتایا ہے کہ جو مسلمان انگریزی گورنمنٹ کی رعایا اور متامن ہیں اور اپنے فرائض مذہبی بلا مزاحمت ادا کرتے ہیں وہ شریعت اسلام کی رو سے بمقابلہ انگریزوں کے نہ جہاد کر سکتے ہیں نہ بغاوت نہ اور کسی قسم کا فساد، ان کو ہندوستان میں انگریزی گورنمنٹ کے زیر حکومت اسی اطاعت و فرما برداری سے از روئے مذہب اسلام کے رہنا واجب ہے جیسا کہ ہجرت اولیٰ میں مسلمان حبش میں جا کر عیسائی بادشاہ کے زیر حکومت رہے تھے۔

سرسید کے ریلوئی نے تمام انگریزی حکام کے دل پر اور نیز انگلستان کے

لے سلب ہے کہ جن دنوں بنگال میں وہابیوں کی تحقیقات اور تلاش ہو رہی تھی ایک یورپین معزز افسر سے جو اسی کام پر مامور تھا ریل میں سرسید سے مل بھیڑ ہو گئی، دونوں آگہ جا رہے تھے اور سرسید کو کسی ذریعے سے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ افسر وہابیوں کی تلاش پر مامور ہے اس افسر نے ان سے پوچھا کہ آپ کا کیا مذہب ہے، انھوں نے کہا وہابی مسلمان ہوں۔ پھر اس نے سرسید کا سلا پتہ دریافت کیا انھوں نے صحیح صحیح بیان کر دیا، جب ریل آگہ میں پہنچی دونوں اتر کر اپنے اپنے ٹھکانے پر چلے گئے پھر سرسید مین صلب کسٹنر آگہ سے ملنے کو گئے اتفاق سے وہ افسر انھیں کے لائ ٹھیکرا سوا تھا اور ان سے ذکر کر چکا تھا کہ اس علیہ اول اس نام کا ایک وہابی مسلمان فلاں جگہ ٹھیکرا ہوا ہے۔ اب صلب کسٹنر نے افسر کو بلکہ کہا کہ لو یہ تمہاری اسامی حاضر ہے جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ شخص باوجود وہابی ہونے کے بڑا خیر خواہ سرکار ہے تو اسے نہایت تعجب ہوا اور سب بہت دیر تک اس بات پر بہتے رہے۔

لوگوں پر نہایت عمدہ اثر کیا۔ اُس زمانہ میں حافظ احمد حسن مرحوم وکیل ٹونک لندن میں تھے، جب انہوں نے دیکھا کہ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب سے لندن میں نہایت جوش اور بے خیالات مسلمانوں کی نسبت پیدا ہو گئے ہیں انہوں نے تمام ریویو پالیونیر کے پرچوں سے نقل کر کے جدا بطور پمفلٹ کے چھپوایا اور لندن میں جا بجا تقسیم کر دیا۔ سنا ہے کہ جب وہ لندن سے آئے تو انہوں نے بیان کیا کہ اس ریویو کے شائع ہونے سے لندن میں لوگوں کی طبیعتوں کا ایسا حال ہو گیا تھا جیسے کہ جلتی اور بھڑکتی آگ پر کوئی پانی ڈال دے۔ جو شخص اُس کو پڑھتا تھا ڈاکٹر ہنٹر کی تحریر پر تعجب کرتا تھا اور جو کچھ انہوں نے مسلمانوں پر دہا بیوں کی نسبت لکھا تھا اس کو صحیح نہیں سمجھتا تھا۔

ہندوستان میں جب بی ریویو پالیونیر کے ذریعہ سے شائع ہوا انہیں دنوں میں پالیونیر مورخہ ۲۳ نومبر ۱۸۷۱ء میں ایک بہت بسوٹا آرٹیکل جو کسی پریس لائق عربی داں انگریز کا لکھا ہوا تھا اور جس کی نسبت یقین کیا گیا ہے کہ وہ سر ولیم میور کا لکھا ہوا تھا، ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کے برخلاف گو یا سرسید کی تائید میں چھپا اور پالیونیر سے سوسائٹی اخبار میں نقل ہوا، اس آرٹیکل میں نہایت علانیہ لیاقت سے ڈاکٹر ہنٹر کے شبہات کا جواب دیا گیا تھا اور سرسید کی تائید کی گئی تھی، اُس کے آخر کے چند فقرے ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں:

”وہابی وہ ہے جو خالصتاً کی عبادت کرتا ہو، سوجد ہو“

اور اس کا اسلام ہواے نفسانی اور بدعت کی آمیزش سے پاک

ہو، اُس کو یہ کہنا کہ وہ ہمیشہ درپردہ تخریب سلطنت کی فکر میں

اور چپکے چپکے منصوبے باندھا کرتا ہے اور غدر اور بغاوت کی تحریک

کرتا ہے، محض تہمت ہے ہم اس وقت بہت سے ایسے آدمی

نشان دے سکتے ہیں جو سرکار کے ایسے ملازم ہیں کہ ان سے زیادہ سرکار کا غیر خواہ اور معتد کوئی نہیں، با اینہم وہ اپنے تئیں علی الاعلان اور بے تامل فخریہ طور پر دہائی کہتے ہیں اور سرکار نے بے سوچے سمجھے ان کو معتد علیہ نہیں گردانا بلکہ غدر کے زمانہ میں جبکہ فتنہ کی آگ ہر طرف مشتعل تھی ان کی وفاداری کا سونا اچھی طرح سے تباہ کیا اور وہ غیر خواہی سرکار میں ثابت قدم رہے۔ اگر وہ جہاد کا دغظ کہتے ہوتے اور بغاوت و ہابیت کی اصل ہوتی تو جو کچھ ان سے ظہور میں آیا یہ کیونکر ظہور میں آتا، ہم ڈاکٹر ہنٹر کی اسگاہی کے لیے ان لوگوں کے چال چلن کو پیش کرتے ہیں۔

اس کے ایک مدت بعد اٹھدہ بجے آئیزور مورخہ ۱۹ مارچ ۱۸۶۲ء میں خود اس کے یورومین اڈیٹر کا ایک زبردست آرٹیکل سرسید کے ریویو پر نکلا جو درحقیقت ہندوستان کے یورومین حکام اور افسروں کی رائے کا آئینہ تھا۔ ہم اس آرٹیکل کے چند مقام میاں بجنسہ نقل کیے دیتے ہیں، تاکہ اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ اس ریویو نے انگریزوں کے دل پر کیا اثر کیا تھا اور تاکہ ہندوستانیوں پر ظاہر ہو جائے کہ انگریز سچی بات کے قبول کرنے میں کس قدر بغیر متعصب اور منصف مزاج ہوتے ہیں۔

وہ لکھتا ہے کہ ”ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا کے لوگوں نے یا دنیا میں سے اس گروہ کے لوگوں نے جو اس قسم کی باتوں سے سروکار رکھتے ہیں، ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب متعلقہ مسلمانان ہندوستان کی قدر و منزلت کی بابت، بلکہ ٹھیک ٹھیک یہ کہتا اچھا ہے کہ اس کے لچر و پوچ ہو نے کی بابت، بالاتفاق تصیف کر دیا ہے۔ جہاں تک کہ ہم کو لٹریچر میں مداخلت ہے اس کے اعتبار سے ہم ڈاکٹر ہنٹر

کی کتاب کو لڑائی سمجھتے ہیں، کیونکہ ان کے سوا ہم نہیں جانتے ہیں کہ کسی مصنف نے
 دیدہ و دانستہ ایسے مضمون پر کتاب چھاپی ہو جس سے وہ بالکل ناواقف ہو
 جس کسی کو کچھ بھی علم ان باتوں کا ہو گا جن کی بحث اس کتاب میں ہے وہ ایک
 ہی نظر میں معلوم کر لے گا کہ ڈاکٹر ہنٹر مسلمانوں کے مذہب کی نسبت اور
 خاص کر وہابیوں کے مذہب کی نسبت کچھ بھی نہیں جانتے وہ شمال مغرب
 کی سرحد کے لوگوں کی حالت سے بالکل ناواقف ہیں۔ یہاں تک کہ جو قومیں
 اُس ملک میں بستی ہیں ان کے نام تک نہیں جانتے اور اس وقت سلطنت
 کی پچھلے دنوں کی نسبت اور اس بات کی نسبت کہ سید احمد کے زمانہ میں
 سکھ اور افغانوں کے باہم کیا معاملہ تھا، نہایت دھندلے خیالات کے سوا
 انھوں نے اور کچھ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اور جب سے کہ ملک پنجاب
 گورنمنٹ انگلیش کے قبضہ میں آیا ہے اُس کے بعد کی سرحدی تاریخ سے بھی
 ناواقف ہیں اور جو مسلمان خاص بنگالہ کی حد سے باہر رہتے ہیں ان کے
 حالات سے بالکل بے خبر ہیں بلکہ جب ان لوگوں کا ذکر کرتے ہیں تو اُس میں
 ایک غلطی سے دوسری غلطی میں پڑتے ہیں اور جب وہ اپنے خیال اور قیاس
 کو اکبر کے زمانہ کے حالات کے تذکرہ سے ثابت کرنا چاہتے ہیں تو
 ایسی باتیں بیان کرتے ہیں جو ہنسی کے قابل اور بالکل تغیر ممکن ہیں۔ اگرچہ
 وہ دلائل اسلام اور دارالحدیث کی بحث ایک مکہ کے مولوی کیسی فصاحت
 اور واقفیت کے ساتھ کرتے ہیں، تاہم ان کے مباحثہ کے ہر حصہ کے
 ماتندان باتوں کا علم بھی ان کو ان مہل اور بے صرفہ خیالات سے کچھ بڑھ
 کر نہیں ہے جو ہر ایسے تعلیم یافتہ اشخاص کے ہوتے ہیں جن نے کچھ
 ہسٹری پڑھی ہو۔

” اسی بڑی ناواقفیت کے باعث ڈاکٹر منہٹر کی کتاب میں ایک ایسا وصف ہے جو اُس کے ساتھ مخصوص ہے جیسا ہم اوپر کہہ آئے ہیں۔ یہ کتاب لٹریچر کے کتب خانہ میں بے نظیر ہے۔ بشرطیکہ جس نے سید احمد خاں کی تحریر کو پڑھا ہے ضرور یقین کرے گا کہ ہم نے جو کچھ اوپر بیان کیا ہے اُس میں اس معاملہ کے اصل حالات کی نسبت کچھ مبالغہ نہیں کیا۔ ڈاکٹر منہٹر کو یہ توقع کہ اپنی فصاحت و بلاغت اور دل فریب عبارت کے ذریعہ سے کامیاب ہو جائیں گے، مگر ظاہراً انہوں نے اپنی ناواقفیت کی گہرائی کی تھماہ دریافت نہیں کی تھی۔ یا غالباً یہ سمجھا تھا کہ جس قدر میں جاتا ہوں اُس سے زیادہ کوئی واقف نہ ہوگا۔ اس لیے کوئی میری باتوں کی اصلاح نہ کر سکے گا۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ میرے میزبان میری کیسی مدامت کریں گے؛ ان کی اس بات پر ہم سے زیادہ اور کسی کو افسوس نہ ہوگا۔ غالباً ڈاکٹر منہٹر ابھی زندہ رہیں گے اور بہت سی کتابیں لکھیں گے جن کی عبارت بہت سے لوگوں کے دل کو بھائے گی۔ مگر اصلی واقعات کے محقق ہونے کی ناموری اُن کے ہاتھ سے ایسی کھوئی گئی ہے کہ پھر کبھی میسر نہ ہوگی۔ کتاب کا پڑھنے والا ان کی کتابوں کو بغیر اس کے کہ کھول کر دیکھے بالائے طاق رکھ دے گا اور یہ سمجھے گا کہ قصہ کی دلچسپ کتابوں کے مانند ہیں جو اپنی طرز میں نہایت دل فریب ہوتی ہیں مگر کسی کام کی نہیں۔“

” سید احمد خاں کا پھوٹا سا رسالہ سوائے ڈاکٹر منہٹر کی تردید کے اور

کبھی خوبی اور عمدگی رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کی لکھی ہوئی کتاب ہے جو ہر طرح سے ہمارے اور اپنے ہم مذہبوں کے درمیان ترجمانی کے کام کے لیے بخوبی لائق ہے۔ سید احمد خاں مذہب اسلام کو خاص خدا کا دیا ہوا ہونے پر نہایت پختہ یقین رکھتے ہیں اور ان کو یہ بھی یقین ہے کہ آخر کار اور

مذہبوں پر یہی مذہب غائب آئے گا۔ مگر اسی کے ساتھ وہ دل سے اور نہایت گرجوشی سے انگریزی عملداری کے معاون ہیں وہ اس بات کو خوب سمجھتے ہیں کہ اگر انسان وحشیانہ حالت کی طرف مراجعت نہ کرنی چاہے تو تہذیبوں کا ہونے رہنا نہایت ضروری ہے۔ بغیر کسی استثنا کے وہ تسلیم کرتے ہیں کہ اگر اسلام کو روحانی سلطنت حاصل کرنی ہے تو وہ تہذیب و شائستگی کے ساتھ ملا جلا رہے، کوئی انگریز اس قسم کی دلیل پر اعتراض نہیں کر سکتا، کیونکہ ان کا دعویٰ اس قدر مدلل اور مستند ہے کہ کوئی انگریز ان دلیلوں اور استدلوں کا بیسواں حصہ بھی اپنے بیان کی تائید میں پیش نہیں کر سکتا۔ پس اگر سید احمد خاں یہ کہتے ہیں کہ وہابی یا پکے مسلمان کے دین کا یہ کوئی جزو نہیں ہے کہ گورنمنٹ انگلشیہ کا مقابلہ کرے اور یہ کہ مسلمان پر جیسا اور غیر مذہب والوں کے ساتھ خاص خاص حالتوں میں جہاد کرنا فرض ہے ویسا ہی عیسائیوں کے ساتھ ہے اور ویسا ہی ہندوؤں کے ساتھ اور یہ کہ مسلمان حکمی فرض سمجھتے ہیں کہ وہ بھی اور مذہب والوں کی مانند تمام بنی آدم کے ساتھ برادرانہ طور پر یگانگت اور اتفاق سے رہیں تو گو اس قسم کے بیانات ہمارے اگلے خیالات کے کیسے ہی مخالف ہوں جب تک کہ ہم کو اس قدر اعلیٰ درجہ کی واقفیت نہ ہو کہ ہم سید احمد خاں پر غلطی کا الزام لگا سکیں اُس وقت ہم کو ان باتوں کے تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔“

”ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ تعصب اور فساد کے مقابلہ میں ہم زیادہ احتیاط نہ کریں، لیکن اب ایسی باتوں کا خوف حد سے زیادہ بڑھ گیا ہے، کیونکہ انگریزوں کے دلوں میں علی العموم اس بات کا یقین ہے کہ مسلمان جس قدر زیادہ ایماندار ہو گا، اسی قدر انتظام کا سخت دشمن ہو گا اور اسی قدر اس کا پکٹا

ارادہ ہو گا کہ یا تو وہ اُسے توڑے یا خود اُس سے ٹوٹ جائے، اور اس میں کچھ شک نہیں کہ ایسے لوگ جن کو یہ یقین ہے کہ اگر ہم کسی انگریز کو حق یا ناحق مار ڈالیں تو ہم کو ثواب دہی ملے گا، گورنمنٹ انگریزوں سے لے نہایت وقت کی چیز ہیں۔ پس یہ نہایت تسلی اور راحت کی بات ہے کہ ایسی عمدہ عمدہ سے جس کی عمدگی حتی الامکان ثابت ہے یقین دلایا جائے کہ یہ خوف بے بنیاد ہے ہم بھی اس قسم کی باتیں بار بار کہہ چکے ہیں مگر ہم کو اس پر نہ تھی کہ ایک انگریز اخبار نویس کی رائے ایسے معاملہ میں کچھ معتبر ہوگی۔

اس کے بعد انڈین آئیڈیو کے ایڈیٹر نے سرسید کے رسالہ سے چند فقرے نقل کر کے ان کی تائید کی ہے اور ایک طبعی بحث کے بعد اپنے آرٹیکل کو اس فقرہ پر ختم کیا ہے "ممکن نہیں کہ کوئی بیان اس سے (یعنی سرسید کے بیان سے) زیادہ صاف ہو، اس سے ان لوگوں کا اطمینان ہونا چاہیے جو بزدل لاؤ و بھی ہیں۔ سید احمد خاں کے مختصر رسالہ میں اور بھی بہت سی باتیں ہیں جن کا تذکرہ ہم کرتے اگر ہمارے اس پرچہ میں گفتگو ہوتی۔ ہم ایسی کسی کتاب سے واقف نہیں ہیں جس میں ایسی تھوڑی سی جگہ میں مسلمانوں کے خیالات کی نسبت اس قدر زیادہ اطلاع حاصل ہو۔ ہندوستان کے ہر انگریز کو اسے بغور پڑھنا چاہیے، اور ہم امید کرتے ہیں کہ یہ بہت پھیلے گی، یہ ٹھیک اسی قسم کی کتاب ہے جس کی ضرورت آج کل ان تمام عام لوگوں کے دلوں کو تسلی اور قرار بخشنے کے لیے ہے جو اپنی ناقصیت کے سبب سایہ سے بھی بھڑکتے ہیں۔" سر ایف فرڈ لائل اپنے ایک ایسے میں جو سرسید کے بعد تصدیق لوجیکل ریویو میں شائع ہوا تھا، ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر یہ بارک کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اس مصنف کو مبارکباد کا جن بسا اوقات پریشان کرتا

ہے اور بہتر ہوتا اگر اس جن کو وہ اتار دیتا۔“

سرستید کے ریلویو اور بھی بعض مدبران سلطنت نے رائیں لکھی ہیں مگر ہم یہاں اسی قدر پر اکتفا کرتے ہیں۔ یہ ریلویو اخبارات میں شائع ہونے کے بعد کتاب کی صورت میں بھی اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں چھپا تھا، اس کی پوری پوری کیفیت جب تک کہ وہ اول سے آخر تک نہ پڑھا جائے معلوم نہیں ہو سکتی، مگر ہم بطور نمونہ کے اس کا ایک مختصر مقام اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔

ڈاکٹر منبر نے اپنی کتاب کے تیسرے باب کے خاتمہ پر یہ لکھا تھا کہ ”مجھ کو ہندوستان کے مسلمانوں سے دلی خیر خواہی اور محبت کی ہرگز توقع نہیں ہے بلکہ میں ان ذات سے بڑی امید یہی کر سکتا ہوں کہ وہ حکومت انگریزی کے قبول کرنے میں سرد مہری کریں گے۔“ سرسید اس پر یوں لکھتے ہیں کہ ”اگر ڈاکٹر صاحبوں کو ہم لوگوں کے مسلمان ہونے کے باعث اس قدر باپوسی ہے تو میں اولاً ان سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ قرآن شریف کی اس آیت کی طرف توجیہ فرمائیں۔ ”وَلْتَجِدَنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَئِيمًا كَفُورًا“ اور وہ بہت گھمنڈ نہیں رکھتے۔“

”دوسرے یہ مسئلہ مشہور ہے کہ جیسا کوئی کہتا ہے ویسا ہی اس کو نتیجہ ملتا ہے۔ پس اگر مسلمان مجز سرد مہری کے قوم حکمراں کی جانب سے

کچھ سلوک نہیں دیکھتے ہیں تو ڈاکٹر صاحب کو مسلمانوں کی سر دمہری پر کچھ
تعمیر نہ ہونا چاہیے۔ ہم دونوں قوموں یعنی عیسائی اور مسلمانوں کو حضرت عیسیٰؑ
کا یہ قول یاد رکھنا چاہیے کہ جس سلوک کے تم اور آدمیوں سے متوقع ہو تم کو بھی
اسی طرح ان کے ساتھ سلوک کرنا چاہیے۔

پھر اسی باب کے خاتمہ پر ایک حاشیہ میں ڈاکٹر بنٹرنے مندرجہ ذیل
سوال لکھا تھا "سوال اسے علماء و محققان شرع اسلام تمہاری اس معاملہ میں کیا
راٹے بے کہ اگر کوئی مسلمان بادشاہ ہندوستان پر ایسے وقت میں حملہ
کرے جب کہ وہ انگریزوں کے قبضہ میں ہو تو اس ملک کے مسلمانوں کو انگریزوں
کی امان ترک کرنی اور اس غنیمت کی مدد دینی جائز ہے یا نہیں؟ اس سوال کے
جواب میں سر سید نے اول اصول اسلام کی رو سے ایک ہیبت لیبی تقریر یہ
کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ "جب تک مذہبی معاملات میں ہم کو ہر قسم کی
سزاوی ہندوستان میں حاصل ہے۔ اپنے مذہبی فرائض بے کھٹکے ادا کرتے ہیں
اوان جس قدر بلند آواز سے چاہیں مسجدوں میں دے سکتے ہیں۔ شارع عام
میں دعوت اسلام کر سکتے ہیں، پادری جو اعتراض مذہب اسلام پر کرتے ہیں
ان کا جواب بلا خوف و خطر دے سکتے ہیں، خود مذہب عیسوی پر اعتراض کر سکتے
ہیں، اس کے برخلاف کتابیں چھاپ سکتے ہیں اور عیسائیوں کو بلا کسی نراحت
اور اندیشہ کے جب وہ مسلمان ہونا چاہیں، مسلمان کر سکتے ہیں، اس وقت
تک انگریزی امان سے علیحدہ ہونا اور غنیمت کو مدد دینا کسی مسلمان کا مذہبی فرض
نہیں ہے، اور اگر مسلمان ایسا کریں تو وہ گنہگار خیال کیے جائیں گے، کیونکہ
ان کا یہ فعل اس پاک معاہدہ کا توڑنا ہو گا جو رعایا اور حکام کے درمیان ہے اور
جس کی پابندی مرتے دم تک کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔"

” اس کے بعد سرسید لکھتے ہیں کہ ” البتہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اگر آئندہ کوئی مسلمان یا کوئی اور بادشاہ ہندوستان پر حملہ کرے تو اس صورت میں باعتبار عمل درآمد کے ٹھیک ٹھیک مسلمان کیا کریں گے؛ کیونکہ وہ شخص درحقیقت نہایت دلیر ہے جو اپنے دلی دوستوں اور رشتہ داروں کے سوا عام شخصوں کی طرف سے بھی کچھ جواب دے، بلکہ میری دانست میں تو شاندرشتہ داروں اور دوستوں کی طرف سے بھی کچھ جواب دینا مشکل ہے چنانچہ جو ملکی لڑائیاں ہندوستان میں ہوئی ہیں ان میں باپ بیٹوں سے اور بھائی بھائی سے لڑے تھے۔ پس کوئی شخص یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ کسی بڑے ملکی ہنگامہ میں کل قوم کا کیا حال ہوگا؛ میں یقین کرتا ہوں کہ ایسی حالت میں مسلمان وہی کریں گے جو ان کی پورے شکل حالت ان سے کروائے گی اور میری دانست میں یہ سخت سوال ہندوؤں سے بھی اسی طرح متعلق ہو سکتا ہے جیسا کہ مسلمانوں سے۔ پس اس لحاظ سے اس کا دریافت کرنا دونوں قوموں سے ضرور ہے۔“

سرسید نے جو کچھ ڈاکٹر منٹر کی کتاب پر لکھا تھا اس کا حال بقدر ضرورت ہم نے بیان کر دیا ہے مگر ہمارے نزدیک بڑی بے انصافی اور ناشکری ہوگی اگر اس مقام پر آئرہیل ڈبلیو ڈبلیو ڈاکٹر منٹر کے اس شریعہ برتاؤ کا ذکر نہ کیا جائے جو اس واقعہ کے بعد سرسید اور مسلمانوں کے ساتھ ان سے ظہور میں آیا۔ انھوں نے مدرسۃ العلوم کے پختہ بورڈنگ ہاؤس میں ایک کمرہ بنانے کے لیے ڈیڑھ ہزار روپیہ اپنی جیب خاص سے دیا اور ۱۸۸۲ء میں جب وہ ایجوکیشن کمیشن کے پریسیڈنٹ تھے کمیشن کے دورہ کے وقت اضلاع شمال مغرب میں پہلا اجلاس علیگڑھ میں کیا اور اپنی اخیر اسپیچ محمدن کالج میں آ کر دی جس میں نہایت بشارت اور کشادہ دلی کے ساتھ سرسید اور ان کی کوششوں کی

بے انتہا تعریف اور کالج کے سرسبز ہونے کی تمنا ظاہر کی تھی اور کہا تھا کہ اگر ایسی ہی چند مثالیں سیلف ہلپ کی اور ہوں تو ہندوستان میں ایجوکیشن کمیشن کی ضرورت نہ رہے گی۔

ابتدائی مدرسہ علیگرہ میں قائم ہونا

فروری ۱۹۳۳ء میں جو جلد صدر کمیٹی کا بنارس میں ہوا تھا اس میں سید محمود نے یہ بھی تحریک کی تھی کہ بہت جلد مقام مجوزہ میں ایک مدرسہ ماتحت مدرسہ العلوم مجوزہ کے قائم کیا جائے چنانچہ ۲۱۔ اگست ۱۹۳۳ء کو علیگرہ میں جو سب کمیٹی کا جلسہ ہوا اور جس میں علیگرہ اور بلند شہر کے اکثر رئیس اور معزز مسلمان شریک تھے، وہاں مولوی سمیع اللہ خاں سکریٹری سب کمیٹی اور سید محمود نے اپنی اسپچوں میں مدرسہ ماتحت قائم کرنے کی دوبارہ تحریک کی۔ پھر ۲۱۔ دسمبر ۱۹۳۳ء کو دوسرا جلسہ علیگرہ ہی میں ہوا اور مولوی سمیع اللہ خاں نے تقریر کرتے وقت کہا کہ مدرسہ العلوم کی مخالفت روز بروز ٹہرتی جاتی ہے۔ اس کے رفع کرنے کی تدابیر اس سے بہتر نہیں کہ ایک ماتحت مدرسہ بطور نمونہ کے علیگرہ میں قائم کیا جائے جس کے طریقہ تعلیم سے لوگوں پر ظاہر ہو جائے کہ جو تعلیم صدر کمیٹی بنارس نے تجویز کی ہے وہ کسی طرح اصول اسلام کے برخلاف نہیں ہے، اس تجویز کو سب نے پسند کیا اور بعض علمائے اہل اسلام نے جو اس جلسہ میں شریک تھے طریقہ تعلیم کو جو سکریٹری نے اس وقت بیان کیا بلا ملاحظہ شرعی تسلیم کیا، اس جلسہ میں اور سب کمیٹیوں کی نسبت چندہ کی رقم زیادہ کھی گئی تھی اور جس شرط پر مدارس ماتحت مختلف مقالات میں جاری کر لے قرار پائے تھے اس کی طرف سے علیگرہ کی سب کمیٹی نے کافی اطمینان

کر دیا تھا۔ اس لیے صدر کمیٹی بنارس نے بھی علیگر ٹھہ سب کمیٹی کی تجویز کو پسند کیا اور سکرٹری سے درخواست کی کہ علیگر ٹھہ میں مدرسہ ماتحت جاری کیا جائے مولوی سمیع اللہ خاں سکرٹری سب کمیٹی نے جو اُس وقت علیگر ٹھہ میں بارڈنٹ بیج تھے نہایت دلی سعی اور کوشش سے صدر کمیٹی کے مقصد کو انجام دیا اور ۲۴ مئی ۱۸۵۷ء کو ملکہ معظمہ کی سالگرہ کا دن تھا مدرسہ کے افتتاح کی تاریخ قرار پائی۔ تاریخ مذکور پر سرستید بھی بنارس سے علیگر ٹھہ آ گئے اور ایک جلسہ میں جس کے صدر انجمن مولوی محمد کریم مرحوم ڈپٹی کلکٹر علیگر ٹھہ تھے رسم افتتاح عمل میں آئی اور یکم جون ۱۸۵۷ء سے جماعت ہندی ہو کر تعلیم شروع ہو گئی تاریخ مذکور سے لے کر اب تک مدرسہ العلوم کو قائم ہوئے ۲۴ برس کا زمانہ گزرا ہے، اس عرصہ کے تمام واقعات اور حالات جو مدرسہ مذکور کے انتظار اور ترقی سے متعلق ہیں ان کے لکھنے کے لیے ایک مجلد کتاب کی ضرورت ہے اس لیے یہاں ہم صرف ضروری امور بیان کریں گے جو اس کتاب کے موضوع سے مناسبت رکھتے ہیں۔

جس وسیع میدان میں اب محمدن کالج علیگر ٹھہ اور اس کی تمام عمارتیں موجود ہیں کسی زمانہ میں یہ چھاؤنی سے متعلق تھا اور یہاں فوج کی پریٹ بٹوا کرتی تھی مگر اب وہاں چھاؤنی نہیں رہی تھی اور اس میدان میں سے کچھ قطعات لوگوں کو سرکار سے کوٹھیاں بنانے کے واسطے مل گئے تھے لیکن اب بھی

۱۔ افتتاح کے موقع پر مولوی محمد اکبر اور مولوی محمد اشتم نے عربی نظم و نثر بطور مبارکباد کے اور مولوی صفحہ حسین نے فارسی ادسا رو میں قطعات تاریخ لکھے تھے چونکہ یہ سب نثریں طولانی ہیں اس لیے صرف قطعہ تاریخ نثر پر کیا جاتا ہے۔

قریب ۷۷ ایکڑ کے زمین باقی تھی۔ سرسید نے مدرسہ کے لیے کمیٹی کی طرف سے
 اس زمین کے ملنے کی درخواست کی تھی۔ اُس وقت ہنری لارنس علیگرہ میں
 کلکٹر تھے انھوں نے اس قطعہ کے ملنے کی رپورٹ گورنمنٹ میں بھیجی وہی اور
 سرولیم میور نے بھی جو اس زمانہ میں لفظ گورنر تھے اُس قطعہ کے دینے
 کا وعدہ کر لیا مگر ابھی وہ قطعہ کمیٹی کو ملنے نہیں پایا تھا کہ ماسٹی گیورٹ صاحب
 علیگرہ میں قائم مقام کلکٹر ہو گئے۔ انھوں نے اس بات کی سخت مخالفت کی
 کہ وہ قطعہ کمیٹی کو کالج کے لیے دیا جائے۔ ان کے بعد چوسٹر کالون مستقل کلکٹر
 و مجسٹریٹ مقرر ہو کر آئے انھوں نے بھی ویسی ہی مخالفت کی اور اس وقت
 کے تمام یوروپین حکام ان کے ہم رائے اور ہمزبان ہو گئے یہ ایسی سخت جرات
 ہوئی تھی کہ بانیان کالج اس کے ملنے سے بالوں ہونے لگے تھے اور قریب
 تھا کہ وہ کالج کا خیال چھوڑ دیں اور تمام کوششیں برباد ہو جائیں۔ مگر خوش قسمتی
 سے اسی زمانے میں سر جان اسٹریچی جن کا اس کالج پر سب سے زیادہ احسان
 ہے لفظ گورنر ہو گئے اور یہ معاملہ ان کے سامنے پیش ہوا۔ وہ خود دورہ
 کے دنوں میں علیگرہ آئے اور موقع کو ملاحظہ کیا۔ سرسید بھی بنا اس سے علیگرہ
 پہنچے اور بہت سی گفت و شنید کے بعد ہنر آرنے سے یہ فیصلہ کیا کہ زمین کالج بنانے
 کے لیے کمیٹی کو اس شرط پر دی جائے کہ جو عمارت اُس میں بنائی جائے اُس
 کے بننے سے پہلے اُس کا نقشہ گورنمنٹ کے ملاحظہ کے لیے بھیجا جائے اور
 اور اگر بالفرض کبھی کوئی ایسا اتفاق پیش آئے کہ یہ کالج بند ہو جائے تو
 جس قدر عمارت کمیٹی کی بنائی ہوئی یہاں موجود ہوں گی ان سب پر سرکار
 کا قبضہ ہو جائے گا۔ کمیٹی نے یہ دونوں شرطیں منظور کر لیں اور سر جان اسٹریچی
 نے اُس کی منظوری گورنمنٹ ہند سے منگا کر سند عطا کی اور کمیٹی کو عمارت

کی اور حسب ضابطہ قطعہ مذکور پر قبضہ دلایا گیا۔ مدرسہ ماتحت کے افتتاح سے سے پہلے یہ زمین کیٹی کول چکی تھی اور جس بنگلہ میں اب تک محمد بن ہانی اسکول کی جگہیں پڑھتی ہیں۔ اس بنگلہ میں ابتدائی مدرسہ قائم کیا گیا تھا۔

۱۲۔ نومبر ۱۹۵۷ء کو سر ولیم میور جو اس زمانے میں وائسرائے کی کونسل کے ممبر تھے مدرسہ کے ملاحظہ کو آئے اور ایک لمبی اسپچ دی جس میں کمیٹی کو مبارکباد دینے کے بعد سر سید کی نسبت کہا کہ میں خاص کر اپنے دوست کی دیرینہ خواہش کے پورا ہونے اور ان کے دلی مدعا کا پہلا پھل حاصل ہونے پر ان کو مبارکباد دیتا ہوں۔

جب یہاں تک نوبت پہنچ گئی اور مدرسہ کو جاری ہونے ایک سال گزر چکا تو سر سید کو ضروری معلوم ہوا کہ نوکری سے علیحدہ ہو کر مدرسے کی تکمیل میں اطمینان اور کامل توجہ سے کوشش کی جائے کچھ نو سرکاری کاموں کی مصروفیت مدرسے کے کام میں جارح ہوتی تھی اور کچھ وہ اپنی جلیب احتیاط کے سبب سے سرکاری عہدہ دار ہونے کی حالت میں چہندہ وصول کرنے سے بچ پاتے تھے۔ پیش کا نقشہ تو وہ مدرسہ کے جاری ہوتے ہی بھیج چکے تھے، جولائی ۱۹۵۷ء کے آخر میں نیشن کی منظوری بھی آگئی اور وہ اسی وقت ملازمت سے کنارہ کش ہو کر علیگڑھ چلے آئے اور اپنی قدیم کوٹھی جو علیگڑھ میں تھی ولایت جاتے ہوئے رہن کر گئے تھے مگر جب یہ امر طے ہو گیا کہ مدرسہ العلوم علیگڑھ میں قائم کیا جائے تو سر سید محمود نے اپنے اور سر سید کے رہنے کے لیے ایک اور کوٹھی خرید لی تھی اور پہلی کوٹھی کو فروخت کر دیا تھا۔ جب سر سید بنارس سے آئے تو اس کوٹھی کو اپنی ضرورت کے موافق درست کیا اور اس میں سکونت اختیار کی۔

جب وہ بنارس سے آئے تو ضلع علیگڑھ کے رؤسا اور معزز لوگوں نے ان کو دعوت دی اور ایک شاندار جلسہ منعقد ہوا جس میں اضلاع قرب و جوار کے رؤسا بھی شامل تھے اس جلسہ میں سرسید کو ایڈریس بھی دیا گیا تھا جس میں ان کے احسانات کا ذکر تھا جو قوم کی بھلائی کے لیے ان سے ظہور میں آئے سرسید نے ایک فقرے کے جواب میں جو الفاظ کہے تھے وہ ہم بجنسہ یہاں نقل کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ”ہاں یہ بات سچ ہے کہ میں نے اپنے اس قدیم نامی اور پرانے شہر کو جہاں میرے بزرگوں اور عزیزوں کی ہڈیاں اتنا زمین میں پڑی ہیں اور جہاں میرے بہت سے عزیز ایتک رہتے ہیں جس کی مٹی سے لوگوں نے خیال کیا تھا میں بنا ہوں اور پھر اسی میں میری خاک مل جائے گی۔ صرف مدرسۃ العلوم کی محبت، اپنی قوم کی بھلائی اور ریشیان ضلع علیگڑھ و بلند شہر کی محبت و عنایت کے خیال سے چھوڑا ہے اور یہاں ایک غریب مسافر کی طرح سکونت اختیار کی ہے۔ میں نے صرف اس خیال سے کہ کیا راہ ہے جس سے قوم کی حالت درست ہو؛ دور و دراز سفر اختیار کیا اور بہت کچھ دیکھا جو دیکھنے کے لائق تھا، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی، جب کبھی عالموں اور مہذب آدمیوں کو دیکھا، جب کبھی علمی مجلسیں دیکھیں جہاں کہیں عمدہ مکانات دیکھے، جب کبھی عمدہ پھول دیکھے، جب کبھی کھیل کو دعائش و آرام کے جلسے دیکھے، یہاں تک کہ جب کبھی کسی خوبصورت شخص کو دیکھا مجھ کو ہمیشہ اپنا ملک اور اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ ہائے ہماری قوم ایسی کیوں تھیں؛ جہاں تک ہوسکا ہر موقع پر میں نے قومی ترقی کی تدبیروں پر غور کیا، سب سے اول یہی تدبیر سوچھی کہ قوم کے لیے قوم ہی کے ہاتھ سے ایک مدرسۃ العلوم

قائم کیا جائے جس کی بنا آپ کے شہر میں اور آپ کے زیر سایہ پڑی ہے۔

فوٹو لیشن سٹون کالج

الغرض سرستید علی گڑھ میں آ کر بہترین کالج کے کام میں مصروف ہو گئے کالج کی عمارتوں میں جلد اول جلد ترقی ہونے لگی۔ ہندوستان کے اطراف میں چندہ کے واسطے زیادہ تحریکیں اور کوششیں ہونے لگیں اور علی گڑھ صرف دارالعلوم ہی نہیں بلکہ رفتہ رفتہ قومی ہمدردی، قومی اتحاد قومی مصالح اور قومی مقاصد کی تحریک کا صدر مقام اور مرکز بننے لگا۔ ۱۸۷۷ء کے شروع میں کالج کا بنیادی پتھر غیر معمولی اور غیر متوقع شان و شوکت کے ساتھ رکھا گیا۔ پہلے یہ سنجوڑ ٹھنڈی تھی کہ لارڈ نارٹھ بروک کے ہاتھ سے یہ رسم ادا کی جائے گی۔ لیکن لارڈ ممدوح کو کسی فائدگی ضرورت کی وجہ سے پیش از وقت ہندوستان کو چھوڑنا پڑا۔ پھر سر جان اسٹریچی لفٹنٹ گورنر شمال مغرب نے اس رسم کے ادا کرنے کا وعدہ کیا، مگر سرکاری ضرورتوں کی وجہ سے وہ بھی وقت معین پر نہ آ سکے۔ آخر لارڈ لٹن وائسرائے و گورنر جنرل کشور بہتہ کے ہاتھ سے اُس عظیم الشان دربار کے بعد جو ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا ادا ہوئی، لارڈ لٹن نے دربار قبیری کے بعد دلی سے مدرسہ العلوم میں آنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ چنانچہ ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو مع لیڈی لٹن کے علی گڑھ میں تشریف لائے اور سرستید کے ہاں مہمان ہوئے۔ سہ پہر کو وقت معین پر مع لیڈی صاحبہ کے فوٹو لیشن کے موقع پر تشریف لے گئے۔ اول سید محمود نے ایڈریس پڑھا اور وائسرائے نے اُس کا جواب نہایت شیریں زبانی اور اپنی مشہور فصاحت کے ساتھ دیا۔ پھر سرستید نے بنیاد کا پتھر رکھنے کی

درخواست کی چنانچہ حضور ممدوح نے بنیاد کا پتھر اس موقع پر جہاں اسٹریچی ہال کے صدر مقام میں سنگ مرمر کا کتبہ بنیاد کے قریب لگا ہوا ہے اپنے ہاتھ سے رکھا اور فونڈیشن کی تمام رسمیں یورپین قاعدہ کے موافق ادا کی گئیں۔

وائسرائے نے علیگڑھ سے چلتے وقت اپنی تصویر اور کئی جہلیں اپنی تصنیفات سرستید کو بطور یادگار کے عنایت کیں، اس کے بعد شہر میں ان کو ایک کشتی تقریبی بطور تحفہ اور یادگار کے بھیجی جس پر عبارت کندہ تھی۔ "بیادگار کھنہ بنیاد کالج کے بدستب خاص فائسرائے بتاریخ ۸ جنوری ۱۸۶۶ء و نشان اعزاز بخشش و دوستی از جانب رابرٹ لارڈ ملٹن، جی۔ سی۔ بی۔ جی۔ ام۔ ام۔ ایس۔ اے وائسرائے و گورنر جنرل ہند بولوی سید احمد خاں صاحب بہادر سی۔ ایس۔ آئی۔ پریسیڈنٹ اینگلو اورٹھیل کالج اہل اسلام مقام علیگڑھ تاریخ یکم جنوری ۱۸۶۶ء"۔

سید محمود نے جو سکیم ۱۔ فروری ۱۸۶۳ء کو کمیٹی میں پیش کی تھی اس میں انہوں نے صاف اس بات کی تصریح کی تھی کہ جاری غرض صرف ایک مدرسہ یا کالج ہی قائم کرنا نہیں ہے بلکہ ایک یونیورسٹی قائم کرنی ہے۔ پس کمیٹی نے جو انگریزی میں اپنا نام "محمدن اینگلو اورٹھیل کالج فنڈ کمیٹی رکھا ہے اس میں سچے کالج کے یونیورسٹی کا لفظ ہونا چاہیے اور اردو میں بجائے مدرسۃ العلوم کے دارالعلوم نام رکھنا چاہیے اور سب سے اس کے گورنمنٹ نگران حال رہے۔ اس کی اور کسی قسم کی مداخلت اس دارالعلوم میں نہ ہونی چاہیے۔ چنانچہ اس سکیم کی جو کاپی گورنمنٹ میں بھیجی گئی تھی اس میں بھی یونیورسٹی کا لفظ لکھا تھا۔ لوکل گورنمنٹ سے اس کا یہ جواب آیا کہ اگر کمیٹی محمدن یونیورسٹی قائم کرنا چاہتی ہے تو گورنمنٹ اس میں گرانٹ ان ایڈ نہیں دینے کی باوجود اس کے سرستید

کا ارادہ یہی تھا کہ یونیورسٹی قائم کی جائے۔ ان کو یقین تھا کہ جب تک موجودہ یونیورسٹیوں کی تعلیم سے قطع نظر نہ کی جائے گی اور مسلمانوں کی تعلیم کے لیے ان کی ضرورتوں کے موافق تعلیم و تربیت کا اپنے طور پر انتظام نہ کیا جائے گا، تب تک اصلی لیاقت قوم کے بچوں میں ہرگز پیدا نہ ہوگی، وہ چاہتے تھے کہ اس دارالعلوم میں کیمبرج یونیورسٹی کے موافق فیلو شپ جاری کیا جائے اور جو طالب علم فارغ التحصیل ہو جائے اس کو کسی خاص علم میں جس سے وہ خاص مناسبت رکھتا ہو، مصروف رہنے اور اس میں کمال حاصل کرنے کے لیے فیلوشپ دی جایا کرے اس طرح ایک گروہ عالموں اور محققوں کا قوم میں پیدا کیا جائے جو تمام قوم میں علم و کمال پھیلانے کے لیے بمنزلہ آلہ کے ہو۔ لیکن قطع نظر اس کے کہ ایسی یونیورسٹی صرف قوم کے بھروسہ پر قائم کرنا کوئی آسان کام نہ تھا، طالب علم اور نہ ان کے مربی کوئی اس بات پر رضامند ہونے والا تھا کہ یونیورسٹیوں کی ڈگریوں سے جو گورنمنٹ کی نوکری کا ذریعہ ہیں قطع نظر کی جائے اور فی الحقیقت مسلمانوں کی حالت اسی بات کی مقتضی تھی کہ صرف موجودہ یونیورسٹیوں کی ڈگریاں حاصل کرنے ہی کو فہم نہ سمجھا جائے الغرض سرسید کو اپنا منصوبہ پورا کرنے سے بالکل مایوسی ہو گئی، یونیورسٹی قائم کرنے کا خیال انھوں نے بالکل چھوڑ دیا اور مدرستہ العلوم میں وہی کورس اختیار کرنا پڑا جو موجودہ یونیورسٹیاں تجویز کریں، انھوں نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لی۔

نہ ہوتا ب پر وازہ گر آسماں تک
تو واں تک اڑیں ہورسانی جہاں تک

چندہ وصول کرنے کی تدبیریں

مدرسۃ العلوم کے متعلق سب سے زیادہ مشکل کام چندہ کا وصول کرنا تھا۔ جن کی اولاد کی تعلیم کے لیے مدرسہ قائم کرنا منظور تھا اول تو وہ پہلے ہی انگریزی تعلیم سے نفور تھے، دوسرے جس وقت مدرسہ کے لیے تحریک شروع ہوئی اسی کے ساتھ تہذیب الاخلاق جاری ہو گیا جس کے مضامین سے مسلمان عموماً نفرت کرتے تھے اور جس کی وجہ سے مدرسۃ العلوم میں چندہ دینے کو معصیت جاننے لگے تھے، اخباروں اور رسالوں میں مدرسۃ العلوم کے خلاف بے شمار مضامین چھپتے تھے اور سرسید کی تکفیر کے فتوے شائع کیے جاتے تھے۔ مولوی وعظ کی مجلسوں میں لوگوں کو چندہ دینے سے روکتے تھے۔ شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ منصبی دباؤ سے چندہ وصول کیا گیا ہو گا مگر یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے۔ سرسید نے مدرسہ قائم ہونے سے ایک ہی برس بعد ملازمت سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور اُس سے پہلے جس قدر چندہ ہوا وہ زیادہ تر علیگڑھ، لاہور، پٹنہ، مرزا پور اور پشاور وغیرہ سے ہوا۔ بنارس میں جہاں وہ خود سرکاری عہدہ دار تھے انھوں نے اپنے چند ہندو یا مسلمان دوستوں کے سوا کسی سے چندہ مانگنا پسند نہیں کیا۔ اس کے سوا ہندوستانی اور خاص کر مسلمان قومی کاموں میں چندہ دینے کے مفہوم سے محض ناواقف تھے۔ جب تک کسی حاکم کا دباؤ یا اشارہ ہوتا تھا چندہ جمع ہونا نہایت مشکل تھا۔ ہم نے سنا ہے کہ سرسید نے ولایت جانے سے پہلے ایک روز نواب انوجان مرحوم سے جو ان کے قریب رشتہ دار تھے برسبین تذکرہ یہ کہا کہ کیوں حضرت آپ کے نزدیک مسلمانوں کی تعلیم کے لیے دس لاکھ

روپیہ جمع ہو سکتا ہے یا نہیں۔ انہوں نے نہایت تعجب سے کہا "تم کیا دیوانوں کسی باتیں کرتے ہو! مسلمانوں سے دس لاکھ پیسے بھی وصول نہیں ہو سکتے" اس حکایت سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت چندہ جمع کرنے کی نسبت لوگوں کے کیسے خیالات تھے۔ باوجود اس کے یہ بات کچھ کم تعجب انگیز نہیں کہ ایک شخص کی تحریک یا کوشش سے بیس برس کے عرصہ میں سات آٹھ لاکھ کی عمارت نیا ہو گئی اور مدرسہ کی آمدنی اس حد تک پہنچ گئی کہ اسی ہزار روپیہ سالانہ تک اس میں خرچ ہونے لگا۔ ایک ایرانی سیاح نے مدرسہ کو دیکھ کر خود ہمارے سامنے یہ الفاظ کہے "واللہ معجزہ بینا بدکار یکہ از سلطنت برنیا بد چگونہ از یک فرور عیت سرانجام شد" مگر ہم سرستید کی اس کامیابی کو معجزہ نہیں سمجھتے بلکہ کامیابی کے اسباب پر نظر کرتے ہیں جن پر بغور کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک دانشمند اور راست باز آدمی استقلال اور ہمت سے ہر قسم کی مشکلات پر غالب آ سکتا ہے۔

سرستید نے مدرسہ کے کام کو جس لیاقت اور باقاعدگی کے ساتھ شروع کیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ سمجھ دار اور روشن خیال مسلمان اس کی طرف گرویدہ ہو گئے اور سلطنت کے بڑے بڑے جلیل القدر رکن اس کی جانب التفات ظاہر کرنے لگے اور اس کے معاون بن گئے، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اس کا اثر ذی مقدور لوگوں پر پڑنے لگا۔ اگرچہ مخالفتیں چلتی گاڑی ہیں برابر ہوتی آتی رہیں مگر کام کی عظمت، اس کی تائید کرنے والوں کا اعتبار اور ان کی وجاہت اور خود سرستید کا استقلال آہستہ آہستہ ہر ایک مخالفت کا مقابلہ کرتا رہا۔ تہذیب الاخلاق تہ مسلمانوں کی مقیم حالت اور انگریزی تعلیم کی ضرورت ان پر ظاہر کرنی شروع کی اور مذہبی توہمات جو تبدیل حالت کے

سڈراہ نھے شیناً فشیناً ووز ہونے لگے، سرسید کی طرف سے اس بات کا اطمینان کہ جس کام کے لیے روپیہ دیا جاتا ہے وہ اسی کام میں صرف ہوگا، سب سے زیادہ فراہمی چہتہ کا باعث ہوا۔

سرسید کی سب سے بڑی تدبیر جس نے کالج کی عظمت کا نقشہ خاص و عام کے دل پر بٹھا دیا اور جس سے کالج کو بے انتہا مدد پہنچی وہ یہ تھی کہ کالج اور بورڈنگ ہوس کی عمارتیں تابعہ دورا علی درجہ کے اسکول پر بنائی تجویز کیں اور عمارت کے بنانے میں نہایت جرات اور دلیری سے کام لیا۔ اگر روپیہ میں کمی ہوئی تو قرض لے لیکر عمارتوں کو پورا کیا۔ اس تدبیر سے ایک طرف تو کالج کی بڑائی کا خیال لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا اور مسلمانوں کو قومیت کے بھولے ہوئے خواب یاد آنے لگے، حکام کے دل میں کالج کی وقعت زیادہ ہونے لگی اور ہر شخص کو اس میں چہتہ دینے کی ترغیب ہوئی اور دوسری طرف کرایہ کی آمدنی روز بروز بڑھنی شروع ہوئی جو رفتہ رفتہ ۲۳ برس کے عرصہ میں تقریباً دس ہزار سالانہ تک پہنچ گئی، مگر بڑی بڑی عمارتوں کا بنوانا خود روپیہ کا محتاج تھا سو اس کے لیے سرسید نے یہ تدبیر نکالی کہ کالج کی ہر ایک عمارت کا تخمینہ کر کے اس کو متعدد حصوں میں تقسیم کر دیا اور اثتبار دے دیا کہ فی حصہ اس قدر روپیہ ہوتا ہے، جو شخص اتنا روپیہ دے گا اس کا نام عمارت پر کندہ کیا جائے گا، مثلاً کالج کے بڑے احاطہ کی سنگین جالیوں کے لیے فی جالی بیس روپیہ قرار دیے اور اس طرح احاطہ کا ایک بیڑا حصہ تیار ہو گیا، یا بورڈنگ ہوس کی پختہ بارک کے لیے فی کمرہ پندرہ سو روپیہ مقرر کیا اور اس طرح ایک تعداد کثیر پختہ کمروں کی رفتہ رفتہ تیار ہو گئی احاطہ کے تین دروازے مقرر کیے اور جو شخص ایک دروازہ

بنواد سے اُسی کے نام سے اُس دروازہ کو نامزد کرنا تجویز ہوا، اسٹریچی ہال کی لاگت کے بہت سے حصے کر کے فی حصہ پانسو روپیہ مقرر کیا اور تین آدمیوں نے پان پانسو روپیہ دینے کا سب کے نام اُس میں سنگ مرمر پر کندہ کر دیئے۔ اس کے سوا بہت سی عالیشان عمارتیں کالج کے بڑے بڑے محسنوں کی یادگار میں بنانی تجویز کیں جن میں ان کے دوستوں اور خواہوں نے بطیب خاطر چندہ دینا قبول کیا، طالب علموں کے رہنے کے لیے بہت سے مکان قرض لے کر بنوائے اور ان کے کرایہ کی آمدنی میں سے کسی قدر سود میں لگا دیا اور جب کہیں سے کچھ روپیہ بہم پہنچا فوراً قرضہ ادا کر کے اُن کی کل آمدنی مدرسہ کے تحت میں لے لی۔

صیغہ تعمیرات کے سوا کالج کے ادراخراجات کے لیے سرسید نے نئے نئے طریقوں سے روپیہ وصول کیا جس کو سن کر لوگ تعجب کریں گے ایک دفعہ تیس ہزار کی لاٹری والی، ہر چند مسلمانوں کی طرف سے سخت مخالفت ہوئی مگر سرسید نے کچھ پروا نہ کی اور بعد تقسیم انعامات کے بیس ہزار کے قریب کالج کو بچ رہا، لطیفہ۔ جن دنوں میں لاٹری کی تجویز درپیش تھی دو رئیس سرسید کے پاس آئے اور لاٹری کے ناجائز ہونے کی گفتگو شروع کی، سرسید نے کہا جہاں ہم اپنی ذات کے لیے ہزاروں ناجائز کام کرتے ہیں وہاں قوم کی بھلائی کے لیے بھی ایک ناجائز کام سہی، سرسید کے ایک دوست وہاں موجود تھے، انہوں نے کہا "لاٹری کا گناہ درحقیقت ریشوں اور دولت مندوں پر ہوگا، اگر وہ مدرسہ کی مدد کرتے تو کیوں لاٹری کی ضرورت ہوتی۔"

لاٹری کے سوا انہوں نے اور بے شمار تدبیروں سے روپیہ جمع کیا۔

اپنی اور اپنے دوستوں کی کتابیں فروخت کر کے روپیہ پیدا کیا۔ اپنی تصویر کی کاپیاں بیچیں اور جو کچھ ملا کالج کو دیدیا جب خلیفہ سید محمد خاں مرحوم وزیر ریاست پٹیالہ کے پوتا پیدا ہوا اور انھیں دنوں میں سرسید کا پٹیالہ جانا ہوا تو وزیر صاحب سے پوتے کے ہونے کی خوشی میں چرائی کے پانچ روپیے طلب کیے جس پر انھوں نے ایک معقول رقم ان کی نذر کی۔ ان کے ایک دوست کے قبائل دور دراز سفر سے علیگڑھ آئے، آپ سہادت کے دعوے سے ان کے ہاں امام ضامن کا روپیہ مانگنے کے لیے پہنچے اور وہاں سے ایک اشرفی اور کچھ روپیے لے کر آئے۔

چندہ وصول کرنے کے موقع پر انھوں نے کبھی اس بات کا خیال نہیں کیا کہ میں کون ہوں؛ کس سے مانگتا ہوں؛ اور کس طرح مانگتا ہوں؛ نمائش گاہ علیگڑھ میں انھوں نے کتابوں کی دوکان لگائی اور خود کتابیں بیچنے کے لیے دوکان پر بیٹھے۔ نیشنل والنیشن کرگلے میں جھولی ڈالی۔ پنی ریڈنگ کالج اور اسٹیج پر کھڑے ہو کر غز لیں گائیں۔

پنی ریڈنگ کالج اس لیے قرار دیا گیا تھا کہ غریب طالب علموں کے وظیفوں کے لیے کچھ سرمایہ جمع کیا جائے۔ جب اس جلسہ کی تیاری تھی تو دوستوں نے منع کیا کہ ایسا ہرگز نہ کیجیے گا۔ لوگ مطعون کریں گے اور تماشے والا کہیں گے۔ اخباروں میں ہنسی اڑائی جائے گی۔ سرسید نے کہا: "اگر میں لوگوں کے کہنے کا خیال کرتا تو جو کچھ اب تک کیا ہے اس میں سے کچھ بھی نہ کر سکتا۔ لوگوں کے کہنے کا کچھ خیال نہ کر دیکھو کہ اس سے درحقیقت قوم کو فائدہ پہنچے گا یا نہیں؛" جس وقت وہ اسٹیج پر کھڑے ہوئے تو انھوں نے ایک نوٹہ تقریر کی جس کے چند فقرے یہاں لکھے جاتے ہیں:

”کون ہے جو آج مجھ کو اسپتال پر دیکھ کر حیران ہوتا ہو گا؛ وہی جن کے دل میں قوم کا درد نہیں، وہی جن کا دل تھوٹی شیخی اور تھوٹی مشینت سے بھرا ہوا ہے۔ آہ اس قوم پر جو شرمناک باتوں کو اپنی شیخی اور افتخار کا باعث سمجھیں اور جو کام قوم اور انسان کی بھلائی کے لیے نیک نیتی سے کیے جائیں ان کو بے عزتی کے کام سمجھیں۔ آہ اس قوم پر جو لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے مکر و پندار کے کالے سوت سے بنے ہوئے تقدس کے برقع کو اپنے منہ پر ڈالے ہوئے ہوں مگر اپنی بد صورتی اور دل کی برائی کا کچھ علاج نہ سوچیں۔ آہ اس پر جو اپنی قوم کو ذلت اور نکبت کے سمندر میں ڈوبتا ہوا دیکھے اور خود کنارے پر بیٹھا ہنستا رہے اپنے گھر میں کھلے خزانے ایسی بے شرمی اور بے حیائی کے کام کرے جن سے بے شرمی و بے حیائی بھی شرمناک ہے۔ لیکن قوم کی بھلائی کے کام کو شرم اور تعزیر کا کام سمجھے۔“

”اے ریشیو اور اے دولتمندو! تم اپنی دولت و حشمت پر مغرور ہو کر یہ مت سمجھو کہ قوم کی بُری حالت ہو اور ہمارے بچوں کے لیے سب کچھ ہے۔ یہی ان لوگوں کا خیال تھا جو تم سے پہلے تھے مگر اب انھیں کے بچوں کی وہ نوبت ہے جس کے لیے ہم آج اسپتال پر کھڑے ہیں۔ اے صاحبو! ہر کوئی تسلیم کرتا ہے کہ تعلیم نہ ہونے سے قوم کا حال روز بروز خراب ہوتا جاتا ہے۔ قوم کے بچے اخراجات تعلیم کے سرانجام نہ ہونے سے ذلیل اور ذلیل ہوتے جاتے ہیں۔ میں نے کونی پہلو ایسا نہیں چھوڑا جس سے قوم کے غریب بچوں کے اخراجات تعلیم میں مدد پہنچے، مگر افسوس! کامیابی نہیں ہوئی۔ خود لوگوں سے بھیک مانگی، مگر قلیل ملی، والنیٹر بنانے چاہے، مگر بہت کم بنے اور جو بنے ان سے کچھ بن نہ آئی۔ پس میں اسپتال پر اس لیے آیا ہوں کہ قوم

کے بچوں کی تعلیم کے لیے کچھ کر سکوں۔ اس کے بعد سرسید نے کچھ اور تقریریں کی اور آخر کو خواجہ حافظ کی یہ غزل بہ اضافہ دو اشعار حسب حال جلسہ میں پڑھی

ساقیب بر خیزد در وہ جام را	خاک بر سر کن غم ایام را
ساغر سے بر کفم نہ تاز بر	بر کشم این دلق اندر ق قام را
گرچہ بدنامی ست نذر دیر عاقلان	مانمی خواہیم ننگ و نام را
بادہ در وہ چند اندر باد غرور	خاک بر سر نفس نافر جام را
دو در آہ سینہ نالان من	سوخت این افسردگان خام را
محرم راز دل شیدا ٹے خود	کس نمی بینم ز خاص و عاآرا
باد آراے سرا خاطر خوش ست	کز ولم کی بارہ برد آ آرام را
ننگ دو گیسو و اندر چمن	ہر کہ دید آں سر و سیم اندام را
کیست آں سر وہی کاندہ سرش	با ختم دین و دل و آرام را
قوم ما! اے قوم ما! کز بہر تو	بادہ ام بر باد ننگ و نام را
صبر کن احمد بہ سختی روز و شب	عاقبت روزے بیای کام را

غرض کہ سرسید نے مدرسہ کی خاطر ہر بابت کو اپنے نفس پر گوارا کر لیا تھا۔

۱۸۶۰ء میں جب پہلی بار انھوں نے لاہور میں لکچر دیا، جہاں لاہور کے تمام جلیل القدر عہدہ دار اور حاکم اور شہر کے ہندو اور مسلمان رئیس اور اداستے اور اعلیٰ تقریباً دس بارہ ہزار آدمی جمع تھے، تو مذہبی مخالفوں کا ذکر کر کے انھوں نے کہا کہ ”فرض کرو کہ میں ایک بد عقیدہ ہوں، مگر اے یورگان پنجاب! میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر مرتد آپ کی قوم کی سبلائی میں کوشش کرے تو کیا آپ اس کو اپنا خادم اور اپنا خیر خواہ نہ سمجھیں گے؟ آپ کے لیے دولت سرا بنانے میں میں آپ آرام کرتے ہیں اور آپ کے بچے پڑش

پاتے ہیں، یا آپ کے لیے مسجد بنانے میں جس میں آپ خدائے واحد الجلال
کا نام پکارتے ہیں، چوڑھے، چار، قلی کافر، بست پرست، بد عقیدہ سب
مزدوری کرتے ہیں، مگر آپ نہ کبھی اس دولت خانہ کے دشمن ہوتے ہیں
اور نہ کبھی اس مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ ہونے ہیں، آپ مجھ کو بھی اس
مدرسہ کے قائم کرنے میں ایک قلی چمک کی مانند تصور کیجیے اور میری محنت
اور مشقت سے اپنے لیے گھر بننے دیجیے اور اس وجہ سے کہ اس کا بنانے
والا یا اس میں مزدوری کرنے والا ایک قلی چار ہے۔ اپنے گھر کو مست
ڈھائیے۔“

مدرسہ کے لیے قلیل سے قلیل چنندہ کو بھی ویسی ہی خوشی اور کشادہ
پیشانی سے قبول کرتے تھے جیسے بڑی بڑی رقموں کو لیتے تھے۔ لوگ دو دو
آنے، اور چار چار آنے دیتے تھے اور وہ چوم پاٹ کر رکھ لیتے تھے ایک
صاحب نے ناچ کی محفل میں اہل محفل سے چنندہ جمع کیا، یہاں تک کہ
طوائف اور سازندوں نے بھی مدرسہ کی حقیقت سن کر خوشی سے چنندہ دیا
اور اس طرح سو سو روپیہ جمع ہو گیا، انہوں نے سید کو اطلاع کی کہ ایسا اور
ایسا روپیہ ہے اگر کہیے تو بھیج دیا جائے، ہر سید نے کچھ پس و پیش نہیں کی
اور فوراً روپیہ منگوا لیا۔

مدرسہ کے لیے انہوں نے بڑے بڑے لیے سفر کیے، پٹنہ، گورکھ پور،
الہ آباد، مرزا پور، لاہور، امرتسر، پٹیالہ، حیدرآباد، نیل گری، بھوپال، جبل پور
اور دیگر مقامات میں صرف مدرسہ کی دھن میں گئے، لاہور اور حیدرآباد متعدد
دفعہ اسی غرض سے جانا ہوا، ہزار ہا روپیہ ان سفروں میں ان کا صرف ہوا۔
اگرچہ ان کے دوست اور رفیق بھی جو ان کے ہمراہ جلتے تھے اپنا اپنا

خرچ اپنی گرہ سے اٹھاتے تھے لیکن وہ اکثر بدلتے رہتے تھے اور سرسید کا ہر سفر میں ہونا ضروری تھا۔ اس کے سوا ہمیشہ رزروڈ گاڑیوں میں سفر ہوتا تھا اور جس قدر سواریاں کم ہوتی تھیں ان کی کسی زیادہ ترسید کو پورا کرنی پڑتی تھی۔ ایک بار ان کے ایک دوست نے ان سے کہا کہ آپ راجپوتانہ کا بھی ایک بار دورہ کیجیے۔ سرسید نے کہا روپیہ نہیں ہے۔ ان کے منہ سے نکلا کہ جب آپ کالج کے واسطے سفر کرتے ہیں تو آپ کا سفر خرچ کمیشن کو دینا چاہیے۔ سرسید نے کہا میں اس بات کو ہرگز گوارا نہیں کر سکتا۔ مدرسہ چلے یا نہ چلے مگر میں اسی حالت میں مدرسہ کے لیے سفر کر سکتا ہوں جب سفر کے کل اخراجات اپنے پاس سے اٹھا سکوں۔

ایک اور طرفیہ انھیں سفروں میں چندہ جمع کرنے کا انھوں نے یہ نکالا تھا کہ جو احباب دعوت کرنی چاہتے تھے ان سے نقد روپیہ لے لیتے اور کالج کے چندہ میں جمع کر دیتے تھے۔ جب وہ دوسری بار پنجاب کو جانے لگے تو انھوں نے خان بہادر برکت علی خاں کو ایک خط لکھا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ "آپ سے اور سب دوستوں سے درخواست ہے کہ جو کچھ آپ یا اور احباب سیری مہانداری میں صرف کرنا چاہیں انہ راہ عنایت اس کی لاگت نقد عنایت فرمائیں۔ میں نے اکثر دوستوں سے اسی طرح دعوت کے بدلے نقد روپیہ لیا ہے اور اس کو کالج کے چندہ میں جمع کر دیا ہے۔ اس میں خوبی یہ ہے کہ امیر اور غریب سب دعوت کر سکتے ہیں، ایک دفعہ ایک دوست نے مجھے دعوت کی بابت ایک روپیہ عنایت کیا۔ میں نہایت خوش ہوا کہ مدرسہ العلوم کے کسی مزدوروں کی مزدوری ملی وہ دوست بھی خوش ہوئے کہ دعوت ٹھکانے لگی، آپ جانتے ہیں کہ میرے ساتھ

چند دوست بھی ہوں گے پس اگر یہ طریقہ دعوت کا اختیار نہ کیا جائے گا تو جن کے ہاں ٹھیروں گا ان پر خرچ کثیر پڑ جائے گا اور وہی مثل ہوگی کہ بھے کا کھایا کھیت جس کا پاپ نہ پُن ۔“

حیدرآباد کے پہلے سفر میں جو مشہور سرستید نے کیا تھا جس قدر روپیہ دعوت میں آیا وہ سب انھوں نے چنہ میں جمع کر دیا تھا جب وہاں سے واپس آئے تو علی گڑھ میں ان کے اجاب نے فی کس بیس روپیہ کے حساب سے دو سو بیس روپیہ اس لیے جمع کیے کہ سرستید کو شکر گزاری کے طور پر دعوت دی جائے۔ سرستید نے کہا اس کا انتظام میں خود کروں گا۔ وہ سب روپیہ ان سے لے کر اہم بیس روپیہ اپنے حصے کے اس میں ملا کر دو سو چالیس روپیہ کی دو اسکا لرشپیں دس دس روپیہ ماہوار کی غریب طالب علموں کے لیے مقرر کر دیں۔ ان کے دوستوں نے کہا کہ آپ نے اپنے ساتھ ہم کو بھی دعوت سے محروم رکھا اب ہم آپ سے دعوت لیں گے۔ اس پر مولوی محمد کریم مرحوم نے کہا کہ سید صاحب کی طرف سے میں سب صاحبوں کو دعوت دوں گا۔ چنانچہ انھوں نے بڑی دھوم سے سب کی دعوت کی۔

سید محمود کی شادی میں نواب امتھار جنگ نے سو روپے بطور اظہار سترت کے اس غرض سے بھیجے تھے کہ کالج میں صرف کیے جائیں۔ اس پر سرستید نے نہایت خوشی ظاہر کی اور اخبار میں لکھا کہ ”ہمارے بعض دوست نیوٹانہ لینے سے ناراض ہوئے مگر ہم نیوٹانہ لینے کو موجود تھے اگر اس کارروپیہ اسی طرح مدد سے العلوم میں خرچ کرنے کو دیا جاتا۔“ پھر لکھا کہ بعض دوستوں نے شکایت کیا ہے کہ شادی میں دعوت دلیہ

نہیں کی، مگر ہم نہ جاگیر دار ہیں نہ زمینیں ہیں، اگر دعوتِ ولیمہ کو تے تو زیادہ سے زیادہ پانسو روپیہ لگا سکتے تھے، سو ہم نے پانسو روپیہ مدرسہ میں دیدیا۔
پوستے کی بسم اللہ کی تقریب میں بھی جو ۹۳ء کی کانفرنس کا اجلاس ختم ہونے کے بعد سب ممبروں کی موجودگی میں ہوئی تھی سرستید نے ایک تہائی عمدہ تقریب کے بعد اسی طرح پانسو روپیہ مدرسہ کی نذر کیے تھے۔

حمید آباد کے اخیر سفر میں جب کہ وہ ایک ڈپوٹیشن بیکر حضور نظام میں ایڈریس پیش کرنے کو گئے تھے، چونکہ تمام ڈپوٹیشن سرکار عالی کا مہمان تھا، سرستید کے دوستوں نے جو کچھ ان کی دعوت میں دیا وہ سب مدرسہ کے چندہ میں جمع کیا گیا، نواب انتصار جنگ نے تو غالباً ہزار روپے نقد دیدیے تھے مگر نواب محسن الملک نے بڑی دھرم کی ایک گاڑیوں پارٹی دینی چاہی تھی۔ سرستید نے انکار کیا اور کہا کہ نقد دلو اور محسن الملک نے کہا نقد بھی لیجیے اور پارٹی بھی ہونے دیجیے، سرستید نے ہرگز نہ مانا اور کہا کہ نقد اور پارٹی دونوں میں جس قدر خرچ ہو وہ سب نقد ہی دیدو۔ آخر پارٹی سو فوف رہی اور ایک ہزار روپیہ نقد نواب محسن الملک نے سرستید کی نذر کیا۔

ابتداء نے قیام مدرسہ کے وقت جس طریقے سے سرستید نے نواب مختار الملک مرحوم کی مدرسۃ العلوم کی طرف متوجہ کیا وہ یادگار کے قابل ہے، انھوں نے مصور سے ایک تصویر بنوائی جس میں مسلمانوں کی حالت اور ان کے تنزل کی کیفیت محض تصویر کے ذریعے سے ظاہر کی گئی تھی اس کی صورت یہ تھی کہ سرستید سمندر کے کنارے ایک درخت سے کمر لگاٹے حیران اور فکر مند دکھڑے ہیں اور اس سے کسی قدر فاصلہ پر مختار الملک مع دو صاحبوں کے استادہ ہیں، سمندر میں طوفان آ رہا ہے، جہاز جس میں بہت سے مسافر

سوار میں اس کا مستول ٹوٹ گیا ہے اور وہ ڈوبا چاہتا ہے۔ کچھ آدمی پانی میں گر پڑے ہیں اور ڈبکیاں لے رہے ہیں۔ ایک کشتی جس میں کچھ آدمی سوار ہیں ان ڈوٹیوں کے بچانے کی جہاز کی طرف جا رہی ہے۔ اس کی جھنڈی کے پھر پیرے پر انگریزی میں یہ الفاظ لکھے ہیں "مڈون کاک روپیز" سرسید اس حیرت اور تشویش کی حالت میں کہہ رہے ہیں کہ "ٹاٹ سفیشنٹ" یعنی یہ روپیہ کافی نہیں ہے، ایک فرشتہ آسمان سے اتر رہا ہے جو ہوا میں سعلق ہے اور ایک ہاتھ سے سرسید کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے ہاتھ کی انگلی سے نواب مختار الملک کی طرف اشارہ کر رہا ہے اور سرسید سے کہتا ہے "ٹکٹ ایٹ دس نوٹل مین" یعنی اس شریف آدمی کی طرف دیکھو۔

اس تصویر میں سمندر سے زمانہ سراوے اور جہاز سے مسلمانوں کی قوم۔ کشتی جو جہاز والوں کی دستگیری کے لیے جا رہی ہے اس سے مدرسۃ العلوم مراد ہے، اس کے پھر پیرے پر جو "ایک لاکھ روپیہ" کا لفظ لکھا ہے اس سے وہ لاکھ روپیہ مراد ہے جو اس وقت تک مدرسہ کے لیے جمع ہوا تھا۔ سرسید گویا مسلمانوں کی سقیم حالت دیکھ کر اپنے دل میں یہ کہہ رہے ہیں کہ مسلمانوں کے اٹھارنے کے لیے ایک لاکھ روپیہ کافی نہیں ہے، اس وقت خدا کی طرف سے ان کے دل میں یہ انفا ہوتا ہے کہ نواب مختار الملک سے مدد مانگنی چاہیے۔ فرشتہ کا ان کی طرف اشارہ کرنا اسی مضمون پر دلالت کرتا ہے۔

یہ تصویر نواب مختار الملک سید تراز علی خان مرحوم کی خدمت میں بھیجی گئی اور وہ اس کو دیکھ کر نہایت متاثر ہوئے۔ سنہ ۱۸۵۷ء میں وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ اس تدبیر کے سوا کوئی دوسری تدبیر روپیہ مانگنے کی ہرے

دل پر فوٹو نہیں ہو سکتی تھی انھوں نے سو روپیہ ماہوار اپنی خاص جاگیر سے اور اول تین سواہر پھر پانسو ماہوار سرکار عالی نظام سے مقرر کیے۔ اُس کے بعد جب حضور نظام نے عنان اختیار اپنے ہاتھ میں لی تو پانسو روپیہ ماہوار کا دو دفعہ کر کے اور اضافہ ہوا۔ پھر ۱۸۹۱ء میں جب سر سید ڈپوٹیشن لیجر حیدرآباد گئے تو حضور نظام نے بجائے ایک ہزار کے دفعہ دو ہزار روپیہ ماہوار ہمیشہ کے لیے مقرر کیا اور اُس کی سند سر سید کو عنایت فرمائی۔ درحقیقت یہ اسی تصویر کا نتیجہ تھا جو رفتہ رفتہ اس درجہ تک پہنچ گیا۔

عرض کہ اس قسم کی بیشمار تدبیروں سے سر سید نے مدرسہ کے لیے سرمایہ جمع کیا ہے۔ ولایت سے واپس آ کر وہ اٹھائیس برس زندہ رہے اس عرصہ میں برابر اُن کو یہی ادھیڑ بن لگی رہی کہ کس طرح روپیہ فراہم ہوا اور کیونکر مسلمانوں کے لیے اعلیٰ درجہ کی تعلیم و تربیت کا سامان مدرسۃ العلوم میں مہیا کیا جائے، ان کے حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سے ان کو مسلمانوں کی تعلیم کا خیال پیدا ہوا انھوں نے چند اصول گویا اپنے اوپر لازم کر لیے تھے۔ اولاً انھوں نے ہر قسم کی داد و دہش سے اپنا ہاتھ روک لیا۔ مدرسۃ العلوم کے سوا رفاہ عام کے اور کاموں میں چندہ دینا شادی اور غمی کی رسموں میں روپیہ صرف کرنا، اپنے کنبے کے حقداروں کے سوا عموماً مساکین و غربا کی امداد کرنا اور اسی قسم کے تمام ابواب یک قسمل بند کر دیے اور جہاں تک بوسہ کا مدرسہ کے چندوں میں آپ بھی دیا اور اپنے عزیزوں اور دوستوں سے بھی لیا اور اپنے دل میں ٹھان لی کہ جو لوگ مدرسہ کی اعانت کریں وہی دوست ہیں اور وہی عزیز و رشتہ دار ہیں۔ اگر غیروں نے اعانت کی تو ان کو دوست اور عزیز سمجھا اور اگر دوستوں

اور عزیزوں نے پہلو تہی کی تو اُن کو سو غیروں کا بغیر جانا۔ انہوں نے ایک بار اپنے بچپن کے ایک نہایت گارٹھے دوست کو جو ذمی مقدور آدمی تھے مگر مدرسہ کے کچھ سرگرم معاون نہ تھے صاف یہ کہلا بھیجا کہ بغیر مدرسہ کی اعانت کے دوستی قائم نہیں رہ سکتی۔

دوسرے جیب سے انہوں نے مدرسہ کے لیے چندہ جمع کرنا شروع کیا مروت اور لحاظ کو جو اُن کی ایک جیلی شخصیت تھی بالکل بالائے طاق رکھ دیا جن سے بے تکلفی اور خالص دوستی تھی اکثر اُن کا نام اور اُن کی رقم چندہ کی فہرست میں بغیر اُن کے اسمتراج کے لکھ دی جاتی تھی اور اُن کو صرف اُس وقت خبر ہوتی تھی جیب اُن سے روپیہ مانگا جاتا تھا۔ بعض اوقات وہ انکار کرتے تھے اور دوسرے سخت اصرار بلکہ ناراضگی کا اظہار ہوتا تھا اور آخر کار بغیر دینے کچھ بن نہ آتا تھا۔ سرسید کے دوست دیتے دیتے تھک گئے مگر وہ مانگتے مانگتے نہ تھکے۔ وہ ایک آرٹیکل میں لکھتے ہیں کہ "ہمارا تو اب یہ حال ہو گیا ہے کہ ہمارے دوست بھی ہم سے ملتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کچھ سوال نہ کر بیٹھیں۔ ہماری صورت ہی اب سوال ہو گئی ہے۔" میں نے ایک دوست سے کہا کہ جہانی سیری قسمت میں جو بیک مانگتا لکھا تھا سو اس لکھے کی بد ملتانوں مگر شکر ہے کہ اپنے لیے نہیں بلکہ قوم کے لیے۔ اس پر سعدی کا ایک شعر یاد آیا اور دل نے چاہا کہ اس میں کچھ مصرعے لگا جائیں تاکہ حسب حال ہو جائے، سو ایک خدا کے بندہ نے مصرعے لگا دیے اور اب اُس شعر کی یہ صورت ہو گئی۔

چش ازین سعدی ریش دل دکاندوست

گفت درباب گدایاں سخن از صدق و یقین

”گر گدا پیش رو شکرِ اسلام بود کافر از بیمِ توقعِ بروزِ تانا و سچیں“
 ایک دن نوبتِ ماکان بھلے پر سید کہ بہ کافر چہ رسد خود تیراں گفت چنین
 گر گدا پیش رو شکرِ اسلام بود ہم مسلمان رو از بیمِ سواشس تا چیں

ایک بار مدرسہ کے کسی کام کے لیے چندہ کھولا گیا، سرستید نے اپنے قدیم دوست مولوی سید زین العابدین خاں سے چندہ کا اتفاق کیا۔ انھوں نے بد مزہ جو کر کہا ”صاحب ہم تو چندہ دیتے دیتے تھک گئے، سرستید نے کہا ”اے میاں اب کوئی دن میں ہم مرجائیں گے، پھر کون تم سے چندہ مانگے گا یہ الفاظ کچھ ایسے طور پر کہے گئے کہ دونوں آبدیدہ ہو گئے اور چندہ فوراً ادا کیا گیا۔

چندہ کے علاوہ جب کبھی ان کو دوستوں سے کچھ اچک لیتے کا موقع ملا انھوں نے اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا، وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ ”خانہ دوستاں برو ب و در دشمنان بکوب“ ایک روز مٹر تھیو ڈور بک کے والد جو سیاحت کے لیے ہندوستان میں آئے ہوئے تھے ایک خاص سکہ کی اشرفی دستا نہ طور پر مولوی زین العابدین خاں کو دینی چاہتے تھے اور وہ اُس کے لیتے سے انکار کرتے تھے، آخر دونوں صاحب سرسید کے پاس آئے اور واقعہ بیان کیا، سرستید نے نہایت بد مزہ جو کر مولوی صاحب سے کہا کہ دوستوں کے ہدیہ کو رد کرنا نہایت بد اخلاقی کی بات ہے، انھوں نے وہ اشرفی لے لی سرستید نے کہا دیکھوں کس سکہ کی اشرفی ہے اور ان سے سیکر مدرسہ کے کھانا میں جمع کر دی، اسی طرح ایک دن سید محمود نے قاضی رضا حسین مرحوم سے کسی بات پر پچاس روپیہ کی شرط پدی اور یہ ٹھیرا کہ جو ہار سے پچاس روپے مدرسہ میں دے، اتفاق سے سید محمود ہار گئے، وہ سو روپیہ کا نوٹ لے کر آنے اور قاضی صاحب سے کہا کہ پچاس روپیہ دیجیے اور

نوٹ لیجیے۔ انھوں نے کہا وہ تو ہنسی کی بات تھی، کیسی شرط اور کیسا روپیہ؟ دوسرے شرط یہ ناجائز بھی نہیں ہے، سرسید بھی وہیں موجود تھے، جب انھوں نے دیکھا کہ روپیہ مدرسہ میں آنا ہے فرمایا کہ جس شرط میں اپنا فائدہ ملحوظ نہ ہو وہ جائز ہے اور فوراً گیس میں سے پچاس روپے نکال کر، سید محمود کو دیدیے اور نوٹس لے لیا۔ اس قسم کے صد ہا واقعات روز سرہ گذرتے تھے، ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے بیان کرنے سے مدعا یہ ہے کہ جس قوم میں عام طور پر تعلیم کی قدر نہ ہو، جہاں ہر کام کا مدار شخصیت اور ذاتی اغراض پر ہو۔ جہاں قومی ترقی اور قومی فلاح کے نتائج سے لوگ بے خبر ہوں، جہاں امیر بے پروا، دولت مند مسرف یا بخیل، علما زمانے کی ضرورتوں سے ناواقف اور عوام الناس جاہل اور مغلس ہوں وہاں ایک ایسا کام جس سے تمام قوم کی بھلائی منظور ہو کوئی شخص نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ سرسید کی طرح اپنے تئیں اس کام میں فائدہ بردے اور جو فائدے کہ وہ اپنی عقل مندی، شہرت، لیاقت، وجاہت، دوستی، کوشش اور محنت سے خود اٹھا سکتا ہے ان سے آپ دست بردار ہو کر اس کام پر وقف نہ کر دے۔ دوستوں کے علاوہ اجنبی اور اسحاق آدمی جن سے کچھ وصول ہونے کی امید ہوتی تھی، شاید پہلی ایک آدھ ملاقات میں ان کی باری نہ آتی ہو ورنہ اکثر حساب سلامت ہوتے ہی سوال ڈالا جاتا تھا اور اس میں کچھ مسلمان ہی کی خصوصیت نہ تھی بلکہ انگریزوں سے بھی بعض اوقات یہی برتاؤ ہوتا تھا۔ ایک بار سرسید نے ایک محض اجنبی مسافر انگریز سے جو ڈاک بنگلہ میں ٹھہرا تھا چند طلب کیا، اس نے بہت روکھے پن سے یہ جواب دیا کہ آپ کو اس کام کے لیے صرف اپنی قوم سے مانگنا چاہیے۔ سرسید نے کہا ”بشیک ہم کو قوم کی پست بہتی سے غیروں کے سامنے ہاتھ پسا کرنا پڑتا ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہیے۔ اگر یہ انٹی ٹیوشن

بغیر انگریزوں کی اعانت کے قائم ہو گیا تو انگریزوں کے لیے کوئی ذلت کی
 بات اس سے زیادہ نہ ہو گی کہ وہ باوجود یکہ ہندوستان کی حکومت سے بے انتہا
 فائدے اٹھاتے ہیں مگر ہندوستانیوں کی بھلائی کے کاموں میں مطلق شریک
 نہیں ہوتے۔ وہ انگریزوں کے شکر مند ہوا اور اسی وقت ایک لڑائی میں روپے کا سرسید کی نذر کیا۔
 سرسید نے مدرسہ کی خاطر اس بات کو بھی اپنے اوپر لازم کر لیا تھا کہ کوئی
 سعی اور کوئی کوشش کسی ایسے کام میں صرف نہ کی جائے جو مدرسۃ العلوم سے
 کچھ علاقہ نہ رکھتا ہو، جو کوشش بظاہر وہ خاص اپنی ذاتی اعراض کے لیے کرتے تھے
 ان سے بھی اگر غور کر کے دیکھا جائے تو خود ان کو اس قدر فائدہ نہیں پہنچتا تھا جس
 قدر کہ مدرسۃ العلوم کو پہنچتا تھا، یہ بات مشہور ہے کہ وہ کبھی کسی اپنے پارلے
 کی سفارش کسی سے نہیں کرتے تھے، درحقیقت اس کا سبب یہ تھا کہ وہ اپنی
 ملاقات یا دوستی یا وابستگی سے جس قدر فائدہ اٹھا سکتے تھے وہ مدرسۃ العلوم
 کے سوا کسی کو پہنچا یا نہیں چاہتے تھے، معاویہ ابن ابی سفیان نے اپنے ایک
 جلس سے کہا کہ "تو اوروں کے فائدے کے لیے سفارش مت کیا کر کیونکہ اس
 سے تیرے فائدوں میں کمی پڑے گی" اگرچہ یہ نصیحت جن معنوں میں کی گئی تھی
 اس کو کوئی کریم النفس آدمی قبول نہیں کر سکتا، مگر جن معنوں میں سرسید نے
 اس پر عمل کیا وہ ایک جو امر فائدہ خصلت تھی جو سرسید کے سوا کسی میں نہیں
 دیکھی گئی، وہ محض قوم کی خاطر دوستوں اور عزیزوں کا برائے نام گوارا کرتے تھے اور
 جو خوشی لوگوں کی سفارش اور حاجت روائی کرنے سے انسان کو حاصل ہوتی ہے
 اس کی کچھ پروا نہیں کرتے تھے، سرسید کے ایک معزز ہ وطن نے ایک رفاہ
 عام کے کام میں ان کو شریک کرنا چاہا، انھوں نے
 صاف کہہ دیا کہ میں صلاح و مشورہ سے مدد دینے کو آمادہ ہوں لیکن چند

نہ خود ہوں گا اور نہ اوروں سے دلوانے میں کوشش کروں گا اگر اس شرط پر ممبر بنانا ہو تو مجھ کو ممبری سے کچھ انکار نہیں۔ لطیفہ ایک شخص نے جس سے کچھ واقفیت نہ تھی سرسید سے سفارش کی درخواست کی اور لکھا کہ "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک بزرگ ہیں جن کی لوگ بے انتہا تعریف کرتے ہیں کہ ان کی تمام عمر قوم کی خیر خواہی میں گزری ہے جب میری آنکھ کھلی تو مجھ کو یقین ہو گیا کہ ہوں نہ ہوں وہ بزرگ آپ ہی ہیں اور میری مشکل آپ ہی سے آسان ہوگی" سرسید نے اس کا یہ جواب لکھ بھیجا کہ "جس باب میں آپ سفارش چاہتے ہیں اس سے مجھ کو کچھ تعلق نہیں ہے۔ اور جن بزرگ کو آپ نے خواب میں دیکھا ہے وہ غالباً شیطان تھا"

عمارات کالج

ہم چاہتے تھے کہ کالج کی عمارت کا حال اور اُن کی تفصیل مفصل طور پر بیان کی جائے کیونکہ ان تمام عمارتوں کا اس قدر جلدہ اور ایسی خوبی کے ساتھ تیارہ مکہ ادینا اور ایک ویران قطعہ زمین کو چند سال میں محض قومی چنڈ سے گلزار بنا دینا اور سیکڑوں پر ویسی طلبہ کی تمام ضروریات اور سائش اور تعلیم و تربیت اور ہر قسم کی ریاضت کا سامان مہیا کر دینا یہ بھی سرسید کی زندگی کے انھیں بڑے بڑے کاموں میں سے ایک کام ہے جن کا ذکر اُن کی لائف میں کرنا ضروری ہے۔ لیکن ہم کو معلوم ہوا ہے کہ نواب محسن الملک کا امدادہ کالج کی مفصل تاریخ لکھنے کا ہے اور اسید ہے کہ اس میں عمارت کا حال نہایت تفصیل کے ساتھ درج کیا جائے گا۔ اس لیے ہم اس موقع پر تمام کالج اور بورڈنگ کی عمارتوں کا مفصل حال بیان کرنا ضروری نہیں سمجھتے مگر جو اصول کہ

سرستید نے ان عمارتوں کے بنانے میں ملحوظ رکھے ہیں اور جس کوشش اور توجہ سے انھوں نے یہ دشوار کام آسان کیا ہے اور جن مصناج سے وہ برخلات اکثر ممبران کمیٹی کی رائے کے تعمیر کے کام کو سب کاموں سے مقدم سمجھتے رہے ان کو کسی قدر بیان کرنا ضروری ہے۔

کالج کمیٹی کے سرگرم ممبر جو کالج کے کاروبار سے زیادہ وابستگی رکھتے تھے ان میں بہت ہی کم ایسے جوں گے جو کالج بلڈنگ میں زیادہ روپیہ صرف کرنے کے روادار ہوں، کیونکہ ابتدا میں تعلیم ہی کے اخراجات کے لیے کافی روپیہ بہم پہنچانا دشوار معلوم ہوتا تھا چہ جائیکہ لاکھوں روپیہ کی عمارتیں تیار کرائی جائیں۔ مگر سرستید نے کالج کی ترقی بلکہ اس کا قیام دوام اسی پر منحصر سمجھا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو اعلیٰ درجہ کی اسکیل پر عمارتیں بنانی جائیں۔ وہ جانتے تھے کہ کالج کے اصلی نتائج علی الاعلان ظاہر ہونے کے لیے جس سے عام لوگوں کو اس کی طرف ترغیب ہو ایک مدت دراز درکار ہے اور تعلیم و تربیت کی خوبی کے سمجھنے والے لاکھوں بلکہ کروڑوں میں ہمیشہ معدود آدمی ہوتے ہیں، البتہ عمارت کی شان و شوکت ایک ایسی چیز ہے جس کا اثر فوراً خاص و عام کے دل پر پڑتا ہے۔ سرستید کا یہ خیال جہاں تک دیکھا جاتا ہے بالکل صحیح نکلا۔ فی الواقع کالج کی عظمت کا خیال باوجود سخت مخالفتوں کے جس قدر سرعت کے ساتھ تمام ملک میں پھیل گیا یہ زیادہ تر اس کی شاندار عمارتوں کا نتیجہ تھا۔ خصوصاً گورنمنٹ اسکولوں کی نظر میں جن کی توجہ اور التفات سے کالج کو نہایت فائدہ پہنچا ہے اس کی وقعت بہت کچھ اسی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ ۱۸۸۲ء میں جب کہ ایجوکیشن کمیشن نے علیگڑھ میں اپنا اجلاس کیا تھا اس وقت علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ ہال میں مسٹر وارڈ

نے جو کمیشن کی لوکل کمیشن کے ممبر تھے علیگڑھ کے ہندوؤں کے ایڈریس کے جواب میں پورٹونگ ہاؤس محمدن کالج کی سچتہ بارگ کی نسبت یہ الفاظ کہے تھے کہ ”جس وقت میں نے کمروں کی نظارہ کو دیکھا جو بعد مکمل ہونے کے تمام دنیا میں شاید اپنی قسم کی سب سے عمدہ عمارت ہوگی تو مجھ کو اس بات کا خیال ہوا کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کے دل میں ان مکانات کو دیکھ کر آیتہ کی نسبت نئی ہمت پیدا نہ ہو۔“ میرے ایک عزیز دوست جو ولایت میں تعلیم پا کر آئے ہیں ان کا بیان ہے کہ ”انگلستان کے نامور سیاح رپورٹنگ کینن ہارنٹ جب چین، جاپان اور امریکہ کی سیاحت کے بعد لندن میں آئے تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں نے کہیں کیسیرج یا آکسفورڈ کے کالجوں کے نمونہ کا کالج سوائے محمدن کالج کے نہیں دیکھا۔“

سرستید کو کالج کی زیادہ شاندار عمارتیں بنانے کا خیال اس نظر سے بھی ضرور ہوتا چاہیے تھا کہ آیتہ نسلوں کو اپنے قومس انسٹی ٹیوشن کا عظیم و شان دیکھ کر اس کے قائم رکھنے کا زیادہ خیال ہو۔ ایشیائی قوموں میں برخلاف اہل یورپ کے یہ خیال کبھی پیدا نہیں ہوا کہ انکوں نے جو کام ادنیٰ درجہ کی حالت میں چھوڑا ہے اس کو اعلیٰ درجہ تک پہنچائیں یا جو کام وہ ادھورا چھوڑ گئے ہیں ان کو پورا کر دیں۔ ہم ایسے بہت سے مد سے اور فاتحانہ نشان دے سکتے ہیں جن کے بانی ان کو تمام چھوڑ کر مر گئے اور وہ چند روزہ میں کھنڈ ہو گئیں۔ لیکن اکثر اوقات عمارت کا عظیم و شان ان ملکوں میں بھی لوگوں کو اس ات پر مجبور کر دیتا ہے کہ اس کو جس طرح ہو سکے قائم اور آباد رکھیں۔ ہم کو اسٹریچی ہال کی نسبت جبکہ وہ بالکل مرتب اور تیار ہو چکا تھا ایک معزز مسلمان کا یہ کہنا یاد رہے گا کہ ”جب تک یہ عمارت قائم ہے مسلمان یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم مرے ہوئے

بھی ایسے کام کر گزرتے ہیں جو زندگیوں سے نہیں ہو سکتے یہ بہر کیف اس انسٹیٹیوشن کے قائم و برقرار رہنے کی اگر کچھ امید ہو سکتی ہے تو انھیں عمارتوں کی بدلت ہو سکتی ہے جن کی نسبت کمیٹی نے گورنمنٹ سے یہ اقرار کر لیا ہے کہ اگر خدا نخواستہ کالج بند ہو جائے تو تمام عمارتیں گورنمنٹ کے قبضہ میں چلی جائیں۔ سرسید نے ان عمارتوں میں آیتہ نسلوں کے فخر و مباہات کے لیے ایک نہایت موثر طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ تمام سنگین اور سختہ عمارتوں پر ان کے بانیوں کے اور کالج کے محنتوں، سربویوں اور مددگاروں کے نام جن میں زیادہ تر مسلمان ہیں بڑے اہتمام سے کندہ کر لئے ہیں، ان میں بہت سی عمارتیں بن چکی ہیں، کچھ زیر تعمیر ہیں، کچھ ناقص پڑی ہیں اور بہت سی قوم کی فیاضی کی منتظر ہیں۔ اگر قوم میں کچھ جان باقی ہے تو وہ ضرور ان معزز ناموں اور معزز کتبوں کی لاج رکھے گی اور اس قوم کی یادگار کو صفحہ روزگار سے شنی نہ دے گی۔ سنا ہے۔

کہ کالج کے احاطہ کی جالیوں پر مسلمانوں کے نام کھدے ہوئے دیکھ کر ایک یورپین افسر نے کہا تھا کہ ”یہ احاطہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ گویا مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیتے ہوئے اس کالج کو چاروں طرف سے گھیرے کھڑے ہیں کہ کوئی آفت اس پر نہ آنے پائے“

کتبوں کے علاوہ اور بھی بہت سی ایسی باتیں ان عمارتوں میں ملحوظ رکھی گئی ہیں جن سے مسلمانوں کے دل میں کالج کی طرف ایک کشش پیدا ہو، مثلاً اکثر محرابیں سیرینک اسٹائل پر بنوائی گئی ہیں یا بزرگ ہوس کے صدر ووازہ کی پیشانی پر کھجور کا درخت جو عرب کی خصوصیات میں سے ہے اور بلال و تاج کا نشان جو مسلمانوں کا برٹش حکومت کے ساتھ تعلق ظاہر کرتا ہے۔ نسبت کرایا گیا ہے۔ اکثر انگریزوں کی اسپیس میں مسلمانوں کو غیرت اور

ان کے اسلاف کی عظمت یاد دلانی گئی ہے جا بجا پتھروں پر کندہ کرادی ہیں۔ جن پر وہ نین افسروں اور حاکموں نے کالج کی مدد کی ہے ان کی عالیشان یادگاریں بنوائی گئی ہیں تاکہ مسلمانوں کو آئندہ زمانے میں اس بات پر فخر کرنے کا موقع ملے کہ ان کے اسلاف اپنے محسنوں کے کیسے شکر گزار اور دل سے قدر کرنے والے تھے۔

بعض ممبروں کی یہ رائے تھی کہ تعمیر کے لیے مہواری باسالانہ ایک رقم معین ہونی چاہیے کہ اس سے زیادہ کبھی صرف نہ ہونے پلٹے بیشک یہ ایک نہایت سلامت روی کی چال تھی لیکن اگر ایسا ہوتا تو سرسید نے جو ہتیلی پریسوں جمائی ہے یہ سرگزظہور میں نہ آتا اور کالج کی وقعت جو دفعتاً تمام زمانے کے دل میں پیدا ہو گئی اس کے لیے ایک مدت دراز تک انتظار کرنا پڑتا اور سرسید کے بعد کسی سے یہ امید نہ تھی کہ تعمیر کا کام ایسے چھوٹے اور مانگ سے سرانجام کرنا جیسے کوئی اپنا محل تیار کرتا ہے۔ حالانکہ سرسید کا سب زیادہ دلچسپ مشغلہ بیٹیہ تصنیف و تالیف و مضمون نگاری کا کام رہا ہے اور ایسے لوگوں کا کسی دوسرے کام کی طرف متوجہ ہونا ناممکن ہے۔ باوجود اس کے انہوں نے اس قطعہ زمین کے آباد و سرسبز کرنے میں فوق العادہ کوشش اور توجہ کی ہے۔ برسوں بلاناغہ دو دوپہر اور تمام دن محنت سے سخت موسموں میں وہ خود مدد پر جا جا کر بیٹھے ہیں اور اپنے سلمے راج مزدوروں اور سنگتراشوں سے کام لیا ہے۔ باوجود اس تن و تلاش کے وہ کالج کے بلوغ کی تیاری میں پہلوں دھوپ اور لوہوں میں پھرتے تھے، کنوئیں کھدواتے تھے زمین ہموار کرتے تھے، ہل چلواتے تھے، روشیں بجاتے تھے، دوردور سے برتریم کی پود سنگراتے تھے جو ان کے روبرو باغ میں لگائی جاتی تھی، باوجود ان

تمام باتوں کے تعمیر وغیرہ کے متعلق ہر ایک کام ان کو اپنی رائے سے کرنا پڑتا تھا۔ نہ کوئی انجینیر یا اور سیر تھا جس سے اصلاح لی جائے نہ کوئی لائق مستری تھا جس کی تجویز اور رائے پر اطمینان ہو جن دیہاتی معماروں سے یہ کام لیے گئے انہوں نے کبھی اس قسم کی عمارتیں نہیں بنائی تھیں اس لیے ہر سٹیڈ کو ہر ایک عمارت کا نقشہ خود ہی سوچنا پڑتا تھا اور خود ہی اس کے تمام نشیب و فراز سوچنے پڑتے تھے۔ معماروں اور سنگتراشوں کو خود بیٹھ کر ایک ایک بات بتانی پڑتی تھی اور پھر جب تک وہ کام ختم ہو خود ہی اس کی نگرانی کرنی پڑتی تھی کہ جس طرح بتایا گیا ہے اسی طرح کام بنتا ہے یا نہیں۔

ہم نے سنا ہے کہ بعض یورپین انجینروں نے کالج اور بورڈنگ ہاؤس کی عمارتوں کو دیکھ کر تعجب ظاہر کیا ہے اور جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ بغیر کسی تعلیم یافتہ انجینیر کی صلاح اور مشورہ کے یہ عمارتیں تیار ہوئی ہیں تو وہ اور بھی زیادہ متعجب ہوئے ہیں۔ با اظہار ممکن ہے کہ ان عمارتوں میں انجینرنگ کے اصول کے موافق یا طلبہ کے آرام و آسائش کے لحاظ سے کوئی کمی یا نقص رہ گیا ہو لیکن ہم کو اس تو می انسیٹیویشن کے لیے ایسا انجینر ملنا ناممکن تھا جو خود ہی تعمیر کے لیے روپیہ فراہم کرے۔ خود ہی عمارت بنوانے، ایک کورسری تنخواہ کی نہ لے، تہدایت و برابری سے اپنا کام انجام دے اور ہر ایک عمارت کو ایسے شوق سے بنوائے کہ گویا اپنا گھر بنواتا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ تعمیر پر جتنا روپیہ صرف ہونا چاہیے تھا اس سے بہت زیادہ صرف بنوا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ایسی عالیشان عمارتیں بنانی کیا ضرورہ تھیں۔ بعض کہتے ہیں کہ بیسیوں عمارتیں ناتمام پڑی ہیں ان کے شروع کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ جس قدر روپیہ آتا جاتا اس قدر عمارتیں بنتی جاتیں

بعض اور اعتراض کرتے ہیں، مگر افسوس ہے کہ انھوں نے خود کسی قومی عمارت کا نمونہ اس سے بہتر بنا کر دکھا یا ہے اور نہ کوئی ایسی عمارت نشان دیتے ہیں جو قوم سے بھیک مانگ مانگ کر اس سے بہتر کسی نے بناٹی ہو۔

ٹیکلے دارم زوانش مند مجلس ہانڈ پڑس

کار فرمایان سپدا خود کار کتری گنند

عمارات کے متعلق اخیر بات جو سرسید کی لائف میں نوکر کے قابل ہے وہ

یہ ہے کہ سرسید نے باوجود اس کے کہ کالج کے بانی ہونے کا فخر و حقیقت انھیں کو حاصل تھا، ہمیشہ اس بات سے انکار کیا ہے کہ کالج میں ان کے نام کا کوئی کتبہ یا نشان خصوصیت کے ساتھ قائم کیا جائے۔ جب اول ہی اول کالج کے قائم ہونے کی تجویز ہوئی تو ان کے دوستوں نے اس بات پر اصرار کیا کہ کالج کا نام مدرسہ احمدیہ رکھا جائے، بلکہ گلگتہ کے اخبار اردو گائیڈ نے ایک دفعہ یہ نام اپنے پرچہ میں چھاپ بھی دیا، مگر سرسید نے اس کی سخت مخالفت کی اور ہرگز اس بات کو منظور نہیں کیا کہ کالج ان کے نام سے موسوم کیا جائے اس کے بعد ۱۸۵۸ء میں آنریریبل حاجی محمد اسمعیل خاں نے سرسید کی اطلاع اور مرضی کے بغیر ایک عمارت ان کی یادگار میں بنانے کے لیے چندہ کھولا اور کالج کا دروازہ ان کی یادگار میں بنانا اور اس پر سرسید کے نام کا کتبہ لگانا تجویز کیا انھوں نے اس کی بھی مخالفت کی اور یہ کہا کہ مسلمان جن سے سیری یادگار کا چندہ وصول کرنے کی آپ امید رکھتے ہیں ان کی نظر میں میری اور میرے کاموں کی مطلق وقعت نہیں ہے پس آپ چندہ کس سے وصول کریں گے مگر جب حاجی صاحب نے کسی طرح نہ مانا تو سرسید دو شرطوں پر راضی ہوئے۔ ایک یہ کہ دروازہ کی پیشانی پر جو کتبہ لگایا جائے

اس پر یہ لکھا جائے کہ قوم نے قومی بھلائی کے لیے یہ کالج بنایا ہے، دوسرے یہ کہ جو کتبہ دروازہ کے اندرونی جانب لگایا جائے اس پر مولوی سمیع اللہ خاں اور حاجی اسماعیل خاں کا نام بھی جو اس عمارت کے بنانے کے محرک ہوئے ہیں کندہ کرایا جائے حاجی صاحب نے پہلی شرط تو سہ آگراہ قبول کر لی، مگر دوسری شرط کی نسبت یہ کہا کہ آج تک کہیں ایسا نہیں سنا گیا کہ کسی خاص شخص کی یادگار میں اوروں کے نام بھی شریک کیے جائیں۔ سرسید نے کسی طرح نہ مانا اور دونوں شرطیں قبول کرنی پڑیں۔ چنانچہ دروازہ کے پیش طاق پر چند عربی اشعار کندہ کرائے گئے جن میں کسی خاص شخص کے نام کی تصریح نہیں ہے اور اندرونی جانب حاجی محمد اسماعیل خاں اور مولوی سمیع اللہ خاں کا نام بھی شامل کیا گیا۔

قطع نظر اس کے کہ حاجی صاحب کے اصرار نے سرسید کو مجبور کر دیا تھا ٹبری وجہ سرسید کے راضی ہو جانے کی یہ تھی کہ ان کو اپنی یادگار کے حیلہ سے احاطہ پور ڈنگ ہاؤس اور کالج کا مسدود دروازہ جو ایک نہایت ضروری عمارت تھی اور پور ڈنگ ہاؤس کے چھ پنچتہ کرے تیار ہونے سے نظر آتے تھے جن کا بغیر اس حیلہ کے تیار ہونا نہایت دشوار تھا۔ چنانچہ ۲۶ جون ۱۸۸۱ء کے جلسہ "کیشی یادگار سید احمد خاں" میں مولوی سید فرید الدین احمد خاں نے صاف کہا تھا کہ اگر حاجی صاحب اس چندہ سے پور ڈنگ کی ایک ضروری عمارت کا بننا تجویز نہ کرتے تو سید احمد خاں اس کی شدید مخالفت کرتے۔

اسی طرح ایک دفعہ کالج کے بعض پور وٹین انسروں نے یہ تحریک کی کہ ایک میاں بھی ولایت کے کالجوں کی طرح فوٹو ڈسے (یعنی بانی مدرسہ کی ساگرہ کا دن، بطور ایک خوشی کے دن کے قرار دیا جائے جس میں

ہر سال کالج کے ہواخواہ اور دوست اور طالب علم جمع ہو کر ایک جگہ کھانا کھایا
 کریں اور کچھ تملٹے تفریح کے طور پر کیے جایا کریں۔ سرسید نے اس کو بھی
 منظور نہیں کیا اور یہ کہا کہ ”بھارے ملک کی حالت انگلستان کی حالت سے
 بالکل جداگانہ ہے۔ وہاں ایک ایک شخص لاکھوں کروڑوں روپیہ اپنے پاس
 سے دے کر کالج قائم کر دیتا ہے اور یہاں سوا اس کے کہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں
 سے چندہ جمع کر کے کالج قائم کیا جائے اور کوئی صورت ممکن نہیں۔ پس کوئی
 وجہ نہیں کہ جو کالج قوم کے روپیہ سے قائم ہو اس کے کسی خاص بانی کے نام
 پر ایسی رسم ادا کی جائے، اس لیے میرے نزدیک نوٹرز ٹرسٹ کے نوٹیشن
 ٹرسٹ یعنی کالج کی سالگرہ کا دن، مقرر ہونا چاہیے۔ چنانچہ اسی تجویز کے
 موافق کئی سال تک یہ رسم ادا کی گئی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سرسید نے کس لیے اپنی یادگار قائم
 کرنے کی مخالفت کی تھی؛ تمام دنیا میں اور خاص کر ان ملکوں میں جہاں ہمیشہ ایسے
 قومی رفاہ کے کام ہوتے رہتے ہیں، یہ عام دستور ہے کہ ہر قوم کے افراد
 ان لوگوں کی شکر گزاری کے طور پر جن سے کوئی قوم کی بھلائی کا کام ہوتا ہے۔
 ان کی یادگاریں قائم کرنے ہیں اور اس سے بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قوم کی ہائیکری
 و احسان فراموشی کا دھبہ نہ لگے اور آئندہ نسلوں میں بھی قوم کی خیر خواہی کا
 حوصلہ پیدا ہو، پھر کیا وجہ تھی کہ ایسے مفید کام کے کرنے سے سرسید لوگوں کو
 مانع آتے تھے؟

اس کا جواب بہت صاف ہے۔ جن ملکوں میں قومیں بھلائی کے کام کرنے
 اور محض قوم کی خیر خواہی میں اپنی عمر صرف کر دینے کا عام دستور ہے اور
 جہاں ہر زمانے میں ایسی مثالیں کثرت پائی جاتی ہیں وہاں کبھی ایسے لوگوں پر

جو ایسے کام کرتے ہیں خود غرضی کا گمان کسی کو نہیں ہوتا بلکہ اونے سے لے کر اعلیٰ
 اور جاہل سے لے کر عالم تک سب دل سے ان کی عزت کرتے ہیں، ان کا احسان
 مانتے ہیں، ان کو مدد دیتے ہیں اور ان کی شکر گزاری اور آئینہ نسلوں کا دل
 بڑھانے کے لیے ان کی یادگاریں قائم کرتے ہیں۔ مگر ہمدے ملک کمال اس
 کے برخلاف ہے۔ یہاں ایسی مثالیں کیاب بلکہ نایاب ہیں کہ کوئی شخص شہانہ
 غرض محض قوم کی بھلائی میں اپنی عمر صرف کر دے۔ مات و ن اسی اڈھیر بن میں
 لگا رہے اور قوم ہی کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بن لے، اس لیے اگر حسن اتفاق
 سے قریب اور صدیوں کے بعد کوئی ایسا شخص پیدا ہو جاتا ہے تو اس کو یہ مشکل
 پیش آتی ہے کہ جس قسم کے کام کا وہ ارادہ ظاہر کرتا ہے اس کا نمونہ قوم میں موجود
 نہیں ہوتا اس لیے اس کو اپنی طرف سے بدگمانی کے رختے بند کرنے
 پڑتے ہیں تاکہ قومی رفقاء کے کام میں خلل واقع نہ ہو اور لوگ اس کا ذاتی کام سمجھ
 کر اہلاد اور اعانت سے پہلو نہیں نہ کہیں، چنانچہ ایک آوہر موقع پر جس کا ذکر
 دوسرے حصہ میں کیا جائے گا، کسی وجہ سے جو سرسید اس مصلحت کا لہذا ظاہر
 کر سکے تو نہ صرف ان کے مخالف بلکہ نہایت عزیز دوست ان کی طرف
 سے کھٹک گئے اور طرح طرح کی بدگمانیاں لوگوں میں پیدا ہو گئیں۔

تسلیم

کالج میں ہاول دو ڈپارٹمنٹ قائم کیے گئے تھے ایک انگریزی ڈپارٹمنٹ
 جس میں یونیورسٹی کا کورس پڑھایا جاتا تجویز ہوا تھا، دوسرا انڈین ڈپارٹمنٹ جس
 کی پڑھائی منقر کرنی کیٹی کے اختیار میں تھی اور دو میں علوم جدیدہ اور فارسی
 و عربی ادب اور علوم قدیمہ پڑھانے جانے قرار پائے تھے اور انگریزی کے

یہ بطور سکنڈ بینگوج کے صرف ایک گھنٹہ مقرر کیا گیا تھا۔ اس ڈپارٹمنٹ کے لیے سرسید انکمکستان سے بڑے بڑے نامور علماء و فضلا سے مختلف علوم و فنون کی کتابوں کی ایک فہرست لکھوا کر اپنے ساتھ لائے تھے جس میں ہر فن کے علمائے اپنے اپنے فن کی نہایت مستند اور معتبر کتابیں لکھی تھیں مطلب یہ تھا کہ ہندوستان میں ان کا ترجمہ کرنا اور انہیں ڈپارٹمنٹ کی پڑھائی میں داخل کر سکیں مگر سو اس کے کہ شمس العلماء مولوی محمد ذکا اللہ نے اس فہرست کی اکثر کتابوں کا ترجمہ بطور خود کر دیا اور کوئی نتیجہ اس سے پیدا نہیں ہوا۔ کچھ عرصہ تک دونوں ڈپارٹمنٹ جاری رہے مگر اوٹھیل ڈپارٹمنٹ روز بروز تنزل کرتا جاتا تھا یہاں تک کہ بلا سبالغہ طلبہ کی تعداد سے استادوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تھی۔ چونکہ طالب علموں اور ان کے مربیوں کو مشرقی زبانوں کی تعلیم میں کوئی امید و نبوی فائدے کی نہ تھی اس لیے اوٹھیل ڈپارٹمنٹ کو کوئی پستندہ کرتا تھا۔ آخر مجبور ہو کر اس کو توڑ دیا گیا۔ مگر انگلش ڈپارٹمنٹ جیسا کہ آگے کسی موقع پر بیان کیا جائے گا، روز بروز ترقی کرنے لگا۔

کالج کلاس قائم کرنا

۲۳ مئی ۱۸۵۷ء کو جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا اہل مدنی مدرسہ کھولا گیا تھا اور کیم جنوری ۱۸۵۷ء کو کالج کلاس قائم ہو گئی نیز اسی سال محمدن کالج فرسٹ آفس کے امتحان تک اور ۱۸۵۷ء میں بی اے اور ایم اے کے امتحان تک اور ۱۸۵۷ء سے قانونی امتحان میں کلکتہ یونیورسٹی کے ساتھ اور اسی طرح سائنس اور آفس کی اعلیٰ تعلیم میں اور نیز قانونی تعلیم میں الہ آباد یونیورسٹی کے ساتھ ایلیٹیٹ ہو گیا۔ جو ترقی گذشتہ ۲۳ سال میں تعلیم و تربیت کے لحاظ سے اس کالج نے کی ہے اس کے متعلق

مفصل حالات کالج کی سالانہ رپورٹوں سے معلوم ہو سکتے ہیں، یہاں ہم صرف اس قدر دکھانا چاہتے ہیں کہ اس کالج کی بدولت صوبہ شمال مغرب و اوڈھ کے مسلمان گریجویٹس کی تعداد میں بمقابلہ ہندو گریجویٹس کے کس قدر اضافہ ہوا ہے۔

۱۹۲۳ء میں جو لکچر آنریبل سید محمود نے ایجوکیشنل کانفرنس میں بمقام علیگڑھ دیا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صوبہ مذکورہ کے سوا ہندوستان کے ہر ایک صوبہ میں سنہ مذکورہ تک مسلمان گریجویٹس کی تعداد بمقابلہ ہندو گریجویٹس کے اس قدر گھٹی ہوئی تھی کہ اُس کو صرف سے زیادہ وقعت نہیں دیا جاسکتی۔ مثلاً بنگال میں جہاں مردم شماری کے لحاظ سے مسلمان گریجویٹس فیصدی ۱۵.۹ ہونے چاہیں وہاں اُن کی تعداد ۳۷۳ سے زیادہ نہیں بنتی، اسی طرح مدراس میں بجائے ۶۶۸ کے صرف ۹ اور بمبئی میں بجائے ۲۱۰۵ کے ۱۱۲ اور پنجاب میں بجائے ۱۷۹ کے ۲۵ فیصدی برآمد ہوئی تھی برخلاف اضلاع شمال مغرب و اوڈھ کے جہاں نسبتاً مسلمان گریجویٹس کی تعداد ۱۱۲۲ ہونی چاہیے تھی لیکن معلوم ہوا کہ سنہ مذکورہ تک اُن کی تعداد ۱۷۶ تھی، اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ محمدن کالج نے قطع نظر اہ فوائد کے جن کا ذکر دوسرے حصہ میں کیا جائے گا خاص کر ترقی تعلیم کے لحاظ سے بھی مسلمانوں کو اس تلبیل عرصہ میں کچھ کم فائدہ نہیں پہنچا۔

تفسیر القرآن

معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت سرسید کو مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے کا خیال پیدا ہوا، اسی وقت سے اُن کو اس بات کی فکر تھی کہ جس طرح ذمیوی عزت کے لیے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف مائل کرنا ضرور ہے، اسی طرح یہ بھی ضرور ہے کہ اُن کو تسلیم کے اُن مضر نتائج سے جو مذہب کے حق میں اُسے (حاشیہ اگلے صفحہ پر ہے)

سے پیدا ہوتے نظر آتے ہیں بہانہ تک ممکن ہو بچایا جائے۔ وہ دیکھتے تھے کہ جو لوگ انگریزی تعلیم پاتے ہیں خواہ ہندو ہوں خواہ مسلمان اور خواہ عیسائی، اُن کے دل میں مستثنیٰ صورتوں کے سوا عموماً مذہب کی وقعت باقی نہیں رہتی۔ وہ مذہب کی کوئی بات جو بظاہر یا فی الحقیقہ عقل یا قانون قدرت کے خلاف ہو اس کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ ریاضی اور علم طبیعی کی ممارست سے مذہبی باتوں کا بھی ویسا ہی ثبوت چاہتے لگتے ہیں جیسا ریاضی اور سائنس کے ہر ایک مسئلہ پر اُن کو ملتا رہا ہے۔ اُن کے عقیدے ثبوت اور معلوم ملکہ الوہیت کی طرف سے بھی مستزلزل ہو جاتے ہیں اور مذہبی احکام کا استخفاف اُن کے دلوں میں بیٹھ جاتا ہے۔ اُن کو معلوم تھا کہ مغربی علوم اور مغربی لٹریچر کی بدولت اکثر ممالک یورپ میں روز بروز دہریت اور الحاد پھیلتا جاتا ہے اور عیسائی مذہب مضمحل ہوتا جاتا ہے اسی لیے ان کو اندیشہ تھا کہ انگریزی تعلیم سے جس کو وہ قوم میں پھیلانا چاہتے ہیں کہیں ویسے ہی مضر نتائج اسلام کے حق میں بھی نہ پیدا ہوں جیسے یورپ میں عیسائی مذہب کے حق میں پیدا ہوئے ہیں، چنانچہ ۱۸۶۹ء میں کہ یہی زمانہ اُن کے تفسیر شروع کرنے کا معلوم ہوتا ہے انہوں نے ایک ایچ میں خاصکر مدرسہ العلوم کے طالب علموں کی طرف مخاطب ہو کر کہا تھا کہ "یا درکھو سب سے سچا کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے اسی پر یقین کرنے سے ہماری قوم ہماری قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے۔ پھر اگر تم آسمان

حاشیہ پچھلے صفحہ کا) ملے صوبہ شمال مغرب داودہ کے گرجاؤں سے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے اُس صوبہ کے کسی کالج میں تعلیم پا کر یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کی ہو نہ صرف وہ گریجویٹ جو خاص صوبہ مذکور کے باشندے ہوں کیونکہ اُن میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہوں نے پنجاب سے آکر ٹرن کالج میں تعلیم پائی اور کسی یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ ۱۲۔

کے تارے ہو گئے تو کیا! پس امید ہے کہ تم ان دونوں باتوں ایعنی علم اور اسلام ا کے نمونے ہو گے اور جیسا کہ ہماری قوم کی عزت ہوگی۔

لیکن باوجود اس اندیشہ کے وہ مغربی تعلیم کو مسلمانوں کے لیے نہایت ضروری اور ناگزیر جانتے تھے۔ اور اسی کے ساتھ جیسا کہ انھوں نے اپنی اکثر تحریروں اور اسپچوں میں ظاہر کیا ہے ان کو یہ بھی یقین تھا کہ خالص اسلام جس کو وہ ہمیشہ ٹھیٹا اسلام سے تعبیر کرتے تھے، اس کو انگریزی تعلیم سے وہ صدورہ برگز نہیں پہنچ سکتا جو یہ پ میں عیسائی مذہب کو پہنچا ہے ان کا ہمیشہ یہ قول رہا ہے کہ جو لوگ مغربی تعلیم یا مغربی علوم کو اسلام کے حق میں خطرناک تصور کرتے ہیں اور اس لیے مسلمانوں میں ان کا پھیلنا نہیں چاہتے، وہ درحقیقت اسلام کو ہیبت بوجا اور کمزورہ مذہب خیال کرتے ہیں جو علم و حکمت کے مقابلہ کی تاب نہیں لاسکتا، انھوں نے ایک موقع پر کہا کہ، "یہ حکمت و فلسفہ جو اس زمانہ میں سچا مانا جاتا ہے اگر آئندہ غلط ثابت ہو جیسے کہ یونانی حکمت اب ثابت ہوئی ہے اور حکمت و فلسفہ کے بالکل نئے اصول سے ثابت ہوں تو بھی میں دعوئے کرتا ہوں کہ قرآن مجید ایسا ہی سچا ثابت ہوگا جیسا کہ اب سچا ہے، اور غور کرنے کے بعد ثابت ہوگا کہ جو کچھ غلطی تھی وہ ہمارے ہی علم کا نقصان تھا مگر قرآن ویسا ہی سچا تھا" البتہ وہ یہ ضرور کہتے تھے کہ جس مجموعہ مسائل و احکام و اعتقادات وغیرہ پر فی زمانہ اسلام کا لفظ اطلاق کیا جاتا ہے وہ یقیناً مغربی علوم کے مقابلہ میں قائم نہیں رہ سکتا۔

الغرض ان کو مدت سے یہ خیال تھا کہ انگریزی تعلیم سے اسلام کے حق میں جن مضر نتائج کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے ان کا انسداد کیا جائے۔ لیکن جو طریقہ استدلال کا زمانہ گذشتہ میں یونانی فلسفہ کے مقابلہ کے لیے ہمارے

تسلیمین نے اختیار کیا تھا اور جس سے رفتہ رفتہ ایک نیا فلسفہ بنام علم کلام کے پیدا ہو گیا وہ کسی طرح فلسفہ حال کے مقابلہ میں کچھ کام نہیں دے سکتا تھا کیونکہ برخلات یونانی فلسفہ کے جس کا مدار محض تکیاس اور ظن و تخمین پر تھا، فلسفہ حال کا ہر ایک مسئلہ تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت کیا جاتا ہے۔ پس ضرور تھا کہ جس طرح مسائل حکمیہ کے ثبوت کا طریقہ بدل گیا ہے اسی طرح اُس کے مقابلہ کے لیے ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی جائے۔

ہمارے علما جو فلسفہ قدیم اور علوم دینیہ میں تمام قوم کے نزدیک مسلم الثبوت ہیں اور جن کا یہ منصب تھا کہ فلسفہ جدیدہ کے مقابلہ میں اسلام کی حمایت کے لیے کھڑے ہوتے، ان کو یہ بھی خبر نہ تھی کہ یونانی فلسفہ کے سوا کوئی اور فلسفہ اور عربی زبان کے سوا کوئی اور علمی زبان بھی دنیا میں موجود ہے۔ وہ اس بات سے بالکل بے خبر تھے کہ علوم جدیدہ صرف کرہ سائنس یا صرف اسلام کی بلکہ تمام دنیا کے مذاہب کی جڑ کاٹ رہے ہیں، اور اگر بالفرض وہ اسلام کی حمایت کا کوئی نیا طریقہ مقتضائے وقت کے موافق اختیار کرنے کا ارادہ بھی کرتے تو ہرگز امید نہ تھی کہ وہ اپنے ارادہ میں کم و بیش کامیابی حاصل کر سکتے ان کو تقلید کی عادت نے ہرگز اس قابل نہیں رکھا کہ وہ قدما کی پیروی کے دائرہ سے قدم باہر رکھ سکیں اور طعن و ملامت کے خوف اور مرجع خاص و عام بننے کی خواہش سے آراوی کا جو ہر ان کی طبیعتوں میں بالکل نہیں چھوڑا۔

مہر کیف سرسید کو اس طرف سے بالکل مایوسی تھی کہ ہمارے مسلم الثبوت علماء اس ضروری کام کی طرف توجہ کریں گے۔ پس انھوں نے اس خیال سے کہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے کا باعث میں خود ہوا ہوں اس کام کو اپنا ایک ضروری فرض سمجھ کر اپنے ذمہ لیا۔ انھوں نے اپنا ایک اسپیش میں

اس معاملہ کے متعلق اپنے تمام خیالات مفصل طور پر بیان کیے ہیں جن میں سے چند نقرے مختلف مقامات سے یہاں نقل کیے جاتے ہیں

انھوں نے کہا کہ ”جو لوگ بلا فلسفی دلیل و حجت کے اسلام پر یقین رکھتے ہیں بلا شک ان کا ایمان اور ان کا یقین بہ نسبت ان لوگوں کے جو دلیل و حجت سے اپنے عقیدہ کو مستحکم کرتے ہیں بہت زیادہ مستحکم ہے کیونکہ ان کے دل میں کسی قسم کے شک و شبہ نے راہ نہیں پائی اور نہ راہ پانے کی اس میں گنجائش ہے..... میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ ان کے ایمان کو (میں اور کسی سے کیوں کہوں) اپنے ایمان سے تو بہت زیادہ مستحکم مانتا ہوں..... خدا کے مانتے اور رسول پر یقین کرنے کے لیے ان کو کسی منطقی دلیل اور فلسفی برہان کی حاجت نہیں کیسی ہی کوئی بات خارج از عقل و ناقابل یقین صحیح یا غلط ان کے سامنے یہ کہہ کر کہ ”خدا اور رسول نے فرمایا ہے“ بیان کیجائے، وہ فوراً اُس پر یقین کریں گے۔ پس ایسے لوگ ماری بحث سے بالکل خارج ہیں۔ میں ان کو یقین کا ستارہ اور اسلام پر یقین کرنے کا نمونہ سمجھتا ہوں اور شیک مسلمان جانتا ہوں۔“

و مگر ان کے سوا ایک اور فرقہ بھی ہے جو ہر چیز کی صداقت کے لیے دلیل چاہتا ہے اور اس بات کا خواہش مند ہے کہ اسلام کے عقائد فلسفی دلائل سے اُس کو بتائے جائیں اور اُس کے دل کے شبہ مٹائے جائیں تاکہ اُس کے دل کو تسخیر ہو..... وہ یہ نہیں چاہتا کہ دل میں تو ڈھکڑ پکڑ ہو اور وہ زبان سے لوگوں کے ڈریا سوسائٹی کے دباؤ سے ہاں ہاں کہا کرے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو ہمہلے مخاطب ہیں اور جن سے ہم کو بحث ہے۔“

و جس زمانہ میں خلفائے عباسیہ کی سلطنت رونق پر تھی..... اس وقت

مسلمانوں میں فلسفہ یونانی اور علم نے کثرت سے رواج پایا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے مسائل میں جو اسلام سے متعلق تھے لوگوں کو شبہ پیدا ہوا کیونکہ جو لوگ ان مسائل فلسفہ علم طبیعی کو پس جانتے تھے اور ان میں اور اسلام کے مسائل میں اختلاف پاتے تھے ان کو اسلام کی نسبت شبہ پیدا ہوتا تھا.....

وہ زمانہ اسلام پر ایسا سخت تھا کہ اسلام کے سخت سے سخت دشمن کے حملہ سے بھی اُس سے زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ تھا۔ علما کو اُس وقت اسلام کی حمایت کی ضرورت پڑی اور انہوں نے اُس کی حمایت اور نصرت میں کوشش کی۔ خدا ان کی کوششوں کو قبول کرے..... پس میرا خیال ہے کہ جس زمانہ میں اسلام کی ایسی حالت ہو اور اُس پر ایسا ہی حملہ ہو جیسا کہ اس زمانہ میں ہوا تھا تو ہم کو بقدر اپنی لیانت کے ویسی ہی کوشش کرنی چاہیے۔

”اے دوستوں تم خوب جانتے ہو کہ اس زمانہ میں جدید فلسفہ و حکمت نے شیوع پایا ہے جس کے مسائل ان لگے مسائل سے بالکل مختلف ہیں اور وہ مروجہ مسائل اسلام کے ایسے ہی برخلاف ہیں جیسے کہ اس زمانہ میں تھے.....

اس زمانہ کی تحقیقات اور یونانی حکمت کے مسائل میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ اس زمانہ کے مسائل حکمیہ زیادہ تر عقلی اور قیاسی دلیلوں پر مبنی تھے..... ہمارے بزرگوں کو نہایت آسانی تھی کہ قیاسی مسائل کو قیاسی دلائل سے اور عقلی مسائل کو عقلی براین سے توڑ دیں اور ان کو تسلیم نہ کریں۔ مگر اس زمانہ میں..... مسائل عظیم طبیعی تجربہ سے ثابت کیے جاتے ہیں اور وہ دکھلا دیتے جاتے ہیں یہ مسائل ایسے نہیں ہیں کہ قیاسی دلائل سے اٹھا دیئے جائیں یا ان تقریروں اور اصولوں سے جو لگے زمانہ کے عالموں نے قرار دیے ہیں ہم ان کا مقابلہ کر سکیں۔“

ایسے اس زمانہ میں..... ایک جدید علم کلام کی حاجت ہے جس سے یا تو ہم

علوم جدیدہ کے مسائل کو باطل کر دیں، یا مشتبہ ٹھیلادیں یا اسلامی مسائل کو ان سے مطابق کر دکھائیں اس وقت جو بزرگ اس جلسہ میں موجود ہیں میں ان سب سے واقف نہیں ہوں مگر میں یقین کرتا ہوں کہ یہاں بہت سے ذمی علم لوگ بھی موجود ہیں، میں اسچ کہتا ہوں کہ میرے نزدیک جو لوگ ایسا کرنے کے لائق ہیں اور وہ پوری کوشش حال کے علم طبیعی و فلسفہ کے مسائل کو اسلامی مسائل سے تطبیق دینے یا ان کا بلکل ثابت کرنے میں نہ کریں گے وہ سب گنہگار ہیں اور یقیناً گنہگار ہیں۔

”میں ایک شخص ہوں جس کا یہ یقین ہے کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو جدید فلسفہ اور جدید علم طبیعی سے بخوبی واقف ہو اور ان تمام اسلامی مسائل پر جو اس زمانہ میں اسلامی مسائل کہلاتے ہیں یقین رکھتا ہو۔ انگریزی خواں نوجوان مجھے معاف کریں گے میں نے کوئی انگریزی خواں جس کو انگریزی علوم کا مذاق بھی حاصل ہو گیا ہو ایسا نہیں دیکھا جس کو پورا پورا یقین ہمارے زمانے کے مروجہ مسائل اسلام پر ہو میں یقین کرتا ہوں کہ جس قدر یہ علوم پھیلیں گے اور ان کا پھیلنا ضروری ہے اور میں خود بھی ان کے پھیلانے میں معین و مددگار ہوں، اسی قدر لوگوں کے دلوں میں مروجہ اسلام کی جانب سے بدظنی، بے پروائی بلکہ روگردانی ہوتی جائے گی، میرا یہ بھی یقین ہے کہ اصلی مذہب کا یہ نقصان نہیں ہے بلکہ یہ ان غلطیوں کا سبب ہے جو اسلام کے نورانی چہرہ پر لگ گئی ہیں یا نا دانستہ لگا دی ہیں۔“

”میں ہرگز اس لائق نہیں ہوں کہ اسلام کے نورانی چہرہ پر سے ان غلطیوں کے سبب و حثیوں کے چھڑانے کا دعویٰ کروں یا حمایت اسلام کا کام اپنے ذمہ لوں، یہ منصب اور بہ فرض دوسرے مفقذین و با علم لوگوں کا

ہے۔ مگر جب کہ میں مسلمانوں میں ان علوم کے پھیلنے کا ساعی ہوں جن کی نسبت میں نے ابھی بیان کیا کہ وہ اسلام کے کس قدر مخالف ہیں تو میرا فرض تھا کہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے صحیح یا غلط جو کچھ میرے اسکان میں ہو اس طرح اسلام کی حمایت کروں اور اس کے اصلی نورانی چہرہ کو لوگوں کو دکھلاؤں۔ میرا کانشنس مجھ سے کہتا تھا کہ اگر میں ایسا نہ کروں گا تو خدا کے سامنے گنہگار ہوں گا۔

”تیسے سیرے دوستوں میں یہ نہیں کہتا کہ جو کچھ میری تحقیقات ہے وہی صحیح ہے مگر جب مجھ کو بجز اس کے کہ جو کچھ مجھ سے ہو سکے وہ کروں اور چارہ کار نہ تھا تو مجھ کو ضرور وہی کرنا تھا جو میں نے کیا یا کرتا ہوں۔ میری نیت خالص خدا کے ساتھ ہے۔ اگر میں نے بُرا کیا ہے وہ چاہیگا مسامحہ کرے گا چاہے گناہ کرے گا۔ اگر میں نے اچھا کیا ہے تو میں اس کا صلہ کسی بندہ سے نہیں چاہتا اور یہی وجہ ہے کہ نہ میں لوگوں کے کافر یا نیچیری کہنے سے ڈرتا ہوں اور نہ بُرا مانتا ہوں۔ جو لوگ میری ان کوششوں کے سبب بُرا کہتے ہیں کافر تبتلے ہیں ہیں ان سے اپنی شفاعت کا خواستگار نہیں ہوں اور نہ ہوں گا۔ جو بھلا یا بُرا معاملہ ہے وہ خدا کے ساتھ ہے۔ اگر مجھ سے کچھ غلطی ہوئی ہے یا آئندہ ہوگی خدا سے مجھے امید ہے کہ وہ مجھ پر رحم کرے گا۔“

الغرض سرسید نے مذکورہ بالا مقصد کے پورا کرنے کے لیے اول اسلام کی سچائی ثابت کرنے کا ایک ایسا معیار قرار دیا جو ہر مذہب کی سچائی و ریافت کرنے کا پیمانہ قرار پاسکے یعنی یہ کہ اس میں کوئی بات قانونِ فطرت کے برخلاف نہ ہو کیونکہ قانونِ فطرت درحقیقت خدا کا فعل ہے اور جو مذہب فی الواقع خدا کا بھیجا ہوا ہو گا وہ خدا کا قول ہو گا پس اس کے فعل اور اس کے قول میں مطابقت ہونی ضرور ہے۔

اس کے بعد انہوں نے اس امر پر غور کیا کہ اسلام جس کی نسبت ہماری

و حوثی ہے کہ اس میں کوئی بات علم و حکمت و صداقت کے برخلاف نہیں اور وہ بالکل قانون فطرت کے مطابق ہے اس سے کیا مراد ہے؟ اور اُس کی حد کیا ہے؟ اور اُس کے ثبوت کی بابت ہم کہاں تک ذمہ دار ہو سکتے ہیں؟ اس امر کے متعلق انہوں نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ اسلام کے شعارات مجموعہ میں سے وہ حصہ جس کو تمام مسلمان ملہم من عند اللہ سمجھتے ہیں اور جس کی نسبت یقین رکھتے ہیں کہ وہ جس طرح خدا کی طرف سے نبی آخر الزمان کے دل میں اتقا ہوا ہے اسی طرح بے کم و کاست نبی سے ہاتھوں ہاتھ ہم تک پہنچا ہے، صرف وہی حصہ اس بات کا استحقاق رکھتا ہے کہ اُس میں جو بات مابقی فلسفہ و حکمت کے خلاف معلوم ہوا ہے اور مابقی حکمت میں تطبیق کی جائے یا مابقی حکم کی غلطی ثابت کی جائے پس انہوں نے جیسا کہ حضرت عمرؓ سے منقول ہے کہ ”حَسْبُنَا كِتَابُ اللَّهِ“ اپنے جدید علم کلام کا موضوع اور اسلام کا حقیقی مصداق محض قرآن مجید کو قرار دیا، اور اُس کے سوا تمام مجموعہ احادیث کو اس دلیل سے کہ ان میں کوئی حدیث مثل قرآن کے قطعی البتہ نہیں ہے اور تمام علماء و مفسرین کے اقوال و آراء اور تمام فقہاء و مجتہدین کے قبایح و اجتہادات کو اس بنا پر کہ ان کے جوابدہ خود علماء و مفسرین اور فقہاء و مجتہدین ہیں نہ اسلام، اپنی بحث خارج کر دیا۔

لہ سرسید کا دعویٰ اسلام کی حمایت کے موقع پر صرف اس قدر ہے کہ کوئی عقل من سائنس کی روش سے قرآن مجید پر وارو نہیں ہو سکتا اس لیے انہوں نے اپنی بحث کا موضوع محض قرآن مجید کو قرار دیا ہے اور مجموعہ احادیث وغیرہ کو اس بحث سے الگ رکھا، لیکن جو لوگ مذہب اسلام کا اطلاق مجموعہ کتاب و سنت و اجراء و قیاس پر کرتے ہیں ان کو اسلام کی حمایت کے لیے منویٰ ہے کہ وہ اس تمام مجموعہ کو سائنس کے حلقہ سے چھائیں، عام اس سے کہ اس کو سائنس کے مسائل پر تطبیق کریں، یا اُس کے مقابلہ میں سائنس کے مسائل کا اعلان ثابت کریں یا ان کو غیر محقق ٹھہرائیں ۱۲۔

یہ دونوں اصول ملحوظ رکھ کر سرسید نے قرآن مجید کی تفسیر لکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اول اول جب تک کہ تہذیب الاخلاق جاری رہا کبھی کبھی بلا لحاظ ترتیب کے وہ متفرق آیتوں کی تفسیریں بطور آرٹیکل کے تہذیب الاخلاق میں چھاپتے رہے۔ مگر جب تہذیب الاخلاق کا پرچہ پہلی دفعہ بند ہو گیا اور سرسید سرکاری خدمات سے سبکدوش ہو کر بنارس سے علیگڑھ چلے آئے تو انہوں نے ابتدا سے قرآن مجید کی تفسیر ترتیب وار لکھنی شروع کی اور اس وقت سے اخیر دم تک جب کبھی ان کو اور کاموں سے فرصت ملی برابر اس کے لکھنے میں مصروف رہے اور قریب دو خمس کے تفسیر لکھنی باقی تھی کہ پیغام اجل آ پہنچا۔

جس اصول پر سرسید نے یہ تفسیر لکھنی شروع کی تھی یہ ایک ایسا مشکل کام تھا کہ اگر کوئی اور شخص ایسا کام شروع کرتا تو چند روز بعد اس کا خیال بالکل چھوڑ دیتا۔ یہ کہہ نیا تو بہت آسان ہے کہ اسلام میں کوئی بات قانونِ فطرت کے خلاف نہیں ہے مگر اس کی تمام جزئیات کو قانونِ فطرت پر منطبق کرنا خصوصاً اس حالت میں جب کہ سلف کی تصنیفات میں کوئی ایسا نمونہ موجود نہ ہو نہایت مشکل کام تھا۔ باوجود اس کے سرسید نے کبھی ہمت نہیں ہاری اور باوصف سخت مخالفوں کے جو قوم کی طرف سے ہونے لگے اور باوجود ان بیشمار مشکلات کے جو تفسیر لکھنے وقت ان کو پیش آتی تھیں نہایت استقلال کے ساتھ اس کام کو اپنے مذہبی قرائض میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری فرض سمجھ کر انجام دیتے تھے۔

اس تفسیر کے مضامین پر ہم دوسرے حصہ میں بحث کریں گے یہاں صرف اس قدر لکھا جاتا ہے کہ اگرچہ سرسید نے اس تفسیر میں جا بجا ٹھوکریں کھائی ہیں اور بعض بعض مقامات پر ان سے نہایت رکیک لغزشیں ہوئی ہیں۔

با اینہمہ اس تفسیر کو ہم ان کی مذہبی خدمات میں ایک نہایت جلیل القدر خدمت سمجھتے ہیں جس سے اسلام کی محبت اور مہم دردی کے علاوہ ان کی لٹریچر لیاقت کا ایک حیرت انگیز کرشمہ ظاہر ہوتا ہے۔

اس تفسیر کے برخلاف اکثر مولویوں نے تفسیریں لکھی ہیں جن میں تفسیر حقانی سب سے زیادہ مشہور ہے مگر ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لکھنے والوں میں سے ایک شخص بھی یہ نہیں سمجھا کہ سید احمد رضا نے کس غرض سے یہ تفسیر لکھی ہے اور کس بنا پر انہوں نے اکثر جگہ تمام معنوں سے اختلاف کیا ہے جس طرح بعض چالاک وکیل کسی حیلہ سے جج کو فریقہ مخالفت پر افر وختہ کر کے اپنا کام نکال لیتے ہیں اسی طرح ان مولویوں نے اپنی تفسیروں کے خریدار پیدا کرنے کا یہ گزٹکا لایا ہے کہ سر سید کو کہیں شیطان کا منکر، کہیں فرشتوں کا منکر، کہیں معجزات کا منکر، کہیں نبوت کا منکر، کہیں جنت و دوزخ کا منکر قرار دے کر مسلمانوں کو ان سے اور ان کی تفسیر نہایت بدگمان اور متنفر کر دیا ہے۔ اگر یہ لوگ فی الواقع حمایت اسلام کی نظر سے سرسید کی تفسیر کا جواب لکھتے تو ان کو سب سے پہلے اس بات کا مفید کرنا چاہیے تھا کہ اگر نیری تفسیر مذہب کے حق میں فی الواقع کوئی خطرہ کی چیز ہے یا نہیں اور اگر ہے تو آیا اس کا علاج یہ ہے کہ انگریزی تعلیم کو قوم میں رواج نہ دیا جائے یا یہ کہ تعلیم سے جو شبہات اسلام کے حق میں پیدا ہوتے نظر آتے ہیں ان کا جہاں تک ممکن ہو استیصال کیا جائے۔ اس کے بعد ان کو یہ دیکھنا چاہیے تھا کہ سرسید نے جو طریقہ شبہات کے استیصال کرنے کا اختیار کیا ہے وہ ٹھیک ہے یا نہیں۔ اگر ٹھیک ہے تو انہوں نے کہاں تک قرآن کی تفسیر اس طریقہ کے موافق کی ہے اور کہاں کہاں اس سے انحراف کیا ہے اور اگر وہ طریقہ ٹھیک نہیں

ہے تو پھر کونسا طریقہ ہے جس کو اس مقصد کے لیے اختیار کرنا چاہیے اور کس طرح اس طریقہ سے ان شبہات کا جو علوم حبرِ بید کی تعلیم یافتہ گروہ کے دل میں پیدا ہوتے ہیں استنبیال کیا جائے مگر افسوس ہے کہ انہوں نے مراتب مذکورہ بالا میں سے ایک بات کا بھی اپنی تفسیروں میں لحاظ نہیں کیا بلکہ اپنی تمام مہمت اس بات میں صرف کی ہے کہ سرستید کی نسبت لوگوں کے نقصانات کو اور زیادہ بھڑکائیں تاکہ ان کی تفسیروں کی زیادہ قدر ہو اور لوگ ان کو بہت بڑا عامی دین اسلام سمجھیں۔

لطیفہ: ایک شخص نے سرستید کو اس مضمون کا خط لکھا کہ "میں بہت کثیر ایصال ہوں اور معاش کی طرف سے تنگ رہتا ہوں، آپ کسی ریاست میں یا سرکار انگریزی میں سیری تو کری کے لیے سفارش کر دیجئے، میں نے انگریزی کی تعلیم تو نہیں پائی مگر عربی کی کتب درسیہ پڑھی ہیں، جو کام آپ سیر سے لائق سمجھیں اس کے واسطے سفارش کر دیں" سرستید نے ان کو لکھ بھیجا کہ سیری عادت کسی کی سفارش کرنے کی نہیں ہے اور وجہ معاش کی تدبیر میرے نزدیک اس سے بہتر نہیں ہے کہ آپ سیری تفسیر کارو لکھ کر چھپوائیں خدا چاہے تو خوب بکے گی اور آپ کو تنگی معاش کی شکایت نہیں رہے گی۔"

چھٹا باب:

۱۸۶۸ء سے ۱۸۹۸ء تک

وائسرائے کی کونسل کی ممبری، ایجوکیشن میں شہادت، محمدن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن، محمدن ایسوسی ایشن علیگر ٹھ، محمدن ایجوکیشنل کانفرنس، پبلک سروس کمیشن کی ممبری، انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت، پٹریاٹک ایسوسی ایشن، کے سی ایس کا تمغہ ملنا، ایل ایل ڈی کی ڈگری، ٹرسٹی بل پر اختلاف، کالج کے رویہ میں غبن ہونا، سرسید کی وفات۔

۱۸۶۸ء میں سرسید کو لارڈ لٹن نے وائسرائے لیجسلیٹو کونسل کا ممبر مقرر کیا اور ان کے بعد دوسری دفعہ لارڈ ڈرپن نے ان کو ممبری کونسل کے لیے انتخاب کیا۔ قانونی کونسل میں ہندوستانیوں کے شریک کرنے کی تحریک جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے سب سے اول سرسید ہی نے کی تھی، انھوں نے اپنے رسالہ اسباب بغاوت میں سب سے بڑا سبب بغاوت کا کونسل میں ہندوستانیوں کے بھرتی نہ ہونے اور انتظام سلطنت سے بالکل بے خبر رہنے کو قرار دیا تھا۔ پس جس عرصہ و امتیاز کا دروازہ انھوں نے اپنے ہم وطنوں کے لیے کھولا تھا اس کا اتھاق فی الواقع سرسید سے زیادہ کوئی نہیں رکھتا تھا۔ بیٹی گزٹ میں ان کے انتخاب کی نسبت یہ رپارک کیا گیا تھا کہ "گورنمنٹ ان نقصوں کے پورا کر لے سے

جو سید احمد خاں نے اسباب بغاوت میں ظاہر کیے تھے غافل نہیں تھی، خود اُس کو لارڈ لٹن اور لارڈ رین کا ممبری کے لیے منتخب اور تازہ کرنا اس بات کی عمدہ ضمانت تھی کہ گورنمنٹ اپنی عیال کے ایک عمدہ حصہ کی ضرورت یا ت اور خواہشات سے آگاہ ہو۔

ہندوستانیوں میں سرستید پہلے شخص ہیں جنہوں نے ممبری کونسل کے نامہ میں ہندوستان کی بھلائی کے لیے قانون سبنا یا، وہ چارہ برس متصل وائس رائل کونسل کے ممبر رہے، اس عرصہ میں انہوں نے دو مسودے کونسل میں پیش کیے، چچیپ کے ٹیکے کا قانون اور قاضیوں کے تقرر کا قانون۔ یہ دونوں مسودے سے پاس ہو گئے، اور اُس سے آج تک اُن کے موافق ہندوستان کے اکثر حصوں میں عمل درآمد چلا آتا ہے۔

قانون ٹیکہ چچیپ

چچیپ کے ٹیکے کا قانون جس کا مسودہ ستمبر ۱۸۷۹ء میں کونسل میں پیش ہوا اس غرض سے بنایا گیا تھا کہ ٹیکے کا قاعدہ اصلاح شمال مغرب، اورہ، مہاک، متوسط، برٹش برہما، آسام، اجیر اور کورگ میں، اور نیز فوجی چھانڈیوں میں لازمی کر دیا جائے، چونکہ ایسا جبری قانون جاری کرنے سے رعایا کی شخصیات آزادی میں ایک نوع کی مداخلت کرنی پائی جاتی تھی اس لیے سرستید نے مسودہ پیش کرتے وقت جو اُس پر ایسا مبارک کیا تھا، اُس میں اُس قانون کے جاری کرنے کی ضرورت بہت خوبی سے ثابت کی ہے اور بتایا ہے کہ "شخصی آزادی کی رعایت اُس سرفرت کو جائز نہیں رکھ سکتی جو مرض چچیپ کے متعدی ہونے سے اوروں کو پہنچتی ہے اور نیز چچیپ کا ضرر بالخصوص اُن بے گناہ بچوں کو

پہنچتا ہے جو اپنی جانوں کی خود حفاظت نہیں کر سکتے۔ پس ٹیکے کے لازمی کر دینے سے جس طرح بڑی عمر کے آدمی ہمسایوں کی یا بے پروائی کے مضر نتائج سے محفوظ رہیں گے اسی طرح معصوم بچوں کی جانوں کی حفاظت ان کے والدین کی بیوقوفی کے نتائج سے عمل میں آوے گی۔ پھر یہ بھی ثابت کیا ہے کہ جس طرح پہلے زمانے میں لوگ عموماً ٹیکے سے ڈرتے تھے اب ایسا حال نہیں رہا۔ اب ملک میں ایک بہت بڑی جماعت تعلیم یافتہ لوگوں کی ایسی موجود ہو گئی ہے جو ٹیکے کا لازمی ہونا پسند کرتے ہیں۔

مح ڈاک ٹیکا لگانے کے قواعد میں جہاں تک کہ ممکن تھا ہر طرح کی آسانی اور نرمی کا لحاظ رکھا ہے۔ اولاً لوکل گورنمنٹوں کو اس میں اختیار دیا گیا ہے کہ جس میونسپلٹی سے مناسب سمجھیں، اس کو متعلق کریں۔ اس کے سوا ٹیکا لگوانے والوں کو اور بہت طرح سے آسانیاں دی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ بچوں کے مکانات پر جا کر ٹیکا لگایا جائے۔ میونسپل کمشنریوں میں سے کوئی ممبر خود جا کر اپنے سامنے ٹیکا لگوائے۔ پولیس کی دست اندازی جہاں تک ممکن ہو نہ پانے، اطفال غیر محفوظ کی تحقیقات اور ان کے رجسٹر کی ترتیب میونسپل کمشنریوں اور سپرنٹنڈنٹ ویکسینٹروں سے متعلق رہے تاکہ بچوں اور ان کے مرتبوں کو مجسٹریٹ کے برو جبراً حاضر کرانے کی ضرورت نہ رہے، کسی بچہ کے بازو سے مادہ نہ لیا جائے بلکہ جہاں تک ممکن ہو حیوانی مادہ سے ٹیکا لگایا جائے اور قانون کی خلاف ورزی کی سزائیں صرف جرمانہ پر محدود رہیں۔

باوجود ان سب باتوں کے یہ بل اختلاف رائے سے محفوظ نہ رہ سکا۔

خصوصاً نواب لغٹ گورنر پنجاب اس کے سخت مخالف تھے، مگر کونسل کے اکثر لیگل ممبر اس سے اتفاق رکھتے تھے آخر ایک آدھ دفعہ کی مجزوی

تسمیم کے بعد ۱۹۶۹ء میں پاس ہو گیا۔

قانون تقرر قاضیان

قاضیوں کے تقرر کا قانون بھی ۱۹۵۵ء میں کسی قدر اختلاف کے بعد مجارٹی سے پاس ہو گیا۔ اس قانون کے بنانے کا منشا یہ تھا کہ گو عہدہ قضا کی وہ حیثیت جو اہل اسلام کے عہد میں ایک جج یا مجسٹریٹ کے برابر تھی، انگریزی عملداری میں باقی نہ رہی تھی، مگر پھر بھی انگلش گورنمنٹ نے اپنے عہد حکومت میں اس عہدہ کو بالکل موقوف نہیں کر دیا تھا بلکہ بعض قوانین کے ذریعہ سے جو ۱۸۶۳ء سے ۱۸۶۷ء تک وقتاً فوقتاً جاری ہوتے رہے، بنگالہ، اڑیسہ، بہار، بمبئی اور مداس میں ایک عدالتی اختیارات کے سوا باقی تمام کام جو قاضیوں سے متعلق چلے آتے تھے قائم رکھے تھے، جیسے دستاویزات کا تیار اور تصدیق کرنا، نکاح خوانی اور ظلف کی مجلسوں میں صد نشین ہونا، انواع و اقسام کے آداب و رسومات وغیرہ کا انجام دینا، فریق شدہ جائیداد کے نیلام کی دید بانی، ترخیراٹ و ونشن و وظائف کا تقسیم کرنا وغیرہ وغیرہ پھر رفتہ رفتہ حسب مقتضائے وقت ان کی خدمات محدود ہوتی گئیں، یہاں تک کہ ۱۹۶۳ء میں جلد قوانین جو قاضیوں کے تقرر اور ان کے کاموں سے متعلق تھے منسوخ کیے گئے اور یہ قرار پایا کہ قاضیوں کا تقرر بذریعہ گورنمنٹ کے عمل میں آنا قرین مصلحت نہیں ہے اور قاضیوں کو اجازت دی گئی کہ جس وقت لوگ ان سے کسی رسم مذہبی وغیرہ کے انجام دینے کے خواستگار ہوں تو وہ بطور خود اس کو انجام دیں۔

مگر جس طبقہ کے لوگوں کو ایسے کاموں کے لیے قاضیوں کو ضرورت جوتی تھی ان کے ذریعہ سے عموماً اور مسلمانانِ صوبہ مداس کے ذریعہ سے خصوصاً

بارہا گورنمنٹ کی اطلاع میں آچکا تھا کہ بغیر ایسے قاضیوں کے جو گورنمنٹ کی طرف سے مقرر ہوں لوگوں کے کاموں میں جرح واقع ہوتا ہے اس لیے سرسید نے یہ مسودہ تیار کیا جس کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ گورنمنٹ نے جو قاضیوں کے تقرر کا اختیار اپنے ہاتھ میں نہیں رکھا اس کو وہ پھر اپنے ہاتھ میں لے اور اول صوبہ مدراس میں اُس کو نافذ کرے اور تمام لوکل گورنمنٹوں کو اختیار دے کر جس صوبہ کے مسلمان اس قانون کو اپنے صوبہ میں جاری کرانا چاہیں وہاں اس قانون کو جاری کریں۔ اس سید ہے کہ جہاں جہاں یہ قانون جاری ہو چکا ہے یا آئندہ جاری ہو گا وہاں کے قدیم قاضیوں کے خاندان جو سرکاری عہدہ دار نہ ہونے کی وجہ سے ایک کس پرسی حالت میں تھے ان کی قدر و پیشش زیادہ ہونے لگے گی اور خاص خاص طبقوں کے مسلمانوں کو نکاح خوانی وغیرہ میں ان سے مدد ملے گی۔

قانون وقف خاندانی

ان دونوں قانونوں کے علاوہ سرسید نے ممبری کونسل کے زمانہ میں ایک اور نہایت مفید خدمت اپنی قوم کی کرنی چاہی تھی مگر انوس بے کہ بعض موانع کے سبب وہ تدبیر لپدی نہ ہو سکی۔ انھوں نے ایک مسودہ قانون وقف خاندانی کے نام سے تیار کیا تھا جس سے مسلمان خاندانوں کو تباہی اور بربادی سے بچانا مقصود تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ مسلمان خاندانوں کی حالت روز بروز تباہ و برباد ہوتی جاتی ہے اور جو امیر اور ذمی مفرد خاندان تھے ان کی اولاد مفلس ہوتی جاتی ہے۔ اور جن میں ابھی کچھ جان باقی ہے وہ تین بیستوں کے بعد ان کی جائیدادیں اور ریاستیں بھی سب برباد اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم اور فرسند

میں فروخت ہو جائیگی۔ اس لیے اُن کو یہ خیال پیدا ہوا کہ کوئی ایسی تدبیر کی جائے جس سے مسلمانوں کے معزز خاندان بنے رہیں اور اُن میں کچھ ایسے ذمی مفدور اور ریشہ دکھائی دیں جن سے مسلمانوں کی قوم کی عزت اور امتیاز قائم رہے۔

اول انھوں نے تہایت محنت و جانفشانی سے سنی اور شیعہ دونوں کی فقہی کتابوں سے اس کا ثبوت بہم پہنچایا کہ ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنی جائیداد کو اپنے لیے اور اپنے بعد اپنی اولاد اور اپنی نسل کے لیے ہمیشہ کو وقف کر دے جس کی رو سے وہ جائیداد نہ کبھی بیچ ہو سکے اور نہ وراثت میں تقسیم ہو سکے اور ہمیشہ قائم و برقرار رہے۔ پھر جہاں جہاں ہندوستان میں مسلمان رئیسوں نے اپنی جائیدادیں اس طرح بہا اپنے خاندان کے لیے وقف کی تھیں اُن کی بہت سی مثالیں بہم پہنچائیں تاکہ مسلمانوں کے عمل درآمد سے مسئلہ شرعی کو اور زیادہ تقویت ہو، اس کے بعد انھوں نے دیکھا کہ جو لوگ خانگی طور پر بلا مدخلت سرکار اپنی جائیدادیں اپنے خاندان کے لیے وقف کرتے ہیں ایسے وقف سے کچھ فائدہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اول تو یہ امید نہیں کہ وہ جانشینی کا ایسا قاعدہ کلیہ مقرر کر سکیں جس میں آخر کار خاشیں پیدا نہ ہوں اور نزاع کا احتمال باقی نہ رہے دوسرے اس صورت میں ہمیشہ وقف کے فرضی اور فرضی ہونے کا الزام لگا کر اُس کی منسوخی کے دعوے، جیسا کہ اکثر ہوتا رہتا ہے، عدالت میں دائر ہو سکتے ہیں۔ تیسرے چونکہ اکثر جائیدادیں دیہاتہ مالگذاری سرکار ہوتے ہیں اس لیے جب کوئی مالان متولی یا جانشین نہ مالگذاری سرکار ادا نہیں کرتا تو اس شرعی یا قانونی اس بات کا مانع نہیں ہوتا کہ وہ حاجت و اجلت باقی نیلام ہو جائے۔ اس لیے انھوں نے ضروری سمجھا کہ یہ مسئلہ شرعی بند بچہ ایک

قانون کے گورنمنٹ کی منظوری سے استحکام پا جائے۔

اس غرض سے انھوں نے ایک مسودہ نہایت لیاقت کے ساتھ تیار کیا اور کونسل میں پیش کرنے سے پہلے وائسرائے سے پرائیویٹ طور پر اس کے مشتبہ کرنے اور مسلمانوں کی رائیں اس کی نسبت دریافت کرنے کی اجازت لے کر تہذیب الاخلاق، علیگڑھ گزٹ اور دیگر اخبارات میں مشتبہ کرایا بہت سے مسلمانوں نے خطوں کے ذریعے سے اس کے ساتھ اتفاق ظاہر کیا۔ بعض شہروں میں وہاں کے رئیسوں اور متاثر لوگوں نے جلسے کیے اور اس تجویز کو نہایت پسند کیا، بعض نہایت مستند عالموں نے وقف خاندان کے مسئلہ کو تسلیم کیا اور اس کے جواز پر فتویٰ لکھ دیا، مگر بہت سے مسلمانوں نے اور خاص کر مولوی ابو سعید عظیم آبادی اور ان کے پیروں نے سخت مخالفت کی، چنانچہ وقف خاندان کے عدم جواز پر فتوے لکھے گئے اور گورنمنٹ میں اس کے برخلاف عرضیاں اور ممبروں کی بھیجی گئی۔

جس زمانہ میں اس مسودہ کے برخلاف مولویوں کے فتوے شائع ہو رہے تھے کسی انصاف پسند مسلمان نے ان فتوؤں کے خلاف ایک اٹکل لکھا تھا جس کا پہلا فقرہ یہ تھا "امگلستان کا ایک مصنف لکھتا ہے کہ "جو شخص اپنے ملک یا اپنی قوم کا بدخواہ ہو اس کی زیارت کرنی چاہیے کیونکہ وہ دنیا میں ایک عجائب چیز ہے؛ ہم کہتے ہیں کہ یہ مصنف چونکہ یورپ میں پیدا ہوا تھا اس لیے شاید اس نے عمر بھر میں کوئی قوم کا بدخواہ نہ دیکھا ہو گا اور اسی لیے وہ قوم کے بدخواہ کو ایک عجیب چیز سمجھتا تھا، لیکن اگر وہ ہماری قوم میں پیدا ہوتا تو بجائے اس قول کے شاید یہ جملہ اس کی زبان سے نکلتا کہ جو شخص مسلمان مولوی ہو کر اپنی قوم کا بدخواہ نہ ہو اس کی زیارت کرنی چاہیے کیونکہ دنیا میں کوئی چیز اس

سے زیادہ عجیب نہیں ہے ۔

مہر حال سرستید نے بہ تدبیر مسلمان ریٹیروں کے لیے نہایت عمدہ سوچی تھی مگر افسوس ہے کہ وہ اس مسودے کو کونسل میں پیش نہ کر سکے۔ نہ اس لیے کہ مسلمانوں نے اس کی مخالفت کی تھی کیونکہ وہ قانون لازمی نہ تھا اور اس کی پابندی محض مالک جائیداد کی مرضی پر منحصر تھی۔ بلکہ اس لیے کہ وہ اصول قانون کی رو سے پاس نہیں ہو سکتا تھا۔ بات یہ ہے کہ وہ قانون بالکل فریقین کی روایات فقہیہ کے مطابق بنایا گیا تھا اور فقہ کی رو سے ضرورت تھا کہ جو وقف اس طرح اولاد کے لیے کیا جائے وہ وقف دائمی ہونہ میعاد می، مگر ولایت کے مقننوں کی یہ رائے قطعی طور پر قرار پا چکی تھی کہ کسی جائداد کو ہمیشہ کے لیے ناقابل انتقال بنا دینا ملک کو نقصان پہنچانا ہے۔ پس سرستید کے بعض دوستوں نے جو کونسل میں تھے ان کو یہ صلاح دی کہ موجودہ صورت میں مسودہ قانون پیش کرنا عبث ہے کیونکہ اس کے منظور ہونے کی امید نہیں۔ ہاں اگر وقف کی کوئی میعاد مقرر کر دی جائے جس سے جائیداد ایک مدت معین تک ناقابل انتقال رہے اور اس کے بعد موجودہ وارثوں میں تقسیم ہو جائے تو البتہ یہ قانون پاس ہو سکتا ہے۔ لیکن چونکہ ایسے وقف کو میعاد ہی قرار دینا شرعاً جائز نہ تھا اس لیے لاجپار اس سے دست بردار ہونا پڑا۔

کونسل میں اسپین

سرستید نے ان تینوں مسودوں کے تیار کرنے کے سوا اور اکثر موقعوں پر جب تک کہ وہ کونسل میں ممبر رہے غیر معمولی بیاقت ظاہر کی ہے۔ باوجود انگریزی نہ جانتے کے ہر ایک اہم معاملہ پر جو کونسل میں پیش ہوتا تھا وہ

گفتگو کرتے تھے اور اس لیے ان کو تمام کاغذات جو اس معاملہ سے متعلق اور
 بالکل انگریزی میں ہوتے تھے سمجھنے پڑتے تھے اور اس طرح کافی اطلاع حاصل
 کرنے کے بعد وہ کونسل میں اسپیکر کرتے تھے۔ اکثر چھوٹی چھوٹی اسپیکر وہ
 اول خود اردو میں لکھ کر ان کا انگریزی میں ترجمہ کرتے تھے اور پھر انگریزی الفاظ
 کو فارسی حروف میں لکھ کر خود کونسل میں اسپیکر دیتے تھے اور بڑی بڑی سیمیں
 جو وہ تیار کر کے لجاتے تھے ان کو اکثر کونسل کا سکرٹری پڑھ کر سناتا تھا۔ ان
 کی ایک اسپیکر پر جو فارسی حروف میں لکھ کر دی تھی لارڈ لٹن نے بڑا تعجب ظاہر
 کیا تھا۔ سر سید کہتے تھے کہ ”جب میں اجلاس عظم ہونے کے بعد کونسل کے
 بال سے اپنے کمرے کی طرف چلا تو لارڈ لٹن بھی پیچھے پیچھے چلے آئے اور مہربانی
 سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے کہ میں نے ایسی قابلیت اسپیکر کبھی نہیں
 سنی تھی“ یہ اسپیکر غالباً مسودہ قانون مزارعان دکن پر تھی جس کا انتخاب کرنل کریم
 نے سر سید کی لائف میں چھاپ دیا ہے۔

ایک اور اسپیکر مسودہ قانون انتقال جائیداد کی رپورٹ پیش ہونے پر سر سید نے
 ۲۶ جنوری ۱۸۵۷ء کرنل کی تائید میں کی تھی۔ اس بل پر انگلش میں ایک لیا آریکل
 چھپا تھا جس میں سر سید کی اسپیکر کی نسبت لکھا تھا کہ ”کسی ہندوستانی جنٹلمین
 نے اب تک اس مسئلہ کی تائید نہ کی کہ ملک کا قانون کو ڈیکلیشن (یعنی مجموعہ احکام
 بنانے) کا محتاج ہے اور اس میں ڈیکلیشن کی گنجائش ہے اور ملک
 کے دونوں فرقوں کی تاریخ اور لٹریچر ایک قومی ضرورت کی طرف بڑے استحکام
 ساتھ اشارہ کرتی ہے۔ ایسی صورت کیساتھ نہیں کی ہے جیسی کہ آئرلینڈ سید احمد خاں نے کی ہے۔“
 اسی طرح قانون حقوق استفادہ اور قانون ترمیم مجموعہ ضابطہ قوجداری جو
 ہندوستان میں ہمیشہ یاد رہے گا اور نیز دیگر قوانین پر انھوں نے بہت باوقفت

اسپیشیوں کی ہیں۔ خصوصاً وہ اسپیش جو قانون لوکل سلف گورنمنٹ متعلقہ اصطلاح مشروط
 پر ۱۲ جنوری ۱۸۸۴ء کو لارڈ رین کے زمانہ میں کی تھی وہ خاص توجہ کے لائق ہے۔
 قانون مذکور میں جو کہ خاص اصطلاح متوسط کے لیے بنایا گیا تھا اس صوبہ کی حالت
 کے لحاظ سے لوکل بورڈوں میں دو ڈسٹ ممبر الیکشن سے اور ایک ڈسٹ گورنمنٹ
 کے انتخاب سے مقرر ہونے بخوبی کیے گئے تھے مگر لارڈ رین کی پالیسی سے اس
 بات کا یقین تھا کہ شمالی ہندوستان میں کل ممبر الیکشن سے مقرر ہوا کریں گے۔ چونکہ
 سرسید کی رائے اس کے برخلاف تھی اور ان کو یہ امید نہ تھی کہ وہ اس وقت
 تک جبکہ ان صوبوں کے لیے قانون بنایا جائے گا کونسل میں میرے رہیں گے اس
 لیے انھوں نے اپنی اسپیش میں نہایت مدلل طور پر بیان کیا ہے کہ تمام ہندوستان
 میں اسی اصول کے موافق دو ڈسٹ ممبر الیکشن سے اور ایک ڈسٹ مینشن سے مقرر
 ہوا کریں چنانچہ انھیں کی اسپیش پر لارڈ رین نے شمالی ہندوستان میں ایک ڈسٹ ممبروں کا تقرر
 گورنمنٹ کے ہاتھ میں رکھا اور دو ڈسٹ کے لیے الیکشن کا قاعدہ مقرر کیا۔

یہ اسپیش سرسید کی اول اسپیشوں اور لکچروں کے ساتھ ایک مجبورہ میں چھپ گئی
 ہے اس لیے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر اس کے بعض فقرات ہم
 اس موقع پر نقل کریں گے جہاں انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت کا مفصل ذکر کیا جائے گا۔
 لارڈ رین کے عہد میں جس قدر زمانہ کہ سرسید کے کونسل میں شریک رہنے
 کا تھا اس کے پورا ہونے بھی ابھی چند روز باقی تھے اور ان کے پورا کرنے کے
 لیے کلکتے جانے میں مدرسہ وغیرہ کے کاموں میں حرج واقع ہوتا تھا اس
 لیے انھوں نے بذریعہ تدارک کے کونسل سے استعفا بھیج دیا مگر اس کے بعد
 میں جب کہ اصطلاح شمال مغرب میں کونسل قائم ہوئی ان کو لوکل گورنمنٹ نے
 اپنی کونسل کے لیے پھر انتخاب کیا اور اس وقت سے لے کر تک وہ

برابراؤں میں ممبر رہے۔ آخر پھر اُن کو مدد سے اس کے کاروبار کی ضرورت امداد غیر
ضیعی کی وجہ سے استعفا دینا پڑا۔

کرنل گریم سر سید کی لائف میں اُن کی ممبری کو نسل کی نسبت لکھتے ہیں
کہ ”جب سر جان منگلم کو بورڈ آف ڈائریکٹرز نے عہدہ گورنری پر مقرر کیا تو
اس تقریب میں گریٹ ڈیوک آف ونگٹن نے سر جان منگلم کو ایک ڈنر
دیا تھا اس موقع پر جو تقریر ڈیوک نے کی تھی، اگر اُس تقریر میں سجائے
انگلستان کے ہندوستان اور سجائے انگریز کے مسلمان کا لفظ بنا دیا جائے تو وہ
تقریر سید احمد خاں کے میر کو نسل ہونے پر خوب چپاں ہوتی ہے اور وہ
فقہ یہ ہے ”ایسا تقریر جیسا کہ یہ ہے عمل کرنے والا ہے۔ انگلستان
کے تمام عرصہ و طول پر اور کم سے کم عمر کا نوجوان انگریز اس میں ایک مثال
پاتا ہے جس کی وہ تقلید کرے۔ اور ایک کامیابی پاتا ہے جس کو وہ حاصل کرے
اور ایسے فیئنگز کے جوش سے جو بھلائی لاکر حاصل ہوتی ہے، اس کی کچھ
انتہا نہیں“

ایجوکیشن کمیشن میں شہادت

۱۸۸۴ء میں جب کہ سر سید لیمبلیٹو کو نسل میں ممبر تھے اُن کی شہادت بھی
ایجوکیشن کمیشن میں لی گئی تھی، اُن کا طولانی اظہار علی گڑھ گزٹ کے متعدد پرچوں
میں چھپا ہوا موجود ہے جس سے اُن کا ایک بڑا تجربہ کار ایجوکیشنسٹ ہونا
شناخت ہوتا ہے۔

سر سید اول کمیشن مذکور کے ممبر مقرر ہوئے تھے، مگر جو طریقہ کمیشن کی کارروائی
کا تھا وہ اُن کی رائے کے خلاف تھا، اول تو ممبروں کو کسی کارروائی کی اطلاع

پہلے سے نہیں دیکھائی تھی تمام رزولوشن دفعتاً پیش کیے جانے تھے اور ممبروں کو ان پر کافی غور اور بحث کرنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ دوسرے جو مباحثہ برائیک رزولوشن پر ہوتا تھا وہ قلمبند نہیں کیا جاتا تھا، اس لیے انھوں نے ایک آدھ اجلاس کے بعد پریسیڈنٹ سے کہا کہ میرے نزدیک ممبروں کو پہلے سے اطلاع ہونی چاہیے کہ کونسی تاریخ کیا کارروائی ہوگی تاکہ ان کو غور کرنے کا موقع ملے دوسرے جو مباحثہ کمیشن میں ہوؤہ بالکل قلمبند ہونا چاہیے مگر پریسیڈنٹ نے ان دونوں باتوں کو منظور نہیں کیا اور کہا کہ موجودہ حالت

۱۔ (حاشیہ بعد غنم کے) ”سید محمود نے اپنی میری کے زمانہ میں ۱۸ رزولوشن کمیشن میں ایسے پاس کرائے تھے جو خاص مسلمانوں کی ترقی تعلیم اور بہبودی سے علاقہ رکھتے تھے مگر گورنمنٹ سے ان کی نسبت یہ حکم ہوا کہ ان کے اجرا یا عدم اجرا کا اختیار لوکل گورنمنٹوں کو ہونا چاہیے جس تجویز کو وہ اپنے صوبہ میں مناسب سمجھیں جاری کریں اور جس کو مناسب نہ سمجھیں جاری نہ کریں وہ رزولوشن یہ ہیں۔

۱۔ مسلمانوں کی تعلیم کی خاص تقویت اور ترقی کا بار لوکل میونسپل اور پرووینشل فنڈوں پر جائز سمجھا جائے۔

۲۔ جو دیسی مدرسے مسلمانوں کے ہیں ان کو ترغیب دی جائے کہ اپنے ہاں کی خواندگی میں خاص ذہنی تعلیم میں اضافہ کریں۔

۳۔ مسلمانوں کے پرائمری اسکولوں کے واسطے خاص سینڈر مقرر کیے جائیں۔

۴۔ پرائمری اور ہڈل اسکولوں میں سوائے ان مقامات کے جہاں اسلامی جماعتیں کسی اور زبان کی خواہش کریں اصل زبان مسلمانوں کی تعلیم

میں بھی کام کی کثرت بہت ہے۔ اگر ایسا کیا جائے گا تو کام بہت بڑھ جائے۔
 گلاسٹید نے کہا کہ اس صورت میں کمیشن کی شرکت سے مجھکو معاف رکھا
 جائے۔ جب لارڈسپن کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے سرستید سے کہا کہ اگر
 کے لیے اُردو ہونی چاہیے۔

۵۔ جہاں دفاتر کی زبان اُردو نہیں ہے وہاں بطور اختیاری مضمون کے
 پرائمری اور مڈل اسکولوں میں جو مسلمانوں کے لیے پبلک فنڈ سے
 قائم ہیں دفاتر کی زبان خواتنگی میں بڑھائی جائے اور نیز حساب اور
 سیاق اسی زبان میں سکھایا جائے۔

۶۔ جن مقامات میں مسلمانوں کی نسبتی تعداد بلحاظ آبادی کے معتد بہ ہے
 وہاں پرائمری اور مڈل اسکولوں میں جو کہ پبلک فنڈ سے قائم ہیں ایسا
 انتظام کیا جائے کہ اُردو اور فارسی زبان کی تعلیم دی جائے۔
 ۷۔ مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کی ترقی کے لیے خوب اچھی طرح ترغیب عمل
 میں لائی جائے، کیونکہ یہ ایسی تعلیم ہے جس میں اس جماعت کو خاص
 مدد کی ضرورت ہے۔

۸۔ جہاں جہاں ضرورت ہو ایک درجہ ہار طریقہ خاص اسکالرشپوں کا
 مسلمانوں کے واسطے جاری کیا جائے جو انعام میں دیے جائیں یعنی (۱)
 جو پرائمری اسکولوں کی کامیابی پر مڈل اسکولوں میں دیئے جائیں اب جو
 مڈل اسکولوں کی کامیابی پر ہائی اسکولوں میں دیئے جائیں (ج) جو
 انٹرنیس اور ایف اے کے امتحانات کے نتائج پر کالجوں میں دیئے
 جائیں۔

۹۔ ہر قسم کے اسکولوں میں جو پبلک فنڈ سے قائم ہیں ایک خاص نسبتی

آپ ممبری سے علیحدہ ہوتے ہیں تو سید محمود کو اپنی جگہ ممبری قبول کرنے پر راضی کر دیجیے اور آپ خود کمیشن میں شہادت دیجیے چنانچہ سید محمود اُن کی جگہ مقرر کئے گئے اور سرسید نے شہادت دی۔

تعداد وظیفوں کی یا تفصیص مسلمان طلبہ کے لیے رکھی جائے۔

۱۰۔ جن مقامات میں تعلیمی اوقاف مسلمانوں کے فائدے کے واسطے ہیں اور گورنمنٹ کے زیر انتظام ہیں وہاں اوقاف کی آمدنی صرف مسلمانوں کی ترقی تعلیم میں صرف ہونی چاہیے۔

۱۱۔ جہاں مسلمانوں کے اوقاف پرائیویٹ لوگوں یا جماعت کے زیر انتظام ہیں وہاں فیاضی سے گرانٹ ان ایڈوی جایش اور پرائیویٹ لوگوں کو ترغیب دیجائے کہ گرانٹ ان ایڈ کے قاعدے کے موافق انگریزی تعلیم کے لیے اسکول اور کالج قائم کریں۔

۱۲۔ جہاں ضرورت ہو نو رمل اسکول یا کلاسیں مسلمان معلموں کی تربیت کے لیے قائم کی جائیں۔

۱۳۔ جن مسلمان مدرسوں میں (جو اوقاف سے قائم ہیں) اردو میں درس ہوتا ہو وہاں کوشش کی جائے کہ حتی الامکان مسلمان معلم تعلیم دیں۔

۱۴۔ افسران معائنہ جو مسلمان ہوں وہ ان پرائمری اسکولوں کا معائنہ جو مسلمانوں کے لیے ہیں موجودہ دستور سے زیادہ کیا کریں۔

۱۵۔ ترقی تسلیم مسلمانان کے واسطے جو ایسوسی ایشن ہیں، اُن کو تسلیم کیا جائے اور ان کی بہت بڑھائی جائے۔

۱۶۔ پبلک انسٹرکشن کی سالانہ رپورٹوں میں ایک خاص باب مسلمانوں کی تعلیم پر ہوا کرے۔

سرٹیفکے اظہارات میں سے چند دلچسپ جواب جو انھوں نے بعض عام سوالات یا جرح کے سوالات پر کیشن میں دیے اس مقام پر بطور خلاصہ کے نقل کیے جاتے ہیں تاکہ تعلیم کے متعلق جو اہم سوالات میں ان کی نسبت ان کی اصلی رائے جو انھوں نے ہر ایک موقع پر نہایت آزادی سے ظاہر کی ہے ناظرین کو معلوم ہو جائے۔

انھوں نے اس سوال کے متعلق کہ آیا مغربی علوم کی تعلیم دہیں زبانوں میں یہ نسبت انگریزی زبان کے زیادہ مفید ہوگی؟ اس طرح جواب دیا کہ "ان ورنیکلر و انگریزی پرائمری اور ٹیل اسکولوں میں جن کا مقصد طالب علموں کو اعلیٰ درجے کی تعلیم کے واسطے تیار کرنے کا نہیں ہے۔ مغربی علوم کا جہاں تک کہ وہ ان میں پڑھائے جاتے ہیں ورنیکلر زبان میں پڑھایا جاتا ہے شک کے حق میں بہتر ہوگا۔ مگر انگریزی اب ترائی اسکولوں میں جو اس غرض سے قائم کیے گئے ہیں کہ اعلیٰ تعلیم کے واسطے بطور ایک ذریعہ کے کام دیں ورنیکلر زبان کے ذریعہ سے یورپین علوم کو پڑھانا تعلیم کو برباد کرنا ہے۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ میں وہی شخص ہوں جس نے سب سے پہلے اس بات کا گمان کیا تھا کہ یورپین علوم کا ورنیکلر زبان کے ذریعہ سے تحصیل کرنا ملک کے حق میں زیادہ سود مند ہوگا۔ میں وہی شخص ہوں جس نے لارڈ مکالے

۱۷۔ لوکل گورنمنٹوں کی توجہ اس نسبت کی طرف مائل کرائی جائے جو تعلیم یافتہ مسلمانوں اور دیگر اقوام کے لوگوں میں نوکریاں تقسیم کرنے میں ملحوظ رکھی جاتی ہے۔

۱۸۔ اصول مذکورہ بالا جو سفارش میں بیان کیے گئے ہیں وہ دیگر اقوام پر بھی جو حالات مذکورہ میں مسلمانوں کے برابر ہوں، عائد ہوں۔ ۱۷۔

کے منٹ ۱۸۳۵ء پر مکنتہ چیتی تھی کہ انھوں نے مشرقی تعلیم کے نقص کو ظاہر کیا اور مغربی علوم کی تعلیم پر توجہ دلائی، اور اس بات کے خیال کرنے سے قاصر رہا تھا کہ ایسی زبانوں کی وساطت سے یورپین علوم کی اشاعت اہل ہند کو کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہے یا نہیں، میں نے اپنی رائے کو صرف بیان ہی پر محدود نہیں کیا بلکہ اس کو عمل میں لانے کی کوشش کی، بہت سے مباحثے بہت سے جلسوں میں کیے، اس مضمون پر متعدد رسالے اور مضامین لکھے، لوکل اور سپریم گورنمنٹوں کو عرضداشتیں بھیجیں اور اسی غرض سے ایک سوسائٹی موسوم بہ سائنٹفک سوسائٹی علیگر ٹھہ قائم کی گئی جس نے کئی علمی اور تاریخی کتابوں کا انگریزی سے ورنیکلر زبان میں ترجمہ کیا، مگر انجام کار میں اپنی رائے کی غلطی کے اعتراف سے باز رہ سکا، مجھ کو ایک مشہور لیبرل سٹیشن کے قول کو تسلیم کرنا پڑا جس نے کہا تھا کہ "جو کچھ ہمارے زمانہ کے ہندوستانیوں کو درکار ہے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، وہ یہ ہے کہ وہ اُس علم و حکمت پر نظر ڈالیں جو ان کے زمانہ کی اور اُس قومی قوم کی جان ہے اور جو اُس کے نزدیک تمام علوم اور تمام طاقت کا مخزن ہے۔" میں لارڈ ولیم بنٹنک کی اس پالیسی کی صحت اور سچائی کو سمجھ گیا کہ ہندوستان کی قوموں میں یورپ کے علم و حکمت کو ترقی دینا گورنمنٹ کا مقصد اعلیٰ ہونا چاہیے۔

"وہ خیال کیا جاتا ہے کہ کسی ملک نے کسی علم میں ترقی نہیں کی تا وقتیکہ وہ علم خود اُس ملک کی زبان میں نہ آگیا ہو، مگر اس دلیل میں ایک بڑے جزو کو جسے اُس کی جان کہنا چاہیے چھوڑ دیا گیا ہے، وہ حقیقت نہایت موزونیت کے ساتھ یوں کہا جاسکتا ہے کہ کسی ملک نے کسی علم میں ترقی نہیں کی تا وقتیکہ وہ علم اس زبان میں نہ آگیا ہو جو اُس ملک پر حکمران ہے، ہندوستان میں جو زبان حکمران ہے وہ ورنیکلر نہیں ہے بلکہ انگریزی زبان ہے، ایسے اس ملک میں ورنیکلر کے ذریعہ سے کسی علم کو ترقی نہیں

ہو سکتی۔ ہماریخ میں کوئی نظیر اس بات کی نہیں پائی جاتی کہ کسی ایسی زبان کی وساطت سے جو حکمران قوم کی زبان نہ ہو کسی قوم میں کسی علم نے ترقی پائی ہے۔

پھر اس سوال پر کہ کونسی تدبیر سے تعلیم کی آزادی اور اس کا اختلاف نوعی محفوظ رکھا جاسکتا ہے، اس طرح جواب دیا کہ "تعلیم کی آزادی اور اس کے اختلاف نوعی کا محفوظ رکھنا اس طریقہ پر منحصر ہے جو کسی ملک کی یونیورسٹی نے مختلف علوم میں ڈگریاں عطا کرنے کے لیے قرار دیا ہو پس ہم کو دیکھنا چاہیے کہ اس ملک کی یونیورسٹیوں نے اس باب میں کیا کیا ہے۔ ہیں یہاں صرف کلکتہ یونیورسٹی کی نسبت جو اس ملک کی سب سے پوری یونیورسٹی ہے گفتگو کروں گا۔ یہ یونیورسٹی انجینئرنگ میڈیسن اور آرٹس میں ڈگریاں عطا کرتی ہے اور ہر شخص کو اس بات کی بالکل آزادی ہے کہ ان میں سے جس مضمون کو چاہے اختیار کرے۔ وہ بلاشبہ تعلیم کی آزادی اور اختلاف نوعی کو لوگوں کے حق میں جہاں تک کہ اس کو علم کی ان چار مختلف شاخوں سے تعلق ہے محفوظ رکھتی ہے۔ لیکن آرٹس کا سبکیٹ ایک وسیع سبکیٹ ہے اور آزادی و اختلاف نوعی کو جواب ہم اس میں محفوظ نہیں رکھا گیا، یا نہایت محدود کر دیا گیا ہے اس کا محفوظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ جو کورس آرٹس کے امتحان کے واسطے ہماری یونیورسٹی نے اختیار کیا ہے وہ لندن کی یونیورسٹی کی ایک نامکمل تقلید پر قرار دیا گیا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے گریجویٹ کسی سبکیٹ میں ایک کامل علم حاصل نہیں کرتے ہیں۔ پس اس طریقہ مردوبہ کے برخلاف ہوں۔ مگر چونکہ یہ سبکیٹ کمیشن کے احاطہ تحقیقات سے خارج ہے اس لیے میں خیال کرتا ہوں کہ مجھ کو اس کی نسبت کچھ زیادہ بیان کرنا مناسب نہیں ہے۔ میں صرف ہیرا کیلنسی والٹر کے اسٹیج میں سے جو کلکتہ یونیورسٹی کے پچھلے سالانہ جلسہ میں حضور ممدوح نے ارشاد فرمائی تھی انتخاب مندرجہ ذیل کمیشن کی اطلاع کے واسطے پیش کرتا ہوں "جس بات کی سب سے اول

تعلیم میں ضرورت ہے وہ علم کی تکمیل ہے۔ فرائض عقلیہ کو چیزوں کے کامل طور پر سیکھنے سے بہ نسبت اس کے کہ بہت سی باتیں بالائی طور پر سیکھی جائیں زیادہ تر عمدہ طور پر تربیت ہوتی ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ "ایک مضمون کو کامل طور پر سیکھنے سے بہ نسبت اس کے کہ سو علم نامکمل طور پر سیکھے جائیں زیادہ تر اصلی عقلی تربیت حاصل ہوتی ہے۔"

پھر اس سوال پر کہ گورنمنٹ کو کس کس حد تک ہر قسم میں تعلیم کی امداد دینی مناسب ہے، اس طرح جواب دیا کہ "اس امر کی نسبت جو میری خاص رائے ہے وہ پبلک فیلنگ کے برخلاف ہے۔ میں نے اس معاملہ کے تمام پہلوؤں پر غور کامل کرنے کے بعد اپنی رائے قائم کی ہے کہ جب تک خود لوگ اپنی تعلیم کا تمام اہتمام اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے اس وقت تک مناسب طور پر ان کی تعلیم کا سہونا ممکن نہیں ہے۔ پس ملک کے لیے یہ زیادہ تر مفید ہوگا کہ گورنمنٹ تعلیم کا تمام اہتمام لوگوں پر چھوڑ دے اور خود اس میں دست اندازی سے بالکل علیحدہ ہو جائے۔ مگر پبلک کی رائے اس رائے کی موید نہیں ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ گورنمنٹ کا اس تعلیم سے علیحدہ ہونا واجب ہو ایک نہایت لائق ہندوستانی نے جس کا میں دل سے ادب کرتا ہوں مجھ سے کہا کہ "یہ خیال کہ ہم کو آپ اپنی تعلیم کا بندوبست کرنا چاہیے بالکل ایک غلط خیال ہے، اور لفظ "اپنے آپ" کا کسی قومی معنوں میں ہندوستان کے باشندوں کی نسبت استعمال کرتا بیجا ہے۔ کوئی قوم بڑا کام نہیں کر سکتی جس میں اعلیٰ اور ادنیٰ تمام فرقوں کے لوگ شریک نہ ہوں۔ ہندوستان میں اعلیٰ درجہ کا پولیٹیکل اور انتظامی اقدار گورنمنٹ اور اس کے یورورپین عہدہ داروں کو حاصل ہے اور جو شخص ہندوستان میں تجارت سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں وہ بھی یورورپین ہیں اور اس وجہ سے وہ

فی الحقیقت ہندوستان کی آبادی میں سب سے زیادہ وقت رکھتے ہیں۔ مگر جب کبھی ان عہدہ داروں سے کسی کالج یا اسکول کیلئے جو اس ملک میں ہندوستانیوں کے فائدہ کے واسطے قائم کیا جاتے زیر نقد کی امداد کی درخواست کی گئی ہے تو وہ علی العموم اس سے اس طرح پر علیحدہ رہے ہیں کہ گویا ان کو اس سے مطلق بہ کھ سروکار نہیں تھا۔“

اس کے بعد سر تید نے کہا کہ ”اس مقام پر میں ایک واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو خود میرے ساتھ گزرا ہے یعنی جس زمانہ میں کہ محمدن اینگلو اوزنٹیل کالج علیگر ٹھہ میں قائم ہوا تو میں نے ایک نہایت معزز یورپین افسر سے اس کی امداد کی درخواست کی اس نے جواب دیا کہ ”ہم پر اس کی امداد کرنا کچھ فرض نہیں ہے۔ وہ تمہارا بچہ ہے، ہمیں اس کو دھکا دیدینا چاہیے۔ اگر تمہارا بچہ ہوتا تو ہم البتہ اس کو والدینی شفقت کے ساتھ چھاتی سے لگا لیتے، پس سبک اپنہین کے لحاظ سے میں اقرار کرتا ہوں کہ ہمارے واسطے اس بات کا کہنا کچھ آسان نہیں ہے کہ لوگوں کو اپنی تعلیم کا خرچ اپنے آپ برداشت کرنا چاہیے اگر ہم ہندوستان کی حالت موجودہ پر ذرا غور کریں تو اس بات کے کہنے پر مجبور ہوں گے کہ اگر لوگ اس قسم کا کوئی ارادہ کریں گے تو اس میں ایسی بے انتہا مشکلات ہیں جن کے سبب سے اس میں سراسر ناکامی کے ہونے کا اندیشہ ہے۔“

اس کے بعد اسی سوال کے متعلق انہوں نے کہا کہ ”اکثر لوگوں میں یہ خیال پھیل گیا ہے کہ گورنمنٹ اس ملک میں ہائی ایجوکیشن موقوف کرنا چاہتی ہے۔۔۔۔۔ پس اگر گورنمنٹ موجودہ کالجوں میں سے کسی کالج کو برداشت کرے گی تو گورنمنٹ کیسی ہی واجب اور معقول دلیل پر کیوں نہ ہو، لوگوں کو یہی خیال ہو گا کہ اس سے گورنمنٹ کا مقصد ہائی ایجوکیشن کے موقوف کرنے کا ہے۔“

پھر کہا کہ "گو میرے نزدیک مشنری اسکولوں اور کالجوں میں بائبل پڑھنا کسی طرح پر مذہب اسلام کے برخلاف نہیں ہے، مگر مسلمانوں کی عام فہمیتنگ با یقین میری اس بات کے خلاف ہے اور اگر کسی مشنری اسکول کی موجودگی کے سبب کوئی گورنمنٹ اسکول توڑ دیا جائے گا تو غالباً اس کی وجہ سے لوگوں میں ناراضی پیدا ہوگی۔ پس گورنمنٹ کو اس باب میں کسی کارروائی کے کرنے سے پہلے پبلک فہمیتنگ کی اصل حالت دریافت کرنا مناسب ہے۔"

پھر کہا کہ "جہاں مشنری کالج اور اسکول ہیں اگر وہاں رعایا کا کوئی فرقہ ان میں اپنی اولاد کو تسلیم دلوانا پس نہ کرتا ہو تو لوگوں کو لازم ہے کہ آپ اپنے لیے علیحدہ اسکول یا کالج قائم کریں اور گورنمنٹ بھی اس کو بغیر لحاظ اس بات کے کہ وہاں مشنری اسکول یا کالج پہلے سے قائم ہیں اور اس صورت میں اور مدرسوں کی ضرورت نہیں، کسی قدر مدد عطا فرمائے، اس کے علاوہ گورنمنٹ اس بات کی بھی خبر گیری کرے کہ حکام ضلع اس قسم کی لوکل کوششوں میں خلل انداز نہ ہوں اور اپنی حکومت اور رعب داب کو ان کے برخلاف عمل میں نہ لائیں۔ جیسا کہ بعض ضلعوں میں ہوا ہے۔"

پھر اس سوال پر گرانٹ ان ایڈ کا قاعدہ جو بالفعل مروج ہے وہ کافی ہے یا نہیں؟ اس طرح جواب دیا کہ "ایک ہائی اسکول کا اسٹاف جب تک کہ اس میں ایک یورپین ہیڈ ماسٹر اور اس کے ماتحت ماسٹریو پیوٹی کے گریجویٹ اور سکٹھ لیٹریج یعنی عربی، فارسی اور سنسکرت کے تین لائق پھر نہ ہوں کافی خیال نہیں کیا جاسکتا۔ اور ایسا اسکول بغیر نو سو روپیہ ماہوار خرچ کے قائم نہیں ہو سکتا اب ہم دیکھتے ہیں کہ قواعد مدوجہ کے موافق اس قسم کے مدرسوں میں کس قدر گرانٹ ان ایڈ دیا جاتا ہے ان قواعد میں یہ شرط ہے کہ لڑکوں کی

اوسط حاضری پر جو انگریزی پڑھتے ہوں فی طالب علم ڈیڑھ روپیہ ماہوار سے۔
 نیا وہ گرانٹ ان ایڈ کا اوسط نہ پھیلے۔ پس ایسے اسکول ہیں جس کا اوپر ذکر ہوا
 جب تک کہ اوسط حاضری انگریزی پڑھنے والوں کی کم سے کم تین سو نہ ہو گورنمنٹ
 سے اس قدر گرانٹ ان ایڈ کے ملنے کی بھی توقع نہیں ہو سکتی جو اُس کے
 نصف خرچ کے برابر ہو۔ یہ شرط عملاً اُس کے مساوی ہے کہ کبھی کوئی شخص
 گورنمنٹ سے مناسب گرانٹ کے ملنے کی توقع پر ایک عمدہ ہائی اسکول قائم
 کرنے کا قصد کرتے..... میرے نزدیک گرانٹ ان ایڈ طالب علموں کی تعداد
 کے لحاظ سے نہیں بلکہ جو تعلیم دیا جائے اُس کی عمدگی کے لحاظ سے بخوبی کرنا چاہیے
 محدود لڑکوں کو ایک عمدہ تعلیم دینا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ بہت سے لڑکوں
 کو ناقص تعلیم دیا جائے۔

پھر سوال متعلقہ اسکالرشپ پر اس طرح جواب دیا کہ "میں اسکالرشپوں کے
 قاعدہ کا طر فہار ہوں اور اس بارے کو ہرگز تسلیم نہیں کرتا کہ اسکالرشپ دے
 کر پڑھانا گویا تعلیم کیلئے رشتہ دینا ہے..... بالخصوص ہندوستان میں اور
 زیادہ تر مسلمانوں کے واسطے اسکالرشپوں کی نہایت ضرورت ہے۔ اسکالرشپوں
 سے اُن غریب طلبہ کو جو اپنی حالت کی وجہ سے اپنی تعلیم کسی خاص جماعت سے
 آگے جاری نہیں رکھ سکتے نہایت مدد پہنچتی ہے۔ اگلے زمانہ کے مشہور و معروف
 شخصوں میں جنہوں نے سائنس کو بڑی ترقی دی ہے، یا اپنی عمدہ تصنیفات
 سے لڑیکہ کو رونق دی ہے، مسلمانوں اور نیز اور قوموں میں اکثر وہ لوگ تھے
 جو غریب اور نہایت مفلس شخصوں کی اولاد میں سے تھے اب بھی اس قسم کے
 لوگوں سے بڑی بڑی امیدیں کی جاسکتی ہیں..... اگر میری معلومات میں غلطی نہ ہو
 تو میں خیال کرتا ہوں کہ اب بھی انگلستان میں اُن غریب آدمیوں کے لیے جو

”سینر“ کہلاتے ہیں کوئی طریقہ جاری ہے۔ مگر ان کے زیادہ خوش حال اسکول فیلو ان کو کسی قدر حقیر سمجھتے ہیں۔ محمڈن کالج علیگر طرح میں بھی مینجنگ کمیٹی نے اس قسم کے سینر طالب علموں کی امداد کا ایک طریقہ جاری کیا ہے۔ لیکن وہ اس کو ایسے معنی طور پر امداد کرتی ہے کہ اور طالب علموں کو اس قسم سینر کے موجود ہونے کی اطلاع نہیں ہوتی اور وہ اس حقارت سے بچ جاتے ہیں جو اور طرح پر کبجاتی ہے۔“

پھر ایک سوال کے جواب میں کہا کہ ”گورنمنٹ کی تعلیم اس اثر کے پیدا کرنے سے اس لیے قاصر تھی کہ مضامین تعلیم بشیما ہیں اور کسی ایک مضمون میں کافی ریاضت نہیں ہوتی..... اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی واقعی عمدہ مصنف یا خیالات کے ہادی پیدا نہیں ہوئے جن کا نام غالباً باقی رہتا۔ یا جن کا اثر قوم پر پڑتا مورل اور سوشل ترقی کے لیے یہ ایک بڑی مصیبت ہے۔ اس ملک کے عام لوگوں کی رائے کثرت مضامین تعلیم کے برخلاف ہے، اگر اس کا مقصد عمیق علم حاصل کرنے کا نہ ہو۔ ہمارے ہاں ایک فارسی مثل مشہور ہے کہ ”نیم حکیم خطرہ جان نیم ملاء خطرہ ایمان اور میں نے سنا ہے کہ پوپ کا بھی کوئی شعر اسی کے مطابق ہے۔“

پھر اس سوال پر کہ گورنمنٹ مسلمان لڑکیوں کی تعلیم میں کہاں تک کوشش کر سکتی ہے اور اس کی کامیابی کی کیا توقع ہے؛ مفصل جواب دینے کے بعد کہا کہ ”گورنمنٹ عملاً کوئی تدبیر ایسی اختیار نہیں کر سکتی جس سے اشرف خاندانوں کے مسلمان اپنی بیٹیوں کو تعلیم کے واسطے گورنمنٹ اسکولوں میں بھیجنے پر مائل ہوں اور نہ کوئی ایسا اسکول قائم کر سکتی ہے جو کہ ان لڑکیوں کے سرہوں کی طمانیت کے لائق ہو۔ ہمیں مسلمانوں پر یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ وہ اپنی لڑکیوں

کوان اسکولوں میں نہیں بھیجتے اور یقیناً کوئی اشراف پور وین بھی، گو وہ کیسا ہی تعلیم نسوان کا شوقین ہو، مسلمانوں پر ایسا ازام نہیں لگا سکتا، بشرطیکہ وہ اس ملک کے مدرسوں کی حالت سے واقف ... جس حیثیت اور وقت کے مدارس نسوان ہندوستان میں ہیں اگر ایسے مدرسے انگلستان میں فرض کیے جائیں تو کیا اشراف خاندانوں کے انگریز اپنی لڑکیوں کو ان مدرسوں میں تعلیم کے لیے بھیجا پسند کریں گے؟ ہرگز نہیں... عورتوں کی تعلیم کا معاملہ اُس فلاسفر کے سوال سے نہایت مشابہ ہے جس نے پوچھا تھا کہ پہلے سرخی پیدا ہوئی یا انڈیا جنی شخصوں کی یہ رائے ہے کہ مردوں کی تعلیم سے پہلے عورتوں کی تعلیم ہونی چاہیے وہ غلطی پر ہیں، حقیقت یہ ہے کہ مسلمان عورتوں کی پوری تعلیم اُس وقت تک نہ ہوگی جب تک کہ اس قوم کے اکثر مرد پورے تعلیم یافتہ نہ ہو جائیں گے۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کی سوشل حالت پر غور کیا جائے اس وقت تک جو حالت مسلمان عورتوں کی ہے وہ میری رائے میں عالمگی نحوشی کے واسطے کافی ہے، جو کچھ بالفعل گورنمنٹ کو کرنا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان لڑکوں کی تعلیم و تربیت کے بندوبست کے جانب کافی توجیہ کرے، جب کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل سنجولی تعلیم و تربیت یافتہ ہو جائے گی تو مسلمان عورتوں کی تعلیم پر اُس کا ضرور بالضرور ایک زبردست گورنمنٹ اثر پھینچے گا، تعلیم یافتہ باپ یا بھائی یا شوہر بالطبع اپنی رشتہ مند عورتوں کی تعلیم کے خواہشمند ہوں گے... اگر گورنمنٹ مسلمان شریف خاندانوں میں تعلیم نسوان کے جاری کرنے کی کوشش کرے گی تو حالت موجودہ میں محض ناکامی حاصل ہوگی اور میری رائے ناقص میں اُس سے مضر نتیجے پیدا ہوں گے اور روپیہ اور محنت ضائع ہلے گی۔

مسٹر پیرسن نے سوال کیا کہ "آیا ہندوستان کے مزدوری پیشہ لوگ اس

بات کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ جو تعلیم سرکاری مدرسوں میں دی جاتی ہے وہ ان کے بچوں کے لیے مناسب ہے یا نہیں؛ سرسید نے اس کے جواب میں کہا کہ "ان کو اس قسم کے سوال پر غور کرنے کی فرصت نہیں۔"

پھر انھوں نے یہ سوال کیا کہ "تعلیم کی ترغیب کے لیے ایجوکیشنل درباروں کی نسبت آپ کی کیا رائے ہے؛ سرسید نے کہا کہ "یہ دربارہ بجز نمائش کے اور کچھ نہیں۔"

مسٹر وارڈ نے سوال کیا کہ "کیا آپ کوئی ایسا یورپین اسٹیشن ہندوستان میں بتا سکتے ہیں جہاں اہل یورپ کسی مٹن اسکول یا اور پرائیویٹ اسکول کے مدارف کے واسطے جو ہندوستانیوں کے لیے ہو، کنٹری بیوشن یعنی چندہ نہ دیتے ہوں؛ سرسید نے اس کا یہ جواب دیا کہ "یہ سوال پیچیدہ ہے..... اس سے ضمنیاً تسلیم کر لینا نکلتا ہے کہ ہندوستان کے ہر ایک یورپین اسٹیشن میں انگریز ہندوستان کی تعلیم کے لیے کنٹری بیوشن دیتے ہیں۔ میں اس ضمنی تسلیم کو جو سوال سے نکلتی ہے تسلیم نہیں کرتا۔ باقی سوال دو جہاں کا گاناہ امور سے متعلق ہے۔ اول مشنری اسکولوں سے سوائس کی نسبت میرا یہ جواب ہے کہ میں کسی ایسے یورپین سے واقف نہیں ہوں جہاں کوئی مشنری اسکول کنٹری بیوشن کے ذریعہ سے مقرر ہوا ہو اور انگریز اس کی مدد نہ کرتے ہوں۔ دوسرے یہ سوال پرائیویٹ اسکولوں سے متعلق ہے۔ اس حصہ سوال کی نسبت میرا یہ جواب ہے کہ میں کسی ایسے اسٹیشن سے واقف نہیں ہوں جہاں کوئی ہندوستانی اسکول قائم ہوا ہو اور اس کی امداد انگریز بذریعہ کنٹری بیوشن کے کرتے ہوں، سوائس نے محمدن کالج علیگر ٹھہ کے جس میں فی الحال صرف ایک کنٹری بیوشن یورپین کی طرف سے مقرر ہے....." اس کے بعد لارڈ نارٹھ ہیرڈک، لارڈ لٹن اور دیگر جلیل القدر حکام اور لارڈ کان سلطنت

کے عطیات کی شکرگذاری کے بعد کہا کہ ”مگر اسٹیشن کے یور وٹین عہدہ داروں میں سے کسی نے ہمارے کالج کو کوئی مابھاری یا سالانہ کنٹری بیوشن اور سوائے ایک کے کسی نے اس کو کیمپس چنندہ بھی نہیں دیا۔“

مسٹر وارڈ نے سوال کیا کہ ”محمدن کالج کے پریسکپٹس میں کیانی الواقع اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ صرف مسلمانوں پر چنندہ کا محدود رکھنا مناسب ہے؛ اس کا جواب سرسید نے اس طرح پر دیا کہ ”کیشی نے تجویز کی تھی کہ انگریزی قوم سے جو ہمارے حاکم ہیں اس کام میں شریک ہونے کی درخواست کی جائے کیونکہ کیشی کے نزدیک ایسے کالج کو قائم کرنا جو انگریزوں کی ہمدردی سے جدا ہو پورے شکل مصلحت کے برخلاف تھا۔ پس اس نے یہ تجویز کی تھی کہ مسلمان۔ انگریزوں سے بھی امداد کی درخواست کریں۔“

پھر مسٹر وارڈ نے پوچھا کہ ”کیانی الواقع سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ کے قائم کرنے میں انگریزوں نے روپیے اور ہمدردی کے لحاظ سے آپ کی بڑی مدد کی تھی؟ اس کا جواب سرسید نے یہ دیا کہ ”سوائے مسٹر براملی کے جنہوں نے مجھ کو ایک ہزار روپیے دیے تھے اور کسی سے مجھے کچھ مدد نہیں ملی مگر انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں نے اس سے پہلے تعلیم کی جانب توجہ نہیں کی تھی۔“

محمدن سول سروس فنڈ ایسوشیشن

۱۸۸۳ء میں سرسید نے ”محمدن سول سروس فنڈ ایسوشیشن“ قائم کی۔ اول اُن کو ۱۸۶۸ء میں جب کہ سائنٹفک سوسائٹی کو قائم ہونے چند سال گزرے تھے یہ خیالی ہوا تھا کہ عام ہندوستانیوں کو خواہ ہندو ہوں اور خواہ مسلمان، تعلیم کی

غرض سے یورپ کے سفر پر آمادہ کرنے کے لیے ایک ایجوکیشن قائم کی جائے اور اس کے ممبر ۶۰ روپیہ ماہوار چنندہ دیا کریں جو بطور ایک فنڈ کے یورپ کے سفر کے لیے جمع ہوتا ہے۔ مگر اس تدبیر میں کچھ کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ ہندو اس وقت یورپ کے سفر کو مذہب اور ذات کے قواعد کے برخلاف جانتے تھے اور مسلمان بھی اس قسم کے توہمات رکھتے تھے اس کے سوا یورپ کا سفر اس زمانہ میں مشکل بھی معلوم ہوتا تھا۔ مگر ۱۸۸۳ء میں یورپ کی آمدورفت کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا اور ہندوستانیوں کے لڑکے تعلیم کے لیے ولایت جانے لگے تھے۔ لیکن خاص کر مسلمانوں کے لیے حالت موجودہ میں سول سروس کا امتحان ولایت جا کر پاس کرنا جیسا کہ سر سید نے علی گڑھ گزٹ مورخہ ۱۱- اگست ۱۸۶۳ء میں مفصل بیان کیا ہے ناگھن معلوم ہوتا تھا۔ انھوں نے خیال کیا کہ کسی قوم کی جب تک کہ وہ گورنمنٹ میں کچھ حصہ نہ رکھتی ہو، عزت نہیں ہو سکتی۔ دو تہہ مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ ان کو اپنی اولاد کی تعلیم کا مطلق خیال نہیں اس وقت سول سروس کے قاعدہ کے موافق ۱۹ برس کی عمر میں ولایت جا کر سوال سروس کا امتحان پاس کرنا پڑتا تھا، حالانکہ اس کے لڑکے ۱۹ برس کی عمر تک بچے سمجھے جاتے تھے اور سمجھے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بقول سر سید کے اس وقت تک تعویذوں کی ہیکل بھی ان کے گلے سے نہیں اترتی ہاں متوسط درجہ کے لوگوں کو بلا شک اولاد کی تعلیم کا خیال تھا اور خیال ہے مگر ولایت کے سفر کا پورا خرچہ وہ برداشت نہیں کر سکتے۔ اسی لیے سر سید نے ایجوکیشن خاص مسلمانوں کے لیے اس غرض سے قائم کی کہ اگر کم سے کم پانچ سو تہہ مسلمان ممبر دو دو روپیہ ماہوار دینے والے پیدا ہو جائیں تو اس سے ہزار روپیہ سالانہ کی آمدنی ہو جائے گی جو بطور فنڈ کے جمع ہوتی رہے گی تاکہ جن

مسلمانوں کے لڑکے ولایت کا تمام خرچ اپنے پاس سے ادا نہیں کر سکتے ان کی اس
تنت سے امداد کی جائے اور مدرسہ العلوم میں ایک خاص کلاس قائم کی جس کی تعلیم کا
طریقہ ایسا مقرر کیا گیا تھا جس سے اُس کلاس کے طالب علموں کو ولایت پہنچ
کر سول سروس کے امتحان میں مدد ملے۔

اگرچہ اس کلاس کا نام سول سروس کلاس رکھا گیا مگر درحقیقت اُس کے
طالب علموں کو اس مقصد کے لیے تیار کیا جاتا تھا کہ وہ انگلستان پہنچ کر مندرجہ
ذیل کورسوں میں سے کوئی کورس اختیار کر لیں:

۱۔ سول سروس کا امتحان مقابلہ۔

۲۔ کسی مضمون میں ولایت کی کسی یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کرنی۔

۳۔ کسی پیشہ میں شل بیرسٹری، ڈاکٹری یا انجینیری کے ڈپلومہ حاصل کرنا۔

پھر اس ایوسی ایشن کے کام کو زیادہ وسعت دینے کے لیے انھوں نے
شمالی ہندوستان کے ہر ایک ضلع میں سب کمیٹیاں قائم کرنے کا ارادہ کیا تاکہ
ممبروں کی تعداد زیادہ ہو اور سب کمیٹیوں کے لیے قواعد مقرر کر کے شائع کیے۔
مگر اس تمام کوشش کا نتیجہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا کہ ایوسی ایشن میں ۲۹۹ ممبر
شامل ہوئے جو کچھ عرصہ تک دو روپیہ ماہوار دیتے رہے اور کچھ لوگوں نے بطور
ڈونیشن کے بھی کسی قدر روپیہ دیا آخر سب کے ارادے سست ہو گئے اور جیسا
کہ ماہواری یا سالانہ چندوں کا ہمیشہ انجام ہوتا ہے، رفتہ رفتہ چندہ دینا بند ہو گیا
ایوسی ایشن مذکورہ کی آمدنی سے چار ہزار ایک روپیہ جمع ہوا تھا جس کو میمبروں
کی منظوری سے سرسید نے الہ آباد بینک میں جمع کرا دیا تھا، تاکہ عین کام کے لیے
وہ جمع کیا گیا تھا جب اُس کا موقع آنے وہاں خرچ کیا جائے اور اُس وقت تک
اس کے شافع سے محمدن کالج علیگر ٹھہ کے طلبہ کو امداد دی جائے۔

محمدن ایسوسی ایشن علیگر ٹرھ

اسی سٹڈنٹ میں سرسید نے بہ شکرکت ریڈیان ضلع علیگر ٹرھ محمدن ایسوسی ایشن قائم کی جس کے مقاصد نہایت عمدہ تھے اور اس کا چلنا بھی ایسا و شوار نہ تھا جیسا کہ سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن کا چلنا اور قائم رہنا و شوار تھا کیونکہ اس کے مقاصد رؤسائے ضلع کے مذاق کے موافق تھے، مگر چونکہ سرسید مدرسہ کے کاموں کی مصروفیت کی وجہ سے اس کے پیروکار نہ تھے اس لیے وہ چند روز کے بعد بالکل مدھم پڑ گئی اور اب اس کا نام ہی نام باقی رہ گیا ہے۔

محمدن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کرنا

۱۸۸۶ء میں سرسید نے محمدن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی محمدن کالج کی حالت جب کسی قدر اطمینان کے قابل ہو گئی تو سرسید کو یہ خیال ہوا کہ اگر بالفرض یہ کالج ہر طرح مکمل ہو گیا تو بھی اس سے قومی تعلیم کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا اور ایک کالج چھ کر ڈر مسلمانوں کی تعلیم کی کفالت نہیں کر سکتا۔ اس کے سوا مسلمانوں کی قوم جو ہندوستان کے دور دراز حصوں میں پھیلی ہوئی ہے وہ سب ایک دوسرے کی حالت سے محض بے خبر ہیں اور کوئی ذریعہ ایسا نہیں کہ مختلف صوبوں اور مختلف اضلاع کے لوگ کسی موقع پر آپس میں ایک جگہ جمع ہوں اپنے اپنے خیالات قومی تعلیم اور قومی ترقی کی نسبت ایک دوسرے پر ظاہر کریں۔ ہر حصہ ملک کے مسلمانوں کی ترقی یا تنزل کا حال تمام قوم کو معلوم ہو اور مسلمان جو باوجود ایک قوم ہونے کے بمنزلہ مختلف قوموں کے ہو رہے ہیں ان میں قومی یگانگت اور ہمدردی پیدا ہو۔ اسی بنا پر چپا کہ سرسید

نے پہلے اجلاس میں بیان کیا تھا یہ کانفرنس قائم کی گئی اور اس کا پہلا جلسہ ۲۶ دسمبر ۱۸۸۶ء کو بمقام علیگر دھ محمدن ایجوکوا اورٹھیل کالج میں منعقد ہوا۔

اس کانفرنس کے مقاصد اولاً حسب ذیل قرار دیئے گئے تھے:

- ۱- مسلمانوں میں مغربی تعلیم کو اعلیٰ درجہ تک پہنچانے میں کوشش کرنا۔
- ۲- مسلمانوں کی تعلیم کے لیے جو انگریزی مدرسے مسلمانوں کی طرف سے جاری ہوں ان میں مذہبی تعلیم کے حالات دریافت کرنا اور تا بمقدور عمدگی سے اس تعلیم کے انجام پانے میں کوشش کرنا۔
- ۳- علوم مشرقی اور دینیات کی تعلیم جو علما نے اسلام جا بجا بطور خود دیتے ہیں اس کو تقویت دینا اور اس کو بدستور قائم اور جاری رکھنے کی مناسب تدبیریں عمل میں لانا۔

۴- جو تعلیم قدیم طرز پر دینی مکتبوں میں جاری ہے اس کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان میں جو تنزل ہو گیا ہے اس کی ترقی اور توسیع کی تدبیریں اختیار کرنا۔ قرآن خوانی اور حفظ قرآن کے لیے جو مکتب جاری ہیں اور جن کو روز بروز تنزل ہوتا جاتا ہے ان کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان کے قائم رکھنے اور استحکام دینے کی تدبیریں عمل میں لانا۔

مذکورہ بالا مقاصد کے سرانجام کرنے کے لیے دو طریقے تجویز کیے گئے تھے، ایک یہ کہ ہر سال کسی مناسب مقام پر جہاں کے ممتاز آدمی کانفرنس کے اجلاس کی خواہش کریں اور کانفرنس کا انتظام اپنے ذمہ لیں، کانفرنس کا اجلاس ہوا کرے اور اجلاس کی تاریخوں میں کانفرنس کے ممبر جو پنجویں مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے متعلق مناسب سمجھیں وہ اجلاس میں پیش کریں اور بعد غور اور مباحثہ کے اتفاق یا اکثریت رائے سے ان کی منظوری یا نامنظوری عمل میں آئے، دوسرے جہاں تک ممکن ہو ہر شہر و

قصبہ میں کانفرنس کے مقاصد کے لیے کمیٹیاں قائم کی جائیں اور جہاں جہاں اسلامی انجمنیں قائم ہیں اگر وہ منظور کریں تو انھیں کو کانفرنس کی کمیٹیاں تصور کیا جائے تاکہ یہ کمیٹیاں اپنے اپنے نواح یا ضلع یا شہر یا قصبہ کی نسبت وقتاً فوقتاً ہر قسم کے مدارس اور مکاتب و صنعت و حرفت و تجارت و زراعت وغیرہ کی ترقی و ترقی کے حالات جو مسلمانوں سے علائقہ سے کہتے ہیں تحریر کر کے کانفرنس کے جلسوں میں بھیجے رہیں اور جو تجویزیں کانفرنس کے سالانہ جلسوں میں منظور ہوں ان میں سے جو تجویزیں ان کے علاقہ میں قابل اجرا ہوں اس کے جاری کرنے میں کوشش کریں۔

۱۸۹۶ء سے ۱۸۹۷ء تک اس کے سالانہ جلسے برابر مختلف شہروں میں ہوتے رہے مگر سال گذشتہ میں کچھ تو سرکاری روک ٹوک کے سبب جو طاعون کے انداد کے لیے ریل کے مسافروں کے ساتھ جا بجا کی جاتی تھی۔ اور زیادہ تر سرسید کی افسردہ دلی اور انقباض کی وجہ سے جس کی نوبت آخر کو مرض الموت تک پہنچ گئی اس کا اجلاس موقوف کیا گیا۔ منجملہ گیارہ کے اول کے پانچ اجلاسوں میں پنجاب اور شمال مغربی اضلاع کے مختلف مقامات کی چھوٹی بڑی ۳۵ رپوشیں اسلامی انجمنوں اور خاص خاص شخصوں نے لکھ کر کانفرنس میں بھیجیں یا خود آکر پیش کیں اس کے بعد ظاہر اچھر کوئی رپورٹ نہیں آئی اور تقریباً استی رزولوشن اتفاق یا کثرت رائے سے پاس ہوئے۔

ہر سال اجلاس کی تمام کارروائی ایک کتاب کی صورت میں چھپر ممبروں کو تقسیم ہوتی رہی جس میں کیفیت انتظام کانفرنس، فہرست ممبران و وزٹیران، تعداد و چندہ رپورٹ سکریٹری متضمن حساب جمع و خرچ زرچہ پندرہ و کیفیت تعمیل و عدم تعمیل تجویزات سال گذشتہ، رزولوشن جو اجلاس میں پیش ہو کر پاس ہوئے اور ان کے متعلق ممبروں کی اسپیکر اور مباحثے، رپورٹیں جو مختلف اضلاع سے موصول

ہوئیں، لکچر اور نظمیں جو کانفرنس میں پڑھی گئیں وغیرہ وغیرہ درج ہوتی تھیں۔ اس اجتماع کا نتیجہ براہ راست یہ ہونا چاہیے تھا کہ جو تجویزیں کانفرنس کے اجلاس میں ہر سال منظور ہو کر شائع ہوئیں ان کے موافق ہر ضلع کی اسلامی انجمنیں اپنی اپنی بستیتوں اور شہروں میں عمل درآمد کرتیں جو تعلیمیں کانفرنس کے سیکرٹری سے تعلق رکھتی تھیں ان کو سیکرٹری انجام دیتا اور عام مسلمان جہاں تک ان کے قبضہ اختیار میں تھا، کانفرنس کی تجویروں کی تائید اور کانفرنس کی صلاح کے موافق اپنی اولاد کی ترقی تعلیم کا انتظام کرتے، کیونکہ کانفرنس اس کے سوا اور کچھ اختیار نہیں رکھتی کہ مسلمانوں کو ان کی واقعی حالت سے اور جو تدبیر ان کی بھلائی کے لیے مناسب سمجھے اس سے آگاہ کر دے۔

لیکن سوا اس کے کہ سرسید نے جو ابتدا سے اخیر دم تک سیکرٹری رہے اپنے فرائض کا پورا پورا حق ادا کیا اور انھیں کی توجہ اور کوشش سے کانفرنس کے اجلاس بلا رہے گیارہ برس تک ترقی روزانہوں کے ساتھ ہوتے رہے، اس کی تجویزوں پر بہت ہی کم عمل درآمد ہوا۔ سرسید ہر سال جہاں کانفرنس ہوتی تھی وہاں اجلاس کی تاریخوں سے کئی کئی دن پہلے خود پہنچتے تھے، وہاں کی لوکل کمیٹی کو ہر قسم کے انتظام میں مدد دیتے تھے۔ انھیں کی صلاح اور مشورے سے اجلاس کے لیے اکثر ہاں کی تیاری اور میزوں کی آرائش کا بندوبست ہوتا تھا، وہ خود کانفرنس کی کارروائی کے قواعد اور پروگرام بتاتے تھے، ٹکٹ چھپواتے تھے، رزلوشن انتخاب کرتے تھے، سال گذشتہ کا حساب اور تعیلات کی رپورٹ کانفرنس میں پیش کرنے کے لیے تیار کرتے تھے، کانفرنس کے اجلاس کے بعد تمام کارروائی کو ایک کتاب کی صورت میں مرتب کرتے تھے، اس کو چھپوا کر تمام ممبروں کے پاس بھیجتے تھے منجنگ کمیٹی جو ہر سال کانفرنس کا مقام تجویز کرنے کے لیے

مقرر ہوتی تھی، اس سے خط و کتابت کرتے تھے۔ سال بھر میں کانفرنس کے متعلق وقتاً فوقتاً اخبار میں آرٹیکل چھاپتے تھے اور جب کانفرنس کا اجلاس علیگڑھ میں ہوتا اور زیادہ تر علیگڑھ ہی میں ہوتا تھا، تو لوکل کمیٹی کے تمام فرائض خود انجام دیتے تھے۔ انھوں نے صرف اس غرض سے کہ ہر ایک ضلع کی رپورٹ باقاعدہ مرتب ہو کر آیا کرے، دوسرے سال کے اجلاس میں ضلع علیگڑھ کی مفصل رپورٹ بطور نمونہ کے لکھنؤ میں خود لکھ کر پیش کی تھی۔ جن رزولوشنوں کی تعمیل بحیثیت سیکرٹری ہونے کے ان کی ذات سے متعلق ہوتی رہی انھوں نے برابر اس کی تعمیل کی، کبھی کسی لوکل گورنمنٹ سے کبھی سررشتہ تعلیم سے اور کبھی یونیورسٹی کے رجسٹرار سے ان کو خط و کتابت کرنی پڑتی تھی اور تمام خط و کتابت کا خلاصہ اور اس کا نتیجہ کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں پیش کرنا ہوتا تھا۔ باوجود ان تمام باتوں کے وہ خود بھی اور ممبروں کی طرح اکثر رزولوشن پیش کرتے اور ان پر لمبی لمبی اسپچیں دیتے تھے۔ اس کے سوا اور بھی بہت سے کام کانفرنس کے متعلق ان کو انجام دینے پڑتے تھے جیسا کہ کانفرنس کے گذشتہ جلسوں کی رپورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ البتہ جہاں جہاں کانفرنس کے اجلاس ہوئے وہاں کی لوکل کمیٹیوں نے بھی چندہ کی فراہمی اور ممبروں کی ملاقات اور ان کی آسائش و خورد و نوش کا انتظام نہایت فیاضی اور کوشش و جانفشانی سے کیا مگر جہاں کانفرنس کا جلسہ ختم ہوا پھر سال بھر تک کسی کو اس کا خیال تک نہیں آتا تھا۔

کانفرنس میں بہت سے رزولوشن ایسے پاس ہوئے ہیں کہ اگر ان کے موافق عمل درآمد ہوتا تو قوم کو بہت فائدہ پہنچنے کی امید تھی، مثلاً قرآن مجید کی تعلیم کو ترقی دینا، مسلمانوں کے اوقات کی طرف گورنمنٹ کو توجہ دلانا، تمام شہروں

اور قصبوں میں مقاصد کانفرنس کی تائید کے لیے کمیٹیاں قائم کرنا اور اسلامی
 انجمنوں سے اُس کی تائید کی خواہش کرنا۔ تمام اسلامی
 انجمنوں کا اس باب میں کوشش کرنا کہ مسلمان طلبہ کی وظیفوں سے امداد کی جائے
 سرکاری مدرسوں میں مسلمانوں کو مذہبی تعلیم کا موقع دینے کی گورنمنٹ سے درخواست
 کرنا، تعلیم نسواں کے لیے مذہب اسلام اور طریقہ شرفائے اہل اسلام کے موافق
 مدرسے جاری کرنے، یورپ کے پورٹوں نے جو غلط الزام مسلمانوں پر لگائے
 ہیں ان کی غلطیاں دور کرنے کے لیے رسائل لکھے جانے، مسلمان بادشاہوں کے
 قدیم قریب جمع کر کے ان کو محفوظ رکھنے کے لیے پھیرانا صاف اور سلیس اردو میں
 خلاقی رسائل اور کتابیں لکھنا جو لوگوں کی تعلیم میں کام آسکیں، مسلمانوں کی قدیم
 دستند کتابوں کا جو کہ اب نامہ الوجود ہیں، پتہ لگانا اور تانبہ قدوران کو بہم پہنچانا
 اس بات کی تحقیقات کرنا کہ جو علوم مسلمانوں نے یونان وغیرہ ملکوں سے
 حاصل کیے تھے ان پر کس قدر اضافہ انھوں نے خود کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ مگر ان میں
 بے کر ان میں سے کسی تجویز پر اللہ شاہانہ کوئی معتد بہ توجیہ قوم یا قومی انجمنوں کی طرف سے نہیں ہوتی
 یا اینہمہ کانفرنس سے جو نتائج بالذات یا بالفرض پیدا ہوئے وہ بھی اُسید
 اور توقع سے زیادہ تھے، سب سے بڑا فائدہ جو اس مجلس کے انعقاد سے ہوا وہ
 یہ تھا کہ ہر سال مسلمانوں کی ایک جماعت کثیر جس کی تعداد بعض اجلاسوں میں
 ہزار ہزار سے متجاوز ہو گئی، نہ کسی سیر اور تماشے کی غرض سے، نہ کسی حاکم کے
 حکم سے اور نہ کسی ذاتی منفعت کے لیے بلکہ محض اس خیال سے کہ جو مجمع قوم کی
 بھلائی کے ارادے سے ہوتا ہے اُس میں شریک ہوں، دور دراز سفر کی تکلیف اور
 آمد و رفت کا خرچ برداشت کر کے کانفرنس کے جلسوں میں شریک ہوتے
 تھے، ایک دوسرے سے ملتے تھے، ایک جگہ کھانا کھاتے تھے، ایک جگہ

رہتے تھے۔ قومی معاملات پر گفتگو کرتے تھے، ہنستے تھے، ہولتے تھے، انجانوں میں تعارف پیدا ہوتا تھا، دستوں میں خلوص بڑھتا تھا، اور اس طرح ایک مردہ اور پراگندہ قوم کے اجزا میں روند بروز التیام پیدا ہوتا جاتا تھا۔ اس کے سوا جب سے کانفرنس قائم ہوئی مسلمانوں میں علی العموم تعلیم کا خیال زیادہ ہو گیا۔ خصوصاً جس شہر میں کانفرنس کا اجلاس ہوتا تھا وہاں کے باشندوں پر بالخصوص اس کا اور بھی زیادہ اثر پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ صرف کانفرنس کی بدولت گذشتہ برسوں میں غریب مسلمان طلبہ کی امداد بہت زیادہ ہوتی رہی۔ کئی سال تک خود کانفرنس کے چندہ میں سے بعد سنبھائی اخراجات کے جس قدر روپیہ بچا وہ وظائف میں صرف ہوتا رہا۔ نیز پنجاب کی اکثر اساتذہ انجمنوں نے کانفرنس کی صلاح سے بہت سے طالب علموں کی امداد کی۔ کانفرنس ہی کی تحریک یا آئینہ سے بہت سے عمدہ اور نہایت عمدہ رسالے، مضمین، اور لکچر ایسے تیار ہو گئے جن سے اردو لٹریچر میں ایک معقول اضافہ ہوا ہے جیسے مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم الجزیرہ، مضمون کتب خانہ اسکندریہ، حقوق الذمیین، مسلمانوں کی ترقی و تنزل کے اسباب، البوریحان بیرونی کی لائف، کتاب کلید و منہ کے تاریخی حالات اشاعت اسلام بلا استعانت حمام، شمس العلماء مولانا نذیر احمد اور نواب محسن الملک اور آئینہ سید محمود کے لکچر اور اسپچیں وغیرہ وغیرہ۔ ایک اور ضمنی فائدہ کانفرنس سے یہ ہوا کہ پبلک سپیکنگ کی بیاد میں کانفرنس کے مباحثوں سے بہت ترقی ہو گئی۔ جن لوگوں کی طبیعت میں اس کی خدا داد قابلیت موجود تھی، مگر اس کے ظاہر ہونے کا کوئی موقع نہ تھا ان کو کانفرنس میں گفتگو کرنے کا موقع ملتا تھا اور ان کا ایک مغضی جو ظہر ہوتا تھا اور چونکہ ممبروں کی تمام اسپچیں کانفرنس کی رونماویں ہر سال چھپتی تھیں اس سے اردو لٹریچر میں

ایک مفید اور بکار آمد اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ اسی کانفرنس کی تحریک سے الہ آباد یونیورسٹی نے ”کاکس ہسٹری“ کو جس میں مسلمانوں کی توہین کے مضامین مندرج تھے، ہائی اسکولوں کے کورس سے خارج کیا اور جب کہ یونیورسٹی میں نہایت زور شور سے اس بات کی تحریک ہوئی کہ فارسی زبان یونیورسٹی کی تعلیم سے خارج کی جائے تو اسی کانفرنس کے ذریعہ سے یونیورسٹی کو مسلمانوں کی ایک باوقفت جماعت کے خیالات سے مطلع ہونے کا موقع ملا اور اس کو معلوم ہو گیا کہ

فارسی زبان یونیورسٹی کے کورس سے خارج کی جائے گی تو اس سے مسلمانوں کی دل شکنی ہی نہ ہوگی بلکہ ہندوستان کی تہذیب، اس کے علم مجلس اور اس کی ملکی زبان یعنی اردو کو سخت صدمہ پہنچے گا نیز کانفرنس ہی کی تجویز کے موافق نواب وقار الملک کو گورنمنٹ میں اس بات کی تحریک کرنے کی اجازت ہوئی کہ سرکاری مدارس میں مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ گورنمنٹ اصلاح شمالی مغرب نے بعض شرائط پر اسکی اجازت دیدی جس کا ٹکڑیہ گیارہویں اجلاس میں ادا کیا گیا۔

سب سے عمدہ اور نتیجہ خیز تجویز جو کانفرنس کے اجلاس واقع ۱۸۹۲ء میں بمقام دہلی مسٹر تھیوڈور بک پرنسپل علی گڑھ محمدن کالج نے پیش کی تھی وہ تعلیمی مردم شماری کی تجویز تھی، یعنی یہ کہ ہندوستان میں جو مسلمان اپنی اولاد کو انگریزی تعلیم نہیں دلوانے ان کا اندازہ کیا جائے کہ وہ کسی قدر میں؟ اور کیوں وہ اپنی اولاد کو تسلیم نہیں دلواتے؟ آیا مذہبی خیالات سے، یا اس وجہ سے کہ تعلیم کے اخراجات

کا مقدور نہیں رکھتے، یا محض اپنی بے پروائی اور سہل انگاری کے سبب؟ اور جن کی نسبت نمبر ہی وجہ معلوم ہو ان کو اولاد کی تسلیم پر متوجہ کیا جائے، ان سے اس عرض کے لیے خط و کتابت کی جائے اور ان کے سمجھانے کے لیے لائق آدمی بھیجے جائیں۔ چنانچہ اس تجویز میں مسٹر بک کی توجہ سے بہت

کامیابی ہوئی ہے اور اگر اسی طرح کوششیں برابر جاری رہے تو اُس سے عمدہ نتیجے پیدا ہونے کی امید ہے۔

اسی طرح کے اور بھی بہت سے فائدے ہیں جو کانفرنس کے نتائج میں شمار ہو سکتے ہیں مگر ایسے مجموعوں کے مفید یا غیر مفید ہونے کا اندازہ ان باتوں سے نہیں ہوتا بلکہ صرف اس بات سے ہوتا ہے کہ قوم اُس کو برابر ترقی رہنا فنروں کے ساتھ قائم رکھ سکتی ہے یا نہیں! اگر قوم میں اُس کے تھامتے اور ترقی دینے کا حوصلہ پایا جاتا ہے تو اُس کی نسبت نہایت وثوق کے ساتھ پیشین گوئی کی جاسکتی ہے کہ وہ مسلمانوں کی قوم میں جان ڈالنے والی اور اُن کو قومیت کے درجہ تک پہنچانے والی ہوگی۔ لیکن اگر اُس کا مدار کسی خاص شخص کی ذات پر ہو تو اس کا عدم اور وجود برابر ہے۔ کیونکہ اس قسم کے سالانہ جلسوں کے نتائج اُن ملکوں میں بھی جو صدیوں سے اُن کے عادی چلے آتے ہیں اور اُن سے بے شمار فائدے اٹھا چکے ہیں، مدت دراز کے بعد ظہور میں آتے ہیں پس ہندوستان جیسے ملک میں جہاں محض یورپ کی تقلید سے ایسی مجلسیں انعقاد پاتی ہیں جہاں نہ قومی بندش ہے نہ عملی طائفت اور جہاں قومی مجلسیں پوبک پر کسی قسم کا رعب و داب نہیں رکھتیں یہ امید رکھنی فضول ہے کہ کوئی کانفرنس یا کانگریس قوم کو چند سال میں کوئی معتد بہ فائدہ پہنچا سکے جو لوگ کانفرنس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اُس نے آج تک کوئی کار نمایاں نہیں کیا وہ گویا اس کو کھہار کا آدا سمجھتے ہیں جس میں بڑن بہت جلد پک کر تیار ہو جاتے ہیں لیکن حقیقت وہ کھہار کا آدا نہیں بلکہ چینی کا خمیر ہے جس کے تیار ہونے کا سالہانہ وراثہ تک انتظار کرنا چاہیے۔

اگرچہ سال گذشتہ میں جو سرسید کی افسردہ ولی کے سبب کانفرنس

کا اجلاس منعقد ہو سکا اس سے بہت بڑی مایوسی ہو گئی تھی اور لوگوں کو یقین ہو گیا تھا کہ سر سید کے بعد کانفرنس کا قائم رہنا مشکل ہے لیکن سر سید کی وفات کے بعد جو غیر معمولی جوش مسلمانوں میں اٹھا ہے اس سے کانفرنس میں پھر جان پرتی نظر آتی ہے۔ نواب محسن الملک نے سر سید کی زندگی ہی میں کئی سال سے کانفرنس کی ترقی پر کوشش کرنی شروع کر دی تھی خصوصاً ۱۸۹۶ء میں جیسا کہ گیارہویں اجلاس کی رپورٹ میں مفصل مذکور ہے جو کوشش اور جانفشانی انہوں نے کانفرنس کی اصلاح اور ترقی میں کی وہ گذشتہ دس سال میں کبھی کسی سے من نہیں آئی تھی اور اب بھی جس سرگرمی کے ساتھ کہ وہ محمدن کالج کی ترقی پر متوجہ ہونے ہیں اسی طرح انہوں نے کانفرنس کی طرف توجہ کی ہے چنانچہ اس سال زندہ دلان پنجاب نے کانفرنس کو لاہور میں مدعو کیا ہے جس سے اس بات کی امید بندھی ہے کہ مسلمان اس قومی میلے کو ہمیشہ برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

پیپک سروس کمیشن کی ممبری

۱۸۸۶ء میں سر سید کو لارڈ ڈفرن نے مول سروس کمیشن کی ممبری کے لیے انتخاب کیا۔ اس کمیشن میں سر سید کے سوا کوئی ہندوستانی ممبر ایسا نہ تھا جو انگریزی کی اعلیٰ درجہ کی لیاقت نہ رکھتا ہو۔ صرف سر سید ہی ایک ایسے ممبر تھے جو انگریزی میں سواس کے کہ اپنا نام لکھ سکتے تھے یا بقدر ضرورت انگریزی سمجھ سکتے تھے، اور ٹوٹی پھوٹی میں معمولی بات چیت کر سکتے تھے، اور کچھ نہ جانتے تھے۔ باوجود اس کے جیسا کہ سنا گیا ہے۔ ممبری کمیشن کے ذرائع انہوں نے نہایت عمدگی سے ادا کیے جس طرح وائس رائل کونسل کی ممبری میں انہوں نے ہر ایک قانون پر جو ان کی موجودگی میں پیش ہوا بڑی بڑی لیگل آپین کیوں اور قانونی لیاقت کا بہت بڑا ثبوت دیا اسی طرح مول سروس کمیشن میں تمام سوالات کے زیر

بحث تھے نہایت قابلیت کے ساتھ بحث کی۔

افسوس ہے کہ کمیشن مذکور کی رپورٹ میں ممبروں کے بلائے اور انکی اسٹیٹس جن سے ہر ایک سوال کے متعلق ہر ایک ممبر کی رائے معلوم ہو، بالکل درج نہیں کی گئیں اور اس لیے ہمارے پاس کوئی ذریعہ معلومات کا ایسا نہیں جس سے سرسید کی کارگزاری اور ان کی رائوں کا جو کمیشن میں انہوں نے ظاہر کیا سزاخ لگا سکے۔ صرف ایک خط سرسید کا جو راقم کے خط کے جواب میں انہوں نے اسی امر کے متعلق لکھا تھا موجود ہے، اُس میں سے چند سطریں جو اس مقام کے مناسب ہیں نقل کی جاتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :

ادسول سروس کمیشن کا حال دریا منت کرنے کے لیے جو آپ رپورٹ طلب کرتے ہیں اُس سے آپ کو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اُس میں بجز اس کے کثرت رائے فلاں امر کی طرف ہوئی اور کچھ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ ان ممبروں کا جن کی رائے مخالف یا موافق تھی، نام بھی ظاہر نہیں کیا گیا، اگر آپ کو میری نسبت کچھ لکھنا ہے تو اس کا خلاصہ یہ ہے کہ پبلک سروس کمیشن میں اس بات پر ساعی تھا کہ سٹیٹیوٹری سول سروس جو جاری ہے اور جس سے ہندوستانیوں کا انتخاب یورپین کے عہدوں پر ہوتا ہے وہ منسوخ نہ ہو، اور جو قواعد اُس کی نسبت گورنمنٹ سے جاری ہوئے ہیں اگر ضرورت ہو تو ان میں کچھ اصلاح کی جائے۔ کثرت رائے اس کے برخلاف تھی اور وہ چاہتے تھے کہ قانون مذکور منسوخ ہو اور اُس کی جگہ دوسرا قانون پارلیمنٹ سے جاری ہو اور اُس میں جدید قواعد مرتب کیے جائیں اسی کثرت رائے کے مطابق یہاں سے رپورٹ گئی، مگر ولایت

میں یہ تجویز ہوئی کہ سٹیٹیوٹری سول سروس کے قانون کو منسوخ کرنا ضروری نہیں اور جدید قانون کے بھی جاری کرنے کی حاجت نہیں مگر ولایت سے اسی تجویز کے مطابق جو کہ کثرت رائے سے جدید قانون بنانے کے لیے لکھی گئی تھی، کچھ قواعد بن کر آئے جن کے بموجب اب عمل درآمد ہے اور جن کو میں پسند نہیں کرتا۔ زیادہ تفصیل اس کا بغیر آپ کی ملاقات کے بیان نہیں ہو سکتی۔

سرستید کا یہ خط ۲۲، نومبر ۱۹۵۷ء کا لکھا ہوا ہے۔ اگرچہ اس خط کے آنے کے بعد کئی دفعہ ان سے ملنے کا اتفاق ہوا مگر اس خیال سے کہ جب کمیشن مذکور کی ممبری کا حال لکھنے کا وقت آئے گا اس وقت اس کی مفصل کیفیت دریافت کر لی جائے گی، ان سے زیادہ تفصیل نہیں پوچھی گئی، کیا خبر تھی کہ جب پوچھنے کا وقت ہوگا تو اس وقت وہ دنیا میں نہ ہوں گے۔ لاچار اسی مختصر بیان پر اکتفا کیا گیا۔

انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت

سرستید کی لائف میں کانگریس کی مخالفت کرنا ایک ایسا واقعہ ہے جس کا اثر ہندوستان سے لے کر انگلستان تک ایک نہایت تعجب انگیز صورت میں اور مختلف قوموں پر مختلف طور سے ظاہر ہوا ہے، اس لیے ہم اس واقعہ کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔

مئی ۱۸۸۵ء میں بابو سرندرو ناتھ بینرجی نے ہندوستان کے اکثر حصوں میں اس غرض سے دورہ کیا تھا کہ ہندوستان کی تعلیم یافتہ جماعتوں کو اس بات کی طرف متوجہ کیا جائے کہ سول سروس کے امیدواروں کی عمر محدود ۲۱

برس سے گھٹا کر ۱۹ برس کی قرار دی گئی ہے اُس کی گورنمنٹ سے درخواست
 کریں کہ ۲۱ کی عمر کا قاعدہ جو امتحان مذکور کے لیے پہلے مقرر تھا وہی اب پھر جاری
 کیا جائے اور تمام ہندوستانی مل کر ایک فنڈ بنام نیشنل فنڈ جمع کریں
 جب کبھی ان کو گورنمنٹ ہند یا گورنمنٹ انگلستان میں کوئی درخواست یا شکایت
 پیش کرنے کی ضرورت ہو اُس فنڈ کی آمدنی میں سے خرچ کیا کریں۔

اس دورہ میں انہوں نے ایک مقام علیگڑھ میں بھی کیا تھا اور جو جلسہ اس
 مقصد کے لیے علیگڑھ میں ہوا تھا اُس میں سر تید سراج منجمن تھے نیز جوہر خواست
 سول سروس کی عمر بڑھانے کے لیے ولایت بھیجی گئی تھی اُس کے بھیجنے میں
 بھی سر تید شریک تھے۔

غالباً اسی سنہ میں بنگالیوں نے کلکتہ میں ایک انجمن قائم کی جس کا نام
 اول بنگال نیشنل لیگ رکھا گیا تھا اور جس کا مقصد مختصر لفظوں میں یہ تھا کہ
 گورنمنٹ نے جن حقوق کے دینے کا ہندوستانیوں سے وعدہ کیا ہے ان کا
 مطالبہ کیا جائے ۱۸۶۵ء کے شروع میں نیشنل لیگ کی طرف سے انگریزی میں
 ایک گنام پمفلٹ شائع ہوا جس کا نام ”دی سٹار این دی ایسٹ“ یعنی ستارہ
 مشرقی تھا۔ اس پمفلٹ کے شروع میں جو چند انگریزی اشعار تھے ان کا یہ مضمون
 تھا ”اے آسمان! کیا امید اور انصاف سرگے! کیا کوئی نیادن کبھی نمودار نہ
 ہوگا! آہ! اے بچو تمہاری ماں اہندوستان! ہمیشہ اسی طرح عبث، ملتوں
 پر منتیں کیے جائے گی! ایک ستارہ (نیشنل لیگ) مشرق کے شفاں افق
 پر چمک رہا ہے اور اے ہندوستان! تیرے بچے جادو کے زور سے
 ایک مدت سے سوتے پڑے خواب دیکھ رہے تھے تیری جگانے کی آواز
 ان کے کان تک پہنچ گئی ہے۔“

پھر انھیں دنوں میں ایک رسالہ بطور سوال و جواب کے اور ایک اور رسالہ جس میں مولوی فرید الدین اور رام بخش دو فرضی شخصوں کا مکالمہ چھپا تھا شائع ہوئے۔ ان تینوں رسالوں کی سچا سچ ہزار جلدیں ہندوستان کی بارہ زبانوں میں ترجمہ ہو کر ہندوستان کے تمام اطراف و جوانب میں مشتہر کی گئیں ازاں جلد اس کا ایک ترجمہ اُردو میں بھی شائع ہوا تھا جس میں گورنمنٹ کی بے انصافی اور موجودہ طریقہ انتظام کی برائی ایسے طور پر بظاہر کی گئی تھی جس سے خاص کر جاہل اور نا عاقبت اندیش لوگوں کے دل پر بُرا اثر ہوتا تھا اور گورنمنٹ کی طرف سے غلط خیالات پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ انھیں رسالوں کی نسبت لارڈ ڈڈلہ نے ایک ایچ میں کہا تھا کہ، کانگریس کے ممبر لاکھوں ناواقف اور زود اعتماد شخصوں کے درمیان ان رسالوں کے تقسیم کرنے کے جوابدہ ہونے جو نہایت مشتبہ نیت کے ساتھ لکھے گئے تھے اور جن کا مقصد مرتج سرکاری افسروں کے برخلاف لوگوں کی عداوت کا برا لگینہ کرنا تھا، اسی طرح اُنہوں نے ولایت جانے سے پہلے اہل کلکتہ کے الوداعی ایڈریس کے جواب میں بنگالی اخبار نویسوں کی نسبت کہا تھا کہ ”گورنمنٹ کے برخلاف رعایا کے بھڑکانے کے لیے کوشش مت کرو جیسا کہ تیس برس کا عرصہ ہوا اسی نظم کی غلط بیابیاں زبردست باعث اس بات کا ہوئیں کہ اس ملک میں خون کی ندیاں بہنے لگیں۔“

۱۸۸۶ء کے شروع میں جب کہ سر ستید سول سروس کمیشن کے ساتھ لاہور گئے تھے ان اشعار کے مضمون پر جو ستارہ شرقی کے شروع میں چھپے تھے بہت سے مسلمانوں کے مجمع میں خود راقم کے سامنے نہایت افسوس کرتے تھے اور بنگالیوں کے ساتھ ٹھیک ہونے کو مسلمانوں کے حق میں مضرت بتاتے تھے۔ پھر جب مولوی فرید الدین اور رام بخش کا مکالمہ مشتہر ہوا اور اُنہوں نے دیکھا

کہ اُس میں ایک فرضی نام مسلمان مولوی کا ہے اُن کو زیادہ خوف ہوا کہ مبادا مسلمان جو پہلے ہی سے بدنام ہیں اس مجمع میں شریک ہو جائیں۔

ہم یہ سرگز نہیں کہتے کہ یہ رسالے فی الواقع بد نیتی سے اور ہندوستان میں بغاوت پھیلانے کی غرض سے لکھے گئے تھے، مگر اس میں شک نہیں کہ سرسید کا خوف بالکل بجا تھا۔ انہوں نے مشہور واقعات صرف آنکھ ہی سے نہیں دیکھے تھے بلکہ خود اُن کو بھگتا تھا اور جو مصائب انگریزوں اور ہندوستان پر گزرے اُن میں وہ خود اور اُن کے اکثر عزیز اور رشتہ دار شریک تھے کلکتہ اور بیجاپور میں جس آگ کا دھواں تک نہیں پہنچا تھا وہ خود سرسید کے گھر میں لگی ہوئی تھی۔ وہ خوب جانتے تھے اور اپنی کتاب اسباب بغاوت میں بدلائل ثابت کر چکے تھے کہ مشہور کی بغاوت جس نے ہزاروں مسلمان خاندانوں کو تباہ کر دیا وہ محض غلط فہمیوں کا نتیجہ تھا نہ کسی ملکی سازش یا پوپٹکل نفرت کا۔ پس گو یہ رسالے بری نیت سے نہ لکھے گئے ہوں مگر نہایت قرین تھا کہ جاہل اور نادان لوگ اُن کا مضمون سن کر گمراہ ہو جائیں۔ یا گورنمنٹ اُن کو بغاوت کی ایک تحریک سمجھے۔

سرسید تیس برس سے جیسا کہ اُن کی لائف علی الاعلان شہادت دیتا ہے۔ براہِ برداشت کر رہے تھے کہ انگریزوں اور مسلمانوں میں موانعت اور دوستی پیدا ہو اور دونوں قوموں کو ایک دوسرے پر زیادہ بھروسہ اور زیادہ اعتماد ہو۔ اس لیے اُن سے زیادہ کسی کو اس بات کا خیال نہیں ہو سکتا تھا کہ مسلمان کہیں پھر انگریزوں کی بدگمانی کا نشانہ نہ بن جائیں۔ وہ قدریں یہ تماشاً اپنی آنکھ سے دیکھ چکے تھے کہ کارتوس کی مخالفت جو بغاوت کی بنیاد تھی ہندوؤں سے شروع ہوئی اور مسلمانوں پر تھپ گئی۔ اُن کو اب بھی یہی خوف تھا کہ جو چہرے بنگالیوں کی لبرٹی سمجھی جاتی ہے، وہ مسلمانوں میں آ کر بیوٹنی نہ بن جائے۔ چنانچہ

گورنر مدراس نے صاف ایک اسپیش میں کہا تھا کہ عقاب چمڑیوں کی چائیں چائیں کی کچھ پروا نہیں کرتا لیکن باز یا تجربہ اس کے آگے چوں بھی کرتا ہے تو فوراً اس کی گردن توڑ ڈالتا ہے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ مسلمان اور ہندوستان کی اکثر قومیں عموماً تعلیم کے لحاظ سے نہایت پست حالت میں ہیں اور آزادی کے مفہوم اور برٹش حکومت کے اصول سے محض بے خبر، ان میں غالب حصہ ان لوگوں کا ہے جن کے نزدیک تمام ملک کا متفق ہو کر گورنمنٹ کے انتظام پر نکتہ چینی کرنا اور اسپیشیشن پھیلانا بعینہ ایسا ہے جیسے سلطنت سے بغاوت اختیار کرنا پس ان کی اور خاص کر مسلمانوں کی خیر اسی میں ہے کہ وہ تعلیم یافتہ لوگوں کے اسپیشیشن سے بالکل علیحدہ رہیں اور ایسی بدایتوں سے جو ناواقفوں کی گمراہ کرنے والی ہوں اپنے کان بند کر لیں۔ ان کو یقین تھا کہ شہسکی بغاوت نے ہندوستانیوں کے اعتبار کو سو برس پیچھے ہٹا دیا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ "اگر یہ واقعہ ظہور میں نہ آتا تو آج ہمارے سبکدوڑوں جو ان والٹیر ہوتے، ایکٹ اسلحہ کبھی وجود میں نہ آتا اور ہم میں بہت سے لوگ فرج کے کپتان اور کرنیل و جرنیل نظر آتے، پس اس بات کا خوف کرنا کچھ بجانہ تھا کہ مبادا جو صفائی اور اعتبار ہندوستانیوں نے تیس برس میں از سر نو حاصل کیا ہے یا کرتے جاتے ہیں وہ پھر اسی بے اعتباری کے ساتھ بدل جائے جو تیس برس پہلے گورنمنٹ کو ان کی طرف سے ہو گئی تھی۔"

باوجود ان تمام باتوں کے سرسید نے علی الاعلان کانگریس کی مخالفت ظاہر کرنے میں جلدی نہیں کی۔ وہ ابتدا سے ہندو مسلمانوں میں قومی اتحاد اور سوشل یگانگت پیدا کرنے کے خواہشمند تھے۔ انھوں نے ملکی معاملات میں ہندوؤں سے کبھی سنجائیت کا خیال نہیں کیا۔ ملازمت کے زمانہ میں ان کا

برتاؤ ہندو مسلمانوں کے ساتھ ہمیشہ یکساں رہا۔ ایامِ غدیر میں بجنور کے ہندو رئیسوں نے خود درخواست کر کے ضلع کا انتظام اُن کے سپرد کر لیا۔ سائنٹفک سوسائٹی کے قائم کرنے سے اُن کا اصل مقصد یہ تھا کہ ہندو مسلمانوں اور انگریزوں میں میل جول اور اتحاد کو زیادہ ترقی ہو۔ اگرچہ ۱۸۶۷ء میں جب کہ شمال مغربی اضلاع کی اکثر ہندو بھانوں اور لائسنوں نے اُردو زبان اور فارسی صرفوں کے برخلاف نہایت سخت کوشش کی تھی، سرسید کی طبیعت ہندوؤں کی طرف سے کھٹک گئی تھی، اور اُن کو یہ امید نہ رہی تھی کہ ہندو مسلمانوں کی ایک قوم کے بل جملہ کوئی کام کریں گے، اس کے سوا بنگالی اخباروں کی نکتہ چینی اور اعتراضات جو کہ وہ ہمیشہ گورنمنٹ کی اُن جزوی رعایتوں پر کرتے رہتے ہیں جو کبھی کبھی مسلمانوں کے ساتھ اُن کی حالت کے لحاظ سے کی جاتی ہیں اور اُن کی وہ مخالفانہ اور دشمن تحریریں جو مسلمانوں کے برخلاف اُن میں ہمیشہ چھپتی رہی ہیں اور بھی مایوس کرنے والی تھیں، مگر پھر بھی جہاں تک ممکن تھا وہ دونوں قوموں میں اتحاد قائم رکھنے کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ انھوں نے بارہ بار اپنی پبلک اسپیچوں میں ظاہر کیا ہے کہ ہندو مسلمانوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ سب اپنے تئیں ایک قوم سمجھیں اور کوئی کام ایسا نہ کریں جس سے منابرت پائی جانے لیا تاکہ کہ گائے کی قربانی کی نسبت جیسا کہ انھوں نے ایک آرٹیکل میں ظاہر کیا تھا ہمیشہ اُن کی یہ رائے رہی ہے کہ اگر ہم میں اور ہندوؤں میں دوستی قائم ہے تو یہ دوستی ہمارے لیے گائے کی قربانی سے بہت زیادہ بہتر ہے اور مسلمانوں کا اس پر اصرار کرنا محض جہالت کی بات ہے۔ محدث کالج علیگڑھ میں انھوں نے کوئی قاعدہ ایسا نہیں رکھا جس سے مسلمانوں طالب علموں کی ہندوؤں پر ترجیح لازم آئے چنانچہ اب تک تقریباً دو سو ہندو طالب علم اس کالج سے مختلف

امتحانوں میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

پس اگرچہ وہ کانگریس کے طریق عمل کو ناپسند کرتے تھے مگر اس خیال سے کہ دونوں قوموں میں زیادہ اختلاف نہ پیدا ہو جائے، دو برس تک انہوں نے کانگریس کے برخلاف کوئی کارروائی نہیں کی بلکہ نہایت صبر و خاموشی کے ساتھ اس بات کے منتظر رہے کہ کانگریس میں کیسی تجویزیں پیش ہوتی ہیں۔ اور کس قسم کے حقوق وہ گورنمنٹ سے طلب کرتے ہیں؛ یہاں تک کہ کانگریس کی رپورٹیں شائع ہوئیں اور اس کے مقاصد ان کو معلوم ہوئے تو ان کو نچتہ یقین ہو گیا کہ اگر بالفرض کانگریس کی کارروائیوں پر گورنمنٹ کو کچھ اعتراض نہ ہو اور اس کے مطالبے بھی سراسر ادب اور تہذیب کے ساتھ ہوں تو بھی مسلمانوں کا اور ان تمام قوموں کا جو تعلیم کے لحاظ سے نہایت پست حالت میں ہیں۔ کانگریس میں شریک ہونا اور اس کی تائید کرنا کس طرح مناسب نہیں۔ انہوں نے خیال کیا کہ کانگریس کے اصلی اور مقدم مقاصد ایسے ہیں کہ اگر وہ پورے ہو جائیں تو مسلمانوں کی پوسٹل حالت کو سخت صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ مثلاً مقابلہ کا امتحان جو متعہد عہدوں کے لیے ولایت میں ہوتا ہے اس کا بند و ستان میں ہونا یا تمام متعہد عہدوں کا مقابلہ کے امتحان کے ساتھ مشروط ہونا، یا ایسے لیٹو کونسل میں رعایا کی طرف سے اور رعایا کے انتخاب سے ممبروں کا مقرر ہونا وغیرہ وغیرہ۔ پھر اسی کے ساتھ ان کو معلوم ہوا کہ مدراس میں جو عنقریب کانگریس کا اجلاس ہونے والا ہے اس میں بعض تعلیم یافتہ نوجوان مسلمان بھی شریک ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں، اس لیے ان کو ضروری معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو ان نتائج سے آگاہ کر دیں جو ان کے نزدیک کانگریس کی شرکت سے مسلمانوں کے حق میں پیدا ہونے والے تھے۔

۶۸۔ دسمبر ۱۹۷۶ء کو جب کہ محمد بن ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرا اجلاس لکھنؤ میں اور کانگریس کا تیسرا اجلاس مدراس میں سہوار ہاتھ، مسلمانوں کے عام جلسہ میں سرسید نے انڈین نیشنل کانگریس کے خلاف ایک نہایت مفصل اور سبز و سبچر دیا جو ان کی اسپچوں کے مجموعہ میں چھپ گیا ہے اور اس لیے اس کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ مگر جو بحث کہ اس میں کونسل کے الگتھن اور امتحان مقابلہ پر کی گئی ہے اس کا ٹب لبا ب ہم اس مقام پر لکھتے ہیں کونسل کے الگتھن کے متعلق ان کی تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ "اگر کونسل کے ممبر انتخاب سے مقرر ہوں تو کسی طرح مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے برابر نہیں ہو سکتی، کیونکہ ہندوؤں کی تعداد ہندوستان میں بمقابلہ مسلمانوں کے چوگنی ہے، پس جو طریقہ انتخاب کا قرار دیا جائے گا اس سے اگر ایک مسلمان ممبر ہوگا تو چار ہندو ہوں گے۔ اور اگر بفرض ممال کوئی ایسا قاعدہ رکھا جائے جس کی رو سے ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے ممبر برابر رہیں تو موجودہ حالت میں ایک مسلمان بھی ایسا نکلے گا جو وائسرائے کی کونسل میں بمقابلہ ہندوؤں کے کام کرنے کے قابل ہو"۔ اس موقع پر انھوں نے صاف یہ بات کہی کہ میں نے کونسل میں چار برس کام کیا ہے۔ مگر ہمیشہ یہ سمجھا ہے کہ مجھ سا ذلیل اور تالاق اور مجھ سے بدتر کونی ممبر نہیں ہو سکتا" اس کے بعد جو تقریر انھوں نے کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "اگر بالفرض کوئی ایسا مسلمان نکل بھی آئے تو ہرگز یہ امید نہیں کہ وہ اپنے کاروبار چھوڑ کر، سفر کی تکلیف گوارا کر کے، تمام اخراجات جو ایک ممبر کونسل کے لیے زیادہ ہیں اپنے پاس سے برداشت کر کے یا قوم سے چندہ کر کے کلکتہ اور شملہ میں حاضر رہے گا۔ بمقابلہ کے امتحان کی نسبت ان کی تمام تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ "اس امتحان کے لیے ہمارا ملک تیار نہیں ہے انگلستان میں بمقابلہ کا امتحان ہر شخص ڈکوک سے لے کر

ایک اونٹن دزدی کے بیٹے تک دے سکتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ ولایت سے مقابلہ کا استمان دے کر میاں آتے ہیں ان میں اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ خاندان کے لوگ ہوتے ہیں مگر یہ لوگ جو انگلستان سے حاکم مقرر ہو کر آتے ہیں وہ ہماری نظر سے اتنی دور ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ وہ کسی لارڈ کے بیٹے ہیں۔ یا درزی کے، اس لیے یہ امر کہ ہم پر ایک اونٹن حکومت کر رہا ہے ہماری آنکھ سے چھپا رہتا ہے۔ مگر ہندوستان کا حال اس کے برخلاف ہے، ہندوستان کی شریف قومیں اپنے ملک کے ایک اونٹن درجہ کے شخص کو جس کی جڑ بنیاد سے وہ واقف ہیں کبھی اپنی جان اور مال پر حاکم ہونا پسند نہ کریں گی۔ اس کے سوا مقابلہ کا استمان اس ملک میں ہو سکتا ہے جہاں اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک سب ایک قوم کے آدمی ہوں یا مختلف قومیں بسبب تعلیم و تربیت کے مل جیں کہ ایک ہو گئی ہوں مگر ہندوستان میں جہاں مختلف قومیں آباد ہیں اور ایک قوم دوسری قوم سے بالکل الگ ہے کسی طرح مقابلہ کا استمان قرین مصلحت نہیں پھر تعلیم و تربیت کے لحاظ سے ہندوستانیوں کی حالت اس قدر مختلف اور متفاوت ہے کہ بہت سی قومیں جیسے مسلمان، راجپوت، سکھ اور جاٹ وغیرہ موجودہ حالت میں کبھی مقابلہ کے استمان سے ناڈہ نہیں اٹھا سکتے۔ بلکہ ہندوستان کی کوئی قوم بنگالیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ پس اگر ہندوستان میں تمام مشہد اور غیر مشہد عہدوں کے لیے مقابلہ کا استمان مقرر کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ کوئی شخص ملک کا ایسا نہ رہے گا کہ سوائے بنگالیوں کے یا کسی قدر تعلیم یافتہ ہندوؤں کے اور کسی کی صورت حکومت یا عدالت کی کرسی پر دکھائی دے۔

سرستید کا یہ لکچر اردو اور انگریزی میں بذریعہ اخبارات کے بہت جلد ہندوستان میں شائع ہو گیا، اور نیز انگلستان کے اکثر فامور اخباروں نے اس

سے نوٹس لیا اور اس پر عمدہ ردیاء کس کیے۔

اس کے بعد ۱۴ مارچ ۱۹۵۸ء کو بمقام سیرٹھ انھوں نے دوسرا لکچر اسی قدر طولانی جیسا کہ لکھنؤ میں دیا تھا مسلمانوں کے عام جلسہ میں دیا۔ اس لکچر کا بڑا مقصد اس بات کا ثابت کرنا تھا کہ کانگریس والوں نے جو اخبارات اور رسالوں کے ذریعہ سے یہ مشہور کیا ہے کہ مسلمان عموماً کانگریس میں شریک ہیں یہ بالکل غلط ہے اور معدوم ہے چند مسلمان جو اُس میں شریک ہوئے ہیں انھوں نے غلطی کی ہے۔ اور اُن کے شریک ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ مسلمان من حیث النعم کانگریس میں شریک ہیں۔ یہ لکچر بھی نہایت پُر زور اور موثر تھا۔ ان دونوں لکچروں میں بڑی بات یہ تھی کہ پُرل نے خیالات کے مسلمان جو ہمیشہ سرسید کی ہر ایک رائے اور ہر ایک تجویز کی مخالفت دیا اُس سے نفرت ظاہر کرتے تھے انھوں نے بالاتفاق ان کی رائے کو تسلیم کر لیا اور ہاستنائے معدوم سے چند تمام تعلیم یافتہ مسلمانوں نے بھی اُس پر پورا پورا عمل کیا۔ نیز پُرل نے خیالات کے اکثر ہندوؤں نے اور تقریباً کل تعلقہ داروں، جاگیر داروں اور سیکولر نے عام اس سے کہ بندو ہوں یا مسلمان اُن کی رائے سے اتفاق ظاہر کیا۔

پٹیریا ٹک ایسوسی ایشن

اس کے بعد اگست ۱۹۵۸ء میں سرسید نے بمقام علیگڑھ "پٹیریا ٹک ایسوسی ایشن" اس غرض سے قائم کی کہ جو قومیں اور جو ریٹس اور تعلقہ داروں وغیرہ کانگریس میں شریک نہیں ہیں اُن کی رائے اور خیالات اور خط کتابت بطور محفوظ کے وقتاً فوقتاً انگریزی میں چھپوا کر اہل انگلستان اور ممبران پارلیمنٹ کی اطلاع کے لیے دلائیے کو بھیجے جائے اور نیز اخبارات کے ذریعہ سے ہندوستان

اور انگلستان میں عام طور پر شائع کیجائے۔

اس ایسوسی ایشن کے قائم کرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ بنگال، بہار، مدراس، بمبئی، ممالک متوسط اضلاع شمال مغرب، اودھ اور پنجاب کی بے شمار اسلامی انجمنوں میں کانگریس کے برخلاف جلسے کیے گئے، تمام تعلقہ داران اودھ، بہار اور بنارس، ریاست حیدرآباد اور دیگر ریاستوں کی طرف سے، ایسوسی ایشن کے ساتھ اتفاق کیا گیا اور جس قدر کارروائیاں کانگریس کے برخلاف تمام ملک میں ہوئیں ان کی روئدادیں ایسوسی ایشن کے ذریعہ سے وقتاً بعد وقتاً چھپ کر ولایت کو روانہ ہوتی رہیں اور پارلیمنٹ کو اس بات کا یقین دلایا گیا کہ کانگریس میں ہندوستان کی بہت سی قومیں اور خاص کر مسلمان شریک نہیں ہیں۔

بنگالی اخباروں میں سرسید کی اس کارروائی سے سخت ناراضی ظاہر کی گئی اور ان کے برخلاف بڑے بڑے تلخ آرٹیکل لکھے گئے۔ سب سے بڑا معترض ان پدیرہ کیا گیا کہ وہ ابتدا سے ریپرنٹیشن اصول کے بڑے طرفدار رہے ہیں اور ان کی تمام اگلی تحریروں اور اسپچوں سے پایا جاتا ہے کہ وہ رعایا کی آزادی کے بہت بڑے حامی ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ وہ انڈین نیشنل کانگریس پر جو ہندوستان میں ریپرنٹیشن اصول کے موافق عمل درآمد چاہتی ہے معترض ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ وہ ریپرنٹیشن گورنمنٹ کو پسند کرتے تھے اور اس باب میں ان کی اب بھی وہی رائے تھی جو ہمیشہ اپنی تحریروں میں ظاہر کرتے تھے، انھوں نے خود لکھنؤ کے لکچر میں اقرار کیا تھا کہ ”ہمیں کنسر وٹو نہیں ہوں بلکہ بہت بڑا لبرل ہوں“ انھوں نے کونسل میں جب کہ لارڈ پرنس کے سامنے سلف گورنمنٹ کا قانون پیش تھا، اپنی اسپچ میں صاف کہا تھا کہ ”ہمیں اس بات کے خیال کرنے سے خوش ہوں کہ میں اس قدر عرصہ تک

زندہ رہا کہ میں نے اس دن کا آغاز دیکھ لیا جب کہ ہندوستان اپنے حاکموں کے ہاتھ سے سیلف ہیلپ اور سیلف گورنمنٹ کے وہ اصول سیکھنے کو ہے جنہوں نے انگلستان میں ریپریزنٹیٹو انسٹیٹیوشن پیدا کیے ہیں اور اس کو دنیا کی قوموں میں بڑا بنا دیا ہے۔“

لیکن اسی سچ میں انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ”انگلستان سے ریپریزنٹیٹو انسٹیٹیوشنوں کا اصول مستعار لینے میں ان سوشل اور پولیٹیکل معاملات کا یاد رکھنا ضروری ہے جن کے لحاظ سے ہندوستان اور انگلستان کے درمیان امتیاز پایا جاتا ہے۔ ہندوستان فی نفسہ ایک براعظم ہے اور اس میں مختلف انواع اور مختلف مذاہب کے آدمی کثرت سے رہتے ہیں۔ مذہبی دستورات کی سختی نے اب تک ہمسایوں کو بھی ایک دوسرے سے جدا رکھا ہے۔ ذات کا قاعدہ بہت شد و مد کے ساتھ جاری ہے۔ ممکن ہے کہ ایک ہی ضلع میں مختلف مذاہب اور مختلف قوموں کے باشندے ہوں اور ایک گروہ دولت مند اور تجارت پیشہ ہو تو دوسرا گروہ ذی علم اور ذی رعب ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک گروہ بلحاظ تعداد کے دوسرے گروہ سے بڑا ہو اور روشن ضمیری کے جس درجہ تک وہ گروہ پہنچ گیا ہو وہ درجہ باقی باشندوں کے درجہ سے بہت اعلیٰ ہو ایک قوم اس بات سے بخوبی واقف ہو کہ لوکل بورڈوں اور ضلع کی کونسلوں میں ان کی طرف سے ممبروں کا شرک ہونا نہایت ضروری ہے اور دوسری قوم کو اس قسم کے معاملات کی مطلق پروا نہ ہو۔ پس ان صورتوں میں اس بات سے انکار کرنا شاید ہی ممکن ہو کہ ہندوستان میں ریپریزنٹیٹو انسٹیٹیوشنوں کے جاری کرنے سے برسی شکلیں اور سوشل اور پولیٹیکل خطرات پیدا ہوں گے۔ ایسے ملک میں جیسا کہ انگلستان ہے۔ جہاں قومی امتیاز

اب باقی نہیں رہا اور جہاں مذہبی معاملات میں تفرقہ اور اختلافات تحمل کی ترقی کے سبب کم ہو گئے ہیں، وہاں ایسے معاملہ میں اس قسم کی مشکلات پیش نہیں آئیں قوم اور مذہب کے متحد ہونے سے تمام انگریز ایک قوم ہو گئے ہیں اور تعلیم کی ترقی سے خفیف اختلافات جو بیشتر ملک کی یہودی سے متعلق ہیں بالکل ناچیز ہو گئے ہیں، عیسائیوں کو پارلیمنٹ میں اپنے مطالب کی حمایت کرنے کے واسطے یہودیوں کی نسبت دوٹ دینے میں کچھ غدر نہیں ہوتا اور درحقیقت سوشل اور پولیٹیکل مقاصد کے واسطے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انگلستان کی کل آبادی ایک ہی قوم ہے۔ لیکن ایک ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے۔ جہاں ذات کے اختلافات اب تک موجود ہیں، جہاں مختلف قومیں غلط ملط نہیں ہوئی ہیں، جہاں مذہبی اختلافات اب تک زور شور سے ہیں اور جہاں تعلیم نے اپنے جدید معنی کے لحاظ سے باشندوں کے تمام فرقوں میں ایک مساوی مناسبت کے ساتھ ترقی نہیں کی، پھر کو یقین کامل ہے کہ لوکل بورڈوں اور ضلع کی کونسلوں میں مختلف مطالب کی حمایت کی غرض سے الگ الگ کے خالص اور سادہ اصول کے جاری کرنے سے بہ نسبت محض تمدنی خیالات کے زیادہ خرابیاں پیدا ہوں گی۔ جب تک کہ قوم اور مذہب کے اختلافات اور ذات کا امتیاز ہندوستان کی سوشل اور پولیٹیکل حالت میں ایک جزو و اعظم رہے گا اور ان معاملات میں جو ملک کے انتظام اور یہودی سے بیشتر متعلق ہیں اس کے باشندوں پر اثر ڈالے گا، اس وقت تک الگ الگ خالص قاعدہ طمانیت کے ساتھ جاری نہیں ہو سکتا۔ پوری قوم چھوٹی قوم کے مطالب پر بالکل غالب آویگی اور جاہل آدمی گورنمنٹ کو اس قسم کی تدابیر کے جاری کرنے کا جواہدہ سمجھیں گے جن کے باعث سے قوم اور مذہب کے اختلافات بہ

نسبت سابق کے اور بھی سخت ہو جائیں گے۔“

یہ ایسی سرسید نے ۱۷ جنوری ۱۸۸۳ء کو یعنی اُس لکچر سے جو کانگریس کے خلاف لکھنؤ میں دیا پانچ برس پہلے لارڈ ڈرین کے سامنے کی تھی۔ اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ وہ جس طرح ہمیشہ رپرزنٹٹیو گورنمنٹ کو پسند کرتے تھے اسی طرح وہ ہندوستان کو موجودہ حالت میں اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ اُس میں رپرزنٹٹیو اصول کے موافق عمل درآمد کیا جاسکے۔ انگلستان میں ہوم رول بل پر جو سب سے بڑا اعتراض مخالف پارٹی کا تھا اور جس نے آخر اُس کو پاس نہ ہونے دیا وہ یہی تھا کہ آئر لینڈ میں رومن کیتھولکس کی تعداد بمقابلہ پروٹیسٹنٹ فرقہ کے بہت زیادہ ہے۔ پس اگر یہ بل پاس ہو جائے گا تو پروٹیسٹنٹوں کو سخت نقصان پہنچے گا۔ جب آئر لینڈ جیسے ملک میں جہاں قومی اور مذہبی اختلافات یقیناً ہندوستان سے بہت کم ہیں، ایک فرقہ کی مبارٹی دوسرے فرقہ کے حق میں اس قدر مضر خیال کیجاتی ہیں تو ہندوستان میں جہاں ہر خلافت تمام دنیا کے مذہبی اور قومی تعصبات ترقی تعلیم کے ساتھ روز بروز بڑھتے جاتے ہیں رپرزنٹٹیو اصول سے کیا بھلائی کی امید ہو سکتی ہے؟

سرسید پر یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ کانگریس کے قائم ہونے سے پہلے جب کہ بابو سرند رونا تھا بنیر جی علیگر ٹھ میں آئے تھے اور انھوں نے نیشنل فنڈ جمع کرنے کی تحریک کی تھی اُس وقت سرسید نے کیوں ان کے ساتھ اتفاق رائے کیا تھا؟ اور کیوں اُس جلسہ میں صدر انجمن بنے تھے جو نیشنل فنڈ جمع کرنے کے لیے منعقد ہوا تھا؟ اور جب کہ وہ فنڈ اسی لیے جمع کیا جاتا تھا کہ تمام ہندوستان کی طرف سے پارلیمنٹ میں جو درخواستیں بھیجی جائیں یا جو استغاثے پیش کیے جائیں ان کے اخراجات میں صرف کیا جائے تو نیشنل

کانگریس سے جس کے لیے وہ فنڈ جمع کیا جاتا تھا، کس لیے مخالفت کی گئی؟ اس کا جواب بہت صاف ہے جس جلسہ کا ذکر کیا جاتا ہے اس میں صرف ایک مقصد کی تصریح کی گئی تھی، یعنی یہ کہ ایک عرضداشت دلائیٹ میں اس عرض سے بھیجی جائے کہ سول سروس کے امتحان کی عمر بھانے ۱۹ برس کے ۲۱ برس کی قرار دیکھائے۔ اس کے سوا جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے اور کسی خاص مقصد کی تصریح نہیں کی گئی۔ چنانچہ اس مقصد کے متعلق جس کے لیے وہ جلسہ منعقد ہوا تھا سرسید کی رائے میں کبھی فرق نہیں آیا۔ سول سروس کمیشن میں انھوں نے برابر اس کی تائید کی اور وہ مقصد اسی طرح حاصل بھی ہو گیا جس طرح کہ ہندوستانیوں کی خواہش تھی اور اگر وہ تجویزیں جو آخر کو کانگریس میں پیش ہوئیں اور جن سے مسلمانوں کو نقصان پہنچے کا یقین کیا جاتا ہے اگر اس علی گڑھ والے جلسہ میں ان کی تصریح کی جاتی تو ہرگز قیاس میں نہیں آتا کہ سرسید ان تجویزیوں سے اتفاق کرنے کیونکہ جو اسپیش انھوں نے پانچ برس پہلے قانون سیلف گورنمنٹ پر کونسل میں کی تھی اس کا سا لٹچوٹا سا بات پر ہے کہ ہندوستانیوں کو ایسے حقوق دینے جن سے ہندوستان کی تمام معزز قومیں برابر مستفید ہو سکیں کسی طرح مناسب نہیں۔

اس کے سوا جو طریقہ کانگریس نے گورنمنٹ پر دباؤ ڈالنے کا اختیار کیا سرسید اس طریقہ کے ہمیشہ مخالف رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب "اسباب بغاوت" میں گورنمنٹ پر اعتراض کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا تھا مگر اس کی ایک کاپی بھی اس طرح جیسے کہ پچاس ہزار رسالے کانگریس نے تمام ملک میں تقسیم کیے ہندوستان میں شائع نہیں کی بلکہ جس قدر جلدیں چھپوائیں ان میں سے ایک آدھ جلد گورنمنٹ ہند کے ملاحظہ کے لیے اور

باقی کل جلدیں پارلیمنٹ میں بھیج دیں وہ اس قسم کے ایکٹیشن کو جیسا کہ کانگریس نے ہندوستان میں شروع کیا تھا تمام ملک کے حق میں عموماً اور مسلمانوں کے حق میں خصوصاً نہایت مضر سمجھتے تھے۔ وہ ایک چٹھی میں جو بدر الدین طیب جی کے نام انھوں نے لکھی تھی ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ "اسریجا میں اول اسی قسم کا ایکٹیشن شروع ہوا تھا اور آخر کو یہاں تک ذہنیت پہنچی کہ آخری لفظ جو ان کے منہ سے نکلا وہ یہ تھا کہ "نوٹیفیکیشن و وارنٹ ریپرنٹیشن" پس جن لوگوں میں اس لفظ کے کہنے کی طاقت ہو وہ اس کانگریس کے ایکٹیشن میں شریک ہوں ورنہ بیخبروں کی طرح تائیاں بجانا ہی ہیں" پھر آگے چل کر اسی چٹھی میں لکھتے ہیں کہ "غدر کیا ہوا۔ ہندوؤں نے شروع کیا، مسلمان دل چلے تھے۔ وہ بیچ میں کود پڑے۔ ہندو تو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے مگر مسلمانوں کے تمام خاندان تباہ و برباد ہو گئے۔"

اگرچہ کانگریس سے علیحدہ رہنے میں مسلمانوں نے عموماً سرسید کے کہنے پر عمل کیا اور چند مستثنیٰ اشخاص کے سوا کوئی مسلمان کانگریس میں شریک نہیں ہوا لیکن بہت سے تعلیم یافتہ مسلمان سرسید کی اس پاسی کو مدت تک نہایت تعجب سے دیکھتے رہے۔ چنانچہ ایک نہایت لائق تعلیم یافتہ مسلمان نے ہم سے کہا کہ "جب گورنمنٹ نے اول ہی اول ہندوستان میں انگریزی تعلیم جاری کرنی چاہی تھی اس وقت ہندوؤں نے اس کو خوشی سے قبول کر لیا تھا مگر مسلمانوں نے نہایت سختی کے ساتھ اس سے انکار کیا تھا لیکن آخر کار مسلمان اپنے انکار سے پشیمان ہوئے اور مجبور ہو کر ان کو انگریزی تعلیم اختیار کرنی پڑی۔ اسی طرح اندیشہ ہے کہ مسلمانوں کو کہیں نیشنل کانگریس کی علیحدگی سے بھی آخر کو پیلے کی طرح پشیمان ہونا نہ پڑے۔" مگر سال گذشتہ میں جو

افسوس تاک واقعات پونا میں گذرے اور جو عبرت انگیز نتیجے ان پر مترتب ہوئے ان کو دیکھ کر غالباً سب کی آنکھیں کھل گئیں ہوں گی اور معلوم ہو گیا ہو گا کہ سرسید کی رائے اس باب میں کس قدر صائب تھی اور کانگریس سے علیحدہ رہنا ایک ایسی قوم کے لیے جیسے کہ مسلمان ہیں کس قدر ضروری تھا۔

اگرچہ بنگالیوں کی طرف سے سرسید پر بے انتہا لے دے ہوئی، ان کو خوشامدی، زمانہ ساز، ٹائم سرور اور کیا اور کیا کہا گیا۔ ان کی پھلی تحریروں کا حال کی تحریروں سے مقابلہ کر کے دکھایا گیا کہ وہ ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہیں مگر سرسید نے جس بات کو اپنے نزدیک قوم کے حق میں بہتر سمجھ لیا تھا اخیر وہ تک اسی پر قائم رہے اور کسی کے کہنے سننے پر مطلق التفات نہیں کیا۔ یہاں تک کہ نکتہ چینیوں کے ترکش خالی ہو گئے اور سب کی زبانیں بند ہو گئیں۔

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چینی ہوئے چپ
سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

کے سی۔ ایس۔ آئی کا تمغہ ملنا

۱۸۸۸ء میں سرسید کو اعزاز "ٹائٹل" کا نڈرٹیفکیشن اعلیٰ ستارہ ہند سے ممتاز کیا گیا۔ ۱۴ مئی روزہ دو شنبہ کو اس تقریب سے علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ کے بڑے ہال میں ضلع اور شہر علیگڑھ کے رئیس اور سرسید کے مسلمان بند و اور یورپین دوست جو باہر سے اس رسم میں شریک ہونے کو آئے تھے اور تمام اسٹیشن کے انگریز جمع ہوئے۔ ہال کی دیواریں علاوہ دیگر معمول آرائشوں کے مشرقی وضع کئی تلواروں اور مغربی وضع کی بند و فوں سے سجائی گئیں۔ مسٹر کریڈک ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ

پولیس، مولوی محمد کریم مرحوم ڈپٹی کلکٹر اور راجہ جیکشن داس سی۔ ایس۔ آئی اپنے
 تمنے پہنے ہونے سرسید کو ہال کے اندر لائے، تمام حاضرین ان کے آنے پر
 کھڑے ہو گئے اور تعظیمی گارڈ نے جس کو ضلع کی پولیس نے مامور کیا تھا
 ہتھیاروں سے سلامی ادا کی۔ اس کے بعد سٹرامی، ایچ ریڈیچی اسٹنٹ
 مجسٹریٹ نے فرمان شاہی حب ذیل پڑھ کر سنائے:

(اول)

(دستخط) وکٹوریہ آرائی

وکٹوریہ یا مدظلہ متحدہ گریٹ برٹن و آئر لینڈ۔ ملکہ حامی دین قیصر ہند فرماں روا نے
 طبقہ اعلیٰ ستارہ ہند

بنام نامی مولوی سید احمد خاں بہادر شریک طبقہ اعلیٰ موصوف ممبر کونسل نواب
 لفٹیننٹ گورنر بہادر ممالک مغربی و شمالی بہ سلاستی و مبارک باد آنکے

چونکہ یہ مد نظر ہوا کہ آپ کو ایک ایسا نشان خسروانہ عطا کیا جائے جس سے وہ قدر
 منزلت آپ کی نمایاں ہو جو اس سلطنت اور آپ کی ذات اور ان خدمات کے

نشایاں ہو جو آپ سے اس سلطنت کے لیے ظاہر ہوئیں، لہذا یہ مناسب اور
 زیب ہے کہ آپ کو اعزاز "ناٹ کمانڈر طبقہ اعلیٰ ستارہ ہند" سے ممتاز

وسر ملینڈ کیا جائے۔ اس لیے بذریعہ اس تحریر کے آپ کو اعزاز ناٹ کمانڈر
 طبقہ اعلیٰ ستارہ ہند عطا ہو کر اختیار دیا جاتا ہے کہ آپ اس اعزاز سے سرفراز

و مستحق ہو کہ حقوق جو توکل متعلقہ طبقہ اعلیٰ موصوف ہوں۔

عدالت عالیہ مقام اسپورن بذریعہ مہر طبقہ موصوف
 آج یکم جنوری ۱۹۹۹ء اور ۱۰ جولائی کو جاری ہوا
 (دستخط) کراس (دوسرے ہند)

(دوم)

(دستخط) وکٹوریہ آر آئی۔

وکٹوریہ مذکورہ متحدہ گریٹ برٹن آئرلینڈ، ملکہ حامی دین، قیصر ہند فرماں روا نے
 طبقہ اعلائے ستارہ ہند

بنام نامی مولوی سید احمد خاں بہادر شریک طبقہ اعلائے موصوف ممبر کونسل ثانوی نواب
 لفٹیننٹ گورنر بہادر ممالک مغربی و شمالی بہار کبیر آباد ملکہ

آپ کو اعزازہ طبقہ اعلائے ستارہ ہند سے ممتاز و نامور کیا گیا ہے از انجاکہ ہم کو حسب
 اختیارات قوانین طبقہ اعلائے موصوف اختیار حاصل ہے کہ آپ کی حاضری
 ولایت کی بغرض استفادہ اعزازہ طبقہ اعلائی کے مساوت کریں لہذا حسب اختیار
 حردانہ طبقہ موصوف ہم آپ کو پورے اختیارات پہنچنے و استعمال کرنے
 ستارہ موصوف کی بجانب چپ بالائے پوشاک بیرونی عطا کرتے ہیں۔ اور
 نیز نشان خاص و بندش متعلقہ ٹائٹ کمانڈر موصوف پہنیں اور استعمال کریں۔
 اور حسب نخواستہ اختیارات مذکور آپ کو اختیار دیا جاتا ہے کہ تمامی حقوق جزو
 کل متعلقہ طبقہ ٹائٹ کمانڈر موصوف مع استعمال ایک نشان خاص ٹائٹ بچلر
 سلطنت موصوف سے مستفیہ و بہرہ یاب ہوں اور یہ اسی طریقہ اور طریقہ
 سے متصور ہے جیسا کہ آپ اس ٹائٹ ہٹ سے ہم سے یا بجائے ہمارے
 نائب سلطنت اور گورنر جنرل ہند سے جو گورنر ہٹ ماسٹر طبقہ موصوف

ہیں اعزاز حاصل کرتے۔

عدالت عالیہ مقام اسپون بذریعہ مہر طبقہ موصوف
آج ۱۱ فروری ۱۹۸۵ء عیسوی اور ۱۵ جمادی الاول ۱۴۰۵ء
(دستخط) کراس (وزیر ہند)

اس کے بعد صاحب کلکٹر مسٹر کینڈی اپنی کرسی پر سے اٹھے۔ سب لوگ
ان کے ساتھ کھڑے ہو گئے اور نعلین گاڑنے پھیر سلامی ادا کی۔ صاحب ممدوح
نے حضور ملکہ معظنہ کو ان و کٹوریا کی طرف سے تارہ ہند سرسید کے سینہ پر لگا
دیا اور فیتہ مع بیخ کے جو اس کے ہاتھ تھا، ان کے گلے میں ڈال دیا۔ سب لوگ
پھر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے اور صاحب کلکٹر نے اردو میں ایک لمبی تقریر کی جس
میں سرسید کی بہت تعریف کی تھی اور جس کے چند فقرے ہم یہاں نقل کرنے
چاہیں۔ انہوں نے کہا کہ "اہل فرنگ اور اہل ہند نے سید صاحب کی وسیع
عقل اور روشن حب الوطنی سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ان میں نوجوانی سے
دو وصف برابر پائے گئے ہیں ایک علم کی محبت دوسرے وطن کی محبت کہ
یہ دونوں ایک جگہ بہت کم پائی جاتی ہیں۔" "برلن نے ان کو کنسر و ٹو خیال کیا
کیوں کہ انہوں نے رسومات مغربی کی بالکل نقل نہیں کی اور کنسر و ٹو کی سمجھ میں
نہیں آیا کہ وہ کس طرح اپنے ملک کے باہر کوئی عمدہ چیز پاسکیں گے انہوں
نے اہل فرنگ اور اہل ہند کے درمیان معقول واقفیت پیدا کرنے کے لیے
وہ مدد دی جو بہت کم لوگوں نے دی ہے۔" "سید صاحب وسیع ہمدردی
دانشندانہ صلاح، تجربہ کاری، سرگرمی، مستعدی، مستقل مزاجی اور حب الوطنی
کی مثال ہیں اور نیز وہ شخص ہیں جنہوں نے اپنے واسطے کبھی کبھی تلاش نہیں کیا
بلکہ ہر چیز اپنے ملک کے واسطے چاہی اور اس لیے ان کے ملک کے لوگ اور

مکہ معظمہ ان کی عزت کرتی ہیں اور ہم لوگ محبت اور تعظیم کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔“
اس کے بعد سرسید نے اس مضمون کے معمولی اقرار نامہ پر کہ وہ طبقہ مذکور
کے قوانین کی اطاعت کریں گے دستخط کیے اور جلسہ برخواست ہو گیا اور مسز
کینڈی نے اسی تقریب میں چند انگریزوں اور مسلمانوں کی اپنے ہاں حاضری
پر دعوت کی۔

اس واقعہ کے متعلق سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ روسائے
ضلع علیگڑھ کو جب یہ بات معلوم ہوئی کہ سرسید کو تمغہ مذکور ملنے والا ہے تو انہوں
نے سرسید کو اور یور وین افسروں کو اسی خوشی میں ایک بہت بڑا ڈنر دینا
چاہا اور کچھ لوگ ریشیوں کی طرف سے مع ایک خط کے سرسید کے پاس
آئے کہ آپ اس ڈنر میں آنا منظور کریں سرسید نے اس کے جواب میں
بعد شکریہ روسائے ضلع کے یہ لکھ بھیجا کہ ”چونکہ قوم کی حالت ابتر ہے
اور اس کو ہم برساتی تعلیم کی بہت حاجت ہے اس لیے میں ایسے فضول خرچہ
کا سخت مخالف ہوں۔ پس اس ڈنر اور سلب سے آپ مجھے معاف رکھیں“
اور اخبار میں ایک آرٹیکل لکھا جس کا ماحصل یہ تھا کہ ”کسی خوشی یا تقریب
میں ڈنر دینے محض فضول ہیں، سب سے بڑی ضرورت اس وقت مسلمانوں
کی تسلیم میں خرچ کرنے کی ہے۔ ہمارے لیے جو ڈنر تجویز ہوا تھا اس کے
لیے بارہ سو روپیہ کا تخمینہ ہوا تھا اگر وہ روپیہ تعلیم مسلمانان کے اخراجات
میں صرف ہوتا تو کس قدر مفید ہوتا۔“

سرسید کے واسطے اس اعزاز کے ملنے کی بہت دن سے تجویز ہو رہی
تھی مگر چونکہ اس تمغے کے پانے والوں کی تعداد محدود ہوتی ہے یعنی کبھی
۷۲ سے زیادہ نہیں ہوتے پاتی اس لیے جب تک نائٹ کمانڈر کا عہدہ

خالی نہیں ہوتا دوسرے شخص کو تمنہ نہیں مل سکتا۔ چنانچہ لارڈ ڈلٹن نے دربارہ
قیصری کے بعد اس بات پر افسوس ظاہر کیا تھا کہ بسبب خالی نہ ہونے کسی نامٹ
کمانڈر کے عہدہ کے اس وقت سرسید کو یہ اعزاز نہ مل سکا۔

ڈاکٹر آوف لاز کی ڈگری

۱۸۸۹ء میں سرسید کو اڈنبرا یونیورسٹی سے بحیثیت ایک اعلیٰ مصنف اور
حامی علوم ہونے کے ایک بڑا علمی امتیاز دیا گیا۔ انگلستان میں دستور ہے کہ
جو لوگ علمی حیثیت سے ملک میں امتیاز حاصل کرتے ہیں یا علم کی روشنی
پھیلانے میں کوشش کرتے ہیں ان کو اہل علم کے عام مجمع میں کسی یونیورسٹی
کی طرف سے ایک خاص اعزاز دیا جاتا ہے جس کو "ڈگری آوف ڈاکٹر
آوف لاز" کہتے ہیں۔ سرسید کی شہرت، خطبات احمدیہ اور دیگر تصنیفات و
تحریرات کے سبب سے انگلستان میں بحیثیت ایک اعلیٰ درجہ کے مصنف
کے ہندوستان سے کچھ کم نہ تھیں۔ اس کے سوا مدرسہ العلوم کے قائم کرنے
اور ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیم کے رواج دینے سے وہ علوم جدیدہ کے
بہت بڑے جامی سمجھے جاتے تھے۔ اس لیے بغیر اس کے کہ سرسید کو اطلاع
ہو ۱۸۸۹ء میں اڈنبرا کی مشہور یونیورسٹی سے ان کو ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری ملنی
تجویز ہوئی۔

۱۸ اپریل کو ایک شہر اڈنبرا کے سب سے بڑے ہال میں جو سائٹڈ ہال کے
نام سے مشہور ہے گریجویٹیشن کی رسم ادا کی گئی۔ یہ جلسہ جیسا کہ علیگڑھ گورنمنٹ
مطبوعہ ۲۸ مئی ۱۸۸۹ء میں بحوالہ اخبارات و پمٹھیان ولایت مفصل مذکور
ہے۔ بڑی شان و شوکت کے ساتھ منعقد ہوا تھا۔ تمام گیلریاں اور ہال کا ایک

عام لوگوں سے جو مدعو کیے گئے تھے مجھرا ہوا تھا اور دوسرا حصہ یونیورسٹی کے گریجویٹس سے مزین تھا۔ اس جلسہ میں دو تہائی سیڈیاں تھیں جن میں لیڈی میور صاحبہ جنھوں نے مدرسۃ العلوم علیگرھ کی "میور پارک" میں سب سے پہلا پودا اپنے ہاتھ سے لگایا تھا۔ موجود تھیں اور ان کے معزز شوہر ولیم میور بھی جن کو ہندوستان کے لوگ عموماً جانتے ہیں بحیثیت پرنسپل یونیورسٹی لارڈ چانسلر کے ہمراہ جو جلسہ کے پریسڈنٹ تھے، تشریف لائے تھے جس وقت لارڈ چانسلر کے سامنے سرسید کا ذکر کیا گیا اور حاضرین نے اس پر تحسین و آفرین کا نعرہ بلند کیا تو سر ولیم میور اور لیڈی میور صاحبہ خوشی سے باغ باغ ہو گئیں۔ اس موقع پر بارہ آدمیوں کو جن میں سے چھ حاضر اور چھ غیر حاضر تھے یہ ڈگری ملٹی تنجو بڑ ہوئی تھی۔ پروفیسر کرک پیٹرک نے سرسید کو لارڈ چانسلر سے انٹرویو کر کے وقت کہا کہ "میں سب سے پہلے آپ سے یہ اجازت چاہتا ہوں کہ سرسید احمد خاں بہادر کے سی۔ ایس۔ آئی کو ان کی غیر حاضری میں ڈاکٹر اوف لازکی اسٹریجی ڈگری عطا کی جانے" اس کے بعد سرسید کی تاریخ ولادت، خاندان سلطنتِ مغلیہ کا قدیم توسل، سرکاری ملازمت، ایامِ غدر کی خدمات اور تیس انگریزوں کی جان بچانے میں نہایت شرفیاب ہیرو ہیروزم ظاہر کرنا، پرنسپل پنشن اور خطابات کا ملنا، وائسیرگیل کونسل کی ممبری، ملکی اور قومی خدمات، آثارِ الصنادید اور دیگر تصنیفات خصوصاً خطابات احمدیہ کا لکھنا، پسیکنگ کی اعلیٰ لیاقت، رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا فیلو مقرر ہونا، محمدن کالج قائم کرنا اور بڑے بڑے ارکانِ سلطنتِ ہند کا اس میں مدد دینا، یہ سب باتیں بیان کیں اور کہا کہ، "سرسید سب سے زیادہ نامور مسلمان سچکٹ حضور لکھنؤ سفیر ہند کے ہیں اور اس لیے خصوصیت

کے ساتھ یونیورسٹی کے اس اعزاز کے مستحق ہیں۔ اس کے بعد تمام حاضرین طلبہ نے تحسین و آفرین کے نعرے بلند کیے اور سرسید کو ایل ایل ڈی کی ڈگری عطا کی گئی۔ افسوس ہے کہ جو سنڈاؤنبراک کی یونیورسٹی نے سرسید کو بھیجی تھی وہ اس کتاب کے لکھتے وقت ہم کو دستیاب نہیں ہوئی۔ اس لیے ہم یہاں اس کے نقل کرنے سے معذور ہیں۔

اگرچہ سرسید اڈنبرا یونیورسٹی کی اس قدر شناسی کے نہایت شکر گزار تھے اور جو اعزاز کہ اُس نے اُن کو دیا تھا اُس پر فخر کرتے تھے لیکن انہوں نے ایسی آزریری ڈگریوں کو ڈگری پانے والوں کی اصلی لیانت کا معیار کبھی نہیں سمجھا بلکہ وہ یونیورسٹی کی ہر ایک ڈگری کو اُس قوم کے حق میں جس کے ہاتھ میں اُس یونیورسٹی کی باگ نہ ہو ایک بھیک کے ٹکڑے سے زیادہ نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک ایڈریس کے جواب میں جو اہل پنجاب نے ۱۹۴۰ء میں اُن کو بمقام جالندھر دیا، صاف کہا تھا کہ ”یونیورسٹیوں کی مثال اور ہمارے کالج کے لڑکوں کی مثال آقا اور غلام جیسی ہے۔ ہم یونیورسٹیوں کے تابع ہیں، اُس کے ہاتھ بکے ہوئے ہیں جو کچھ اُس نے علم کا وہ دیتی ہے اُس کو کھا کر پیٹ بھر لیتے ہیں اور اسی پر قناعت کرتے ہیں۔ اے دوستو ہماری پوری پوری تعلیم اُس وقت ہوگی جب کہ ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی، یونیورسٹیوں کی غلامی سے ہم کو آزادی ہوگی، ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہوں گے اور بغیر یونیورسٹیوں کی غلامی کے ہم آپ اپنی قوم میں علوم پھیلانے کے فلسفہ ہمارے ہاتھ میں ہوگا اور نچرل سائنس ہائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الہ الا اللہ کا تاج سر پر۔ یونیورسٹی کی تعلیم ہم کو صرف خچر بناتی ہے۔ اے دوستوں میں خود بھی انہیں میں ہوں کیونکہ مجھ کو بھی ایک یونیورسٹی

نے ایل ایل ڈی کی ڈگری دی ہے۔ ہم آدمی جیسی بنیں گے جب ہماری تعلیم
ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔

ٹرستی بل پر اختلاف

کالج کا انتظام ابتدا میں صرف ایک کمیٹی سے جو کالج فنڈ کمیٹی کہلاتی تھی
متعلق تھا۔ لیکن جوں جوں کالج ترقی کرتا گیا نئی نئی ضرورتیں پیش آتی گئیں چنانچہ
۱۹۸۳ء میں پہلے قواعد کی ترمیم ہو کر نئے بائی لاز بنائے گئے اور کالج فنڈ
کمیٹی کے ماتحت چار اور کمیٹیاں مقرر ہوئیں۔

- ۱۔ کمیٹی ڈائریکٹران تسلیم السنہ مختلفہ علوم ذہنیہ۔
- ۲۔ کمیٹی مدیران تسلیم مذہب اہل سنت و جماعت۔
- ۳۔ کمیٹی مدیران تسلیم مذہب اشاعتیہ۔
- ۴۔ مینجنگ کمیٹی جس کا کام بورڈنگ ہاؤس کا انتظام اور بورڈوں کی سرطرح کی
نگرانی تھا۔

اس کے بعد جب کالج کی حالت اور اس کی جائیداد بہت ترقی کر گئی اور
اس پر لوگوں کا اعتماد زیادہ ہو گیا یہاں تک کہ لوگ ہزار ہا روپیہ اپنے بچوں کی
تعلیم کے لیے پیشگی طور پر کمیشن میں امانت رکھوانے لگے تو سرسید کو یہ خیال
ہوا کہ اب کالج کا ایک معمولی کمیٹی کے سپرد سنا مناسب نہیں، اس خیال کو
پیدا ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ اتفاق سے سرسید سخت بیمار ہو گئے جب
صحت یابی ہوئی تو انہوں نے اس بات کو بہت ضروری سمجھا کہ ان کی زندگی میں سرکاری
قانون مروجہ وقت کے موافق کالج اور اس کی جائیداد کے لیے ٹرستی (۱۱ مین)
مقرر ہو جائیں اور ایسے قواعد اور رگولیشن بنائے جائیں جو تمام ضروری جزئیات

کالج پر حاوی ہوں اور جہاں تک ممکن ہو ایسا انتظام کیا جائے کہ جن اصول پر کالج کی بنیاد رکھی گئی ہے انھیں اصول پر وہ ہمیشہ قائم رہے سرسید کے معزز یوروپین دوستوں نے بھی دورانِ تشریح کی راہ سے یہی صلاح دی اور گورنمنٹ کی طرف سے بھی یہ ایسا پایا گیا کہ جب تک اطمینان کے قابل آئینہ انتظام نہ ہو گا گورنمنٹ اور حیدرآباد کی امداد جاری نہیں رہ سکتی۔

پس سرسید نے ۱۸۸۹ء میں حسبِ ضابطہ ٹرسٹیوں کے تقرر اور دیگر انتظامات کے لیے ایک کوڈ بنایا اور بل کی صورت میں چھپوا کر اس کی کاپیاں تمام ممبروں کے پاس رائے کے لیے بھیجیں۔ مولوی سمیع اللہ خاں بہادر سی ایم جی نے اس کی بعض دفعات سے اختلاف کیا جن میں سے ایک وہ دفعہ تھی جس کی رو سے انریبل سید محمود کو جانشین سکرٹری مقرر کیا گیا تھا اور ان کے ساتھ ان کے اکثر دوست بھی جن میں زیادہ تر ضلع علیگڑھ اور بلند شہر کے رئیس تھے اس اختلاف میں شریک ہو گئے، اگر یہ اختلاف اختلاف رائے کی حد سے متجاوز نہ ہوتا اور ٹرسٹیوں کے پاس ہو جانے پر بالکل رفع ہو جاتا تو ہم اس کو خدا کی رحمت سمجھتے، مگر افسوس ہے کہ وہ آخر کار مخالفت کی صورت میں بدل گیا۔ باوجودیکہ مسودہ ممبران کی پیشی کے بھرے جلسہ میں مجارٹی کی رو سے پاس ہو گیا مگر ان کی مخالفت رفع نہ ہوئی۔ چنانچہ مولوی سمیع اللہ خان اور تقریباً ان کی تمام پارٹی کالج سے بے تعلق ہو گئی۔

اگر فرض کر لیا جائے کہ سرسید کی رائے اس باب میں خطا پر تھی تو بھی جب کہ ٹرسٹیوں بل قلمدہ کے موافق پاس ہو چکا تھا تمام کالج کے ہونا خواہوں کو اسے سر پر رکھنا چاہیے تھا۔ یہی وہ مستحکم بنیاد ہے جس پر تمام شاہدہ ملکوں میں قومی جماعتیں اور قومی انسٹی ٹیوشن قائم ہیں اور روز بروز ترقی کرتے جاتے

ہیں جب تک کوئی تجویز کثرت رائے سے پاس نہیں ہوتی اس سے نہایت دور شور کے ساتھ اختلاف کیا جاتا ہے اور ایک پارٹی دوسری پارٹی پر غالب آنے کے لیے تمام وسائل جو اس کی قدرت میں ہوتے ہیں کام میں لاتی ہے مگر جہاں ایک پارٹی کثرت رائے سے غالب آئی فوراً دوسری پارٹی نے ہتھیار ڈال دیئے اور اختلاف اتفاق کے ساتھ بدل گیا۔ چنانچہ انتصار جنگ مولوی مشتاق حسین نے کہ وہ بھی اس اختلاف میں شریک تھے بل پاس ہو جانے کے بعد اس کو برسرِ حشم قبول اور منظور کر لیا اور کالج کے پہلے سے زیادہ حامی و مددگار بن گئے مگر اور صاحبوں نے قانونِ ٹریشیاں کو برسرِ گز تسلیم نہیں کیا اور کالج سے بالکل قطع تعلق کر لیا۔

اگرچہ سرسید چالیس برس برابر طرح طرح کی مخالفتیں جھیلتے رہے مگر کوئی مخالفت ان کو ایسی شاق نہیں گزری جیسی کہ مولوی سمیع اللہ خاں اور ان کی پارٹی کی مخالفت جس سے فی الواقع ان کا حوصلہ تنگی کرنے لگا تھا اور صبر و تحمل کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اول تو مولوی سمیع اللہ خاں کو وہ اپنا قوت بازو سمجھتے تھے جن سے کالج اور یورڈنگ کے انتظام اور نگرانی میں ان سے بے انتہا تقویت پہنچتی تھی اور ایسے عزیز دوست اور مددگار سے ایسی سخت مخالفت کا ظہور میں آنا فی الواقع ناقابل برداشت تھا۔ دوسرے ان کی مخالفت انھیں کی ذات تک محدود نہ تھی بلکہ کالج کے بہت سے معاون ان کے ساتھ ہو گئے تھے اور اس لیے سرسید کو ہمیشہ ہو گیا تھا کہ کہیں کالج کی چلتی گاڑی میں روڑا نہ اٹک جائے چنانچہ انھیں دنوں میں جو اٹھوں نے ایک نہایت پُر جو ش آرٹیکل علی گڑھ گزٹ میں شائع کیا تھا اور جس میں ڈائریس چل کر ڈوئل لڑنے کا چیلنج دیا گیا تھا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سرسید

کے دل کی اُس وقت کیا حالت تھی۔ اس میں شک نہیں کہ سید احمد خاں بالکل ایک ڈسپالک طبیعت کے آدمی تھے۔ اس خصیت کو چاہو اُن کے تمام برے برے کاموں کی بنیاد سمجھو اور چاہو اُن کے اخلاقی عیوب میں شمار کرو بہر حال یہ خصیت اُن میں ضرور تھی، گو وہ جزوی اور فرضی باتوں میں اختلاف رائے سے کبھی تنگ دل نہ ہوتے تھے مگر جن اصول پر انھوں نے کالج کی بنیاد رکھی اُن سے وہ ہرگز دست بردار ہونا نہیں چاہتے تھے اور جس بات کو ان میں محفل سمجھتے تھے اُس کو جہاں تک کہ اُن کے اسکان میں تھا چلنے نہیں دیتے تھے۔ اُن کا مقصد محمدن کالج قائم کرنے سے صرف یہی نہ تھا کہ مسلمانوں کی اولاد اس میں تسلیم پائے بلکہ سب سے بڑا اور مقدم مقصد جو عہدہ سے لیکر اخیر دم اُن کے پیش نظر رہا، یہ تھا کہ مسلمانوں اور انگریزوں میں ایک جہتی میل جول اور اتحاد کو ترقی ہو۔ اسی لیے انھوں نے یورپین اسٹاف کو کالج کا جزو غیر منفک قرار دیا تھا اور انگلستان سے چیدہ چیدہ آدمی بلوا کر کالج میں جمع کیے تھے مگر بد قسمتی سے ایسے اسباب جمع ہو گئے تھے کہ یورپین اسٹاف مولوی صاحب ممدوح کی طرف سے کھٹک گیا تھا اور اُن کو یقین ہو گیا تھا کہ اگر سرستید نے اپنی زندگی میں آئیندہ کے لیے سکرٹری شپ کا کوئی انتظام نہ کیا تو ان کے بعد ضروری مولوی سمیع اللہ خاں سکرٹری ہوں گے۔ انھوں نے اسی لیے بعض اور یورپین افسروں نے سرستید کو صلاح دی کہ سپہ محمود کو جاسٹ سکرٹری مقرر کر دیں تاکہ یورپین اسٹاف کا جس کو معاہدہ کر کے انگلستان سے بلایا گیا ہے سرستید کے آئیندہ جانشین کی طرف سے پورا پورا اطمینان ہو جائے، اگرچہ سرستید کو یقین تھا کہ سپہ محمود کو جاسٹ سکرٹری مقرر کرنے سے لوگوں کے دل میں طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا ہوں گی اور ایسی بدگمانیوں سے جیسا کہ

اس کتاب کے صفحات میں جا بجا مذکور ہے۔ وہ سو سو کو سبھا گتے تھے۔ اس کے سوا سید محمود کی نسبت معتبر ذریعوں سے سنایا گیا ہے کہ وہ جانٹھ سکر ٹری یا سکر ٹری بننے کو پسند نہیں کرنے تھے مگر چونکہ یورپین اسٹاٹ کو اس بات پر سخت اصرار تھا اور ان کو کالج کی آئینہ حالت کی نسبت مطمئن کرنا ضروری تھا اس لیے سرسید کو ٹرسٹی بل میں ایک خاص دفعہ سید محمود کے جانٹھ سکر ٹری مقررہ کرنے کے لیے داخل کرنی اور سید محمود کو یہ حیر اس تجویز پر راضی کرنا پڑا۔

جو لوگ کالج کے خیر خواہ تھے ان کا فرض تھا کہ اول تو اس تجویز سے اختلاف ہی نہ کرنے کیونکہ وہ ہر ایک ایسی مصلحت پر مبنی تھی جس کو سرسید نے ہمیشہ نظام کالج میں سب سے زیادہ مقدم سمجھا ہے، یہاں تک کہ اگر بالفرض کثرت رائے سرسید کی طرف نہ ہو جاتی تو سرسید قطعاً کالج کو چھوڑ بیٹھتے اور یورپین اسٹاٹ یقیناً کالج کو خیر باد کہہ کر چلا جاتا اور پھر کوئی یورپین جنٹلمین یہاں آنے کی ہامی نہ بھرتا اور انیگلو انڈین افسروں اور حاکموں کو جو ہمدردی کہ اب کالج کے ساتھ ہے وہ ہرگز باقی نہ رہتی۔ اور اگر انھوں نے اختلاف ہی کیا تھا تو بل پاس ہو جانے کے بعد لازم تھا کہ اس کو خوشی سے منظور کر لیتے اور سمجھ لیتے کہ اگر اس تجویز کے نتائج خاطر خواہ نہ نکلے تو ہر وقت اس تجویز کا تدارک اور دفعہ مذکور کی ترمیم ہو سکتی ہے لیکن اگر اس مخالفت پر باوجود پاس ہو جانے بل کے برابر اصرار کرتے رہے تو کالج کو سخت صدمہ پہنچے گا اور مسلمانوں کی پھوٹ اور نا اتفاق پر سا لہ زمانہ بنے گا۔ یہ کہنا کہ ہم حق پر تھے اور اس لیے ہم کو غلط مجاہدی کا اتباع کرنا ضروری نہ تھا، بالکل ایسی بات ہے جیسے دو فریق قرعہ اندازی پر فیصلہ کا

انحصار کریں اور جب قرعہ کسی فریق کے خاطر خواہ نہ نکلے تو یہ غدر کرے کہ اس میں میری حق تلفی ہوتی ہے اس لیے میں اس فیصلہ کو تسلیم نہیں کرتا۔

الغرض بل پاس ہو جانے کے بعد اگرچہ مولوی صاحب اور ان کی پارٹی کالج سے بالکل بے تعلق ہو گئی تھی مگر مدت تک ان کے نام ٹرسٹیوں کی جماعت میں بدستور قائم رکھے گئے اور مثل تمام ٹرسٹیوں کے سرسید ان سے بھی کالج کے معاملات میں برابر مشورہ اور رائے طلب کرتے رہے لیکن چونکہ وہ تمام کارروائی کو جو جدید قواعد کے بموجب کی جاتی تھی، غلط سمجھتے تھے اس لیے انہوں نے کبھی کبھی جواب نہیں دیا اور آخر ایک عرصہ کے بعد مجبور ہو کر ان کا نام ٹرسٹیوں کی جماعت سے خارج کر دیا گیا۔

پھر کچھ دنوں بعد نواب سر وقار الامرا مہار مدارا مہام ریاست حیدرآباد نے جبکہ وہ کالج کے ملاحظہ کے لیے علیگڑھ میں تشریف لائے ہوئے تھے، بنظر سرپرستی کالج و خیر خواہی اہل اسلام سرسید اور مولوی صاحب ممدوح کے درمیان صفائی کرا دی تھی چنانچہ سرسید نے سالانہ اجلاس ٹرسٹیاں میں مولوی صاحب اور ان کی پارٹی کے نام پھر ٹرسٹیوں میں داخل ہونے کی تحریک کی اور تمام حاضرین جلسہ نے بہت خوشی سے اس کو منظور کیا، مگر بعض مقبول وجوہات پر جن کی تفصیل طولانی ہے انہوں نے طرہی بنا منظور نہیں کیا اور جو صفائی کہ نیرا کیلنسی نے کرائی تھی سرسید کی زندگی میں اس پر کوئی عمدہ نتیجہ مترتب نہ ہوا، لیکن خدا کا شکر ہے کہ گذشتہ جولائی میں نواب لفٹیننٹ گورنر اضلاع شمال مغرب نے مسلمانوں کو بدبختی پر رحم فرما کر آئریبل سید محمود اور مولوی سمیع اللہ خان سی ام جی کے باہم چھ صفائی کرا دی ہے اور خدا کی ذات سے امید ہے کہ اس صفائی کا انجام بہتر ہوگا اور تمام

لائق اور ذی رعب مسلمان متفق ہو کر اس قومی انسٹیوشن کے استحکام و دوام اور ترقی میں دل و جان سے کوشش کریں گے۔

اگرچہ قوم کے ان دو معززہ ممبروں میں صفائی ہو جانے کے بعد ہمارا ہرگز جی نہ چاہتا تھا کہ سرسٹی بل کے ناگوار واقعہ کا ذکر کر کے ناظرین کو وہ نامبارک زمانہ یاد دلاؤں جو قومی کالج اور قومی تقسیم کے حق میں ایک سخت مصیبت کا زمانہ تھا مگر چونکہ سرسید کی باپوگرانی میں ان تمام واقعات کا جن سے ان کے اخلاق پر کوئی روشنی پڑتی ہو، استقصا کرنا ضروری ہے اس لیے جو کچھ اس معاملہ کے متعلق ہم کو معلوم تھا یا ہماری سمجھ میں آیا ہے کم و کاست بیان کر دیا گیا۔

کالج کے روپیے میں غبن ہونا

عربی میں یہ مثل مشہور ہے: "اللهم بقدر العلم" یعنی جس قدر تہمتیں عالی ہوتی ہیں اسی قدر رنج و غم زیادہ ہوتے ہیں۔ سرسید نے کالج کے عشق میں اتنے کام اپنے سر دھریے تھے کہ ایک آدمی کا ان سے عہدہ برآ ہونا سخت دشوار تھا۔ آخر ۱۸۹۵ء میں ان کو کالج کی بدولت ایک ایسا دھچکا لگا جس کا صدمہ اخیر دم تک فراموش نہیں ہوا۔ منجملہ اہلکار ان دفتر سکریٹری کے ایک شخص شام بہاری لال جون ۱۸۸۳ء سے بیڈ کلرک کے عہدہ پر مامور تھا جو علیگڑھ کے ایک ممتاز کالیستھ خاندان کا آدمی تھا اس کا باپ پنجاب میں تحصیلدار اور کسٹرا اسٹنٹ کمشنر رہ چکا تھا اور اب نیشن پاتا تھا اس کا داوالفٹنٹی پنجاب میں میرمنٹی تھا سرسید نے اس کو ایک اشرف خاندان کا آدمی سمجھ کر اپنے انگریزی دفتر میں بیڈ کلرک مقرر کر لیا تھا۔ اگرچہ سرسید کو اس کی تقرری کے برس ڈیڑھ برس بعد بتایا گیا کہ یہ پنجاب میں سرکاری ملازم تھا اور وہاں سرکاری

روپیہ غبن کرنے کی علت میں سزا سے قید پا چکا ہے مگر سرسید نے اس خیال سے کہ اول تو یہاں اُس کی تحویل میں کچھ روپیہ نہیں رہتا جس میں غبن کا احتمال ہو دوسرے اثرات آدمی ایک دفعہ زک اٹھا کر پھر ویسی ہی غلط نہیں کرتا اُس کو بدستور اس کے عہدہ پر سجال رکھا، سرسید میں ایک خاص خصالت تھی جس کو اگرچہ پرانی سوسائٹی میں ایک نہایت اثر لیا نہ خصالت خیال کیا جاتا تھا مگر اس زمانہ میں وہ سخت اعتراض کے قابل سمجھی جاتی ہے خاص کر اُس صورت میں جبکہ اُس کا اثر ذاتی معاملات سے گذر کر قومی معاملات تک پہنچ جائے، اُن میں ایک خاص قسم کی مردت بدرجہ غایت تھی وہ کسی کو ملازم رکھ کر، عام اس سے کہ اُن کا ذاتی ملازم ہو یا نہ ہو، یا وجود متواتر شکایتوں کے علیحدہ کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ اُس کے باب میں کسی قسم کی شکایت کو صحیح نہیں سمجھتے تھے کسی کی نسبت اُن کو مطلق بدگمانی نہ ہوتی تھی۔ وہ اپنے ماتحتوں پر پورا اعتماد کر لیتے تھے اور جو کام اُن کو سپرد کرتے تھے اُس کی طرف سے بالکل مطمئن ہو جاتے تھے۔ اگرچہ بغیر اعتبار کے دنیا کا کوئی کام نہیں چسپل سکتا۔ لیکن اس مشہور قول کے موافق کہ *الحذوم سوء الظن*، ضرور ہے کہ کبھی کبھی امتحاناً اپنے ماتحتوں کے کام کو جانچ لیا جائے تاکہ اُن کے دل میں ڈر رہے اور وہ ہر ایک بات کا اپنے تئیں جوابدہ سمجھتے رہیں، مگر سرسید کے دل میں کبھی اس قسم کے امتحان کا خیال نہ آتا تھا۔ شام بہاری لال چون ۱۸۶۸ء سے جولائی ۱۸۶۹ء تک اُن کے دفتر میں رہا اس عرصہ میں کبھی اُس نے یہ نہیں جانا کہ مجھ سے کوئی باز پرس کرنے والا ہے یا نہیں۔

کالج کا بہت سا روپیہ بیشک بنگال میں بصیغۂ امانت جمع رہتا تھا جو وقتاً فوقتاً بحسب ضرورت چمکیوں کے ذریعہ سے وصول کیا جاتا تھا اور کچھ پرائیمری

نوٹ مالیت کالج بطور کیٹل فنڈ کے بینک کی سپردگی میں تھے جن کا منافع تقریباً دو ہزار سالانہ بینک سے ہر سال وصول ہوتا تھا چیک بک سرٹید کے پاس ایک بکس میں بند رہتی تھی اور اس کی کنجی بھی انھیں کے پاس رہتی تھی مگر جب چیک جاری کرنے کی ضرورت ہوتی تھی تو شام بہاری لال سرٹید سے کنجی لے کر چیک نکال لیتا تھا اور اس کی خانہ پُری کر کے سرٹید سے دستخط کرا لیتا تھا اور چیک جاری کر دیتا تھا، سرٹید چونکہ انگریزی نہیں جانتے تھے اور کلرک پر اعتماد رکھتے تھے بے تامل چیک پر دستخط کر دینے تھے کئی سال تک تو وہ بیٹیک بیٹیک کام کرتا رہا مگر جب اس نے دیکھا کہ سکرٹری کو اس پر پورا اعتماد ہو گیا ہے اس نے ہاتھ ہاؤ نکالنے شروع کیے جب چاہتا سکرٹری سے کنجی لے کر چیک نکال لیتا اور جس قدر روپیہ چاہتا اس میں درج کر کے کبھی خود سکرٹری سے دستخط کرا لیتا اور کبھی آپ ان کے جعلی دستخط بنا کر چیک جاری کر دیتا۔ یہاں تک کہ جب ذرا امانت جو بینک میں جمع رہتا تھا ختم ہو گیا تو اس نے ایک نہایت دیسری کا کام کیا۔ ۴۹ ہزار کے پرائیسری نوٹ جو بطور کیٹل فنڈ کے بینک کی سپردگی میں تھے اور کسی کو ان کے منافع کے سوا اصل فنڈ میں تصرف کرنے کا اختیار نہ تھا ان پر ہاتھ مارنے کا ارادہ کیا۔ اس نے ٹرسٹیوں کی طرف سے ایک جعلی مختار نامہ بنایا جس میں بینک کو اختیار دیا گیا تھا کہ وقتاً فوقتاً جس قدر روپیہ کی کالج کو ضرورت ہو پرائیسری نوٹوں کی کفالت پر سو دی روپیہ قرض دیتا رہے اور سات ٹرسٹیوں کے جعلی دستخط کر کے اس کو بینک میں بھیج دیا۔ کچھ کم ۶۳ ہزار روپیہ تو وہ ذرا امانت میں سے عین کر چکا تھا اب نوٹوں کی کفالت پر سو دی قرض بینک سے وصول کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ علاوہ ذرا امانت کے بیالیس ہزار پالسو ستر روپیہ اور بینک

سے وصول کر کے خور و برد مگر گیا۔

پتہ یہ ہے کہ ماہ جولائی ۱۹۹۵ء کا لالچ کے حق میں، سرسید کے حق میں اور خود اس ناخدا ترس کے حق میں جس نے مسلمانوں کا کوڑی دکان سانگکا ہوا ایک لاکھ پانچ ہزار چار سو نو روپیہ شراب خواری اور عیاشی میں برد و باد کر دیا۔ سخت معنوں اور نامبارک مہینہ تھا جس کے بعد کالج کی تعمیر بائبل بند اور آگے کو چنندہ کی راہ مسدود ہو گئی۔ سرسید کا اس رنج میں گویا کام ہی تمام ہو گیا اور شام بہاری لال قالج میں مبتلا ہوا، اسی حالت میں پکڑا گیا۔ دورہ سپرد ہوا اور نہایت تلخی اور رسوائی کے ساتھ حوالا لٹا ہی میں کچھ کھا کر مر گیا۔

اگرچہ اس صدمہ کا اندازہ کرنا نہایت مشکل ہے جو اس عین فاحش سے سرسید کے دل پر گزرا ہو گا انہوں نے پھٹیوں پھٹیوں تالاب بھرا تھا اور قطرہ قطرہ اس جمع کر کے قوم کی پیاس بجھانے کا سامان مہیا کیا تھا مگر باوجود اس سخت صدمہ کے وہ نہایت غنیمت سمجھتے تھے کہ ان کی زندگی میں یہ راز کھل گیا تھا اور شام بہاری لال کی بد اعمالی سب پر ظاہر ہو گئی اگر وہ دفعتاً سخت بیمار نہ ہو جاتا تو خدا جانے یہ مادہ فاسد اندر ہی اندر کس حد تک پہنچ جاتا اور اس سے آخر کو کیا نتیجے پیدا ہوتے ہر سید نے انہیں دنوں میں جب کہ شام بہاری لال پر کالج کی طرف سے فوجداری میں مقدمات دائر ہو رہے تھے راقم کو ایک خط لکھا تھا اس میں لکھتے ہیں کہ: اگرچہ ان دنوں میں میری طبیعت نہایت پریشان ہے اور عدالت میں حاضر ہونے اور مقدمات میں حلفی اظہار وینے کی تکلیف نہایت سخت معلوم ہوتی ہے مگر جو امور تقدیری ہیں ان سے کچھ چارہ نہیں..... بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شام بہاری لال نے جو تصرف کیا وہ اس خیال سے تھا کہ چونکہ میری عمر زیادہ ہو

گئی ہے اور سوت کے دن قریب آتے جاتے ہیں، ایک دن میں مریاؤں گما اور جو کچھ اس نے جیلسازی کی ہے وہ سب تپوٹ ہو جائے گی مگر خدا کا شکر ہے کہ میری زندگی ہے میں اس کی جیلسازی اور قریب کھل گیا، ورنہ میرے بعد بڑی مشکل پڑتی اور لوگ سمجھتے کہ میں نے ہی روپیہ میں تصرف کیا ہے۔ پس خدا کی مہربانی تھی کہ میرے سامنے ہی یہ راز کھل گیا۔ بعض لوگ اپنی حماقت سے سمجھتے ہیں کہ روپیہ میری تحویل میں اور میرے قبضہ میں تھا۔ حالانکہ یہ امر بالکل غلط ہے، فالون ٹرسٹیان میں حکم ہے کہ روپیہ بینک میں جمع کیا جائے چنانچہ کل روپیہ بینک میں جمع تھا اور بینک کے خزانے سے بذریعہ جعلی چیکوں کے تصرف ہوا اور جعلی چیکوں کو روکنا جب تک کہ اُن کا حال نہ کھلے کسی بشر کے اختیار میں نہیں، بہر حال میں تو خدا کی رحمت سمجھتا ہوں کہ میری زندگی میں یہ حال کھل گیا گو کہ مجھ کو کیسا ہی رنج اور صدمہ ہو۔“

الغرض جب شام مباری لال و نعتہ فالج میں مبتلا ہو گیا اور اس کی غیرت میں بینک سے چھیاں موصول ہوئیں تو اُن کا معنون سنکر سرسید کو شبہ ہوا، انہوں نے بیک نکلا کر دیکھی تو معلوم ہوا کہ بہت سے چیکوں کے نصف ٹکڑے جو بینک میں بھیجے جاتے ہیں نثار وہیں اور اُن کے مٹنے جو چیک بک میں لگے رہتے ہیں وہ کورے بغیر کھلے لگے ہوئے ہیں جب روز نامچہ دیکھا تو ان نمبروں کے کسی چیک کی روائتی روز نامچہ میں مسدج ہ پائی گئی اور جو ڈاکٹ کے چیکوں کے ساتھ حسب قاعدہ بینک میں بھیجے گئے تھے ان کی نقل بھی رجسٹر میں نہ ملی۔ آخر جب سرسید نے بینک سے خط کتابت شروع کی اور وہاں سے تمام کاغذات کی نقلیں منگوائیں تو کلرک کی تمام چوریاں اور جیلسازیاں من وعن ظاہر ہو گئیں۔ انہوں نے حسب منشاء فالون ٹرسٹیان فوراً اس واقعہ

کی اطلاع گورنمنٹ میں بھیجی اور دس مقدمے شام مہاری لال پر فوجداری ہیں وائر کیے گئے یہاں تک کہ صاحب مجسٹریٹ نے اُس کو سپریشن کر دیا لیکن ابھی عدالت سشن میں روبرو کی گئی نوبت نہ پہنچی تھی کہ وہ حوالات ہی میں غالباً کچھ کھا کر وقت مر گیا۔

سر سید نے جو رپورٹ سالانہ اجلاس ٹرسٹیاں منعقدہ یکم جنوری ۱۹۰۶ء میں پیش کی تھی اُس سے ظاہر ہے کہ انھوں نے ایک بات کے سوا اُن تمام فرائض کے ادا کرنے میں جو بحیثیت سکرٹری ہونے کے اُن کی ذات سے علاقہ رکھتے تھے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ بلے شک اُن سے یہ بہت برسی فروگذاشت ہوئی کہ ایک مدت دراز تک یہ دھاری چورچیک بنگ میں سے نکال نکال کر جعلی چیک جاری کرتا رہا اور اُن کے مٹنے کو رے بغیر لکھے چیک بنگ میں لگے رہے اور کبھی کسی نے چیک بنگ کو کھول کر نہ دیکھا کہ اُس میں دن و ہارے کیا نوٹ چم رہی ہے اور اُس کا سبب سرسید کی وہی نیک ولی اور ان کا حسن ظن تھا جس کی وجہ سے خبیث نفس کی طرف کبھی ان کا ذہن انتقال نہ کرتا تھا جیسا کہ کہا گیا ہے۔ ”اِنَّ الْكِرَامَ اِذَا خَادَعْتَهُ لَخَدَّعَا“ یعنی کریم النفس آدمی کو جب دھوکا دو گے وہ دھوکا کھا جائے گا۔ اس ایک الزام کے سوا کسی قسم کی گرفت سرسید پر نہیں کی جاسکتی۔ اُن کا کلرک کی انگریزی تھریون پر پلا تامل دستخط کر دینا کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ تمام دفاتر سرکاری وغیر سرکاری میں اسی طرح ماتحتوں پر اعتماد کیا جاتا ہے کیونکہ اگر ان پر ایسا اعتماد نہ کیا جائے اور خواہی نحو اسی اُن کے کام کو مشتبہ سمجھا جائے تو ہر کام نہیں چل سکتا۔ اس کے سوا کلرک مذکورہ تمام جعلی چیکوں اور جعلی ڈاکٹوں پر سرسید سے دستخط نہیں کرانے بلکہ زیادہ تر اپنے ہاتھ سے جعلی دستخط بنا کر چیک جاری

کیے، جو روپیہ نوٹوں کی کفالت پر بطور سودی قرض کے بینک سے وصول کیا گیا۔ اس کا الزام بھی عائد نہیں ہوتا، کیونکہ ان کو ہر طرح سے اطمینان تھا اور اطمینان ہوتا چاہیے تھا کہ کیٹل فنڈ کی کفالت پر بینک کسی کو ایک حربہ قرض نہیں دے سکتا، اور جعلی مختار نامہ کلرک نے بینک میں بھیج کر اس کو دھوکا دیا اس کا کسی کو سان گمان بھی نہ تھا، نہ اس پر سرسید کے اصلی دستخط تھے اور نہ کسی ٹرسٹی کئے بلکہ سب کے دستخط کلرک نے اپنے ہاتھ سے بنائے تھے اور مختار نامہ بالا ہی بالاتیہ کر کے بینک کو چلتا کر دیا تھا، مرزا عابد علی بیگ صاحب ٹرسٹی کالج اور سید ولایت حسین صاحب بی۔ اے سکندھ ماسٹر اسکول ڈیپارٹمنٹ نے جو تین مہینے کی لگاتار کوشش اور محنت سے کالج کے حساب کی ابتدا سے اخیر تک جانچ پڑتال کی اور اس کا مقابلہ بینک کے حسابات سے کیا اس سے جیسا کہ سرسید کی رپورٹ میں درج ہے، صاف پایا جاتا ہے کہ بینک میں پہنچنے سے پہلے کسی طرح کا تغلب دفتر سرکاری میں نہیں ہوا، بلکہ بینک میں پہنچنے کے بعد جعلی چکیوں کے ذریعہ سے روپیہ نکلا گیا، چنانچہ سرسید کی رپورٹ مذکورہ بالا سکر تمام ٹرشیوں نے جو جلسہ میں حاضر تھے اس بات کو تسلیم کیا تھا کہ سرسید نے جو احتیاط کہ ممکن تھی اس میں کسی طرح کی فروگذاشت نہیں کی اور جس طریقہ سے کہ غبن وقوع میں آیا اس کا احتمال بہت کم ہوتا ہے اور شام مباری لال کے ہاتھ میں کسی رقم وصولی کا نہ بنا اور تمام رقوم مندرجہ روز نامہ چھپکا با لیتین بینک میں جمع ہو جاتا اس بات کے لیے کافی تھا کہ سرسید کو کلرک کی نسبت کسی طرح کی بے اطمینانی نہ ہو، اسی بنا پر جملہ حاضرین نے بالاتفاق ایک ووٹ اوف نل کا فیصلہ عیس اس مضمون کا پاس کیا کہ سرسید نے حسابات کالج میں کوئی دقیقہ احتیاط کا فروگذاشت نہیں کیا اور سید کلرک

پراس سے زیادہ ہم دسا نہیں کیا جیسا کہ انگریزی دفتروں میں عموماً ایسے عہدہ داروں پر کیا جاتا ہے۔ ایک صاحب نفاس ووٹ کے پاس ہونے کا حال سن کر کہا کہ "ٹرٹھی اگر ایسا ووٹ پاس نہ کرنے تو اور کیا کرتے! وہ خود اس الزام میں جس سے انہوں نے سکریٹری کو بری کرنا چاہا ہے، سکریٹری کے شریک غالب تھے۔ حق یہ ہے کہ ٹرٹھیوں کے پاس اس اعتراض کا کوئی معقول جواب نہیں ہے اور ہمارے نزدیک مولوی سمیع اللہ خاں نے اپنے خط موصوفہ سکریٹری مورخہ ۲۵ جنوری ۱۹۱۷ء میں بالکل صحیح لکھا تھا کہ "اگر ٹرٹھی نگرانی کرتے اور سال میں دو سال میں بھی کبھی اپنے فرض کے پورا کرنے کے خیال سے حسابات کو کالج کے جانچتے تو یہ لاکھ روپیہ سے زیادہ کے تغلب کی مصیبت، جس میں مسلمانوں کا روپیہ برباد گیا، کالج پر کیوں نازل ہوتی۔ سچی بات یہ ہے کہ گو مسلمان قومی تعلیم میں روپیہ خرچ کرنا سیکھ گئے ہیں مگر روپیہ دینے کے بعد پھر اس کی خبر لینا بالکل نہیں جانتے اور ٹرٹھیوں میں ایسے لوگ شاذ و نادر ہی نکلیں گے جو اپنے تئیں کالج کے کسی معاملہ کا ذمہ دار سمجھتے ہوں پس جب تک مسلمانوں میں یہ خیال پیدا نہ ہو گا کہ جو روپیہ ہم نے قوم کی تعلیم کیلئے دیا ہے وہ کیونکر خرچ ہوتا ہے اور اسکے محفوظ رہنے کا کیا انتظام کیا گیا ہے، اور جب تک تمام ٹرٹھی اپنے تئیں کالج کے معاملات کا جوابدہ نہ سمجھیں گے اور اپنے فرائض کو جو قانون ٹرٹھیان میں بیان ہوئے ہیں ہمیشہ نصب العین نہ رکھیں گے اس وقت تک کالج کا سر باہر بدستور خطرے میں رہے گا۔ ایک سکریٹری کس کس چیز کی خبر رکھے گا اور کہاں کہاں اپنا ذہن دوڑائے گا اور ایک قحط زدہ قوم میں ایسا جامع حیثیات سکریٹری کہاں سے آئے گا جو فکر معاش سے فارغ اہمال اور خانگی بکھیڑوں سے بالکل آزاد ہو۔ رات دن کالج کے انتظام میں مصروف رہے اور جب روپیہ کی ضرورت ہو تو در در بھیک ماگتا پھرے، گورنمنٹ اور

قوم دونوں کا معتمد علیہ ہو، سپیکر ہو، رٹائر ہو، ڈائریکٹر ہو، سب سے زیادہ سچا اور سچا باوجود ان تمام باتوں کے ایک نہایت کارآمد اور کامیاب شخص بھی ہو جو لوگوں کی چالاکیوں سے بچنے کی آگاہ اور خبردار ہو۔

سرسید کی وفات

اگرچہ غبن کے واقعہ نے سرسید کی خوش دلی کو بہت کچھ مگر کر دیا تھا مگر اس صدمہ سے ان کی طبیعت ایسی مغلوب نہیں ہوئی تھی کہ ان کی بہت اور کوشش میں فتوہ آجائے وہ تمام قومی خدمات اپنی قدیم عادت کے موافق برابر انجام دیتے تھے اور غبن کے سبب سے جو نقصان کالج کو پہنچا تھا اس کے تدارک کی فکر سے بھی غافل نہ تھے۔ لیکن اہوس ہے کہ اس غلٹ سے ابھی سبقت نہ ہوئی تھی کہ ان کو ایک ایسی لاعلاج مصیبت پیش آئی جس کا اعادہ کرنا اس سے زیادہ سخت مصیبت ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ۱۸۹۶ء کے نصف اخیر میں اس بیٹے کی علالت اور سوء مزاج نے جس پر نہ صرف باپ کو بلکہ تمام قوم کو فخر تھا سرسید کو آؤے کی طرح بٹھا دیا۔ گو یہ ظاہر وہ اس مصیبت کو اخیر دم تک نہایت صبر اور خاموشی کے ساتھ اور ایسے تحمل کے ساتھ جس کی نظیر ملتی شکل ہے، برابر جھیلے رہے مگر یہ صدمہ اندر ہی اندر کام تمام کرتا جاتا تھا۔ جو تلخ اور ناگوار حالت اس زمانے میں ان پر گزری اس کا کسی قدر اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ مرض الموت میں ایک بڑے ڈاکٹر نے ان کے ملاحظہ کے بعد لوگوں سے کہا کہ اگر یہ صدمہ ان کو نہ پہنچتا تو ان کے قوی ایسے عمدہ تھے کہ پندرہ بیس برس تک اور زندہ رہ سکتے تھے۔ باوجود ایسی تلخ حالت کے کبھی کسی نے اس کو وہ وقار شخص کی زبان سے کوئی شکایت یا افسوس کا کلمہ نہ سنا ہو گا۔ برنہ سے دو ڈیڑھ مہینے پہلے ان کو چپ لگ گئی تھی، بولتے بہت کم تھے اور زبان

اور نہیں کے سوا بات کا بہت کم جواب دیتے تھے۔ اُن کے بارغدا محسن الملک اور سید زین العابدین خاں گھنٹوں اُن کے پاس خاموش بیٹھے رہتے تھے۔ محبت کا لطف یا نکل جاتا رہا تھا۔ ایک دن سید زین العابدین خاں نے پوچھا کہ آپ ہر وقت خاموش کیوں رہتے ہیں؟ سر سید نے کہا ”اب وہ وقت قریب ہے کہ ہمیشہ چپ رہنا ہوگا۔ اس لیے خاموش رہنے کی عادت ڈالتا ہوں۔“

باایں ہمہ قومی خدمات کی دُھن اور خاص کر کالج کی بہبودی کا خیال کبھی اُن کے دل سے فراموش نہ ہونا تھا۔ اسی حالت میں انھوں نے متعدد آرٹیکل تعلیم پر لکھے۔ انھیں دنوں میں اُردو زبان اور فارسی خط کے خلاف جب تیسری بار جھگڑا اٹھا تو انھوں نے اس معاملہ کی نسبت پھر اپنی قدیم رائے مرنے سے آٹھ دن پہلے ظاہر کی اور گورنمنٹ کو اس کی طرف توجہ دلائی اور جو کمیٹی الہ آباد میں اُردو زبان اور فارسی خط کی حمایت کے لیے قائم کی گئی تھی اُس سے خط و کتابت کی اور باوجود ہر طرح کی مفذوری کے تا بمقدور اس کی تائید کرنے کا وعدہ کیا انھیں دنوں میں ایک عیسائی نے رسالہ اُتھت المؤمنین اسلام کے برخلاف شائع کیا تھا جس میں آنحضرت صلعم کی ازواج اور آپ کے اخلاق پر شبہات و بیوہ دہنی سے اعتراض کھے تھے۔ سر سید نے اول بطور تمہید کے ایک آرٹیکل اصول تنقید روایات پر اسی رسالہ کو دیکھ کر لکھا اس کے بعد اُس کا جواب لکھنا شروع کیا۔ یہ جواب ابھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ ۲۴ مارچ ۱۸۵۸ء کو اقتباس بول کا عارضہ ہوا۔ صاحب مول سرحین علی گڑھ بڑی توجہ سے علاج کرنے لگے اور میرٹھ کے مشہور میڈیکل آفیسر ڈاکٹر موریاٹی کو بھی مشورہ کے لیے بلایا گیا مگر چونکہ

۱۲ یہ جواب جس قدر لکھا گیا تھا، کالج میگزین میں چھپ گیا ہے۔

وقت ہو عود آسپینچا تھا کوئی نندہ سیرکار گرنہ ہوئی ۲۶ کی شام کو علاماتِ رویتہ
ظاہر ہونے لگیں۔ ۲۷ مارچ کی صبح سے نہایت سخت درد سراحتی ہوا جو اس
بات کی علامت تھی کہ یورک ایسڈ دوران خون میں شامل ہو کر جلد جلد
وماغ پر اپنا اثر کر رہا ہے۔ اسی دن شام کو شدید لرزہ کے ساتھ تپ
چڑھی اور تھوڑی سی دیر میں ہذیان کی صورت پیدا ہو گئی۔ ان کی عادت
تھی کہ ہمیشہ بیماری کی شدت میں ”حَسْبِيَ اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ“ بار بار پڑھا کرتے
تھے۔ اس واقعہ بھی ہذیان کی حالت طاری ہونے سے پہلے قرآن کی یہ دو
آیتیں برابر ان کی زبان پر جاری رہیں۔ حَسْبِيَ اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ نِعْمَ الْمَوْلَى وَنِعْمَ
النَّصِيرُ ۲۱ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ يَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا صَلُّوا عَلَیْهِ
وَصَلُّوا عَلَیْهِ وَسَلَّمَ“ مگر تپ کی شدت اور ہذیان کی حالت میں کوئی بات جو سمجھ
میں آئے ان کی زبان سے نہیں نکلی، گویا کہ تپ کے چڑھتے ہی تھوڑی دیر
بعد احتضار شروع ہو گیا تھا۔ تین گھنٹے سخت کرب اور بے چینی رہی اور رات
کے دس بجے حاجی اسمعیل خاں کی کوشش میں جہاں مرنے سے دس بارہ روز پہلے
حالتِ صحت میں وہ سید محمود کی کوشھی سے اٹھ گئے تھے، وفات پائی دوسرے
دن ساڑھے پانچ بجے دن کے جنازہ اٹھایا گیا۔ مدرسۃ العلوم کاکل اسٹان
اور تمام طالب علم اسٹیشن کے یورپین اور ہندوستانی افسر اور اہل کار، علیگڑھ
کے رئیس اور سردار جبہ کے مسلمان ہندو اور عیسائی اس کثرت سے جنازہ
کے ساتھ تھے کہ غالباً علیگڑھ میں اس نوعیت کا ازدحام کسی نے نہ دیکھا ہو
گا۔ جو راج مزدور پڑھنی اور سنگلاش ۲۵، ۲۶ برس سے کالج میں کام کرتے
تھے وہ اور ان کی عورتیں اور بچے جو دیہان سے یہ خبر سن کر آنے تھے جنازہ
کی گذرگاہ کے ایک جانب کھڑے ہوئے نہایت حسرت بھری نگاہ سے

اپنے مربی کے جنازہ کو تکا رہے تھے اور اکثر طالب علم ناز و قطار روتے جاتے تھے۔ الغرض ۶ بجے کے بعد کرکٹ فیلڈ میں جنازہ کی نماز ہوئی۔ جنازہ کے بعد جب جنازہ فیلڈ سے بورڈنگ ہاؤس کے احاطہ میں داخل ہوا تو گاڑی آف آئر تے۔ جو گورنمنٹ کی طرف سے مامور ہوا تھا۔ پریوینٹ اوف آفس کی سلامی اتاری اور قبیل مغرب مسجد مدرسۃ العلوم کے شمالی پہلو پر پہنچے تو تھوڑی سی جگہ مسجد کی حد سے خارج اس کے احاطہ کے اندر بے کار ٹہری تھی، وہاں اس قوم کی امید گاہ اور پشت پناہ کو دفن کیا گیا۔

قوم را سراپایہ مجدد علا از دست رفتہ
بعد از ان کاہی گنج را در خاکداں انداختند

تا قیامت گوئی از تاریخ ما فارغ شدند

کابں مصیبت بر سر اسلامیان انداختند

اگرچہ سرستید کی وفات کی بے شمار تاربتجیں کھئی گئی ہیں لیکن دو عربی ماورے بحیب و غریب بکلمے ہیں ایک " غُفَّالَہَا " اور دوسری قرآن مجید کی یہ آیت " اِنِّیْ مُتَوَقِّئُکَ وَرَافِعُکَ اِلَیْ وَ مَطْہَرُکَ "

اس شخص کے مرنے پر جس غیر معمولی طریقے سے نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ غیر قوموں نے اور نہ صرف ہندوستان میں بلکہ غیر ملکوں میں بھی رنج و افسوس کا اظہار کیا گیا ہے، اس کی مثال ملنی دشوار ہے۔ تعزیت کے کچھ کم دو سوتار جن میں سے کسی قدر بذریعہ کالج میگزین کے شائع کیے گئے تھے، اطراف ہندوستان

لے اس آیت میں عیسیٰ کی طرف خطاب ہے جس میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے عیسیٰ میں تجھ کو موت دیتے والا ہوں اور اپنی طرف اٹھائینے والا ہوں اور تجھ کو کافروں کے انجام سے

پاک کرنے والا ہوں ۱۲

سے اُن کے بیٹے کے نام پہنچے اور تمام ہندوستان میں شاید ہی کوئی اسلامی انجمن یا سوسائٹی ایسی رہ گئی ہوگی جس میں سرسید کی وفات پر ماتمی جلسہ اور رینج و ملال کا اظہار نہ کیا گیا ہو۔ حضور وائسرائے اور نواب لٹنٹ گورنر کے علاوہ اکثر لوہر پین افسروں اور عاکموں نے بذریعہ تار یا تحریر یا تقریر کے اس بزرگ کی موت پر رینج ظاہر کیا۔ نواب لٹنٹ گورنر نے صاحب کلکٹر علی گڑھ کو بذریعہ تار کے اطلاع دی کہ ہزار آؤں کی طرف سے جنازہ کی مشابعت اور دفن میں شریک ہوں تاکہ میں کوئی انگریزی یا دیسی اخبار ایسا نہ ہوگا جس میں بار بار اس عالمگیر حادثہ پر آرسکل یا نوٹ نہ لکھے گئے ہوں اور بہت سے اخباروں نے تو آج تک اپنے کالم اس مضمون کے لیے وقف کر رکھے ہیں، لندن کے بڑے بڑے نامور اخباروں میں ایسے ٹائمز آف لندن، پال مال گزٹ، ایوننگ سٹینڈرڈ، ایکو، پیپل، ڈیلی میل، لائٹننگ ایوننگ نیوز وغیرہ وغیرہ اس واقعہ کو ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک نہایت اعلیٰ درجے کی پوشکل طاقت کے نوال سے تعبیر کیا گیا اور اینگلو انڈین اور مسلمانوں دونوں کے لیے ایک عام مصیبت بیان کیا گیا۔

انگلستان میں جو ایک مسلمانوں کی سوسائٹی موسوم بہ "مسلم پیٹر یا کنگ لیگ" ہے اُس میں بھی سرسید کی وفات پر ایک ماتمی جلسہ کیا گیا جس میں مولوی رفیع الدین احمد نے ایک ریزولوشن اس مضمون کا پیش کیا تھا کہ سرسید کی خدمات کا شکریہ ادا کرنا اور اُن کی وفات پر رینج و افسوس اور اُن کے وارثوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا جائے۔ ٹائمز آف لندن نے بھی اس جلسہ کا ذکر کیا تھا اور سرسید کی وفات پر ایک لبا آرسکل چھاپا تھا جس میں لکھا تھا کہ توہ (یعنی سرسید) اپنے ہم مذہبوں کی حمایت میں اُن کو سائنس کے

حملوں سے بچانے کے لیے ہمیشہ تیار رہے ہیں اور خود ہمارے کالموں نے اور بعض بڑے بڑے میگزینوں نے ان کی اس علمی اور منطقی لیاقت کی شہادت دی ہے۔ جو انھوں نے اپنی قوم کی حمایت میں ظاہر کی۔ اس کے بعد اس میں لکھا تھا کہ "کسی شخص نے ہندوستان کے مسلمانوں کو بیدار کرنے اور ان کو اپنے تنزل اور خاص کر تعلیم کے ضروری معاملے کا خیال دلوانے میں ان کے کام کا دسواں حصہ بھی نہیں کیا۔ فی الحقیقت جب اس معاملے میں ان کی عمر بھر کی لگانا کوششوں اور تعجب انگیز کامیابیوں کو دیکھا جاتا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیم کا پیغمبر کہا جائے۔ علیگڑھ کی سوسائٹی اس کا مطبع، اس کا اخبار اور محمدن کالج جو کیمبرج اور آکسفورڈ کے کالجوں کے نمونے پر مسلمانوں کی شریف قوموں کے لیے بنایا گیا ہے۔ یہ سب اس کی بہت عقل اور فراخ حوصلی کی شاندار یادگاریں ہیں۔"

پال مال گزٹ مورخہ ۲۹ مارچ میں سرسید کی نسبت لکھا تھا کہ "سرکار انگریزی اور باشندگان ہند کے تعلقات کی کہانی میں کوئی باب ایسا نہیں ہے جس پر ہم دل سے اپنے تئیں اس قدر مبارک باد دے سکیں جس قدر سرسید احمد خان کی زندگی پر۔ وہ ابتدائے عمر سے آخر دم تک انگریزی راج کا پکا دوست رہا اور جو خدمتیں اس نے کیں ان کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا مشکل ہو گا۔"

انگلستان کے اخباروں کے حوالہ سے یورپ کے اکثر اخباروں میں اور نیز ممالک اسلامیہ کے بعض عربی اخباروں میں بھی اس حادثہ پر افسوس کیا گیا تھا۔ چنانچہ الموبید میں انھیں کے حوالہ سے لکھا تھا کہ مسلمانوں میں سید مرحوم ایک بڑے زبردست پرورش تھے اس لیے مرحوم کی وفات اسلامی دنیا میں ایک عالمگیر مصیبت خیال کی گئی ہے۔ خدا ان کی مغفرت کرے اور

مسلمانوں کو ان کا نعم البدل عنایت کرے۔

پابونیر سورخہ ۲۹ مارچ ۱۹۰۸ء میں اس واقعہ کی خبر پہنچے ہی یہ لکھا گیا تھا کہ ”سر سید احمد خاں جو ایک وہر اندیشین مڈبر ہونے کی وجہ سے تعلیم کا نہایت سرگرم حامی تھا اُس کے انتقال کے ساتھ اُس نہایت مفید بار آور اور نہایت زبردست یونٹل طانت کا خاتمہ ہو گیا ہے جس نے موجودہ صدی کے اخیر ربع میں ہندوستان کی اسلامی دنیا کو متحرک کر دیا تھا۔“

ٹائمز آف انڈیا سورخہ ۲۹ مارچ ۱۹۰۸ء میں جو ایک آرٹیکل کسی اینگلو آئڈین کا لکھا ہوا اس واقعہ کے متعلق چھپا تھا اُس میں سر سید کی نسبت لکھا تھا کہ ”اُس کا یہ خیال تھا کہ اسلام کو دوبارہ اس درجہ پر پہنچا دیا جائے جو بارہویں صدی عیسوی میں علم و حکمت کا سرب ہونے کی حیثیت سے اُس کو حاصل تھا جو اسپین، انگریزوں اور ہندوستانوں نے اطراف ہندوستان کے ماتمی جلسوں میں سر سید کی وفات پر کی ہیں وہ گنتی اور شمار سے خارج ہیں، یہاں ہم صرف دو محرز اور لائق انگریزوں کی تقریر کا خلاصہ لکھتے ہیں، جن کو مدت دراز تک علیگڑھ میں رہنے اور سر سید سے ملنے جلنے اور ان کے حالات پر غور کرنے کا اتفاق رہا۔“

مسٹر پورٹر، کلکٹر و مجسٹریٹ میرٹھ نے جو تقریر میرٹھ کے ماتمی جلسہ واقع ماہ اپریل ۱۸۹۸ء میں کی اُس میں انھوں نے کہا ”آج اس جلسہ میں ہم پر ایک غم کی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ سر سید احمد کے انتقال سے نہ صرف ملک نے ایک بڑا رکن سلطنت اور قوم کا بڑا خیر اندیش کھو دیا ہے بلکہ حاضرین جلسہ میں سے اکثر کا ایک ذاتی دوست ہاتھ سے جاتا رہا ہے۔۔۔۔۔ اگر میں نے اُس کی زندگی کے مطالعہ میں غلطی نہیں کی تو (میں کہہ سکتا ہوں) کہ جہاں اُس میں اور

بڑے بڑے اوصاف موجود تھے اُن میں دو بہت ہی اعلیٰ درجہ کے تھے،
 اول اُس کی اعلیٰ درجہ کی حب الوطنی اور دوسری اعلیٰ درجہ کی دلیری اُس نے
 گویا ابتدائے عمر ہی میں معلوم کر لیا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان بالوستانہ
 جہالت میں ڈوبتے جاتے ہیں اور اُن کو روشن ضمیر بنانے کی سخت ضرورت
 ہے۔ بڑی بڑی قومی ضرورتیں رفع کرنے کے لیے ہمیشہ بڑے آدمی درکار ہوتے
 ہیں اور یہ ہندوستان کے مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ ایسا بڑا شخص اُن
 کی ضرورت رفع کرنے کو اٹھا۔ سر سید احمد نے مجبوری کے ساتھ اپنے
 تمہیں تقدیر کے حوالہ نہیں کیا اور نہ اُس نے گورنمنٹ سے مدد چاہی کیونکہ وہ
 جانتا تھا کہ جو کام اس کو پیش ہے اگر اُس کو پورا کرنا ہے تو قوم ہی اس کو
 پورا کرے گی اور اس لیے اس نے زندگی کے ایک ایسے زمانے میں جب
 کہ ہم میں سے اکثر ہاتھ پاؤں ہلانے سے جی چراتے ہیں اور باقی عمر کو اپنی ذاتی
 آسائشوں اور ذاتی افتزائشوں کے لیے مخصوص کر دیتے ہیں، اپنا وقت، اپنی
 طاقت، اپنا روپیہ، اور سچ پوچھو تو اپنا سب کچھ ہم جنسوں کی بھلائی کے لیے
 وقف کر دیا۔ ہم میں سے جو یہاں موجود ہیں کوئی شخص ان مشکلات کا جن کا
 اُس کو مقابلہ کرنا پڑا اور اس عزم جہزم کا جو ان مشکلات کے مغلوب کرنے
 کے لیے مطلوب تھا، تصور اور اندازہ نہیں کر سکتا لیکن باوجود تمام مشکلات
 اور تمام ناامیدیوں کے وہ اپنے منصوبہ پر کامل وثوق رکھتا تھا اور اُس کو اپنی
 کوششوں کا ثمرہ مل گیا۔

اس کے بعد مسٹر پورٹرنے کالج کی ابتدا اور اُس کی ترقیات کا ذکر
 کرنے کے بعد کہا کہ "لندن کے سینٹ پال کیتھدرل میں سر کرستوفر رن

کی لاش مدفون ہے اور اُس کی قبر پر لٹین میں یہ مشہور کتبہ کندہ کیا ہوا ہے کہ اگر تم اُس کی یادگار تلاش کرنی چاہتے ہو تو اپنے چاروں طرف دیکھو جن لوگوں نے یہ کتبہ دیاں کندہ کرایا تھا انہوں نے خیال کیا اور صحیح خیال کیا کہ اس بڑے نقاش کی سب سے عمدہ یادگار یہی نامی گر جا ہے جو اُس کے مجوزہ نقشہ پر بنایا گیا ہے۔ اسی طرح جب تم سے لوگ مر سید کی یادگار پوچھیں تو تم بھی اُس عالیشان کالج کو بتا سکتے ہو جس کی بنیاد اُس نے ڈالی ہے اور کہہ سکتے ہو کہ اپنے چاروں طرف دیکھو۔ لیکن اگر تم اور تمہاری آئینہ نسلیں اپنے بڑے سید کی زندگی کے سبقوں کو خوب ذہن نشین کر لیں گی تو اُس سے بھی زیادہ عالیشان یادگار اُس کے لیے قائم کریں گی۔ تم نہ صرف سب سے جان پہچان پٹ اور سالے کو بلکہ ایک بڑے قومی کالج کی زندہ اور زندگی بخش طاقت کو اور اُس کے تعلیم یافتہ گروہ کی بے سقم تربیت، حب الوطنی، خود اعتمادی اور سب سے بڑھ کر اُن کی اعلیٰ درجہ کی اخلاقی طاقت کو پیش کر سکو گے۔

و صاحبو! ایک ایسے وقت میں جیسا کہ یہ وقت ہے میں جو ایک مختلف کونسل کا ممبر اور مختلف مذہب پر یقین رکھنے والوں آپ سے ایک درخواست کر سکتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ تم تمام اختلافات اور حسد اور عداوت کو جس نے تمہیں متفرق کر رکھا ہے اپنے مرحوم سید کی قبر میں دفن کرنے پر راضی ہو جاؤ۔ خفیہ خفیہ باتوں یا مذہبی خیالات میں تم مر سید کے ساتھ یا باہم گر کیسا ہی اختلاف رکھو مگر تم سب کو اُس عالیشان جانفشانی کی جو اُس نے اسلام کی حمایت میں ظاہر کی اور اُن اعلیٰ نتائج کی جو اس جانفشانی کی وجہ سے اُس نے حاصل کیے؛ فہم کرنی چاہیے۔ اگر تم صرف اُس کے کام ہی کو جاری رکھو گے تو یقیناً تم کو کامیابی حاصل ہوگی کیونکہ میں تم کو یاد دلاتا ہوں کہ دنیا میں اتفاق

اور صرف اتفاق ہی کا نام طاقت ہے۔“

مسٹر آرنلڈ نے جو انجمن اسلامیہ لاہور کے ماہی جلسہ واقع ۲۹ مارچ سنہ مذکور میں سرسید کی وفات پر تقریر کی اُس کا ترجمہ ہم اول سے آخر تک نقل کرتے ہیں انھوں نے کہا، میں امید کرتا ہوں کہ اس موقع پر مجھ کو اس کا لحاظ سے کہ دس برس تک اُس بزرگ اور شریف آدمی کی خدمت میں مجھے رہنا نصیب ہوا ہے جس کی موت پر ہم اس وقت رنج و الم ظاہر کرتے ہیں، چند الفاظ کہنے کی اجازت دی جائے گی۔

مجھ کو دس برس تک اس عجیب و غریب اور بالاترین شخص سے تقرب اور دوستی کی عزت حاصل رہی ہے۔ نہیں نہیں بلکہ فرزند کے شفقت پھر لفظ سے انھوں نے مجھ کو مخاطب کیا ہے۔ اس دس برس میں سوئے زمانہ تعطیل کے مجھ کو سرسید سے روزانہ ملنے جلنے کا اتفاق رہا۔ ان کا مکان میرا گھر سے چند قدم کے فاصلے پر تھا جس کا دروازہ ہر وقت میرے لیے کھلا رہتا تھا جس قدر سرسید سے کوئی شخص زیادہ واقف ہوتا تھا اسی قدر ان کی بزرگی اور عظمت کا زیادہ معترف ہوتا تھا کیونکہ حقیقی عظمت کا اگر کوئی انسان مستحق ہو سکتا ہے تو یقیناً سید احمد شاہ اس کے مستحق تھے۔ تاریخ سے معلوم ہو گا کہ دنیا میں بڑے آدمی اکثر گزرے ہیں لیکن ان میں مہبت کم ایسے نکلیں گے جن میں یہ حیرت انگیز اوصاف اور ایاتیں مجتمع ہوں، وہ ایک ہی وقت میں اسلام کا محقق، علم کا حامی، قوم کا سوشل ریفارمر، پولیٹیشن، مصنف اور مضمون نگار تھا، اس کا اثر اس سوچنے والے عالم کا ساتھ تھا جو گوشہ تنہائی میں بیٹھا اپنی تحریروں سے لوگوں کے دل اکساٹے بلکہ علانیہ دنیا کے سامنے لوگوں میں لوگوں کا رہبر بن کر اس لیے آیا کہ جس بات کو صبح اور صبح سمجھے۔

اگر اس کی دنیا مخالف ہو تو ساری دنیا سے لڑنے کے لیے ہر وقت تیار اور آمادہ رہے۔ ہندوستان میں ہم کو ایسے شخص کی مثال جیسا کہ وہ تھا کہاں مل سکتی ہے کہ نہ جاہ و مرتبہ تھا اور نہ دولت تھی باوجود اس کے ہندوستان میں مسلمانوں کی قوم کا سردار بن کر ظاہر ہوا۔ یہ وہ مرتبہ ہے جو اس سے پہلے کسی شخص کو بغیر تلوار کے زور کے حاصل نہیں ہوا، سرسید نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ لاہری، غفلت، جہالت اور ذلت سے جن میں وہ مبتلا تھے اپنے تئیں نکالیں اور دیکھو اس کی پکار پر ایک نئی نسل اٹھ کھڑی ہوئی، لوگوں نے سرسید کو چھوٹا سمجھا، ان کی باتوں کو ہنسی پر محمول کیا اور چاروں طرف سے ان پر طعن و تشنیع کی بوچھاڑ ہوئی مگر اس نے تمام مخالف قوتوں کو سامنے سے ہٹایا اور رستے کی تمام خس و خاشاک کو صاف کرتا ہوا اس منزل کی طرف سیدھا ہویا جس پر پہنچنا مقصود تھا۔ جو منصوبے وہ باندھتا تھا ان کی طرف سے اول گورنمنٹ کو اطمینان دلانا ہوتا تھا جو اہتدایں اس اندیشہ سے کہ وہ کہیں سلطنت کے احکام اور ناک کے امن میں خلل انداز نہ ہوں مطمئن نہ تھی اور پھر اپنے ہم مذہبوں کے تعصبات اور اوہام سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا جو سرسید سے اس لیے بدگمان تھے کہ اس نے مذہبی مسائل میں ایک نیا اسکول قائم کیا تھا جس کی وجہ سے وہ اس کو ملحد اور بے دین کے نام سے پکارتے تھے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس میں ہم نہایت مضبوط شہادت سرسید کی طبیعت کی اس متقناطیسی قوت پر باتیں ہیں جس سے وہ لوگوں کے دلوں کو تسخیر کرتی تھی۔ وہ ایک ایسی قوم میں جس کی قومیت کی بنیاد صرف مذہب پر قائم ہو اور ایسی حالت میں جب کہ وہ نیچری اور کافر سمجھا جاتا ہو اپنی قوم کو مسلم سرکار مانگا گیا۔ تاریخ اسلام میں بہت سی مثالیں ایسی تحریکوں کی پائی جاتی ہیں جن کو مذہبی پیشواؤں نے

شروع کرتے تھیں تاکہ پہنچایا اور ہزاروں پروفیڈر ان لوگوں میں سے جو مذہبی خیالات میں اشتراک رکھتے تھے پیدا کرے۔ لیکن کوئی شریک ایسا کہ میں یقین کرتا ہوں، اسلام کی تاریخ میں ایسی نہ ملے گی جس میں ایک مسلمان شخص ایسے مسلمانوں کا سرپرست تسلیم ہوا ہو جو اس کے مذہبی خیالات سے ہم درومی نہ رکھتے ہوں۔

”جب سر آک لینڈ کالون ہندوستان سے جاتے لگے تو علی گڑھ میں آئے اور اپنے دوست سید احمد خاں کے ذکر میں جن کو انھوں نے گریٹ ہین کے لفظ سے یاد کیا تھا غم کے اس ہولناک زمانے کا ذکر کیا جب کہ لوگوں کے دل عداوتوں سے بھرے ہوئے اور انتقام کے خیالات دلوں میں موج زن تھے انھوں نے کہا کہ ”اس وقت کیا ہندوستانیوں میں اور کیا انگریزوں میں سرسید پہلے شخص تھے جنھوں نے اس سوال کی طرف توجہ کی کہ اس خرابی کا کیوں کر علاج ہوا اور حاکم و محکوم میں کس طرح آشتی پیدا ہو۔“

”سر سید نے قدر شاہ کے بعد سب سے پہلے انگریزوں اور ہندوستانیوں میں دوستی پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس وقت سے مرنے دم تک وہ اسی بات میں کوشش کرتے رہے کہ قلم سے زبان سے اور نصیحت و تنبیہ سے حاکم اور محکوم کے زخموں پر مرہم لگائیں اور ان میں ایک مضبوط اتفاق پیدا کریں۔“

”آپ کو معلوم ہے کہ برٹش گورنمنٹ کی طرف سے اور سچی قوم کی طرف سے سر سید کی قدر و منزلت ہوئی لیکن یہ عزت اور خطاب ہمیشہ بے طلب آنے لگا۔ دنیا کے سگ طبیعت لوگ اس بات پر جس قدر ان کا جی چاہے بھونکنے لگے لیکن میں جو برہمنوں سے سرسید کو جانتا ہوں اس بات کو سچ سمجھتا ہوں ہیں آج تک کبھی کسی ایسے شخص سے نہیں ملا ہوں جس نے سرسید سے

زیادہ شریف و نڈگانی بسر کی ہو جو جاہ طلبی میں ان سے زیادہ بے غرض ہو اور جو ان سے زیادہ سچ کا حامی اور دوسروں کی خدمت پر اپنے تمہیں وقف کر دینے والا ہو یہی وجہ ہے کہ یہاں آج ہم اسکی ہوت پر رقتے ہیں اب اس جیسا کوئی کہا دے گا۔

” ایک اور بات رہ گئی ہے جس کو میں اس وقت کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اگر آپ کے یہ اسوجھوٹے نہیں ہیں اور آپ جو سرسید کے ہم نوا ہیں اور ثنا خواں ہیں اگر آپ کا یہ غم و الم سچا ہے تو کیا آپ کو رونے کے علاوہ کوئی اور کام باقی نہیں ہے! سمجھ لیجیے کہ یہ شخص جس کو آپ رو رہے ہیں یہ اس قدر مفلس تھا کہ نہ اس کے پاس رہنے کو گھر تھا نہ مرنے کو، لیکن پھر بھی اس نے ایک دولت آپ کے لیے چھوڑی ہے وہ آپ ہی کیلئے یہ کام چھوڑ گیا ہے کہ تعصب اور جہالت کے مقابلہ میں شریفانہ لڑائی جاری رکھو اور آپ ہی کے پیرو یہ کام کر گیا ہے کہ اپنی افتادہ قوم کو اٹھاؤ اور موجودہ فرائض زندگی جو کچھ ہیں ان سے اپنی قوم کی مصالحت کراؤ۔ اس شخص نے آپ کے لیے ایک ایسی مثال چھوڑی ہے کہ اگر آپ نے اس کی پیروی کی تو وہ آپ کے اور آپ کی اولاد کے قبضہ میں سب سے بڑی دولت ہوگی۔“

جس قدر مریشیے اردو، فارسی اور انگریزی میں اس حادثہ پر لکھے گئے ہیں ظاہر واقعہ کہ بلا کے بعد کسی شخص کی موت پر نہ لکھے گئے ہوں گے کہتے ہیں کہ جعفر بن یحییٰ برمکی اور معن بن زائدہ شیبانی کے مرنے پر بھی شعرا نے عرب نے بے شمار مریشیے لکھے تھے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ وہ تعداد میں سرسید کے مرثیوں سے کچھ کم نہ تھے تو بھی وہ مریشیے ان مرثیوں سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے۔ ان میں شعرا اپنے ذاتی فائدوں اور شخصی منفعاتوں کو روتے تھے جو ان کی ذات کو جعفر اور معن کے بذل و عطا سے ہمیشہ پہنچتی تھیں اور ان میں اس نقصان عظیم پر

افسوس کیا گیا ہے جو قوم کے تمام افراد کو ایک شخص کے مرنے سے پہنچا ہے۔ وہ ان شخصوں کی شان میں لکھے گئے تھے جو لوگوں کی جیبیں درہم و دینار سے بھرتے تھے اور یہ اس شخص کے لیے لکھے گئے ہیں جو لوگوں کی جیبیں خالی کرتا تھا۔ ان کا موضوع ایک خاندان یا ایک قبیلہ کی تباہی پر افسوس کرنا تھا اور ان کا موضوع تمام قوم کی مصیبت پر رنج و افسوس کرتا ہے۔ عرب کے ایک شاعر اشمع بن عمر سلمی نے جو اشعار اپنے باپ کے مرثیہ میں بطور مبالغہ کے لکھے تھے سچ یہ ہے کہ مرثیہ سے بہتر ان کے مضمون کا کوئی مصداق نہیں ہو سکتا۔

الْحَضِي بْنُ سَعِيدٍ حِينَ لَمْ يَتَوَقَّ مَشْرِقًا
وَمَا كُنْتُ أَذْرِي مَا فَوَاضِلُ كَفِّهِ
عَلَى النَّاسِ حَتَّى حَيَّيْتَهُ الْمَبْتَلِخَ
عَلَى أَحَدٍ إِلَّا عَلَيْهِ النَّوَاحِجُ
كَأَنَّ كَرَمِيكَ حَتَّى سَوَّاهُ وَكَرَّمْتُمْ

ترجمہ: ابن سعید گزر گیا جب کہ مشرق اور مغرب میں کوئی جگہ ایسی نہ رہی جہاں اس کا کوئی نہ کوئی مداح نہ ہو جب تک کہ وہ قبر میں دفن نہ کیا گیا ہی نہیں جانتا تھا کہ لوگوں پر اس کے قدر احساسات ہیں۔ گویا اس کے سوا دنیا نہ کوئی زندہ آدمی مرے اور نہ کسی پر فوجہ کیا گیا ہے۔

مجموعہ ان بے شمار مرثیوں اور نوحوں کے جو اس حادثہ عظیم پر لکھے گئے ہیں چند اشعار ایک یورپین فاضل لیڈی نے بھی انگریزی زبان میں ترتیب دیئے ہیں چونکہ شرمی دنیا میں شاید یہ پہلی ہی مثال ہے کہ ہندوستان کے ایک مسلمان کی موت پر انگلستان کی ایک شریف لیڈی ایک نظم بطور مرثیہ کے اپنی زبان میں لکھے اس لیے ہم اس لطیف سونٹ (مرثیہ) کا ترجمہ اس مقام پر لکھتے ہیں:

ۛ ایک تنادر درخت جہاں کھڑا تھا وہیں گر پڑا۔ اس کی سایہ دہانیاں

جو چاروں طرف دور تک جھومتی تھیں صحت بخش شبنم ان سے چمکتی
تھی اور انھوں نے کثرت سے بیج بکھیرے تھے، ان کے سایہ
میں بنجر زمین اصلاح پا گئی۔

بیج پھوٹ نکلے، شگفتہ و شاداب پھول کھلنے لگے اور خوب صورت
نوںہالوں نے جو طاقت اور حسن سے آراستہ تھے اس ویران ریگستان
کو گلزار بنا دیا۔ روؤ! اب شاہانہ درخت کے لیے کہ اجل نے اُس
کو گرا دیا ہے۔

نغم کرو، مگر امید کے ساتھ، کیونکہ اس کی بہری بھری کھیتیاں جو اُس کی
سالہا سال کی محنت کا ثمرہ ہیں اُس کی قبر کے گرد لہلہا رہی ہیں جن
نوںہالوں کو اُس نے اپنی چھالوں میں پرورش کیا تھا وہ پھول رہے ہیں
اور پھینک رہے ہیں۔ یہ نوںہال بھی اسی کی مات دزدندہ رہیں
گے تاکہ کسی ویرانہ کو گلزار بنا جائیں۔

مہر سید کی ذہانت پر لوگوں نے صرف زبانی مدح و ثنا اور مرثیہ خوانی و
نوحہ خوانی ہی پر بس نہیں کی بلکہ علیٰ طور پر اس بات کا کافی ثبوت دیا ہے کہ
یہ شخص اپنی راست بازی اور خلوص سے ایک عالم کے دل میں اپنی عظمت کا
نقش بٹھا گیا ہے اور اپنی محبت کا بیج بو گیا ہے اور قومی ہمدردی کی چٹیک ایک
ایسی مردہ دل قوم کو لگا گیا ہے جو سرد مہری میں ضرب المثل اور نا اتفاقی میں
شہرہ آفاق غمی مہر سید کے مرتے ہی کچھ لوگ ان کی ایک عظیم الشان یادگار
یعنی محدث یونیورسٹی قائم کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے جن کا اپیل مسلمانوں نے
اور خاص کر پنجاب کے زندہ دل مسلمانوں نے بڑی توجہ اور مہارت و ذوق
شوق سے سنا اور اس کی تائید پر فوراً کمر بستہ ہو گئے۔ اہل پنجاب نے

سخت تقاضوں سے ان کو لاہور میں بلایا اور اٹھانے راہ میں اسی گرج پوٹھی کے ساتھ جیسی کہ سرسید کے استقبال میں ظاہر کی جاتی تھی، ان کی آؤ بھگت اور مدارات کی گئی۔ یونیورسٹی کے لیے مالیر کوٹلہ اور لاہور میں بڑی اسٹاک اور چاؤ سے لوگوں نے چندہ دیا اور صرف صوبہ پنجاب سے دو لاکھ روپیہ جمع کرنے کا وعدہ کیا گیا۔ لاہور کے جلسوں میں سرسید کی تصویریں جن کی آئینہ دو آنے سے زیادہ قیمت نہ تھی پانچ پانچ روپیہ کو لوگوں نے خریدیں بعض جوان مرد تاجروں نے اپنے منافع کا ایک معتد بہ حصہ سرسید کی یادگار کے لیے مخصوص کر دیا۔ اکثر تھوڑی تھوڑی تنخواہ کے ملازموں نے اپنی ایک ایک پوری تنخواہ چندے میں دیدی۔ کالجوں اور اسکولوں کے طلبہ نے بڑے شوق سے چندہ جمع کیا۔ طالب علموں کی ایک جماعت نے خاص اس کام کے لیے دوکان لگائی تاکہ جو کچھ اُس سے فائدہ ہو اس فنڈ میں جمع کیا جائے پنجاب کے سوا اور اطراف میں بھی اس کی تحریک شروع ہو گئی ہے یہاں تک انگلستان میں جو مسلمان طلبہ کی ایک مختصر جماعت نے انجمن اسلامیہ قائم کر رکھی ہے اس میں بھی گرج پوٹھی سے چندہ کی تحریک ہوئی اور پہلے ہی جلسے میں حاضرین نے بیس پونڈ دینے کا وعدہ کیا اور آئندہ چندہ کے لیے کوشش کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اضلاع شمال و مغرب کے بعض مقامات میں بھی معقول چندہ کیا گیا ہے اور دکن میں بھی اس کے لیے تحریک ہو رہی ہے۔ چندہ کی تعداد صرف تین مہینے میں ہی پچاس ہزار تک پہنچ گئی ہے جس کی ہرگز توقع نہ تھی۔ نواب محسن الملک جنھوں نے درحقیقت سرسید کا جوا اپنے کندھے پر رکھا ہے ان کو مسلمان اسی نگاہ سے دیکھتے ہیں جس نگاہ سے کہ سرسید کو دیکھتے تھے اور ہر شخص کی نظر میں ان کی وقعت ویسی ہی ہے جیسی ان کے اُس بڑے پیش رو کی تھی۔

یہ تمام علامتیں اس بات کی ہیں کہ مسلمان قومی خدمات کی قدر کرنے لگے ہیں اور قومی ہمدردی کی آگ جو سرسید کے سینے میں مشتعل تھی اُس کو وہ اپنے ساتھ قبر میں نہیں لے گئے بلکہ اُس کی آبیخ و درود پہنچ گئی ہے اور اُس ایک چراغ سے بہت سے چراغ روشن ہو گئے ہیں۔ اکثر لوگ اُن انگریزوں کی ہمدردی پر تعجب کرتے ہیں جو سرسید کی یادگار کے چندہ میں بہت خوشی سے شریک ہوئے ہیں خصوصاً لارڈ سٹیٹلی کا انگلستان سے دو سو پونڈ بھیجنا اور مسٹر آرٹلڈ کی تحریک سے لاہور میں اسی مقصد کے لیے ایک یورٹو مین کمیٹی کا قائم ہونا، بڑے بڑے افسروں کا اس میں شریک ہونا اور معقول رقمیں چندہ میں دینا بڑے استعجاب کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے مگر ہم کو اس سے کچھ تعجب نہیں ہوا، ان لوگوں کا ضمیر اس سرزمین کی خاک سے ہے جہاں بنی نوع کی بھلائی کے کاموں میں لوگ اڑ کر شریک ہوتے ہیں، انسانی ہمدردی اُن کی گھٹی میں ٹہری ہوئی ہے، وہ اپنے قومی ریفاہی مروجوں کی کوشش سے اعلیٰ مدارج ترقی پر پہنچنے ہیں اور اس لیے ہر قوم کے رفارمر اور ہر ملک کے ہیرو کی دل سے عزت کرتے ہیں اور اُس کی یادگار قائم کرنے کو منجملہ فرائض انسانی کے سمجھتے ہیں۔ پس اُن لوگوں کا ہماری بھلائی کے کاموں میں شریک ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں ہے۔ ہاں اگر تعجب ہے تو ہم کو اپنی مردہ دل قوم کی حالت پر ہے جو اب سے تیس برس پہلے ہمدردی، قومیت اور ریفاہی مشین کے مفہوم تک سے واقف نہ تھے۔ جنھوں نے سلف کے اوصاف کے کاموں کو پورا کرنے کا کبھی سبق نہیں پڑھا تھا۔ جو اپنی ذاتی اغراض کے سوا کسی رفاه عام کے کام میں روپیہ خرچ کرنا مطلق نہ جانتے تھے اور بغیر حکام کے رعب و داب کے ایک پسیا ہاتھ سے نہ چھوڑتے تھے۔ ایسی تو ہیں اپنے ہیرو کی یادگار قائم کرنے کا جوش، یا اُس

کے منصوبے پورے کرنے کا خیال، یا ایک قومی درسگاہ کو یونیورسٹی بنانے کا ارادہ کہاں سے پیدا ہو گیا؛ بیشک یہ بیخ سرسید کے بابرکت ہاتھ کا بویا ہوا ہے جس کو ان کی مساعی جمیدہ کا سب سے اعلیٰ اور افضل نتیجہ سمجھنا چاہیے، کیونکہ اگر ان کی کوششیں انھیں کی ذات پر ختم نہ ہوجاتیں اور قوم میں یہ ولولہ پیدا نہ ہوتا تو ان کی تمام عمر کی جانفشانی اور محنت گویا بالکل رائیگاں جاتی اور اُس گھنگھری گھٹا کی طرح جو ایک ناقابلِ زراعت زمین میں خوب زور شور سے برس کرکھل جائے، درحقیقت سرسید کی کوئی پانیدار اور زندہ نشانی دنیا میں باقی نہ رہتی مگر خدا کا شکر ہے کہ اُس نے قوم میں اپنی زندہ یادگار چھوڑی ہے اور قوم کے محبت سے افراد میں وہ اپنا درو مرض متعدی کی طرح پھیلا گیا ہے۔

فَتَى عَيْشٍ فِي مَعْرُوفِهِ كَعَدَّ مَوْقِعَهُ كَمَا كَانَ بَعْدَ السَّيْلِ فَجَرَّ الْأَقْرَبَاتُ
یعنی وہ ایک جواں مرد تھا جو خود مر گیا اُس کا فیض زندہ ہے جیسے روکی گزرگاہ جب روکا پانی نکل جاتا ہے تو موسیٰ کے لیے ایک سرسبز چراگاہ بن جاتی ہے۔

مصر کے ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے اپنے سفرِ یورپ کا حال عربی زبان میں لکھا ہے۔ وہ اہل یورپ کی ملکی اور قومی ہمدردی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ "اسی خصلت نے ان قوموں کو تمام دنیا کی قوموں سے بالاتر اور بزرگ تر کر دیا ہے۔ یہ لوگ وطن اور قوم کی خدمت کرنے والوں کی صرف اُن خدا کو دیکھتے ہیں جو انھوں نے عام بھلائی کے لیے کی ہیں اور ان کے عیسویوں پر مطلق نظر نہیں کرتے؛ اس کے بعد اُس نے اٹلی، فرانس، انگلینڈ اور روس کے چند وطن دوستوں کے نام لیے ہیں اور ان کے بڑے بڑے اخلاقی عیوب جو تاریخ میں مذکور ہیں بیان کیے ہیں اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ "اُن کے بہنوں۔ اُن عیسویوں پر بالکل نظر نہیں کرتے بلکہ اُن کے احسانات کو جو انھوں نے

قوم پر کیے ہیں یاد کر کے اُن کے نام پر سر جھکاتے ہیں، اُن کے سٹیچو جو ملک میں قائم کیے گئے ہیں اُن کی زیارت کے لیے اطراف و جوانب سے آتے ہیں اور اُن کی تعظیم کے لیے سروں سے ٹوپیاں اور تاج آمار لیتے ہیں اور ان پر فخر کرتے ہیں۔

اگرچہ ہماری قوم میں ابھی تک یہ شریف خصلت کیاب ہے لیکن سرسید کی وفات کے بعد جو غیر معمولی جوشِ پمدردی لوگوں نے ظاہر کیا ہے اور جس کو مجبوشی کے ساتھ سرسید کی یادگار قائم کرنے کا ولولہ قوم میں اٹھا ہے اور جس کو توجہ اور خوشی سے اُس کے محکروں کا اپیل سنا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خصلت قوم میں رفتہ رفتہ ترقی کرتی جاتی ہے لوگ اپنی قومی ضرورتوں سے واقف ہوتے جاتے ہیں اور جوان ضرورتوں کے رفع کرنے پر کمر باندھتے ہیں اُن کی عظمت دلوں میں بٹھی جاتی ہے یہی قوموں کی زندہ دل کی علامت ہے اور یہی وہ صفت ہے کہ جس قوم میں وہ معدوم ہو جاتی ہے وہ قوم جینے ہی مر جاتی ہے۔ ہ مجھے یہ ڈر ہے کہ دل زندہ تو نہ مر جائے کہ زندگانی عبارت ہے تیب جینے سے

مذکورہ بالا تحریر کے بعد معلوم ہوا کہ ۲۳ جولائی ۱۹۱۹ء کو نواب نضت گوڈر بہادر اضلاع شمال مغرب محض سرسید سمیر مل فنڈ کمیٹی کی تاسیس کے لیے علیگڑھ میں تشریف لائے اور ایک عام جلسہ میں جس میں علیگڑھ اور اس کے گرد و نواح کے رئیس شریک تھے کمیٹی کے ایڈریس کا جواب دیتے وقت حضور لارڈ ایلگن وائسرائے کشور ہند کی چٹھی جو اس موقع پر اُن کے نام موصول ہوئی تھی، حاضرین کو پڑھ کر سنائی جس میں حضور مداح نے محمدن اینگلو اور نیٹیل کالج پر نہایت مہربانہ توجہ اور کمیٹی کی ان کوششوں پر جو وہ کالج کی ترقی میں کر رہی

بے کمال نموشنودی ظاہر فرمائی تھی اور مسلمانوں کو اور غیر قوموں کو جو تسلیم سے دلچسپی رکھتے ہیں اس تحریک کی اعانت پر توجہ دلائی تھی اور لکھا تھا کہ ”میں ہمیشہ اپنے تئیں اس وجہ سے خوش نصیب سمجھوں گا کہ سال گزشتہ میں مجھ کو علیگرہد جانے کا موقع مل گیا اور سرسید سے ملاقات کرنے اور اُس دارالعلوم کو دیکھنے کا جو سرسید کو نہایت عزیز تھا ایسی حالت میں کہ ان کی ذات کا حوصلہ بخش سایہ اُس پر چھایا ہوا تھا، امتیاز حاصل ہوا، اس کے بعد لکھا تھا کہ ”اُس دن کی یادگار میری اس خواہش کو قوی کرتی ہے کہ میں بھی اپنے تئیں اُس کالج کے دوستوں کے زمرہ میں شامل کروں اور اس لیے میں چاہتا ہوں کہ جو فنڈ اب جمع ہو رہا ہے اُس میں دو ہزار کلابندہ شامل کر کے اپنی ہمدردی کا عملی اظہار کروں امید ہے کہ آپ اندازہ مہربانی میری اس خواہش سے کمپنی کو مطلع کر دیں گے۔“

اس کے بعد نبرآز کی موجودگی میں حاضرین کے سامنے چٹندہ کی نبرست پیش کی گئی اور اُسی جلسے میں تقریباً پچیس ہزار کا چٹندہ جس میں حضور وائسرائے اور نواب لفٹنٹ گورنر کا چٹندہ بھی شامل ہے، لکھا گیا۔

کسی بزرگ کا قول ہے کہ ”اچھے دوست کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گنجان میوہ دار درخت کہ جب تک سر سبز ہے اُس کے سایہ میں راحت ملتی ہے اور اُس کے پھل سے لذت حاصل ہوتی ہے اور جب خشک ہو گیا تو اپنی لکڑی سے طرح طرح کے فائدے پہنچاتا ہے، یہی مثال ہمارے ہیرہ سرسید کی تھی۔ وہ بھی مسلمانوں کا ایسا ہی دوست تھا، جب تک زندہ رہا اپنے ہاتھ پادوں زبان قلم جان اور مال سے اُن کی مدد کرتا رہا اور جب مر گیا تو اپنی محبت اور اپنے کام کی عظمت کا نقش لوگوں کے دلوں میں یادگار چھوڑ گیا تاکہ اُن

کی سچلائی کا کام جو اُس نے ادھر اچھوڑے اُس کو سب مل کر پورا کریں حق
یہ ہے کہ ایسے ہی لوگوں کی شان میں کہا گیا ہے :

جَمَالُ زِي الْأَرْضِ كَانُوا فِي الْحَيَاةِ وَهُمْ بَعْدَ الْمَمَاتِ جَمَالُ
الْكِتَابِ وَالسَّيِّئِ

سرسید کی لائف انکی تصنیفات اور انکے کاموں پر تحقیق

سرسید کی ترقی کے اسباب

ہمارے ملک میں ترقی کا لفظ زیادہ تر عہدہ یا منصب کی ترقی پر اطلاق کیا جاتا ہے۔ مگر اس موقع پر یہ ایسی ترقی سے جاری غرض متعلق ہے اور نہ ہمارے نزدیک سرسید نے عہدہ یا منصب کے لحاظ سے ترقی کا کوئی ایسا درجہ حاصل کیا ہے جو ان کی اعلیٰ لیاقتوں کے مقابلہ میں کچھ وزن رکھتا ہو۔ میرے ایک دوست سے ایک لائق انگلشمن نے سرسید کا ذکر کرتے وقت کہا کہ اگر یہ شخص یورپ میں پیدا ہوتا تو کسی بڑی ایمپائر میں وزیر اعظم کے درجہ تک پہنچتا کرنل گریم نے سرسید کی لائف میں ان کو باعتبار پولیٹیکل لیاقت کے سر سالانہ جنگ اول سے دوسرے درجہ پر رکھا ہے۔ مگر اخبار براڈ ایئر و مطبوعہ ۱۳ فروری ۱۸۸۶ء میں اس پر یہ ریمارک کیا گیا تھا کہ "سید احمد خاں کو سر سالانہ جنگ سے دوسرے درجہ پر رکھنے میں ایک ممتاز ہندوستانی جنٹلمین کی قدر و قابلیت کا غلط اندازہ کیا گیا ہے جس کی تمام زندگی شمالی ہندوستان کے واسطے برکت اور رحمت رہی ہے۔"

بہر حال یہاں سرسید کی جس ترقی کے اسباب بیان کرنے مقصود ہیں وہ عہدہ اور منصب کی ترقی نہیں بلکہ وہ ترقی ہے جو بعض اوقات کسی شخص کو نہ اور منصب کے لحاظ سے اور نہ مال و دولت و جاہ و حکومت کے اعتبار سے بلکہ اعلیٰ اور اشراف خصال انسانی کے لحاظ سے نہ صرف اپنے خاندان میں بلکہ تمام قوم اور ملک میں ممتاز کرتی ہے۔

سرسید کی زندگی کے واقعات جو پہلے حصہ میں بیان ہو چکے ہیں اگر ان کو محض سرسری طور پر دیکھا جائے تو بھی ان سے اس قدر ضرور ثابت ہوگا کہ ایک مسلمان جو قومی تنزل کے زمانہ میں پیدا ہوا جس نے ایک مردہ دار الخلافہ کی پٹر مردہ سوسائٹی میں ہوش سنبھالا اور ہندوستان کی کمزور آب و ہوا میں نشوونما پائی، اس نے اپنی عمر کا بہت بڑا حصہ نہایت جاگہا محنت، دلی شوق اور بے نظیر استقلال کے ساتھ گورنمنٹ کی خیر اندیشی، ملک کی خیر خواہی، قوم کی خدمت اور مذہب کی حمایت میں بسر کر دی پس اس مقام پر ضرور یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی چیز نے یہ غیر معمولی تحریک اس کے دل میں پیدا کی؟ اور کیونکر وہ اس قدر طول طویل زمانہ تک ایسے استقلال کے ساتھ اپنے ارادوں پر قائم رہا؟ اگرچہ اس سوال کے جواب میں صرف یہ کلام معجز نظام پیش کرنا کافی ہے کہ "كُلُّ مَلِيئَةٍ لَمَّا خُلِقَتْ لَدُنَّ" یعنی ہر شخص کو اس کام میں جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے آسانی دی گئی ہے، لیکن چونکہ سرسید کی بائوپوگرافی کو ہم آئینہ نسلوں کے لیے ایک مثال قابل تقلید سمجھتے ہیں اس لیے ان کی ترقی کے اسباب کی تفتیش کرنا غالباً قائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

سرسید کی لائف میں جیسا کہ ان کے ابتدائی حالات پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے، بہت سی ایسی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں جن پر ان کی ترقیات

کی بنیاد قائم کی جا سکتی ہے۔ قطع نظر اُن جسمانی اور اخلاقی قابلیتوں کے جن کے بچپن میں قدرت نے بہت بڑی عیاضی کی تھی اور جن کے بغیر کوئی شخص بڑا آدمی نہیں ہو سکتا۔ اتفاقاتِ حسنہ نے بھی اُن کے ساتھ کچھ کم مساعدت نہیں کی۔ وہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جس میں قدیم خاندان کی نیکیاں اور نئے خاندان کی اولوالعزمی اور بہت مجتمع تھی۔ اُن کی دوھیال سلطنت کے ایک قدیم متوسل گھرانے کی یادگار تھی اور اُن کی نھیاں ایک ایسے خاندان سے علاقہ رکھتی تھی جس نے اپنی ذاتی لیاقت حسن تدبیر اور علم و فضل سے اپنے اقربان و امثال میں امتیاز حاصل کیا تھا اور اپنے تئیں زمانہ کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ وہ خوش قسمتی سے بچپن میں زیادہ تر اپنی نھیاں ہی میں رہے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ انھوں نے اپنے نانا کا عہد اپنی آنکھ سے دیکھا اور اپنے لائق ماموں کی صحبت برتی۔ اُن کی ماں ایک نیک تہلو، سنجیدہ اور دانشمند بی بی تھیں جن کی تعلیم و تادیب سرسید جیسے جو بہر قابل کے لیے اسی کا حکم رکھتی تھی۔ انھوں نے حسن اتفاق سے ایسی حالت میں نشوونما پائی کہ نہ اُن کی مدد سے زیادہ

رودک لوگ ہونی اور نہ ان کو بالکل مطلق العنان

بھٹوڑا گیا، وہ بڑھتے لکھتے بھی تھے اور ہر قسم کے کھیل بھی کھیلتے تھے مگر اپنے رشتہ داروں کے سوا غیر جنس کے لڑکوں سے کبھی نہ ملنے پاتے تھے۔ نہ اُن پر تعلیم کا ایسا بوجھ ڈالا گیا تھا کہ قورسے جسمانی مضمحل ہو جائیں اور نہ ان کی ڈور ایسی ڈھیل چھوڑی گئی تھی کہ جدھر منہ اٹھ گیا چل سکے۔

اُن کے والد ایک آغا و نیش اور تعلقاتِ دنیوی سے الگ ٹھک رہنے والے آدمی تھے گھر کے انتظام اور اولاد کی پرورش اور تربیت کا مدار زیادہ تر بلکہ

بالکل سرسید کی والدہ پر تھا جو باوجود طنطنہ اور رعب داب کے نہایت متحل و
برہ دار تھیں پس وہ بیجا تشدد اور سختی جو اولاد کی تسلیم و تربیت کے زمانہ میں
اکثر والدین سے ظہور میں آتی ہے اور جس سے رفتہ رفتہ اولاد کے دل میں خود
اپنی حقارت اور ذلت بٹھیر جاتی ہے، سرسید پر کبھی نہیں گذری۔

جوانی کے آغاز میں سرسید کو بچپن کی نسبت کسی قدر زیادہ آزادی حاصل
ہوئی وہ اکثر رنگیں جلسوں میں شریک ہونے لگے اور شہر کے نوجوان امیرزادوں
سے ملنے جلنے لگے۔ سوسائٹی کا پرچھاواں اُن پر بھی پڑا اور پٹے ناچا بیسے تھا مگر
ہو نہ بار نوجوانوں کی لغزشیں بھی اُن کی اصلاح کا باعث ہوتی ہیں۔ وہ ایک
ٹھوکر کھا کر ایسے چوکنہ ہو جاتے ہیں کہ پھر کبھی عمر بھر ٹھوکر نہیں کھاتے، بھائی
کی عبرت انگیز موت سے دل پیر ایسے افسردگی چھائی کہ ہمیشہ کے لیے لہو و
لعب سے دست بردار ہونا پڑا، مگر چونکہ طبیعت میں آتش گیر مادہ بھرا ہوا
تھا وہ آخر کار مشتعل ہونے بغیر نہ رہا۔ وہی سو دا جو غنقران شباب میں ہوا
وہوں کی شکل میں ظاہر ہوا تھا ہیں برس بعد حُتِ قومی کے یاس میں جلوہ گر ہوا
اور میر کا یہ شعر سرسید کے حال پر منطبق ہو گیا۔

”دل عشق کا ہمیشہ حرین نبرد تھا“

اب جس جگہ کہ داغ ہے یا آگے درو تھا“

جس حد تک سرسید کی تعلیم ہوئی اُس کو بھی اُن کی ترقی کا مؤید سمجھا جاسکتا
ہے۔ انہوں نے جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہو چکا ہے قدیم یا جدید کسی طریقہ میں پوری
تعلیم نہیں پائی، اگر وہ پر اُن نے طریقہ کی تعلیم پوری کر لیتے اور علوم قدیمہ کا رنگ ان
پر چڑھ جاتا پھر ممکن نہ تھا کہ کسی دوسرے رنگ کے قبول کرنے کی تابیت اُن
میں باقی رہتی۔ وہ تعصب کی بندشوں میں جکڑ بند ہو جاتے اور تعصب کے

پہلے ان کی آنکھوں پر پڑ جانے۔ نئے طریقہ کی تعلیم بھی ان نتائج تک پہنچانے والی نہ تھی جو سرسید سے ظہور میں آئے۔ یورپ کی اعلیٰ درجہ کی سویٹزریشن اور حیرت انگیز ترقیات جو ایک ہندوستانی طالب علم کے دل پر تعلیم کے ساتھ ساتھ نقش ہوتی جاتی ہیں وہ آخر کار اس کو اپنے ملک کی ترقی سے مایوس کر دیتی ہیں یہاں تک کہ وہ ان کوششوں کو جو ہندوستانیوں کی ترقی اور اصلاح کے لیے کی جاتی ہیں محض بے سوا اور لا حاصل جاننے لگتا ہے پس کہا جاسکتا ہے کہ سرسید کا پرانی تعلیم میں ادھور لڑنا اور شی تعلیم سے آشنا نہ ہونا منجملہ ان اتفاقاتِ حسنہ کے تھا جنہوں نے قوم کی اصلاح کے عظیم الشان کام پر ہاتھ ڈالنے سے ان کو جھجکنے نہیں دیا۔

اگرچہ یہ تمام باتیں جو اوپر بیان کی گئیں بلاشبہ ایسی ہیں جن کو سرسید کی ترقی میں بہت کچھ دخل معلوم ہوتا ہے مگر ان میں سے ایک بات بھی ایسی نہیں جس کو ان کی ترقی کے اسباب میں شمار کیا جائے کیونکہ یہی باتیں اکثر اوقات ترقی کی سڈراہ دیکھی گئی ہیں۔ اس کے سوا ایک ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے اور خاص کر ہماری مردہ قوم میں جس قسم کے حیرت انگیز اور عظیم الشان کام سرسید سے ظہور میں آئے ہیں اور جیسی جلیل القدر خدمتوں میں انہوں نے اپنی زندگی کا ایک معتد بہ حصہ نہایت استقلال کے ساتھ بسر کیا ہے ان کو محض اتفاقیہ امور کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا۔

بعض اوقات خیال کیا جاتا ہے کہ سرسید کا اپنی بی بی کے انتقال کے بعد دوسری شادی نہ کرنا اور چالیس برس تھوڑا اور بے تعلقی کی حالت میں رہنا یہی ان کے تمام بڑے بڑے کاموں کی بنیاد تھی اگر وہ دوسرا نکاح کر لیتے تو سرگتہ ان کو ان کاموں کے سرانجام کرنے کا موقع نہ ملتا۔ مگر اس نقطہ پر

پر یہ سوال باقی رہتا ہے کہ وہ کیا چیز تھی جس نے ایک چالیس بیالیس برس کے توانا
تندرست ذمی استطاعت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمان شخص کو نکاحِ طہانی
سے باز رکھا اور تخر و کنی ناگوار اور تلخ زندگی پر قانع کر دیا؟

البتہ ایک اور بات لحاظ کے قابل ہے جو سرسید کی لائف پر غور کرتے
وقت لوگوں کے ذہن میں ضرور تیار اور بہتر ہوگی یعنی یہ کہ جب سے انگریزی تعلیم
ہندوستان میں پھیلی ہے اور یورپ کے اُن نامور لوگوں کے حالات سے
جنہوں نے ملک اور قوم پر اپنی جانیں قربان کی ہیں ہندوستان کے لوگ واقف
ہوتے ہیں اُس وقت سے ہندوستان میں بھی کم و بیش قومیت اور قومی ہمدردی
کا خیال لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتا جاتا ہے۔ پس یہ بات بالکل قرین قیاس
ہے کہ سرسید نے بھی جو کچھ ملک، قوم یا مذہب کی خدمت میں کیا وہ انھیں
یورپ کے ریفاہ مروجوں اور وطن دوستوں کے حالات سن کر ان کی ریس سے
کیا ہو۔ لیکن اول تو جس وقت سرسید کو ملک اور قوم کی خدمت یا مذہب کی
حمایت کا خیال پیدا ہوا اُس وقت تک انگریزی تعلیم ہندوستان میں نہایت
محدود تھی اور مسلمانوں میں بالکل نہ تھی دوسرے اگر بالفرض یہ بات مان بھی لی
جائے تو صرف اسی قدر مافی جا سکتی ہے کہ یورپ کی تاریخ سے اُن
کے دل میں بھی حب وطن اور قومیت کا خیال ایسا ہی پیدا ہو گیا ہو جیسا کہ
ہندوستانی تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں ایک دودھ کا سا اُبال پیدا
ہو جاتا ہے مگر اُس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ خیال ایسا پک جائے کہ ایک
ہندوستان کا مسلمان قوم کی دُشمن میں اپنے دشمنی فنا کر دے جس طرح حالت
موجودہ میں یہ ممکن نہیں کہ یورپ کے موجدوں اور مخترعوں کے حالات
سن کر ہندوستان میں بھی ویسے ہی موجد اور مخترع پیدا ہونے لگیں۔

اسی طرح یہ بھی امکان سے خارج ہے کہ لیرپ کے ریفارمرز اور وطن دوستوں کے حالات کتابوں میں پڑھ کر یازبانی سنکر ہندوستان میں بھی ویسے ہی ملک کے جاں نثار اور قوم کے مصلح پیدا ہو جائیں۔

اصل یہ ہے کہ ایشیائی طرز حکومت جو ایک طاقت کو اعتدال سے زیادہ بڑھانے والی اور اُس کے سوائے تمام طاقتوں کو فنا کرنے والی ہے اور جو ہندوستان میں بھی تمام ایشیائی ملکوں کی طرح ابتدائے آفرینش سے ایک عنوان پر چلی آتی تھی اُس نے ایشیا کی کسی قوم بلکہ بلکہ کسی متنفس میں قومیت کی روح باقی نہیں چھوڑی۔ ایک بڑے حکیم کا قول ہے کہ شخصی حکومت میں صرف ایک شخص یعنی بادشاہ، ملک کا خیر خواہ ہو سکتا ہے اور بس۔ جان سٹوارٹ لکھتے ہیں کہ ”اگر رعیت کو ایسا بنا دے کہ وہ ملک کے لیے کچھ نہ کر سکے تو اس کو ملک کی کچھ پر داندہ رہے گی“ اگرچہ ہندوستان میں سو برس سے طرز حکومت بدل گیا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ لوگوں میں ملک اور قوم کی بھلائی کا خیال اور جوش پیدا ہو مگر جو کون اور انجماؤ ہندوستان کی قوموں میں صد ہا پشت سے متوارث چلا آتا ہے اور جوان کے آب و گل میں خمیر ہو گیا ہے اُس کو پریش طرز حکومت جیسی کہ وہ ہندوستان میں ہے ایک صدی میں ترائی نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ لیرپ کی نظیریں سن سن کر جو اکثر ہندوستانوں کے دل میں بعض اوقات ملک اور قوم کی بھلائی کا جوش و فتنہ اٹھتا ہے کچھ زیادہ دن نہیں گزرتے کہ وہ آوے کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔

البتہ مذہب ایک ایسی چیز ہے جو ہر ملک میں اور خاص کر ایشیائی ملکوں میں مذہبی آدمیوں کو نہایت استقلال کے ساتھ تمام عمر اپنے ارادوں پر ثابت قدم رکھ سکتا ہے یہ مذہب ہی میں طاقت ہے کہ انسان نہایت سخت

ریاضتوں میں اپنی زندگی بسر کرتا ہے، تمام لذات کو اپنے اوپر حرام کر دیتا ہے۔ آگ میں پتا ہے، برت میں گلاب، گھر بار لٹا دیتا ہے اور ہر ناقابلِ شہوت تکلیف اٹھاتا ہے، مگر مذہب بھی کیسا ہی سچا اور خدا کا بھیجا ہوا ہر طرز حکومت کا تابع ہوتا ہے۔ اُس میں جتنی باتیں طرز حکومت کے منقضا کے موافق ہوتی ہیں وہ رواج پاتی ہیں اور باقی حصہ ناقابلِ عمل سمجھ کر چھوڑ دیا جاتا ہے، مثلاً خود مختار سلطنت جس میں کوئی بات شخصیت سے خالی نہیں ہوتی اس میں مذہب بھی ذاتی اور شخصی جھلائیوں کے سوا اور کچھ نہیں سکھاتا، وہ صرف ایسی نیکیاں سکھاتا ہے جن کا نفع یا تو نیکی کرنے والے کی ذات پر ختم ہو جاتا ہے اور یا صرف خاص خاص شخصوں کو پہنچتا ہے۔ وہ کبھی ایسی نیکیوں کی ترغیب نہیں دیتا جن سے بلا واسطہ تمام ملک یا تمام بنی نوع کو فائدہ پہنچے۔ مذہب کی یہ حالت ایسی پائیدار اور مستحکم ہو جاتی ہے کہ خود مختار سلطنت کا دورہ ختم ہو جانے کے بعد بھی صدیوں تک وہ اسی حالت پر قائم رہتا ہے پچھلے جس شاہراہ پر اگلوں کو چلنا دیکھتے ہیں آپ بھی آنکھیں بند کر کے اسی شاہراہ پر چلنے لگتے ہیں، دائیں بائیں آنکھاٹھا کر نہیں دیکھتے، مگر بعض اوقات زمانہ کی ضرورتیں خود مذہبی فرقہ میں کوئی ایسا شخص پیدا کر دیتی ہیں جس کو مذہب کی چھان بین کرنی پڑتی ہے اور مذہب کا وہ متروک حصہ جو موجودہ زمانہ کے موافق ہوتا ہے اس پر عمل کرنا اس کو رواج دینا پڑتا ہے زمانہ کی ضرورتیں اُس کی آنکھیں کھولتی ہیں اور باقی مذہب کی محبت اور عقیدت اس کو مذہب کی حقیقت کھولنے پر مجبور کرتی ہے اور خود مذہب اُس میں استقلال پیدا کرتا ہے جس کی بدولت وہ قوم کی شاہراہ کے خلاف اپنی کٹھن منزل طے کرتا ہے جس سے اس چیز کا سراغ چلتا ہے جس نے سرسید سے تمام ملکی اور قومی خدشیں

سراجمام کو لائی ہیں۔ ہمارے نزدیک جہاں تک کہ ان کی لائفت شہادت دیتی ہے اور جس قدر کہ ان کے حالات، افعال اور اقوال سے ظاہر ہوتا ہے ان کی تمام ترقیات کا منبع ان کے کل مقاصد عالیہ کا محرک اور ان کی ہر منزل کا رہبر مذہب کے سوا اور کوئی چیز قرار نہیں پاسکتی۔

اسلام کی حقیقت کا یقین اور بانی اسلام کی محبت اور عقیدت گویا سرسید کی گھٹی میں پڑی تھی۔ دار الخلافہ کا اخیر دور تھا اور مسلمانوں کو آخرت کی امیدوں کے سوا جن کا اسلام وعدہ کرتا تھا کوئی امید دنیا میں باقی نہ رہی تھی اس لیے وہ مذہب کو زیادہ مضبوط پکڑتے جاتے تھے۔ خصوصاً شریف اور ممتاز خاندانوں میں مذہبی فرائض کی پابندی اور مذہبی باتوں کا چرچا بہت زیادہ تھا۔ شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ جو اُس زمانہ میں دیندار مسلمانوں کا ملجا یا ولی تھی، اس کے ساتھ سرسید کو ایک خاص تعلق تھا ان کے والدین خانقاہ کے مشائخ سے کمال عقیدت و ارادت رکھتے تھے اور اس لیے سرسید بچپن ہی سے اپنے والد کے ساتھ خانقاہ میں چلے گئے تھے اور ایک مدت ورنہ تک انھوں نے وہاں کا رنگِ صحت اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ ان کی والدہ کے سوا ان کے نخیال والے جہاں انھوں نے نشوونما پائی شاہ عبدالعزیز صاحب کے خاندان کے معتقد تھے۔ پس سرسید نے آنکھ کھول کر اپنے سارے گھر میں مذہب ہی کا دورہ دورہ دیکھا تھا، گویا مذہب ہی کی آغوش میں انھوں نے پرورش پائی تھی اور مذہب ہی کی گود میں ہوش سنبھالا تھا۔ علوم جدیدہ جس عمر میں مذہب سے دل اچاٹ کر سکتے ہیں اس عمر میں سرسید پر ان کی پرچھائیں تک نہیں پڑی تھی بلکہ زیادہ تر ان کی لے اس وقت کھلی شروع ہوئی جب مذہب کی جڑ پتال تک پہنچ چکی تھی اور جب کہ سائنس کو

بجائے اس کے کہ مذہب کے ساتھ جنگ کرے اس سے صلح کرنی ضرور تھی۔
 چونکہ سرسید کا تعلق خاندان دو ایسے خاندانوں سے عقیدت رکھتا تھا جو
 نہ صرف دلی بلکہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں جامع شریعت و طہارت
 سمجھے جاتے تھے اس لیے ان کا گھر بہت سی ایسی جاہلانہ رسموں اور یہودہ
 ادہام اور لغو عقاید سے پاک تھا جن میں اکثر جاہل مسلمانوں کے خاندان گرفتار
 ہوتے ہیں، چنانچہ سرسید کہتے تھے کہ ”اس زمانہ میں بھی جب کہ میرے مذہبی
 خیالات متفقانہ اصول پر مبنی ہیں، میں اپنی والدہ کے عقاید میں ایک آدھ بات
 کے سوا کوئی عقیدہ اپنے اصول کے خلاف نہیں پاتا“ یہی عقائد ابتدا سے
 سرسید کے دل میں ڈالے گئے تھے اور اسلام کا یہی صورت انہوں نے
 آنکھ کھول کر دیکھی تھی، گویا بوش سنبھالتے ہی انہوں نے اپنا قدم تحقیق کی پہلی
 سیڑھی پر پایا تھا۔ پھر مولانا سمیع شہید کی تصنیفات نے ان کے خیالات
 کی اور زیادہ اصلاح کی اور ان کو کسی قدر تقلید کی بندشوں سے آزاد کیا۔ مگر
 جب تک قدیم سوسائٹی کا رنگ ان پر غالب رہا مذہبی خیالات میں کوئی
 بڑا انقلاب واقع نہیں ہوا، وہ انہیں سنت و بدعت و تقلید و عدم تقلید
 کے جھگڑوں میں الجھے رہے اور اسلام کے اشرف و اعلیٰ مقصد کو صرف
 انہیں شخصی کاموں میں منحصر جانتے رہے جن کا نفع یا تو خود کام کرنے والے
 کی ذات کو اور یا خاص خاص شخصوں کو پہنچتا ہے، مگر آخر کار زمانہ کی ضرورتوں
 نے ان کی آنکھیں کھولیں اور خود اس یقین نے جو اسلام کی حقیقت کی نسبت
 ان کی گٹھی میں پڑا تھا، ان کو اسلام کی حقیقت اور اس کے اصلی مقاصد تک
 پہنچا دیا۔ جو باتیں دین حق کی پاکیزگی اور تقدس کے خلاف معلوم ہوئیں ان کو
 چھوڑا اور جو اس کے مطابق پائیں ان کو پکڑا اور زبرد و عمر کی مخالفت کا

خوف یک قلم دل سے اٹھا دیا۔ ہر ایک معاملہ میں خود مذہب کو نہ کہ زید و عمر کو اپنا رہبر بنایا جو سوال پیش آیا اس کو بلا واسطہ مذہب ہی سے پوچھا اور جو کچھ وہاں سے جواب ملا اس کو سر پر رکھا۔ لوگ انگریزی نوکری پر اعتراض کرتے تھے۔ مگر مذہب نے اجازت دی اس لیے انگریزی نوکری بے تامل اختیار کر لی۔ مذہب ہی سے یہ سوال کیا کہ غیر قوم اور غیر مذہب گورنمنٹ کی نوکری محض دفع الوقتی و ایام گذاری کے طور پر کرنی چاہیے؛ یا تہ دل سے اس کے فرائض ادا کرنے چاہئیں۔ مذہب نے جواب دیا کہ نوکری کا پورا معاوضہ لینا اور اس کے فرائض تہ دل سے ادا نہ کرنا خدا اور رسول کی مرضی کے خلاف ہے، اس لیے نوکری کے فرائض نہایت ایمان داری اور سچائی کے ساتھ سرانجام کیے۔ مذہب ہی سے پوچھا کہ غیر قوم کی حکومت میں رعیت کو اس کی خیر خواہ اور وفادار رعایا بن کر رہنا ضرور ہے یا نہیں۔ مذہب نے جواب دیا کہ کوئی گناہ اس سے بڑھ کر نہیں کہ جس گورنمنٹ کے سایہ حمایت میں رعیت کو ہر طرح کا ظلم و سزا دی حاصل ہو اس کی رعیت اپنی گورنمنٹ کی وفادار اور خیر خواہ نہ ہو، لہذا اپنی تمام زندگی گورنمنٹ کی وفاداری اور خیر خواہی میں صرف کرے۔ مذہب ہی سے یہ پوچھا کہ غیر مذہب قوموں کے ساتھ صدق دل سے دوستی میل جول اور کھانا پینا دین حق کی پاکیزگی اور تقدس کے موافق ہے یا نہیں۔ مذہب نے جواب دیا کہ موافق ہی نہیں بلکہ نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ اسلام نفاق سے بدتر اور رذیل تر خصلت کو نہیں بتاتا اس لیے ہمیشہ انگریزوں اور تمام غیر مذہب قوموں کے ساتھ اسی صداقت اور خلوص کے ساتھ میل جول رکھا جیسا کہ مسلمانوں کے ساتھ رکھنا چاہیے۔

واقعہ ۱۸۵۷ء نے جی ہندوستان کے مسلمانوں کو نہایت سخت

صدمہ پہنچایا اور ان کے سنے کی بالکل امید نہ رہی اس سے سرستید کے دل پر
 ایسی افسردگی اور مایوسی چھائی کہ ان کا ارادہ ہندوستان سے تعلقات قطع
 کر کے کسی دوسرے ملک میں جا کر رہنے کا ہو گیا۔ اس وقت بھی انھوں نے
 مذہب ہی سے یہ سوال کیا کہ قوم کی آگ میں کودنا بہتر ہے یا اپنی جان بچا کر
 اور کسی گوشہ میں بیٹھ کر خدا کی یاد کرنی بہتر ہے؟ مذہب نے جواب
 دیا کہ اسلام کا اصل اصول بلکہ خود اسلام محض قوم کی خیر خواہی اور مہمدی ہے
 اور بس۔ مذہب نے ان کو بتایا کہ بانی اسلام جس کی اطاعت اور اتباع تمام
 امت پر فرض ہے اور جس کی نسبت قرآن ناطق ہے کہ "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي
 رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" اُس نے دنیا میں آکر کیا کیا؟ اپنی تمام عمر ملک اور قوم
 کی خیر خواہی میں بسر کی۔ وہ گمراہ تھے ان کو ہدایت کی، وہ وحشی تھے ان کو
 انسان بنایا، وہ ایک دوسرے کے دشمن تھے ان میں اخوت اور دوستی کی
 بنیاد ڈالی۔ وہ آپس کی خانہ جنگیوں میں پھنسے ہوئے تھے ان میں ملک گیری اور
 کشور کشائی کا مادہ پیدا کیا۔ ان کا دین اور دنیا دونوں درست کیے، ان کی
 خیر خواہی اور اصلاح میں سخت شہائد اور شہیدین اپنے نفس پر برداشت کیے
 ملک کی محبت کو جزو ایمان قرار دیا اور کہا کہ "حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْإِيمَانِ"
 قوم کی محبت پر تمام امت کو مجبور کیا اور فرمایا کہ "حُبُّ الْعَرَبِ مِنَ الْإِيمَانِ"
 قوم کی سرداری کو قوم کی خدمت میں منحصر ٹھہرایا اور کہا کہ "رَبِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُ"
 اخیر دم تک اُمت یعنی قوم ہی کا خیال رکھا اور اُمّتی اُمّتی کہتا و نُب سے
 رخصت ہوا۔

سرستید نے مذہب کی یہ ہدایت سن کر تمام ارادے فسخ کیے اور اس
 اصول کو مضبوط پکڑ لیا۔ انھوں نے دیوی تعلقات کو جن کے بغیر قوم کی خیر خواہی

اور قوم کو نفع پہنچانا غیر ممکن تھا قطع تعلق سے ہزار درجہ بہتر سمجھا اور اپنی تمام
زندگی اور طاقت اور استطاعت ادا اپنے تمام قومی کو نفس واپس تک
قومی خدمت اور قومی خیر خواہی کے لیے وقف کر دیا۔ انھوں نے مذہب
ہی سے یہ پوچھا کہ قوم کی اصلی اور حقیقی خیر خواہی کس چیز میں ہے؟ مذہب
نے جواب دیا کہ مسلمانوں کے اعتراف سے اسلام کو معزز کرنا اور دنیا کے
ذریعہ سے دین کو تقویت دینی۔ مذہب ہی نے ان کے دل میں ڈالا کہ مسلمان
دنیوی عزت میں حد سے زیادہ گروے ہونے ہیں اور گرتے چلے جاتے ہیں اور
مسلمانوں کی دولت بعینہ اسلام کی دولت ہے۔ اگرچند روزانہ کا یہی حال
رہا تو بندوستان میں ان کا عدم اور وجود برابر ہو جائے گا اور اسلام اس ملک
سے رخصت ہو جائے گا۔ اس لیے انھوں نے قوم کو اول دنیا ہی کی طرف
متوجہ کیا اور جوڑے ان کی دنیوی ترقیات کے تھے ان کے لیے مہیا کیے
سب سے زیادہ ان کی ترقی کا مدار انگریزی تسلیم پر سمجھا۔ اس لیے گو ایک
زمانے نے انگریزی تسلیم کی مخالفت اور مزاحمت کی۔ مگر انھوں نے اس
کو قوم میں جاری کر کے چھوڑا۔ مذہبی وہام اور غلط خیالات جو دنیوی ترقی کے
مانع تھے اپنی پُر زور تحریروں سے ان کی غلطی ثابت کی۔ سوشل اور اخلاقی
خرابیاں جو قوم میں شائع تھیں جن پر غیر قومیں ہنسی تھیں اور جو دنیوی عزت
اور وقار کی منافی تھیں ان کی اصلاح میں جہاں تک ممکن تھا کوشش کی قوم
کی طرف سے جو گورنمنٹ کو پورے شکل بدگمانیاں تھیں ان کو رفع کیا۔ گورنمنٹ
کی طرف سے جو قوم کے دل میں منہایت یا دبشت یا جھجک تھی اس کو دور
کیا۔ انگریز جو اسلام کو ایک نہایت ہیبت اور خوفناک مذہب خیال کرتے
تھے اور اس لیے مسلمانوں کی طرف سے مطمئن نہ تھے، ان کو اسلام کی اصلی

صورت دکھائی اور ثابت کیا اگر دنیا میں کوئی مذہب عیسائیوں کا دوست عیسائی مذہب کا حامی، بائبل کی تصدیق کرنے والا اور اس کے اصول سے مطابقت رکھنے والا ہے تو وہ صرف اسلام ہے اور بس، ہندو مسلمانوں میں جہاں تک کہ ممکن تھا اتحاد و اتفاق پیدا کرنے میں کوشش کی کیونکہ دونوں قوموں کی عزت اسی بات پر موقوف تھی اور موقوف ہے کہ آپس میں مل جل کر رہیں جتنے مدرسے اور انسٹیٹیوشن قائم کیے اُن میں دونوں قوموں کو شریک کیا اور اُن سے دونوں کے فوائد محفوظ رکھے، ہمیشہ اپنی پلک اسپچوں میں دونوں قوموں کو اسی بات کی نصیحت کی کہ ہندوستان کی عزت اتفاق میں ہے، مسلمانوں کے مختلف فرقے جن میں مذہبی نزاع اور جھگڑوں نے پھوٹ ڈال رکھی ہے اور اس لیے وہ روز بروز ضعیف اور حقیر ہوتے جاتے ہیں جہاں تک ممکن تھا اُن میں اتفاق و التیام کی بنیاد ڈالی۔ مدرسۃ العلوم میں ہر مسلمان فرقہ کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا اور ہر فرقہ کے طالب علموں کو ایک مسجد میں نماز پڑھنے کی ہدایت کی، اپنے سنی دوستوں کو شیعوں کے خلاف کتابیں لکھنے سے روکا اور خود جو ابتدائے عمر میں اسی قسم کی چھیڑ چھاڑ کی تھی اُس سے ہمیشہ کے لیے اجتناب کیا۔ باوجودیکہ اُن کو اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے مذہب سے متعلق صد ہا باتیں جمہور کے خلاف لکھنی پڑیں مگر بغیر سخت ضرورت کے کبھی کوئی نئی بات نیاں سے نہیں نکالی کبھی جمہور اہل اسلام سے مقابل کوئی جدید فرقہ کھڑا کرنا اور آپ اس کا سرگروہ بنا نہیں چاہا، کبھی مخالفین کے اعتراضات کا جواب پلٹ کر نہیں دیا۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ قوم میں اختلاف اور نزاع بڑھنے نہ پائے اور میل کاہل نہ بن جانے۔

جس وقت سرسید نے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم جاری کرنے کا ارادہ کیا

اس وقت مذہب ہی نے ان کو اس یقین پر قائم رکھا جو صدرہ یورپ میں عیسائی مذہب کو تعلیم سے پہنچا ہے وہ اسلام کو برگز نہیں پہنچ سکتا۔ اور جب کہ انگریزی تعلیم ان میں جاری ہو گئی اور اس کو روز بروز ترقی ہونے لگی اس وقت بھی مذہب ہی نے ان کو یہ سمجھایا کہ جب تک سائنس اور اصول اسلام میں تطبیق نہ کی جائے تب ان کو رے اور سادہ لوح طالب علموں کی طرف سے اطمینان نہیں ہو سکتا جو مذہبی تعلیم سے بے بہرہ ہوتے ہیں اور اس لیے ان کے دل میں مذہب کی طرف سے سو وطن پیدا ہو جاتا بالکل قرین قیاس ہے۔ مذہب نے ان کو ڈرا یا کہ اگر تعلیم سے اسلام کو کچھ صدرہ پہنچا تو اس کا منظرہ خاص کر اس شخص پر ہو گا جس نے قوم میں تعلیم جاری کی۔ چنانچہ اس عظیم الشان کام کو بھی انھوں نے اپنے ذمہ لیا اور اپنی سمجھ اور علم و عقل کے موافق قرآن مجید کی تفسیر لکھ کر شروع کی۔ یہاں تک ہم نے جو کچھ لکھا یہ محض بے سرو پا تیا سات نہیں ہیں بلکہ خود سرسید نے اپنی تحریروں میں جا بجا اس معنون کی طرف اشارہ کیا ہے خصوصاً وہ آرٹیکل جو تہذیب الاخلاق مورخہ یکم ربیع الاول ۱۲۸۸ھ ہجری میں "ایک نادان خدا پرست اور نادان دنیادار" کے عنوان سے لکھا ہے اس سے ہمارے مذکورہ بیانات کی خوبی تا شبہ ہوتی ہے اس کے علاوہ ہم ہمیشہ اپنی آنکھ سے دیکھتے تھے کہ سرسید قومی خدمت اسی سرگرمی اور ذوق و شوق کے ساتھ انجام دیتے تھے جیسے ایک مترجم اور نفس کش زاہد عبادت الہی بجا لاتا ہے۔ نہ بیماری اور ضعیفی ان کے ذوق و شوق کو کم کرتی تھی اور نہ گزرمی یا سردی کی شدت یا اور کسی ہرج مرج سے ان کی بہت قاصر ہوتی تھی۔ چالیس برس برابر انھوں نے مخالفتیں جھیلیں، ان کے کفر کے لیے ہتھیار فتوے کھمے گئے، انکو دہری، ملحد، کافر اور وبال سب کچھ کہا گیا، ان کو بلدہا

قتل کی دھکیاں دی گئیں۔ صد ہا گناہ خطوں میں منغلظ گالیباں لکھ کر بھیجی گئیں۔ اخباروں اور رسالوں میں جہاں تک ہو سکا ان کی توہین کی گئی، مگر وہ اپنی دھن میں اسی طرح لگے رہے اور اپنا کام اسی فوج و شوق کے ساتھ کیے گئے، بلکہ جس قدر مخالفت بڑھتی گئی اسی قدر ان کا جوش اور سرگرمی زیادہ ہوتی گئی، لوگ ان کو بُرا کہہ کر اور گالیاں دے کر اس قدر خوش نہ ہوتے ہوں گے جس قدر کہ وہ بُرا سُکر اور گالیاں کھا کر خوش ہوتے رہے، ان کی بہن کے انتقال کی خبر ان کو اس وقت پہنچی جب کہ وہ قومی کانفرنس کی کاروائی میں مصروف تھے، جب تک جلسہ اپنے معمولی وقت پر برخواست نہ ہوا وہ بہن کی بچہ یزد تکلیف میں شریک نہ ہوئے، جوان بیٹے کی موت سے ان کو سخت صدمہ پہنچا پندرہ برس روز تک قلب کی حرکت نہایت سست رہی اور یہ صدمہ آخر تک فرسوش نہ ہوا، یا اینہم وہ اپنی قومی خدمات میں برابر مصروف رہے اور ایک رات امریکہ دن سے زیادہ جو کہ ولی کی آمدورفت میں صرف ہوا انھوں نے باوجود ایسے سخت صدمہ کے کوئی قومی کام ملتوی نہیں کیا اور ایسے مواقع کو تا بہت دور کبھی پاس نہیں آنے دیا جن سے بیٹے کا داغ تازہ ہو، اور قومی خدمات میں جرح واقع ہو، ولی میں انھیں خیالات سے وہ جنازہ کے ساتھ نہ گئے اور دفن کرنے میں شریک نہیں ہوئے، لوگوں کو سخت تعجب ہوا اور بعضوں نے بڑے بڑے اعتراض کیے اور حق یہ ہے کہ ان کے اعتراض بالکل بجا تھے کیونکہ ”من جہل شیئا اعدا کا“ الفرض یہ سب باتیں شہادت دیتی ہیں کہ ان کے تمام کاموں کی محرک کوئی ایسی مدعا ہی اٹنگ تھی جس پر دنیا کے معمولی ظلمان غالب نہیں آسکتے تھے اور جس قدر جسمانی انگلیں کم ہوتی جاتی تھیں وہ اٹنگ بڑھتی جاتی تھی۔

اس مقام پر یہ بات بھی لحاظ کے قابل ہے کہ سرسید کی فطرت میں جیسا کہ ان کے حالات اور ان کے کاموں سے معلوم ہوتا ہے، غایت درجہ کی فراخ حوصلگی اور کشادہ دلی تھی یہاں تک کہ بعض اشخاص غلطی سے ان کو حد سے زیادہ مسرت اور فضول خرچ خیال کرتے تھے جو لوگ ان کے حالات سے واقف ہیں ان کو معلوم ہے کہ جب تک مسلمانوں میں تعلیم پھیلانے کا خیال ان کے دل میں پیدا نہیں ہوا تھا وہ ہمیشہ اپنی بساط سے بہت بڑھ کر غریبوں اور مسکینوں کے ساتھ سلوک کرتے تھے اور کبھی ان کی آمدنی میں سے ایک حبہ پس انداز نہ ہوتا تھا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جب سے ان کو تعلیم اہل اسلام کا خیال ہوا انھوں نے اس قسم کے شخصی سلوک اور احسان بالکل بند کر دیئے۔ جو کچھ ان کے ضروری اخراجات سے بچا وہ انھوں نے مدرسہ کے سوا اور کبھی صرف نہیں کیا سائل ان کے دروازہ سے ہمیشہ ناکام پھرتے تھے تعلیم کے سوا کسی اور رفاہ عام کے چندہ میں بھی وہ شریک نہیں ہوتے تھے بنگلہ اس کے مدرسہ کی امداد میں وہ اپنی طاقت اور استطاعت سے بہرا بڑھ کر خرچ کرتے رہتے تھے۔ مدرسہ سے پہلے جب کہ وہ بجنور میں مدرسہ میں تھے

۱۸۵۷ء میں جبکہ مشیر مودھاں بہادر رئیس پور کالج کے ملاحظہ کو علی گڑھ میں آئے اور ریٹیروں کی طرف سے سرسید نے ان کو ایڈمٹ کیا، اسی وقت کالج کی خیر خواہی کے سبب میں سرسید نے ایک ایسا کام کیا جس کو سن کر شخص بوجھ بھلا نہیں ہو سکتا۔ چھوٹی پچاس سو پیر سرسید کے پوتے سید مسعود کو اور پچاس سو پیر کا جو نواب محسن الملک کا عزیز ہے اور پچاس روپے دونوں صاحبوں کے ملازموں کو علاوہ پانسو روپے چندہ کالج کے دیئے تھے، دونوں بچوں نے نو خوشی سے کہہ دیا کہ ہم دونوں کے سوا دوسرے کالج کی تعمیر میں صرف کیے جائیں مگر سرسید نے نو کردوں کا رویہ بھی لینا چاہا نواب محسن الملک نے تو اپنے نو کردوں کے انعام کو ان سے لینا برگزینہ کیا اور پچاس روپے انھیں کو دیدیے مگر سرسید نے حجت شرعی تمام کرنے کو نو کردوں سے کہا کہ اگر تم کو ہماری نوکری منظور ہے تو جو انعام نواب صاحب نے تم کو دیا ہے وہ کالج میں دیدو ورنہ ابھی اپنا سب کر لو، وہ پچاس روپے نوکری کو نہ چھوڑ سکتے تھے انھوں نے مجبور پچاس روپے سرسید کو دیدیے اور سرسید نے پانچ روپے ان سے دوسرے کے کالج فنڈ میں جمع کر لیا ۱۲

انہوں نے کئی مسجدوں کی تعمیر اور مرمت کرائی، اپنے پاس سے بھی روپیہ صرف کیا اور اپنے دوستوں اور عزیزوں سے بھی کئے کر دکھایا۔ مگر غدر کے بعد جب سہارنپور کی جامع مسجد کے لیے ان سے چندہ طلب کیا گیا تو انہوں نے چندہ دینے سے صاف انکار کیا اور لکھ بھیجا کہ "میں خدا کے زندہ گھروں کی تعمیر کی فکر میں ہوں اور آپ لوگوں کو اینٹ مٹی کے گھر کی تعمیر کا خیال ہے۔" ان باتوں سے صاف پایا جاتا ہے کہ سرسید کی کل مذہب کے ہاتھ میں تھی۔ مذہب جہاں چاہتا تھا ان سے خرچ کراتا تھا اور جہاں چاہتا تھا ان کا ہاتھ روک دیتا تھا کیونکہ مذہب کے سوا کوئی ایسا زبردست حاکم نہیں ہے جو انسان کی طبیعت کے اقتضا پر غالب آجائے اور ایک ہی شخص کو ہمیشہ کے لیے ایک جگہ غایت درجہ کا فیاض اور دوسری جگہ حد سے زیادہ محسوس اور تنگدل بنا دے۔ جیسا کہ بعض صحابہ کا حال تھا کہ کہیں ان کی داد و دہش کے آگے ماتم کی فیاضی بیچ معلوم ہوتی تھی اور کہیں ان کی کفایت شعاری اور جبررسی پر حد سے زیادہ تعجب ہوتا تھا۔

اگرچہ اس میں شک نہیں کہ سرسید نے جتنے بڑے بڑے کام کیے وہ عقل سلیم اور رائے صاحب کی ہدایت سے کیے اور اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ ان کے کارہائے نمایاں ان کی دانشمندی اور رائے صاحب کے نتیجے تھے نہ مذہب کے۔ لیکن اول تو جو شخص مذہب اور عقل کو لازم و ملزوم جانتا ہو اس کے کسی کام کی نسبت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ عقل کا نتیجہ تھا نہ مذہب کا۔ دوسرے عقل کا کام صرف اس قدر ہے کہ وہ راہِ راست بتا دیتی ہے مگر اس راہ پر چلنا اور ثابت قدم رہنا اور نہایت استقلال کے ساتھ اس کی تمام منزلیں طے کرنا جب تک کہ مذہب کا سہارا نہ ہو غیر ممکن ہے۔

اس بحث کو جو ہم نے اس قدر طول دیا ہے اس سے شاید لوگوں کو یہ خیال ہو کہ ہم سرسید کے مخالفوں کو ان کے مسلمان یا پابند مذہب ہونے کا یقین دلانا چاہتے ہیں مگر فی الواقع ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کیونکہ جس مذہب کو سرسید مذہب سمجھتے تھے اور جس اسلام کو وہ اسلام جانتے تھے مخالفوں کے نزدیک نہ وہ مذہب مذہب تھا اور نہ وہ اسلام اسلام، بلکہ ہمارا مقصد اس طولانی بحث سے صرف اس بات کا ظاہر کرنا ہے کہ ایشیائی ممالک میں جہاں وطنیت اور قومیت کا خیال بالکل نہیں ہے جو شخص مذہب کا پابند نہ ہو وہ ہرگز ملک یا قوم کی بھلائی کا کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔ پس ہماری قوم کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو جو قومی مجددی کا دم بھرتے ہیں، یاد رکھنا چاہیے کہ جب تک وہ اسلام پر ثابت قدم نہ ہوں گے ممکن نہیں کہ قوم کی بھلائی کا کوئی بڑا کام کر سکیں۔ یورپ اور امریکا میں اب تک جس قدر ترقیات اور اصلاحات ظہور میں آئی ہیں ان کے بانی سبھی تقریباً تمام وہی لوگ نکلیں گے جو مذہب کے سخت پابند تھے، لوتھر، کالون، بیکن، ملٹن، نیوٹن، کولبس، ہنچن، فرینکلین، جارج بیٹن، واشنگٹن، ہمپڈن، میٹھی وغیرہ وغیرہ سب مذہب کے نہایت پابند تھے۔

سرسید کی ملکی خدمات اور ان کے نتائج

اس عنوان کے تحت میں ہم سرسید کی سرکاری، ملکی اور قومی، تینوں قسم کی خدمات کا ذکر کریں گے مگر پیشانی پر ہم نے ان تمام خدمات کو ملکی خدمات کی لفظ سے تعبیر کیا ہے، کیونکہ سرسید کو گورنمنٹ کی خیر خواہی اور حسن خدمت کی بدولت ملک اور قوم کی بھلائی کرنے میں بے انتہا مدد پہنچی ہے اور اس لیے ہم ایسی سرکاری خدمات کو بھی ملکی خدمات میں شمار کرتے ہیں۔ رسمی طرح ملک کے کسی فرقہ کو جو زمانہ کے انقلابات سے پست ہو گیا ہو، اُتھارنا اور اس کے ہم وطنوں میں اس کا اعزاز اور سرنو قائم کرنے میں کوشش کرنا، حقیقت ملک کے ایک ایسے عضوِ ماؤت کی اصلاح کرنا ہے جس کے سبب سے اس کے تمام صحیح اعضاء معرضِ خطر میں ہوں۔

سرکاری خدمات

سب سے پہلے ہم سرسید کی سرکاری خدمات پر جو ان کی تمام ترقیات کی پہلی سیڑھی اور ان کے تمام کارناموں کا ایک روبرو دستِ آکر رہی ہیں، نظر ڈالتے ہیں، اور اپنی قوم کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو جو گورنمنٹ سروس کے ذریعہ سے غزاز حاصل کرنا چاہتے ہیں، نصیحت کرتے ہیں کہ ان کو سرسید کی راستبازی، دیانت، وفاداری اور شرفیافتہ، نہ غلامانہ، اطاعت سے

جس پر وہ ملازمت کے زمانہ میں اور اُس کے بعد ہمیشہ کاربند رہے، سبق لینا چاہیے۔ کیونکہ حسن خدمت کی کوئی مثال اور کوئی نمونہ ان کو اس سے بہتر دستیاب نہیں ہو سکتا۔

سرکاری ملازمت کی ابتدا

جس زمانہ میں سرسید نے انگریزی نوکری اختیار کی اس وقت مسلمانوں کو انگریزوں کے اخلاق، عادات، طرز معاشرت اور اننگلٹن گورنمنٹ کی طرز حکومت سے بہت ہی کم واقفیت تھی اور دلی اور اُس کے نواح کے مسلمان عموماً انگریزی نوکری اور انگریزی تعلیم سے متنفر تھے۔ خصوصاً جو خاندان قلعہ دہلی سے کچھ تعلق رکھتے تھے ان کو انگریزی نوکری کا بھی خواب بھی نظر نہ آتا ہو گا۔ چنانچہ سرسید نے جب سرکاری ملازمت کی خواہش ظاہر کی تو ان کے تمام عزیز اور رشتہ دار اس ارادہ سے مانع آئے مگر چونکہ ان کے تانا دہیر الدولہ نے بعض سرکاری خدمات انجام دی تھی اور ان کے خالو خلیل اللہ خاں اس وقت ایک ممتاز انگریزی خدمت پر مامور تھے اس لیے انھوں نے قلعہ دہلی کے تبرک پروفیسر سے نہ کی بلکہ انگریزی نوکری اختیار کر لی۔

کام سیکھنے کا شوق

سرسید نے ابتداء سے ملازمت ہی میں یہ نکتہ بخوبی ذہن نشین کر لیا تھا کہ کسی کام کے ملنے سے پہلے اُس کام کی لیاقت اور اس کے فرائض کی اطلاع حاصل کرنی ضرور ہے۔ چنانچہ ۱۸۳۷ء میں جب مسٹر رابرٹ سمبلٹن نے ان کو عدالت مشن کا سٹڈنٹ قرار مقرر کرنا چاہا تو انھوں نے اُس کے

(حاشیہ اگلے صفحہ)

قبول کرنے سے انکار کیا اور صاف کہہ دیا کہ جس کام کی میں اپنے میں یاقوت نہیں پاتا اس کو کیونکہ قبول اور اس کے فرائض ادا کر سکتا ہوں؛ جب وہ آگرہ کی کمشنری میں نائب منشی کے عہدہ پر مقرر ہوئے تو انھوں نے بہت جلد قوانین مالی سے واقفیت حاصل کر لی اور ترتیبیت دفتر کا ایک دستور العمل بنایا جس کے مطابق تمام دفتر کمشنری آگرہ کا مرتب کیا گیا۔ پھر عداوت منصفی کے متعلق قوانین کا ایک خلاصہ تیار کیا جس کو صاحب کمشنری آگرہ نے گورنمنٹ میں پیش کر کے ان کے لیے عہدہ منصفی کی سفارش کی۔

حسن خدمت

اس کے بعد انھوں نے اپنے تمام زماںہ ملازمت میں اس قاعدہ کو ہمیشہ نصب العین رکھا کہ جو کام سرکار کی طرف سے ان کو تفویض ہوا اس کے متعلق کافی واقفیت بہم پہنچانی اور اس کے فرائض بڑے تجربہ کار آدمیوں کی طرح سر انجام کیے۔ یہاں تک کہ سروس کا زمانہ ختم ہونے کے بعد بھی جتنے کام گورنمنٹ نے ان سے لینے چاہیے ان کو کمال جانفشانی اور محنت سے اور نہایت بصیرت اور اطلاع کے ساتھ انجام دیا۔ لیجس لیٹو کونسل کی ممبری انھوں نے ایسی یاقوت کے ساتھ کی کہ ان سے پہلے کسی بندوستانی ممبر نے

لے چوک سررشتہ داری عداوت سٹیشن کے قبول کرنے سے سب نے اس خوف سے انکار کیا تھا کہ بلو اٹس کے فرائض ان سے ادا نہ ہو سکیں اس لیے مشورہ بہت مہینے نے جو سفارش کی تھی سٹریٹنڈی کے نام لکھ کر سرسید کو آگرہ بھیجا تھا اس میں ان کو عالی خاندان اور ہوشیار ہونے کے علاوہ ڈرپوک بھی لکھا تھا۔ اس خط کی کورنل گیم سرسید کی لائف میں نقل کر کے لکھے ہیں کہ سرسید میں اب کوئی علامت ڈرپوک ہونے کی نہیں ہے اس کے بعد وہ عداوت جنگ کے معنی ماٹروٹ دار لکھ کر کہتے ہیں کہ غدار کے موقع پر سید احمد نے اس خطاب کا کافی ثبوت دیا ہے۔ ۳۔

نہیں کی تھی۔ اُن سے پہلے ظاہر کسی میٹرو میئر نے کوئی مسودہ قانون پیش نہیں کیا تھا۔ انہوں نے تین مفید قانون بنائے جن میں سے صرف دو پیش ہوئے اور دونوں پاس ہو گئے کونسل کے اکثر مباحثوں میں باوجود انگریزی نہ جانتے کے نہایت سنجیدہ اور سیکل اسپینس کہیں اور بعض اپنی اعلیٰ بیافت کے سبب دو وائسرائوں کے عہد میں دوبارہ منتخب ہوئے۔ اُن کی ایک اسپینس کی نسبت جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہو چکا ہے خود لارڈ لٹن نے اپنی زبان سے کہا کہ میں نے ایسی قابلانہ اسپینس کبھی نہیں سنی۔ اسی طرح ماسچو کیشنل کیشن میں جیسی ممبروں اور مفصل شہادت انہوں نے دی اور جو روشنی تعلیمی معاملات پر اُن کی شہادت نے ڈالی اس سے زیادہ کسی شہادت میں نہیں سنی گئی۔ غرض کہ انہوں نے سرکاری کام کو کبھی بیگار یوں کی طرح نہیں کیا بلکہ ہر ایک خدمت کے فرائض نہایت تندہی اور جانفشانی سے ادا کیے اسی سبب سے اُن کے افسر ہمیشہ ان کے مداح اور شکر گزار رہے۔

بے غرضی

جہاں تک ہم کو معلوم ہے انہوں نے کبھی اپنی ترقی یا کسی خدمت کے صلہ کی صراحت یا کیا بیٹہ اپنے فائدے سے درخواست نہیں کی بلکہ ہمیشہ اپنی کار گذاری اور حسن خدمت سے اُن کے دل میں جگہ کی اور خود اپنے کاموں کو اپنا سفارشی بنایا۔ ۱۸۸۸ء میں جب کہ سرسید کو بمقام علیگڑھ کے سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب دیا گیا اس وقت صاحب کلکٹر علیگڑھ مسٹر کینڈی نے سرسید کی تعریف میں جو لمبی تقریر کی تھی اس میں یہ بھی کہا تھا کہ "یہ وہ شخص ہے جس نے اپنے واسطے کبھی کچھ نہیں چاہا بلکہ ہر چیز اپنے ملک کے واسطے

کبھی کچھ نہیں چاہا بلکہ ہر چیز اپنے ملک کے واسطے چاہی۔" پر وفسر آرنلڈ ایم اے جو دس برس علیگڑھ کالج میں سرسید کے پاس رہے انہوں نے لاہور کے ماتمی جلسہ میں جو سرسید کی ذماتہ پر اسی طرح ویسی تھی اس میں یہ بھی کہا تھا کہ گورنمنٹ کی طرف سے جو اعزاز یا خطاب ان کو ملا وہ ہمیشہ بے طلب ملا اور میں آج تک کسی ایسے شخص سے نہیں ملا جو ان سے زیادہ شریفانہ زندگی بسر کرنے والا اور ان سے زیادہ بے لگ اور بے غرض ہو۔

دیانت داری کی صفت ان کی تمام پیکر ہے۔ سر دوس میں ایسی نمایاں رہی ہے جیسے آفتاب میں روشنی، صہیب رومی کی نسبت آنحضرت نے فرمایا ہے کہ "فَوَلَعْبُدُ صَہِیْبَ لَوْ كَذَّبَتْ اَهْلًا لَّدَیْ عِصْرَةَ" (یعنی صہیب ایسا نیک بندہ ہے کہ اگر وہ خدا سے نہ ڈرتا تو بھی اس کی نافرمانی نہ کرتا، یہی حال سرسید کے تدین کا تھا وہ نہ کس حاکم کے خوف سے اور نہ شرعی امتناع کی وجہ سے بلکہ محض اپنی طبیعت کے اقتضا سے کوئی کام دیانت داری کے خلاف نہیں کر سکتے تھے، غدر سے پہلے ان کا تدین بہت خردناک صورت میں ظاہر ہوتا تھا۔ اہل مقدمہ کو یہ جرات تو نہ ہوتی تھی کہ ان کے سامنے کچھ مدعا پیش کریں، یا ایسا پیغام بھیجیں، البتہ کبھی کبھی ناواقف لوگ دوران مقدمہ میں ان کے مکان پر سرفٹننے کے بہانے یا کوئی سوغات لے کر چلے جاتے تھے، سوغات کا قبول کرنا تو درکنار ہم نے سنا ہے کہ وہ سوغات لالے والے سے اس قدر گمان ہو جاتے تھے کہ اُس کا اثر مقدمہ کے فیصلہ تک پہنچتا تھا، آخر اہل مقدمہ نے اثنائے تحقیقات میں ان سے ملنا چھوڑ دیا تھا، جھوٹے مقدمے بنانے والے اور چھوٹی گواہیاں دینے والے ان کے نام سے کا پتے تھے، نہ ان سے اپنوں کو رعایت کی توقع تھی اور نہ غیروں کو صاحب بیج بنارس نے سالانہ رپورٹ میں ان کی نسبت

لکھا تھا کہ "شہر اور صنایع بنارس کو سید احمد خاں ایک ایسا شخص ملا ہے جس پر
 وہ نہایت اعتماد رکھتے ہیں اور جس کو فریب یا دھوکا نہیں دے سکتے۔"
 قدر سے پہلے جو اکثر یورپین افسروں نے سرسید کی نسبت اپنی چٹھانت
 میں رائے ظاہر کی ہے اس میں زیادہ تر اُن کے علو خاندان لیانفت اور دیانت
 داری کا ذکر کیا ہے کیونکہ اس سے زیادہ وہ ہندوستانیوں کے کیرکٹر سے اس وقت
 بخوبی واقف ہو سکتے ہیں جب کوئی امتیاز کا موقع پیش آئے یہاں ہم صرف
 ٹامس مڈکات صاحب ریزیڈنٹ و کمشنر دہلی کی چٹھی مورخہ ۱۴ جولائی ۱۸۵۸ء
 کا ترجمہ نقل کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "سید احمد خان معزز خاندان کے ممبر ہیں
 اور نواب دبیر الدولہ خواجہ فرید خان مرحوم کے جو شاہنشاہ اکبر شاہ مرحوم کے
 وزیر اعظم تھے، لوے ہیں۔ اور میں اپنے ذاتی تجربے سے اس بات کی شہادت
 دیتا ہوں کہ ایمانداری اور لیانفت میں بہت اعلیٰ درجہ کا کیرکٹر رکھتے ہیں۔"
 اس باب میں سرسید کی احتیاط کا یہ حال تھا کہ اُن کی سرسختی ختم ہونے پر او جو بولویہ
 گورنمنٹ بہت محوشی سے اُن کو کام کرنے کی مہلت دینی چاہتی تھی۔
 مگر انہوں نے رپاؤہ مہلت یعنی مناسب نہ سمجھی کیونکہ مدرسہ العلوم قائم
 ہو چکا تھا جس کے لیے چندہ جمع کرنے کی از بس ضرورت تھی اور وہ عام
 طور پر چندہ وصول کرنا ملازمت کی حالت میں غلاف احتیاط سمجھتے تھے۔
 چنانچہ جب تک انہوں نے پیش نہیں لی بنارس میں اپنے دوستوں کے سوا
 کسی سے چندہ طلب نہیں کیا۔

آزادی

اگرچہ سرسید نے اُس دربار کے سایہ میں پرورش پائی تھی جو ایک
 قدیم ڈسپاٹک گورنمنٹ کی یادگار تھا، جہاں آزادی کے پر جلتے تھے اور

خوشامد کا بازار گرم تھا، نیز اُس وقت شمالی ہندوستان میں انگریزی عملداری کا
 اہتدائی زمانہ تھا اور اس لیے برٹش گورنمنٹ میں بھی اُس وقت تک
 ایسی بیانی طرز حکومت کی تمام غاصبتیں موجود تھیں، اہل کار خوشامد کو اہلکاری کا
 زیور سمجھتے تھے اور اس وجہ سے یورپین حکام اور ہندوستان میں آکر خوشامد پسند بن
 جاتے تھے، باوجود اس کے سرسید کا تبراؤ اپنے افسروں کے ساتھ ابتدا
 سے اخیر تک نہایت آراو اند رہا۔ وہ اپنے افسروں کا ادب اور تعظیم اور
 سرکاری میں ان کی اطاعت جیسی کہ چاہیے ہمیشہ کرتے تھے مگر ان کا بے جا دباؤ
 کبھی نہیں مانا اور بے موقع کبھی ان کی ہاں میں ہاں نہیں ملائی۔ غدر سے بہت
 پہلے جب کہ دلی میں جان پائن گنہیں سشن جج اور سرسید مصنف تھے قنمت
 دہلی کے دو جاگیر دار بھائیوں میں جن میں سے ایک سرسید کا گہرا دوست تھا
 جاگیر کی بابت سخت نزاع تھا اور ان کا جھگڑا گورنمنٹ میں پیش تھا۔ دوسرے
 بھائی نے صاحب جج سے شکایت کی کہ میرے بھائی کو سید احمد خاں بھگاتا
 اور ہر قسم کی مدد دیتا ہے اس کو آپ بھادریں کہ جب تک بھلا جھگڑا عدالت
 سے طے نہ ہو جائے، وہ میرے بھائی سے ملنا چھوڑوے جان پائن گنہیں کے
 طنطنے اور رعب و وب کی تمام قنمت میں دھاک تھی اور ان کے کسی ماتحت کی
 یہ مجال نہ تھی کہ ان کا کہنا نہ مانے۔ انھوں نے ایک روز سرسید کو بلا کر سمجھایا کہ
 جب تک یہ نزاع رفع نہ ہو تم اپنے دوست سے ملنا چھوڑو۔ سرسید نے
 صاف کہہ دیا کہ میں بیشک آپ کا ماتحت ہوں، سرکاری معاملات میں جو کچھ
 آپ ہدایت کریں گے اُس کی بسر و چشم تعمیل کروں گا مگر میرے ذاتی تعلقات
 میں آپ کو دخل دنیا نہیں چاہیے، اگر آپ کہیں کہ تم چند روزہ کو اپنی مسال
 یا بہن سے ملنا چھوڑو تو میں کیوں کر آپ کے حکم کی تعمیل کر سکتا ہوں۔ اگرچہ

انگریزوں میں ہندوستان کی آب و ہوا ٹھکم اور خوشامد پسندی پیدا کر دیتی ہے مگر چونکہ آزادی ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہوتی ہے وہ ایسے آرزو ٹھکھوں کی آفر کار قدر کرنے لگتے ہیں اور برخلاف عام اشخاص کے ان کے ساتھ خاص طور کا برتاؤ برتتے ہیں جب صاحب نج نے یہ معقول عذر سنا پھر کبھی ن پر ایسا بے جا دباؤ نہیں ڈالا۔

۱۸۵۱ء میں جب کہ وہ پہلی بار مسٹر کرک کی جگہ صدر امین مقرر ہو کر رہنمائی میں اس وقت رہنمائی میں کھل بلی پڑی ہوئی تھی، مسٹر گتھی قائم مقام مجسٹریٹ نے ہیشمار مقدمے بد اعمالی اور رشوت ستانی کے مسٹر کرک پر دائر کر رکھے تھے، مخبری کا بازار گرم تھا، جو لوگ گتھی صاحب کے ہاں کرک کے برخلاف مخبری کرتے تھے ان سے سب لوگ دبتے تھے، خان بہادر غلام نبی خان مرحوم جو اس وقت وہاں نائب سررشتہ دار کلکٹری تھے ان کا بیان ہے کہ ”سید صاحب نے وہاں جا کر کئی کام صاحب مجسٹریٹ کی مرضی کے بالکل برخلاف کیے اور کبھی ان کا دباؤ نہیں مانا، ایک شخص باہر خاں نامی قصبہ رہنمائی کا نمبر وار جس کو راقم بھی جانتا ہے، گتھی صاحب کا بڑا منقریب تھا جس نے کرک کے برخلاف ان کو بہت مدد دی تھی، اس نے کسی دیوانی کے مقدمے میں سید صاحب کے اجلاس میں چھوٹی گواہی دی، انھوں نے فوراً اس کو ماخوذ کیا، ہر چند گتھی صاحب نے اس کی رہائی کے لیے سفارش کی مگر سید صاحب نے سفارش نہیں مانا اور اس کو دورہ سپرد کر دیا جہاں سے اس کو تین برس کی قید کا حکم ہوا۔“

پھر میونسپل کمیٹی کے ایک مقدمے میں گتھی صاحب ایک ٹھیکہ دار کی جائیداد بعلت مطالبہ ٹیکسی نیلام کرنی چاہتے تھے اور تمام ممبران کمیٹی

سوائے بید صاحب کے ان سے متفق رائے تھے۔ سرسید نے اس وقت کے بلاز کے مطابق بیٹے دی کی کمیٹی بدون حاصل کرنے ڈگری دیوانی کے اپنے اختیار سے ٹھیکہ وار کی جلیداونیسلام کرنے کی مجاز نہیں ہے جب سب نے اس رائے سے اختلاف کیا تو انہوں نے اپنی رائے مدلل تحریر کر کے کمیٹی میں بھیج دی۔ آخر گتھی صاحب کر بصد اکراہ انہیں کی رائے کے موافق عمل کرنا پڑا۔

منشی صاحب ہی کا یہ بیان ہے کہ "جب سے گتھی صاحب نے مسٹر کرک کوڑک دی تھی صدر امینی کی کچھ وقت لوگوں کی نظر میں نہیں رہی تھی خصوصاً ملازمان کچھری ضلع اس کو لاشے محض سمجھنے لگے تھے۔ اتفاق یہ کہ ایک شخص جس کا باپ صاحب ضلع کے محکمہ میں سررشتہ دار تھا، صدر امینی میں بزمہ محرران نوکر تھا اور اس گمنام پر کہ میرا باپ صاحب بمسٹر کرک کی ناک کا بال ہے اپنا کام نہایت بے پروائی سے کرتا تھا۔ سرسید نے اس کو بخلت غفلت و بے پروائی کے سبب کر دیا۔ ہر چند ضلع والوں نے سفارش کے لیے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے مگر انہوں نے کچھ اتفاقات نہ کیا، یہاں تک کہ وہ دیوانی کی تعطیل میں دلی چلے گئے، مگر تعطیل سے واپس آ کر کسی کے کہنے سے نہیں بلکہ اس کے باپ کے بڑھاپے کا خیال کر کے اس کو پھر بحال کر دیا۔ یہ واقعات اس زمانے کے ہیں جب کہ سرسید یور و چین حکام کی نظر میں ایک ہندوستانی عہدیدار سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے اور جو وقت اور اعتبار ان کو ایام غدر کی خدمات کے بعد انگلش حکام اور خود انگلش گورنمنٹ میں حاصل ہوا اس کا عشرہ عشر بھی اس وقت حاصل نہ تھا، مگر اس حالت میں بھی انہوں نے اپنی آن کو کبھی ہاتھ سے نہیں

جانے دیا اور اپنے فرائض منصبی نہایت آزادی اور دلیری سے ادا کرتے رہے۔ منشی غلام نبی خاں مرحوم کہتے تھے کہ ”منشی صاحب جو سٹر کرک کے مفدمات کی تحقیقات کے لیے اڈیشنل کمشنر ہو کر رہتک گئے تھے۔ جب سرسیدان سے ملے تو وہ ان کی ملاقات سے نہایت خوش ہوئے اور ان کی غیبت میں لوگوں سے کہا کہ ہم نے بندوستانی افسروں میں ایسا صاف اور آزاد طبیعت کوئی افسر نہیں دیکھا۔ اسی وجہ سے سرسید کا منشی صاحب سے اس قدر ربط بڑھ گیا تھا کہ آٹار الصنادید کا انگریزی ترجمہ جو سٹر بارٹس جنٹ مجسٹریٹ دہلی نے ناتمام چھوڑ دیا تھا اس کے پورا کرنے کا وعدہ انہوں نے سرسید سے کیا۔ چنانچہ جب صاحب موصوف مراد آباد میں حج ہو کر گئے تو ہیبت سا ترجمہ انہوں نے کرایا۔“

تھیوڈور مارلسین اس آرٹیکل میں جو انہوں نے سرسید کی وفات کے بعد ان کے پوٹیکل ورکس پر لکھا تھا، ترکی اور مسلمانوں کے تعلقات کی نسبت لکھتے ہیں کہ ”اس مضمون پر سرسید نے کوئی مذہب اور مشتمہ آواز نہیں نکالی۔ اس نے بھی اور مسلمانوں کی طرح سلطان ترکی کے ساتھ ہمدردی ظاہر کی اور اس کے تشریح پر افسوس کیا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ عمامے سلطنت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلا جائے اور اس کو یہ خوت تھا کہ مبادا مسلمان بھی پوٹیکل بے وقعتی کی اس حالت تک پہنچ جائیں جو یورپ میں یہودیوں کی حالت ہے۔ اسی لیے ترکی کے ہر ایک صدر پر وہ ویسے ہی پتے دل سے رنج و الم کرتا تھا جیسا کہ ہر مسلمان کرتا ہے لیکن اس ہمدردی کی بدولت جو اس کو اپنے معزز ہم مذہبوں کے ساتھ تھی، وہ قیصرینہ کی وفاداری اور احسانتندی سے سبکدوش نہیں ہو سکا۔“

بے تعصبی اور انصاف

اس کے سوا سرسید نے اپنی تمام ملازمت کا زمانہ جس بے تعصبی اور کشادہ دلی سے بسر کیا وہ فی الحقیقت ہمارے ملک میں ایک ایسی مثال ہے جو نایاب نہیں تو کیا بضرور ہے۔ انھوں نے عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر ہر قوم اور ہر مذہب کے آدمی کو ہمیشہ ایک نگاہ سے دیکھا اور کبھی ایک جج ہونے کی حیثیت سے اپنی قوم اور اپنے مذہب کے آدمی کو دوسری قوم اور دوسرے مذہب کے آدمی پر ترجیح نہیں دی۔ بلکہ ایسی ترجیح دینے کو ایک نہایت کمینہ نصحت اور تنگ انسانیت تصور کیا ان کی بے تعصبی کا پڑا ثبوت یہ ہے کہ غدر کے موقع پر جیسا کہ پہلے حصہ میں مفصل بیان ہو چکا ہے، باوجودیکہ ضلع بجنور کے ہندو مسلمانوں میں کمال عداوت تھی، وہاں کے تمام ہندو تعلقہ داروں نے خود سرکار سے کمال غمخوشی اور آرزو کے ساتھ یہ درخواست کی کہ جب تک ضلع میں امن نہ ہو سید احمد خاں اور ڈپٹی رحمت خاں کو ضلع سپر دیکھائے اور انھیں کو ضلع کا حاکم بنایا جائے۔ تاریخ سرکشی بجنور میں سرسید نے جہاں ہندو چودھریوں کا حال لکھا ہے اُس سے ان کی غایت و وجہ کی بے تعصبی ظاہر ہوتی ہے۔۔

باوجودیکہ ہندو چودھریوں اور ان کے ساتھیوں کی طرف سے مسلمانوں پر سخت ظلم اور زیادتیاں ہوئی تھیں اس پر بھی چونکہ وہ فی الواقع بغاوت کے الزام سے پاک تھے اس لیے ان کو اس الزام سے بالکل ہری کیا ہے، اور واقعات کے بیان کرنے میں مذہبی یا قومی تعصبات کو جو اس وقت تمام ملک میں دیا کی طرح پھیلے ہوئے تھے مطلق کام نہیں فرمایا۔

جب سرسید ملازمت سے کنارہ کش ہو کر بنارس سے روانہ ہونے کو

تھے تو وہاں کے ہندو اور مسلمان رؤسائے بشمول یورپین حکام کے ان کو ایک حکام کے ان کو ایک دوامی ایڈریس دیا تھا جس میں ان کی سرکاری ملکی اور قومی خدمات کے علاوہ خاص کر ان کے بے لاگ انصاف اور بے تعصبانہ فیصلوں کی تہایت تعریف تھی۔ سر سید نے اس کے جواب میں کہا کہ "اگر میں نے قانون کی تعمیل انصاف کے ساتھ بلا لحاظ کسی کے رقبہ اور قوم اور رنگ یا مذہب کے کی تو اس کے لحاظ سے میں کسی شکر یہ کا مستحق نہیں ہوں مجھ کو تمام عمر اس بات کی فکر رہی ہے کہ جو بڑا فرض مجھ کو تفویض ہوا ہے اس کو ایمانداری کے ساتھ انجام دوں۔ میں اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو ہمیشہ خوب سمجھتا رہا ہوں اور دنیا کی دولت اور عزت پر سچا پتہ کو اور خدا تعالیٰ کی خوشنودی کو انسان کی قدر وانی اور تعریف پر ہمیشہ ترجیح دیتا رہا ہوں۔ میں نے ہمیشہ اپنے تئیں خدا تعالیٰ کا جواب دہ سمجھا ہے، نہ کہ انسان کا گو میں نے اپنی راستے میں غلطی کی ہو، مگر ہمیشہ اپنے ایمان کی ہدایت پر عمل کیا ہے باوجود اس کے مجھ کو اس بات کے دیکھنے سے کچھ کم خوشی حاصل نہیں ہوتی کہ جو کوششیں میں نے سب لوگوں کے حق میں انصاف کرنے میں کی تھیں ان کی قدر شناسی میرے ہم وطنوں نے کی ہے۔"

انہیں دنوں میں جب کہ سر سید بنارس سے رخصت ہونے والے تھے شہر کے بندو اور مسلمان شرفانے ان کی یادگار قائم کرنے کے لیے ایک کمیٹی منعقد کی تھی جس کے پریذیڈنٹ راجہ شمشون رائے سنگھ بہادر تھے۔ اس کمیٹی میں راجہ صاحب موصوف نے سر سید کی یادگار کے طور پر بنارس کالج میں طبیعات کی تحصیل کے لیے ایک سکالرشپ ہمیشہ کے واسطے "سید احمد شاہ سکالرشپ" کے نام سے مقرر کی تھی جو اب تک برابر جاری ہے۔

اشٹام قحط ضلع مراد آباد کا مفصل حال ہم پہلے حصہ میں لکھ چکے ہیں اسی کے ضمن میں وہ واقعہ جو راجہ جیکشن واس صاحب نے مجھ سے خود بیان کیا تھا اور جس سے ان کو سرسید کی بے تعصبی کا یقین ہوا تھا ملاحظہ کے قابل ہے کہ رسالہ "لائل محمد نزاوت انڈیا" کو دیکھ کر انہوں نے سرسید کو ایک سخت متعصب مسلمان خیال کیا تھا مگر مراد آباد کے محتاج خاندان میں ہر مذہب اور برہمت کے ادنیٰ ادنیٰ کنگلوں کی خدمت گزاری میں ان کو دیوانہ وار سرگرم دیکھ کر وہ حیران اور ان کی بے تعصبی کے دل سے قائل ہو گئے۔

وفاداری

غدر کے زمانہ میں جس خلوص اور سچائی کے ساتھ گورنمنٹ کی وفاداری خیر خواہی اور یورپین مردوں سمیت ان لوگوں کی جان کی حفاظت ان سے بن آئی اس کو ہم مفصل پہلے حصہ میں لکھ چکے ہیں یہاں صرف سر جان اسٹریچن کے چند الفاظ نقل کیے جاتے ہیں جو انہوں نے ۱۸۹۰ء میں ہندوستان سے رخصت ہوتے وقت محترم کالج کمیٹی کے ایڈریس کے جواب میں سرسید کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہے تھے انہوں نے کہا کہ "کسی شخص نے اس سے زیادہ شرفیاءہ طور پر ولیری اور وفاداری کا ثبوت برٹش گورنمنٹ کے ساتھ نہیں دیا جیسا کہ شہ میں انہوں نے (یعنی سید احمد خاں نے) دیا، میں کوئی لفظ بھی ایسا استعمال نہیں کر سکتا جس سے ان کی مہا نشادری کا کافی طور پر اظہار ہو سکے" اسی ایسیچ میں انہوں نے یہ بھی کہا کہ "شمال مغربی اضلاع میں ان سے زیادہ کوئی روشن صمیمیت نہیں ہوا۔ اور اسٹریچن نے اپنی رپورٹ میں اقرار کیا تھا کہ "اگر صدر ایجنٹ (یعنی

سید احمد خاں ایچ میں واسطہ نہ ہوتا تو ہماری جانیں نواب محمود خاں کی شکار ہو جاتیں۔
 اسی رپورٹ میں انھوں نے سرسید کی دانشمندی بے مثل ایمانداری اور
 سرگرمی پر شہادت دی تھی۔

بنارس کی سول جسٹس ایڈمنسٹریشن رپورٹ ۱۸۶۴ء میں صاحب راج
 بنارس نے ان کی نسبت لکھا کہ "شہر اور ضلع بنارس کو سید احمد خاں
 ایک ایسا شخص ملا ہے جس پر وہ نہایت اعتماد رکھتے ہیں اور جس کو فریب
 یا دھوکا نہیں دے سکتے۔ وہ اپنے ورائٹس کے ادا کرنے میں نہایت باقاعدہ
 اور ان کی طرف متوجہ رہنے والا ہے اور اس کے فیصلے نہایت احتیاط اور غور
 سے کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ مقدمہ کے ہر ایک پہلو اور ہر ایک جانب
 پر اس طرح غور کرتا ہے کہ عدالت اپیل کے فیصلہ کے واسطے کچھ باقی نہیں
 رہتا۔ ان کے اس بہت بڑے تجربہ سے جو ہر قسم کے جوڈیشل امور میں
 حاصل ہے، میں نے خود بہت فائدہ اٹھایا ہے۔"

ہائی کورٹ کے ججوں نے سرسید کی درخواست پینشن گورنمنٹ میں بھیجے
 وقت حسب ذیل رپورٹ کی تھی "سید احمد خاں کے اوصاف اور قابلیت
 بحیثیت ایک پبلک سرونٹ کے ہزاروں پر بخوبی روشن ہیں مگر یہ عدالت
 بوجہ بالا دست عدالت ہونے کے جس کے سید احمد خاں ماتحت رہے
 ہیں، ان کی ذہانت، محنت، قابلیت اور ہوشیاری کی بلند درجہ اور بے داغ
 شہرت کو جو انھوں نے اپنے طول طویل زمانہ ملازمت میں تمام جماعتوں
 کے درمیان حاصل کیا ہے بطور شہادت کے درج کر دینا چاہتی ہے اور نیز
 اس نقصان پر افسوس ظاہر کرنا چاہتی ہے جو پبلک سروس کو جو انھوں نے
 استعانت اور شرافت کے ساتھ انجام دی ہے، ان کی کنارہ کسی سے

پہنچے گا۔

نواب لٹنٹ گورنر کی طرف سے جو اس رپورٹ کا جواب موصول ہوا وہ یہ ہے ”سید احمد خاں کا استعفا منظور کرنے میں سبز آنر لٹنٹ گورنر نے مجھکو ہدایت کی ہے کہ ان کی جانب سے میں ان کی ہائی اپینین سید احمد خاں کی اس قابلیت اور ہوشیاری کی نسبت ظاہر کروں جو پبلک سروس میں ان کے امتیاز کا باعث رہی ہے اور نیز ان کی اس روشن، مہذب اور بے غرضانہ محنت کی نسبت بھی جو انھوں نے اپنی پرائیویٹ لائف میں اپنے ہمسوطنوں کے فائدے کے واسطے کی ہے۔“

استحقاق

اس موقع پر ہائی کورٹ نے چاہا تھا کہ سرسید کی خدمات کی نسبت ایک خاص شکر یہ گورنمنٹ گزٹ میں مشتہر کرایا جائے مگر چونکہ یہ ایک غیر معمولی طریقہ تھا اس لیے عمل میں نہیں آنے پایا لیکن پائیور نے غالباً رجسٹرار ہائی کورٹ کے اشارے سے اس شکر یہ کے الفاظ چھاپ کر مشتہر کر دیے تھے۔

کتاب ”پرزادوف دی انڈین اسپائر“ جس میں سرسید کو ارکان سلطنت ہندوستان میں سے ایک رکن شمار کیا گیا ہے، ان کی ممبری کونسل کے زمانہ کی طرف اشارہ کر کے یہ لکھا ہے کہ ”ان طریقوں میں سے جو لارڈ لٹن نے ہندوستانوں کو عزت اور ذمہ داری کے مناصب پر ترقی دینے کے لیے اختیار کیے تھے کوئی طریقہ انروئے استحقاق کے اس قدر ہر دل عزیز نہیں ہوا جیسا کہ

شایستہ مسلمانوں کے اس واجب التحظیم لیڈر ایسی سید احمد خاں کالجیس
 بیٹو کونسل میں مقرر کرنا ہوگا ہے۔ اس اعزاز کو بہت دور مسلمانوں نے
 مساوی طور پر سید احمد خاں کی دیانت داری۔ بے غرضانہ اور شرفیابہ برتاؤ
 اور ان کی قابلیتوں کا صلہ تسلیم کیا ہے۔

پولشکل خدمات

سٹراپیج جی کہین ممبر پارلیمنٹ نے اخبار ”ہوم ورڈ میل“ میں سرسید کی نسبت اپنی یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ”سید احمد خاں جس سے میں نے شہ میں جب کہ وہ لیجس بیٹو کونسل کا ممبر تھا، واقفیت حاصل کی تھی، ٹھیک اس قسم کا شخص ہے جس کو ہندوستان کا انگلش منتظم اپنے ساتھ رکھنے کی خاطر شکل او خطرہ کے وقت میں خواہش کرے گا۔ وہ ایک خاندانی، تعلیم یافتہ، لائق، دفاہ ارادہ پوری اریجنل اور مستقل طبیعت کا آدمی ہے۔ وہ تاج برطانیہ کا ایک خیر خواہ اور دوست سجکٹ ہے، مگر یا اینہم وہ انگریزی گورنمنٹ کے نقطوں سے بخوبی واقف ہے۔“

سٹر تھیوڈور بک نے جو ۲۹ مارچ ۱۹۰۷ء کو سرسید کی وفات پر اسٹیج دی تھی اس میں انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ”دس برس کا عرصہ ہوا کہ سر آکلنڈ کالون نے جب کہ وہ لٹنٹ گورنر تھے مجھ سے یہ کہا تھا کہ ”کسی زندہ شخص نے عام اس سے کہ وہ انگریز ہو یا ہندوستانی، برٹش گورنمنٹ کا استحکام سلطنت ہندوستان کے بارہ میں اس قدر کوشش نہیں کی ہے جس قدر کہ سرسید نے کی ہے۔“

رسالہ اسباب بغاوت اور اس پر لوگوں کی رائیں

رسالہ اسباب بغاوت جس کا کہنا ایک حیثیت سے ملک اور قوم کی

بے نظیر خدمت اور دوسری حیثیت سے تاج برطانیہ کی حقیقی خیر خواہی کا کام تھا، سر سید کی ان جلیل القدر خدمات میں سے بے جن سے وہ ارکان سلطنت میں شمار کیے جانے کے مستحق ہوئے ہیں، وہ اپنے ایک خط میں جو ولایت سے مولوی سید مہدی علی خاں کو بھیجا ہے لکھتے ہیں کہ ”میں انڈیا وفس میں صاحب سکریٹری وزیر ہند کے پاس گیا تھا، انھوں نے مجھ کو کنسل کے کاغذات میں میری کتاب ”اسباب بغاوت“ مع تامل و کمال انگریزی ترجمہ کے دکھلائی، اچھے دیکھ کر میرا ہیت دل خوش ہوا، جو کچھ رایش اس کی بدولت قرار پائیں ان کا بیان بے فائدہ ہے، اہل ہند ناقدر دان، دوست کش اور اپنے خیر خواہ کے دشمن ہیں مگر میں خوش ہوں کہ میرے سموطنوں کی بھلائی ہوئی“

اسی حال کو انھوں نے زبانی مجھ سے اس طرح بیان کیا کہ ”ولایت میں سر جان کے فارن سکریٹری وزیر ہند سے پرائیویٹ ملاقات ہوئی تو ان کی میز پر ایک دفتر کاغذات کا موجود تھا، انھوں نے ہنس کر کہا کہ تم جانتے ہو یہ کیا چیز ہے؟ یہ تمہارا رسالہ اسباب بغاوت اصل اور اس کا انگریزی ترجمہ ہے اور اس کے ساتھ وہ تمام مباحثات ہیں جو اس پر پارلیمنٹ میں ہوئے مگر چونکہ وہ تمام مباحثے کا نفیڈنٹ شامل تھے اس لیے وہ تہ چھپے اور نہ ان کا ولایت کے کسی اخبار میں تذکرہ ہوا۔“

سر آکلنڈ کالون کی رائے

اسی کتاب کی نسبت مشہور ہے سر آکلنڈ کالون لفٹنٹ گورنر نے ٹرسٹیان محمدن کالج کی ایڈریس کے جواب میں یہ الفاظ کہے تھے کہ ”جو واقعات سب سے پہلے مجھ کو اس وقت پیش آئے جب کہ میں اول مرتبہ ہندوستان

میں آیا تھا۔ منجملہ ان کے ایک یہ بات تھی کہ میرے دوست سر سید احمد خاں نے ایک ایسے معاملہ میں مجھ سے اعانت کی خواہش کی جو اس وقت انہوں نے شروع کیا تھا اور جس کی طرف ان کی دلی توجہ مائل تھی۔ انہوں نے مجھ سے یہ فرمائش کی تھی کہ میں ان کو ہندوستانی زبان سے انگریزی زبان میں اس رسالہ کا ترجمہ کرنے میں مدد دوں جو انہوں نے ان افسوسناک واقعات کے اسباب کی نسبت تحریر کیا تھا جو ۱۸۵۷ء میں ظہور میں آئے ہیں کہہ سکتا ہوں کہ آپ میں سے اکثر صاحبوں نے اس رسالہ کو دیکھا ہوگا انہوں نے مجھ سے اس امداد کی درخواست کر کے مجھ پر ایک ایسا احسان کیا ہندوستان میں میرے دورِ ملازمت کے خاتمہ تک قائم رہیگا کیونکہ انہوں نے اس رسالہ میں خاص کر بعض ایسے خیالات پر زور دیا تھا جن کی پوری قوت کو میں اس کے بعد اپنے تجربہ کی رو سے بخوبی سمجھ سکا ہوں۔ سر سید احمد نے اس میں اشارہ کیا تھا کہ جو باتیں انگریزوں اور ہندوستانیوں دونوں کے لیے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ایک دوسرے کے خیالات اور حالات کو بخوبی سمجھیں۔ انہوں نے اس بات پر اصرار کیا تھا کہ زیادہ تر ان واقعات کی بنیاد جن پر وہ بحث کر رہے تھے، سہلے ناراضی کے غلط فہمی تھی۔ پس اگر انگریز اور ہندوستانی ایک دوسرے کے خیالات کے سمجھنے میں ثابت قدمی کے ساتھ کوشش کریں گے تو ان کے باہمی تعلقات بہت زیادہ مزبور و مستحکم ہو جائیں گے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ ”انہیں خیالات سے ہمارے ہندوستان کے انتظامی مسائل حل ہوں گے اور انہیں خیالات کی دوسری صورت علی گڑھ کالج ہے۔“

مسٹر مارلین کی رائے

مسٹر تھیوڈور مارلین نے جو سرسید کی وفات کے بعد اُن کے پوسٹل ورکس پر ایک آرٹیکل لکھا تھا اس میں وہ اسی رسالہء اسبابِ بغاوت کی نسبت لکھتے ہیں کہ ”انگریزوں میں بہت سے اس بات کے بڑے خواہش مند تھے کہ فتح کے بعد (ہندوستان میں) دل کھول کر انتقام لیں اور اُن کے غصہ کی آگ مسلمانوں کے برخلاف خاص کر بھڑکی ہوئی تھی جن کی نسبت بہت سے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ وہ غدر کے محرک ہوئے ہیں۔ اُس وحشیانہ حالت میں جبکہ شدید تر خیالات کے پھیلنے کا احتمال تھا ایک ایسی حق بات کا جو عام پسند نہ تھی، منہ سے نکالنا کوئی آسان بات نہ تھی... ۱۸۵۸ء میں یہ دلیری کے الفاظ تھے، باوجود اس کے سرسید کے دلائل کے عام منہ سے کی سچائی اُسی وقت سے تسلیم کر لی گئی ہے اور جو لوگ سرسید کے اس برتاؤ پر جو اُس نے نیشنل کانگریس کے ساتھ کیا، الزام لگاتے ہیں اُن کے لیے اس بات پر غور تا مفید ہو گا کہ اس نے اتنی مدت پہلے جتنی کہ ۱۸۵۸ء سے اب تک گزری ہے گورنمنٹ پر زبرد والاتھا کہ جس بیٹو کنسل میں دسیوں کے داخل کرنے کی نہایت ضرورت ہے۔“

، بیوم نیوز کی رائے

انگلستان کے مشہور اخبار ”بیوم نیوز“ نے اس کتاب کی نسبت لکھا تھا کہ ”سید احمد خاں نے جو غدر کے اسباب تخریر کیے تھے اُن میں سے بعض نہایت قیمتی اور عمدہ آمد کے قابل تجویز ہیں پیش کی تھیں جو حکام

ہندوستان نے کسی اور ذریعہ سے حاصل نہیں کیں، اس نے نہایت دلیری کے ساتھ اپنی رائے اس مضمون پر ظاہر کی۔ یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ حکمران گروہ میں اس کی رائے نے نہایت اثر پیدا کیا۔ وہ ان اسباب کے بیان کرنے سے خائف نہیں ہوا جن کی طرف غدر کو بخوبی منسوب کیا جا سکتا ہے اور جن کی صحت تجربہ سے پورے طور پر ثابت ہو چکی ہے۔“

برمنگھم ڈیلی گزٹ کی رائے

”برمنگھم ڈیلی گزٹ نے سرسید کی اسی کتاب کا اس قدر خلاصہ لکھ کر یہ تحریر کیا تھا کہ ”ان شکایتوں کو اس طرح رفع کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی سے لے کر تاج برطانیہ سے متعلق کی گئی اور ہندوستانی احمدیہ پین جو ملازم سرکار نہ تھے وہ وائسرائے اور پریزیڈنسیوں کی لیجس لیٹو کو نسلوں میں شریک کیے گئے۔“

سینٹ جمیس بجٹ کی رائے

اخبار ”سینٹ جمیس بجٹ“ نے اسی کتاب پر ریمارک کیا تھا کہ ”سید احمد خاں کی مستحکم و فاداری جو اس یقین پر مبنی ہے کہ انگریزی حکومت اس کے

لئے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ رسالہ اسباب بغاوت کے دیکھنے کے بعد یہ تبدیلی عمل میں آئی ہے کیونکہ حکم سطر کا اشتہار میں اس تبدیلی کا اعلان کیا گیا تھا سرسید کی کتاب چھپنے سے پہلے شائع ہو چکا تھا پس اس سے یہ مراد ہے کہ جس بات کی آرزو سرسید نے اس کتاب میں ظاہر کی تھی وہ ان کی کتاب کے پیش ہونے سے پہلے ہی پوری کر دی گئی ۱۲ -

ملک کے واسطے سراسر مفید ہے، وہ اُس کے اُن خیالات اور رایوں کو نہایت سنگین کر دیتی ہے جو اُس نے بڑے جوش اور فصاحت کے ساتھ کتاب ”اسباب نجات“ میں بیان کیے ہیں۔ یہ کتاب انگریزوں کے واسطے اب تک نہایت دلچسپ اور فائدہ مند ہے۔ خود سر سید احمد خاں دو دفعہ وائسرائے کی کونسل میں لارڈ لٹن اور لارڈ رین کے عہد میں ممبر رہا ہے اور اس کی وہ خواہش جو ہندوستانیوں کے کونسل میں شریک ہونے کی تھی پوری ہوئی ہے۔ لیکن ابھی اُس کی اس شکایت میں زور ہے کہ حاکم اور محکوم دونوں طرف داری اور غلط فہمی ہونے کے سبب ہنوز ایک دوسرے سے جدا ہیں اور یہ اکثر صورتوں میں عدم ہمدردی یا بالآخر قوم کی طرف سے عمدہ اخلاق ظاہر نہ ہونے کے سبب سے ہوتا ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک خیالی شکایت ہے۔ لیکن اگر ہم یہ خیال کریں کہ ہم عملی لوگ ہیں، اس لیے ہم کو خیالی شکایتوں پر زحیم نہ کرنی چاہیے تو بے شک ہم اُس غلطی میں گھر جائیں گے جس کی سید احمد خاں شکایت کرتا ہے، ہمارے نزدیک سید احمد خاں کی شکایتوں کا اثر بہت جلد اور بہت وسعت کے ساتھ پھیلا ہے۔ نسبت اُن شکایتوں کے جو لال موہن گھوس اور اُس کے اسکول کے نوجوان آدمی نہایت فصاحت کے ساتھ کرتے ہیں۔

کرنل گریم کی رائے

کرنل گریم جنھوں نے سر سید کی لائف لکھی ہے، وہ اس کتاب کی نسبت لکھتے ہیں کہ ”اگرچہ ہم میں سے بعض لوگ سید احمد کی ”اسباب نجات“ سے متفق نہ ہوں مگر یہ رسالہ جس کو ہمدردی خیر خواہ اور وفادار

مسلمان شرفا ہیں سب سے لائق ترین شخص نے لکھا ہے، فی نقسہ بدرجہ غایت مفید ہے، کہ اس سے ہندوستانی طرز خیالات کے اندازہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔

رسالہ اسباب بغاوت کے بعض نتائج

اگرچہ کرمل موصوف کے بیان کے موافق ممکن ہے کہ کچھ انگریز ایسے ہوں جو اس رسالہ کے مضامین یا لکھل نہ تسلیم کرتے ہوں یا اس کے بعض مضامین سے اختلاف رکھتے ہوں، لیکن اس میں شک نہیں کہ گورنمنٹ نے جیسا کہ مذکورہ بالا انگریزی اخباروں میں تصریح کی گئی ہے، سرسید کی بہت سی تجویزوں کے موافق عمل درآمد اکثر شکایتوں کا تدارک کیا، مثلاً سب سے بڑی چیز جس کو سرسید نے کتاب مذکور میں بغاوت کا اصلی سبب قرار دیا تھا وہ ہندوستانیوں کا قانونی کونسل میں شریک نہ ہونا تھا جس کے سبب سے گورنمنٹ کے خیالات رعایا پر اور رعایا کے خیالات گورنمنٹ پر ظاہر نہ ہونے پاتے تھے۔ گورنمنٹ نے فوراً اس شکایت کا تدارک کیا، یعنی ۱۸۶۱ء میں یہ رسالہ گورنمنٹ میں پیش ہوا اور ۱۸۶۱ء میں ہندوستانی ریس لیجنس لیٹو کونسل کی ممبری پر نامزد کیے کیے چنانچہ جنوری ۱۸۶۲ء کے اجلاس کونسل میں ہم پہلی ہی بار مہاراجہ نرنندر سنگھ رئیس پٹیالہ، راجہ دلوی، نرائن سنگھ رئیس بنارس اور راجہ ڈنکر رائے دیوان ریاست گوالیار کو شریک پاتے ہیں اگرچہ اس وقت ہندوستانیوں کا کونسل میں شریک ہونا محض برائے نام تھا، مگر سرسید نے درحقیقت یہ بیج بویا تھا اس پودے کا جواب کسی قدر بار آور ہونے لگا ہے۔ اور ان کا یہ احسان تمام ملک پر ہمیشہ رہے گا۔ یا

مثلاً کتاب مذکور میں یہ بھی شکایت کی گئی تھی کہ بندہ دستاویزوں کو بڑے بڑے ذمہ داری کے عہدہ پر مقرر نہیں کیا جاتا۔ اس شکایت کا دفعیہ بھی گورنمنٹ نے بہت جلد کیا۔ کتاب مذکور کے پیش ہونے سے ایک برس بعد یعنی ۱۸۶۲ء میں پہلی ہی بار پنڈت شمشو ناتھ رائی کوٹ کلکتہ کے جج مقرر ہوئے اور اس کے بعد رفتہ رفتہ اکثر اعلیٰ عہدے جو پہلے بھی ہندوستانیوں کو نصیب نہیں ہوئے تھے ملنے لگے۔

پولٹکل خدمات پر پال مال گزٹ کی رائے

لندن کے نامور اخبار پال مال گزٹ میں سرسید کی وفات پر ان کی پولٹکل خدمات کی نسبت یہ ریمارک کیا تھا کہ ”سرکار انگریزی اور باشندگان ہند کے تعلقات کی کہانی میں کوئی باب ایسا نہیں ہے جس پر ہم دل سے اپنے تئیں اس قدر مبارکباد دے سکیں جس قدر کہ سرسید احمد خاں کی لائف پر وہ ابتداء سے آخر دم تک سرکار انگریزی کے راج کا پکا دوست رہا اور جو ضد متین اُس نے کہیں ان کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا مشکل ہو گا۔“

یہاں تک ہم نے سرسید کی سرکاری خدمات، اور جو وقعت اور اعتبار انھوں نے ان خدمات کی بدولت ایک ایسی قوم کی حکومت میں حاصل کیا جس کی نظر میں ہندوستانیوں کا جتنا شاید فعال سے کچھ ہی کم ہو گا، اس کو بطور مشتے نمونہ از خردارے بیان کر دیا ہے، اب ہم ان کی ملکی اور قومی خدمات پر نظر ڈالتے ہیں جن کی نظیر کم سے کم ہندوستان کی تاریخ میں مشکل سے دستیاب ہوگی۔

اگرچہ پہلے حصہ میں سرسید کے ہر قسم کے واقعات زندگی کے ضمن میں

ان کی ملکی و قومی خدمات کا ذکر اپنی اپنی جگہ تفصیل کے ساتھ ہو چکا ہے۔ مگر ہم کو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر ان کو ایک سلسلہ میں منہایت اختصار کے ساتھ منظم کر کے ناظرین کو خاص طور پر ان کی طرف متوجہ کیا جائے اور ان کے متعلق جو امور پہلے حصہ میں بیان نہیں ہو سکے وہ اجودتاً شرح ان خدمات پر مترتب ہونے ان کو بھی اس سلسلہ میں شامل کر دیا جائے۔

مگر یاد رکھنا چاہیے کہ ہم اس کتاب میں ایک ایسے شخص کی خدمات کا ذکر کر رہے ہیں جس کے اختیار میں اپنی طاقنت کے موافق کوشش و تدبیر کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ نہ ان کے ہاتھ میں سلطنت اور حکومت کی باگ ڈور تھی کہ اپنے ملک اور قوم کے واسطے جو چاہے سو کر گزرے اور نہ ملک اور قوم کے دل اس کے قبضے میں تھے کہ جو نیک صلاح ان کو بتائے اس سے کسی کو اختلاف یا انکار نہ ہو۔ پس ہم کو سرسید کی لائف میں یہ نسبت اس کے کہ اس کی کوششوں سے ملک اور قوم کو کیا کیا فائدے پہنچے، زیادہ تشریح دیکھنا چاہیے کہ اس نے ان کے فائدے کے واسطے کیا کیا کوششیں کیں۔ اسی لیے ہم نے سرسید کی کامیاب اور باآؤر کوششوں کے ساتھ ان کاموں کا بھی ذکر کیا ہے جن سے کوئی معتدبہ نتیجہ پیدا نہیں ہوا۔ یا جو سبب نامساعدت و وقت کے ادھور رہ گئے، تاکہ لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ اس شخص کی ساری عمر کس دھن اور کس ادھیڑ میں گزری ہے۔

ملکی و قومی خدمات

ہمدردی

ہمدردی کا اصل مادہ ظاہر انسان اور تمام حیوانات میں یکساں پیدا کیا گیا ہے فرق صرف اس قدر ہے کہ دیگر حیوانات کی ہمدردی اس حد سے جو ان کی فطرت میں رکھی گئی ہے، کبھی آگے نہیں بڑھ سکتی برخلاف انسان کے کہ کبھی اس کی ہمدردی ایک چھوٹے سے حلقہ میں محدود رہتی ہے اور کبھی بیرونی اسباب سے وہ نہایت وسیع ہو جاتی ہے۔ لیکن ہمیشہ اس کا تعلق اول گھر کی چار دیواری سے شروع ہوتا ہے، پھر جس قدر انسان میں بیرونی اسباب سے متاثر ہونے کی قابلیت زیادہ ہوتی ہے اسی قدر وہ تعلق بڑھتا جاتا ہے۔ سرسید کے واقعات زندگی سے یہ آسانی یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ان میں ہمدردی کا مادہ اور بیرونی اسباب سے منفصل ہونے کی قابلیت معمولی آدمیوں سے ہر انتہا بڑھ کر پیدا کی گئی تھی۔ محبت جو کہ ہمدردی کی ماں ہے ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

خاندان کی محبت

محبت کی پہلی سیڑھی خاندان کی محبت ہے، سو اس کی شہادتیں اس کتاب میں چاہجائیں گی۔ خاندان کے بعد وطن کی محبت ہے سو وہی کے ساتھ جو دستگی

اُن کو تھی اور جو آخر کو حسرت کے ساتھ بدل گئی تھی۔ اس کا ثبوت بھی اس کتاب میں متعدد مقامات پر ملے گا۔

وطن کی محبت

اس وطن کی محبت کا اقتضا تھا جس نے اُن کو اُس اُجڑے دیار کے پرانے کھنڈروں اور قدیم یادگاروں کی تحقیقات میں بے انتہا مشقتیں اٹھانے پر مجبور کیا اور آئین اکبری کی تصحیح میں جس سے دلی کے افضل ترین بادشاہ کی ایک دُھندلی تصویر کا اجالنا مقصود تھا، اُن سے فوق العادت محنت کرانی لیکن یہ سب کام ایسے تھے کہ اگر سرسید کی کوشش انھیں کاموں پر ختم ہو جاتی تو شاید اُن کو ایک محب وطن کی خدمات کا درجہ نہ دیا جاتا، مگر جب اُن کی آئندہ مسلسل خدمات پر جن کا سلسلہ اُن کے اخیر دم تک برابر جاری رہا، نظر کیجاتی ہے تو لامحالہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اُن کے یہ معمولی کام اسی طوفانی زنجیر کی ابتدائی کڑیاں تھیں جو زراعت مستقبل میں اُن کی ملکی اور قومی خدمات کے ترتیب پانے والی تھی۔

عملی قوت

پہلے حصہ میں جو سرسید کے ہر قسم کے کام تاریخ وار بیان کیے گئے ہیں اُن پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص میں جس درجہ کی عملی قوت پسند کی گئی تھی وہ اُن کاموں پر بس کر نیوالی نہ تھی جو وہ ابتداء میں وقتاً فوقتاً سرانجام کرتے رہے، باوجودیکہ عدالت کا کام جوان کو سپرد تھا اور جس کو وہ کمال تندرستی اور نہایت غور و فکر سے انجام کرتے دیتے تھے، فی نفسہ

ایک تھکادینے والا کام تھا یا اینہد وہ بعینہ ایک سستی کی طرح، جس کی پیاس چلو
 دو چلو پانی سے نہیں بھتی اور وہ کنویں یا در کی طرف دڑتا ہے ہمیشہ کسی بڑے
 کام کی تلاش میں رہتے تھے۔ غدر سے پہلے جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہو چکا
 ہے۔ انہوں نے مختلف قسم کے بہت سے کام سرانجام کیے مگر ان کی پیاس
 کسی طرح نہ بکھی۔

خارجی اسباب سے متاثر ہونا

آخر وہ وقت آپہنچا جب کہ ان کی طبیعت کے اصلی جوہر ظاہر ہونے
 والے تھے۔ شہ کے بنگامہ نے جیسا کہ سرسید کے کسی دوست کا قول ہے
 ان کے دل پر وہ کام کیا جو لو تھر کے دل پر بجلی کے گرنے نے کیا تھا جس
 طرح سورج کی گرمی سے پانی کا ایک خاص حصہ اپنے خیر طبعی سے بلند ہو جاتا
 ہے۔ اسی طرح غدر کی آہنی نے سرسید کو اپنے طبقہ کی سطح سے بالاتر کر دیا، وہ
 مراد آباد اور بجنور کے مسلمان خاندانوں کی متبہا اور سردادی دیکھ کر جس جوش
 کے ساتھ ہمدردی کی لہر ان کے دل میں اٹھی وہ فی الواقع حیرت انگیز تھی اس
 وقت ان کا حال بعینہ اس شخص کا سا تھا جس کے گھر میں آگ لگ کر گھر کا ایک
 حصہ جل گیا ہو اور باقی حصوں کے بچانے کے لیے دیوانہ وار اُدھر اُدھر ہاتھ
 پالو مارتا پھرتا ہو۔ انہوں نے خیال کیا کہ جو مسلمان غدر کی روندن میں آچکے اور
 جو خاندان بگڑ چکے ان کو مدد و ہنپانی نواب مسکان سے خارج ہے مگر جو باقی ہیں
 اور جو ہندوستان کی آبادی کا ایک چوتھائی حصہ ہیں ان کو کس طرح غدر کے
 آئندہ خوفناک نتیجوں سے بچایا جائے؛ گورنمنٹ تمام ہندوستان کے
 مسلمانوں سے یہ گمان ہو گئی ہے مسلمان گورنمنٹ کے شاید انتقام اور

سخت مسزاولوں سے جو عذر کے بعد ظہور میں آئیں اُس کی مہربانی اور شفقت سے بالکل مایوس ہو گئے ہیں جن غلط فہمیوں کے ہندوستانی شکار ہوئے ہیں اُن کی سوتیلی بدستور جاری ہیں جس جہالت اور تعصب نے یہاں تک نوبت پہنچائی وہ اسی طرح ہندوستانیوں اور خاص کر مسلمانوں کے سر پر سوار ہے جہاں قوم مسلمانوں کی دشمنی کی نگاہ سے دیکھتی ہے، انگریزی اخباروں میں ہزار مسلمانوں کے برخلاف آئینہ شکل کھے جاتے ہیں جن سے انگریزوں کا دل روز بروز مسلمانوں سے زیادہ پھٹتا جاتا ہے، کچھ بلیاں اور دفتر مسلمانوں سے خالی ہوتے جاتے ہیں، فوج میں اُن کی بھرتی سزوت ہو گئی ہے۔ وہ درباروں میں کم بلائے جاتے ہیں غرض کہ تمام آثار اس بات پر گواہی دیتے ہیں کہ اب مسلمانوں کا ہندوستان میں عزت اور اعتبار کے ساتھ رہنا غیر ممکن ہے۔

ان تمام باتوں پر نظر کر کے اول اول تو سرسید کا جی چھوٹ گیا تھا یہاں تک کہ انھوں نے ہندوستان سے کسی دوسرے اسلامی ملک میں جا کر بود و باش کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا، مگر آخر کار اُن کو وہ ارادہ فسخ کرنا اور قوم کی آگ میں کودنا پڑا۔ اس وقت جو کیفیت ان کے دل پر طاری تھی اُس کا کسی قدر اندازہ اُس رور و مناجات کے پرورد الفاظ سے ہو سکتا ہے جو علامہ معظّمہ کا اشتہار معانی شائع ہونے کے وقت انھوں نے بعد ازاں دوگانہ شکر الہی کے پندرہ ہزار مسلمانوں کے مجمع میں بمقام مراد آباد پڑھی تھی، اور جس کو ہم پہلے حصہ میں بجنسہ نقل کر چکے ہیں۔

الغرض اس مہم کے سر کرنے کے لیے جب کبھی خود تہ سیران کے خیال میں گذری اس کو انھوں نے کیے بغیر نہیں چھوڑا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانہ میں اُن کو یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ جب تک ہندوستان میں مغربی

طریقہ تسلیم عام نہ ہوگا اُس وقت تک رعایا اور گورنمنٹ میں جو منافرت
حسلی آتی ہے، وہ رفع نہ ہوگی۔

مدیر مراد آباد

چنانچہ مراد آباد میں آتے ہی اعلیٰوں نے اول ایک اسکول جس کو
تعلیم کے میدان میں اُن کا پہلا قدم سمجھنا چاہیے، قائم کیا پھر انہیں دنوں میں
جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہو چکا ہے۔

سرکاری طریقہ تعلیم پر اعتراض

ایک رائے جس میں درنیکلاسکولوں پر سخت اعتراض کیے تھے اور
گورنمنٹ کو نہایت شدومد کے ساتھ مسترد ویا تھا کہ اگر وہ ہندوستان کے
ساتھ فی الواقع بھلائی کرنی چاہتی ہے تو اُن کو انگریزی زبان میں تسلیم دے،
اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں چھاپ کر شایع کی۔

بغاوت کے اسباب سے گورنمنٹ کو مطلع کرنا

پھر رسالہ اسباب بغاوت کے ذریعہ سے گورنمنٹ ہند اور پارلیمنٹ
کو اُن تمام شکایتوں سے جو ازراہ غلط فہمی یا واجبی طور پر گورنمنٹ کی طرف سے
ہندوستانیوں کے دلوں میں شگن تھیں اور اُن کے ظاہر ہونے کی کوئی سبب
نہ تھی، نہایت دلیری اور صفائی کے ساتھ ظاہر کیا۔

یہ اسی سال میں جہاں اعلیٰوں نے ہندوستانیوں کے کونسل میں شریک نہ ہونے کی شکایت کی ہے وہاں
(بقیہ آگے صفحہ ۲)

انتظام قحط اور یتیموں کی حفاظت

اسی بہدردی کے جوش میں جو اس وقت اُن کے دل میں سوچ دن تھا، انھوں نے صاحب کلکٹر مراد آباد سے خود درخواست کر کے قحط کا انتظام اپنے ذمہ لیا اور جہاں تک اُن کی دسترس تھی ہندو مسلمانوں کے یتیم بچوں کو مشنریوں کے چنگل سے بچانے میں کوشش کی۔ پھر اسی زمانہ میں جب کہ مسلمانوں کے برخلافت انگریزی اخباروں میں زیادہ پوچھاڑ سونے لگی تو انھوں نے ایک ماہی رسالہ موسوم بہ

رسائل لائل محمد نراف انڈیا

لائل محمد نراف انڈیا اردو اور انگریزی میں جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان

ابقہ حاشیہ) اس اعتراض کا جواب کہ ہندوستانی جو جہاں اور بے ترتیبیت تھے کونسل میں کبھی نہ شریک کیے جاسکتے تھے اس طرح دیا جبکہ کونسل میں رعایا کے شریک کرنے کا طریقہ ہم نے علیحدہ بیان کیا ہے اس کو ملاحظہ کرنا چاہیے۔ پھر جو شرط سرسید نے ولایت سے سید مہدی علی خاں کو رکھی ہیں اُن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ولایت ہی میں طریقہ انتظام سلطنت ہندوستان پہ ایک مبسوط کتاب لکھنی چاہتے تھے مگر جب راقم نے بعد ازیں تحریر کے ان سے اس کتاب کا حال دریافت کیا تو انھوں نے ایک ایسی تحریر بھی لکھی تھی جس کا اصل یہ تھا کہ اس کتاب کے کھتے وقت یہ ارادہ تھا کہ انڈیا کونسل کے ممبروں سے بھی ہر ایک پوائنٹ پر اس باب میں گفتگو کی جائے مگر کونسل مذکورہ کے تمام ممبر انگریزی میں گفتگو کرتے تھے اور میں اردو میں نہ دھڑیری بات سمجھتے تھے اور نہ میں اُن کی اس لیے کافی معلومات ملنے کا کوئی سامان میسر نہ آیا۔ پھر ہر ایک ممبر سے گفتگو کرنے کے لیے کو ایہ کی گامی پہنانا پڑتا تھا اور حسب تک گفتگو ہو گا ری کو باہر کھڑا کھڑا پڑتا تھا اور ان اصرارات کا تحمل ناممکن تھا، اس لیے جو چند یادداشتیں اندر مسودے کے کھتے تھے وہ سب معدوم کر دیے گئے۔ ۱۲۔

ہو چکا ہے۔ نکان شروع کیا۔ اسی زمانہ میں انھوں نے سنا کہ ایک مسلمان کو

شرح لفظ نصاریٰ

اس جرم میں کہ اُس نے انگریزوں کو لفظ نصاریٰ سے تعبیر کیا تھا سخت سزا دی گئی ہے۔ یہ سننے ہی انھوں نے ایک رسالہ اس لفظ کی تحقیق پر لکھ کر اردو اور انگریزی میں شائع کیا جس میں نہایت خوبی سے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ مسلمان انگریزوں کو ازراہ تخریر کے نصاریٰ نہیں کہتے بلکہ قرآن کی رو سے ان کے ہاں کوئی لقب انگریزوں کے لیے اس سے زیادہ معزز نہیں ہے۔

تفسیر باتیل

مراد آباد ہی میں سرسید کو یہ خیال ہوا کہ جو غلط فہمیاں عیسائی ملکوں میں اسلام اور بائی اسلام کی نسبت ابتداء سے شروع اسلام سے آج تک چلی آتی ہیں۔ اور جو تیرہ سو برس تک پکتے پکتے تمام دنیا کے عیسائیوں کی طرح انگریزوں کے نزدیک بھی مثل علوم متعارفہ کے مسلم الثبوت ٹھہر گئی ہیں جب تک وہ رفع نہ ہوں گی اور ان کا رفع ہونا ہنسی کیل نہیں ہے) اُس وقت تک مسلمان ہمیشہ انگریزوں کی نظر میں کھٹکتے رہیں گے اور جو تدبیر مسلمانوں کی صفائی کے لیے کی جائے گی وہ اس دعا کی طرح جو بغیر زائلہ سبب کے کسی مرض میں علاج میں استعمال کی جائے بے سود ثابت ہوگی۔ اگرچہ یہ بہت بڑا کام تھا جس کا بوجھ سید احمد خاں جیسی حیثیت کے آدمی سے اٹھانا ناممکن معلوم ہوتا تھا لیکن وہ جو شہور ہے کہ بہت کا حامی خدا ہوتا ہے جوں ہی سرسید کو یہ خیال پیدا ہوا سانس کار سے اُن کی مددوں کی چڑھی ہوئی تنخواہ جو غدر کے زمانہ میں

بند رہی تھی اور لٹے ہوئے اسباب کا معاوضہ اُن کو مل گیا۔ انھوں نے فوراً جیسا کہ پہلے حصہ میں مفصل مذکور ہے اس عظیم الشان کام کی بنیاد مراد آباد ہی میں ڈال دی اور سائیل کی تفسیر لکھنی اور ساتھ کے ساتھ چھپوانی شروع کر دی جس بنیاد پر اور جس غرض سے سرسید نے اس کتاب کے لکھنے کا ارادہ کیا تھا اور جو اثر اُس کے شائع ہونے سے عیسائیوں کے دل پر ہوا اُس کا ذکر مجلاً ہم پہلے حصہ میں کر چکے ہیں اُس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ کام خاص کر ہندوستان کے مسلمانوں کے حق میں کس قدر مفید اور نتیجہ خیز تھا لیکن کچھ تو اس لیے کہ مسلمانوں میں اُس کی کچھ قدر نہ ہوئی اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ سرسید کی توجہ اُس سے مفید تر اور اعلیٰ تر کاموں کی طرف منحطف ہو گئی اس تفسیر کی صرف دو جلدیں چھپ کر رہ گئیں۔

سائنٹفک سوسائٹی

غارتہ پور پونج کراٹھوں نے دوسری طرح ہے ہندوستان میں اور انگریزوں میں میل جول بڑھانے اور اُس مسافرت کے دور کرنے کی جو سائنٹفک کی بغاوت نے حاکم و محکوم میں پیدا کر دی تھی۔ بنیاد ڈالی اس سے ہماری مراد سائنٹفک سوسائٹی کا قائم کرنا ہے جو اس غرض سے قائم کی گئی تھی کہ لٹریچر اور علمی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر کے مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کا مذاق اہل وطن میں پیدا کیا جائے علمی مضامین پر سوسائٹی میں لکچر دیتے جائیں، رعایا کے خیالات گورنمنٹ پر اور گورنمنٹ کے اصول حکمرانی رعایا پر ایک ایسے اخبار کے ذریعہ سے ظاہر کیے جائیں جو اردو انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوا کرے ہندو، مسلمان اور انگریزی تینوں قوموں کے ممبر اُس میں شامل کیے جائیں

اور اس طرح قومی مغایرت اور مذہبی تعصبات اور جو جھجک ہندوستانوں کے دلوں میں انگریزوں کی طرف سے ہے اس کو آہستہ آہستہ کم کیا جائے۔

سوسائٹی کے نتائج

قطع نظر ان اہم مقاصد کے جن کے لیے یہ سوسائٹی قائم ہوئی تھی اس سے اور بہت سے ضمنی فائدے نہ صرف شمالی ہندوستان بلکہ ملک کے اکثر حصوں کو پہنچے ہیں۔ شمالی ہندوستان میں جہاں تک ہم کو معلوم ہے کوئی انسٹی ٹیوشن یا قومی مجلس جو ذکر کے قابل ہو اس سوسائٹی سے پہلے قائم نہیں ہوئی تھی۔

انجمنوں کا قائم ہونا

پھر ۳۵ برس کے عرصہ میں جس قدر سوسائٹیاں، انجمنیں اور سبھاؤں تمام ملک میں پھیلیں وہ سب اس کے بعد اور ساسی کی ریس سے قائم ہوئیں اور اسی سوسائٹی کے اخبار نے تمام ویسی اخباروں کا رنگ بالکل بدل دیا۔ ان میں بجائے اس کے کہ کچھ سچی اور اکثر بے سرو پا بعید از قیاس خبریں درج ہوتی تھیں، پورے شکل سوشل اور علمی و اخلاقی مضامین بھی خبروں کے ساتھ چھپنے لگے۔

اخباروں کی اصلاح

لگے اور بجائے اس کے کہ وہ محض ویسیوں کے دل بہلانے کے اوزار تھے، ان کو یہ دن نصیب ہوا کہ گورنمنٹ ان کی آواز پر کان لگائے۔

اردو لٹریچر کی ترقی

پھر اسی سوسائٹی کی درخواست پر جو کہ اس نے اپڈیس مورخہ ۹، مئی ۱۹۰۷ء میں بحضور سر دلیم میور لٹنٹ گورنر بمقام علی گڑھ پیش کی تھی، نبر آنر نے وعدہ کیا کہ جو کتابیں ویسی زبان میں تصنیف و تالیف ہاں ترجمہ کی جائیں گی ان میں گورنمنٹ ضرور امداد دے گی۔ چنانچہ ۲۶ اگست ۱۹۰۷ء کو یعنی ایڈریس کے پیش ہونے سے ساڑھے تین مہینے بعد گورنمنٹ شمال مغرب نے وہ انعامی اشتہار جاری کیا جس کا بندوستان پر ہمیشہ احسان رہے گا اور جس نے تیس برس کے عرصہ میں ملک کو اس سرے سے اس سرے تک ویسی زبانوں کی تصنیفات سے مالا مال کر دیا۔ اگرچہ انعام سے کچھ زیادہ آدمی مستفید نہیں ہوئے اور اشتہار کی مبیاد چند سال بعد گزر گئی لیکن اس اشتہار کا اثر اس تمام گروہ میں جو ویسی زبانوں میں تصنیف و تالیف کی کم و بیش لیاقت رکھتا تھا مگر اس لیاقت کو کام میں لانا نہیں جانتا تھا، برقی قوت کی طرح دوڑ گیا، انھوں نے اپنی تصنیفات سے ملک کو بھی فائدہ پہنچایا اور خود بھی حق تصنیف سے فائدہ اٹھانا سیکھ گئے خصوصاً اردو لٹریچر صرف اسی سحر کی بدولت جو کہ اشتہار مذکور نے ملک میں عموماً پیدا کردی تھی تھوڑے عرصہ میں توقع سے بہت زیادہ ترقی کر گیا۔

اسی ایڈریس میں جو کہ سر دلیم میور کی حضور میں پیش کیا گیا تھا یہ بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ منجملہ ان کتابوں کے جو اردو زبان میں سوسائٹی تیار کر رہی ہے۔ دو کتابیں سید احمد خاں لائف آنزیری سکریٹری تیار کر رہے ہیں، ایک اردو لٹریچر کی تاریخ یا قبرست جس میں تمام کتابوں کا جو ابتدا سے آج تک چھپی ہیں، نام، اس کے مصنف کا حال، تصنیف کا زمانہ، طرز بیان اور مختلف

مناقشات سے اُس کی عبارت کے چند نمونے اور بعض مضامین کا خلاصہ ہو گا۔ دوسری اُردو ڈکشنری، مگر معلوم ہوتا ہے کہ پہلی کتاب کی شروع کرنے کی نسبت نہیں پہنچی لیکن اُردو ڈکشنری جو سرستید نے لکھنی شروع کی تھی اُس کا نمونہ سوسائٹی کے اخبار میں چھپا ہوا اور اس پر بعض یورپین فاضلوں کے عمدہ ریمارکس موجود ہیں۔ اگرچہ سرستید نے ان دونوں کاموں میں سے کوئی کام پورا نہیں کیا لیکن اس سے اتنی بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ ٹاک اور قوم کی تمام مقدمات ضرورتیں جن میں سے بعضی اب تک بھی لوگوں کو محسوس نہیں ہوئیں، اس شخص نے اب سے تیس بلکہ چالیس برس پہلے پنجوبی محسوس کر لی تھیں۔ یہاں تک کہ جب کوئی ان ضرورتوں کا پورا کرنے والا نظر نہ آتا تھا تو یاد وجود یک سر و ہزار ہوا ہونے کے خود ہی اس کام کے سرانجام کرنے کو کھڑا ہو جاتا تھا۔

مگر درحقیقت یہ سب سوسائٹی کے ضمنی نتائج تھے اور جس بڑے مقصد کے لیے وہ قائم کی گئی تھی اُس کا گھرا بھی بہت دور تھا اور محض سوسائٹی اُس درو کی دوا نہیں ہو سکتی تھی

سوسائٹی کی ترقی میں کوشش

! انہیہ سر سید نے سوسائٹی کے ترقی دینے میں
 --- کوئی دقیقہ کوشش و تدبیر کافر و گناہت نہیں کیا یہاں تک کہ سالانہ
 چند، اور قیمت اختیار کی تعداد دس ہزار آٹھ سو پچاس روپیہ سالانہ تک
 پہنچ گئی۔ مصلح کے رعیتوں کو اس کی امداد پر آمادہ کیا، گورنمنٹ کو اس کی طرف سے
 توجہ دلائی، خود اپنی لباط سے بڑھ کر اُس کو مالی مدد پہنچائی، اُس کی عالیشان
 عمارت اپنے اہتمام اور نگرانی میں بنوائی، اُس کی مستقل آمدنی کے لیے عمدہ عمدہ
 تنظیمیں کیں، لائق لائق آدمی ترجمہ کے کام کے لیے مقرر کیے، قریب چالیس

کے چھوٹی بٹری علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی اور دو میں ترجمہ کرائیں، غازیپور سے علیگڑھ بنارس جہاں کہیں رہے سوسائٹی کے اخبار کو اپنے عمدہ مضامین سے برابر مدد پہنچاتے رہے یہاں تک کہ ہندوستان چھوڑنے کے بعد بھی سوسائٹی کی دُھن برابر لگی رہی۔ چنانچہ ولایت ہاتے ہوئے جو خط کہ انھوں نے مولوی مہدی علیخان کو عدن سے بھیجا تھا اُس میں لکھتے ہیں کہ مجھ کو علاوہ سفارقت احباب کے کہہ پر رنج بڑا ہے کہ میرے پیچھے لوگ عقل کے دشمن سائنٹفک سوسائٹی کی بٹری مخالفت کریں گے اور کوئی درجہ سعی و کوشش کا واسطے شکست کر دینے کے باقی نہ رکھیں گے پس میں چاہتا ہوں کہ آپ سوسائٹی کی طرف زیادہ متوجہ ہوں اور اُس کے سنبھالنے اور لمبروں کے بڑھانے میں زیادہ کوشش فرمائیں سوسائٹی قائم کرنے کے بعد جب تک کہ سرسید اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچے جو کام ملک اور قوم کی بھلائی کا اُن کو معلوم ہوا اسی ذوق و شوق اور سرگرمی کے ساتھ جو ان کی جبلت میں داخل تھا اُس کو سرانجام دیا۔

غازیپور کا مدرسہ

۱۸۶۴ء میں انھوں نے غازیپور میں محض قومی چندہ سے بٹری دھوم دھام کے ساتھ ایک مدرسہ قائم کیا جس کی اٹھان مدرسۃ العلوم کی ابتدا سے کچھ ہی کم سمجھنی چاہیے اور جواب تک و کٹوریا اسکول کے نام سے غازیپور میں جاری ہے۔

برٹش انڈین ایسوسی ایشن

پھر ۱۸۶۸ء میں انھوں نے علیگڑھ آکر "برٹش انڈین ایسوسی ایشن" جس

نے اب "نیشنل کانگریس" کی صورت میں جنم لیا ہے قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی اپنے حقوق کی خواہش اور اپنے دردوں اور اپنی ہی شکایتوں کے اظہار کے لیے براہ راست پارلیمنٹ اور گورنمنٹ ہند سے تعلق پیدا کریں۔ اگرچہ جس مقصد کے لیے یہ ایسوسی ایشن قائم ہوئی تھی وہ اس سبب سے کہ ملک میں اس کے چلانے کی قابلیت نہ تھی اور سرسید جو اُس کے بانی بانی تھے وہ ایک اتار و صدمہ بیمار کے مصداق تھے، حاصل نہ ہوا۔ مگر اُس کے ذریعے سے اکثر مفید تحریکیں کی گئیں اور ان میں سے اکثر میں کامیابی ہوئی جیسے مسافران ریل کی شکایات کی شکایت، کتہوں کے محمول میں تخفیف کی درخواست، ورنیکلز یونیورسٹی قائم کرنے کی سلسلہ جنابانی وغیرہ۔

ہومیو پتھیک کی تائید

پھر ۱۸۵۷ء میں تمام بنارس اُن کو یہ خیال ہوا کہ ہومیو پتھیک سے زیادہ کوئی طریقہ علاج کا ملک کے لیے مفید نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے جہاں تک اُن کی قدرت میں تھا، اُس کی حمایت اور ترویج و اشاعت میں کوشش کی۔ اُس کی تائید کے لیے ایک کمیٹی قائم کی جس کے وہ خود سرکاری تھے ایک ہومیو پتھیک ہسپتال کھولا۔ اس طریقہ علاج کی بہتری اور اُس کے اصول پر لکچر دیے اور ایک رسالہ لکچر شایع کیا۔

تعلیمی کمیٹیاں

پھر ۱۸۵۷ء میں سرسید ہی کی سلسلہ جنابانی سے تمام اضلاع شمال مغرب

میں تعلیمی کمیٹیاں مقرر کی گئیں جن میں ہر ضلع کے زمینداروں کو تعلیم کے انتظام نگرانی اور اخراجات پر بحث اور گفتگو کرنے کا اختیار دیا گیا۔

اردو زبان کی حمایت

پھر بنارس ہی میں انھوں نے اردو زبان اور فارسی خط کی حمایت میں جو بظاہر خاص مسلمانوں کی طرف لاری کا، مگر درحقیقت تمام شمالی ہندوستان کی بھلائی کا کام تھا ہے انتہا کوشش کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی ہندوستان کے دفاتر سرکاری میں اردو زبان اور فارسی خط بدستور بحال و برقرار رکھا گیا اور سبزی ہا ہندو مسلمان جو بدلیعہ اردو تخریب اور فارسی خط کے سرکاری نوکری کرتے تھے یا نوکری کے امیدوار تھے اور جن کو بڑھے طوطے کی طرح اب بھاشا زبان اور ناگری حروف کا سیکھنا اور اس میں امتحان دینا ایسا ہی مشکل تھا جیسا نیچر کا بدلتا، اس ناگہانی طوفان کے ریلے سے بچ گئے اور اردو زبان جس نے کئی صدیوں کی ترقی کے بعد ایک مستقل زبان کا درجہ حاصل کیا تھا اور جو ہندوستان کے ہر صوبہ اور ہر کھٹے میں برابر بولی اور سمجھی جاتی تھی وہ اس صدمے جو کورٹ کی زبان اور خط کے بدلنے سے اس کو پہنچنے والا تھا، محفوظ رہی۔

مسلمانوں اور انگریزوں میں میل جول پیدا کرنا

اس کے سوا بنارس ہی میں انھوں نے احکام طعام اہل کتاب پر ایک رسالہ اس غرض سے لکھا کہ مسلمان جن کا مذہب انگریزوں کے ساتھ کھانا کھانے سے مانع نہیں ہے، بلکہ محض رسم و رواج کی قید نے ان کو آج

تک انگریزوں سے دور دور رکھا ہے ان کی یہ جھجک اور رکاوٹ جاتی رہے ان کو حکمران قوم کے ساتھ زیادہ میل جول کا موقع ملے، ہر ایک قوم دوسری قوم کے مصلی خیالات سے بلا واسطہ اطلاع حاصل کرے اور بدگمانی اور خوف صفائی اور اطمینان کے ساتھ بدل جانے۔ اگرچہ اس وقت اس رسالہ پر بہت سے دے ہوئی اور سرسید کو اس کے کھنسنے پر جیسی کہ اسید تھی سب کچھ کہا گیا مگر آخر کار اس کا نتیجہ ہوا کہ مسلمانوں کے ایک جم غفیر نے جن کی انگریزوں تک رسائی اور ان کے ساتھ ربط مضبوط تھا، یہ آں بالکل توڑ ڈالی۔

اس رسالہ کے علاوہ سرسید نے اور طرح طرح سے انگریزوں اور مسلمانوں میں موانعت پیدا کرنے کی کوشش کی مسلمانوں کی جھجک نکلانے کے لیے انھوں نے اولاً خود انگریزوں کے ساتھ معاشرت اور مواصلت اختیار کر کے قوم کے واسطے ایک مثال قائم کی اور رفتہ رفتہ اپنے دوستوں کی سوسائٹی میں اس طریقہ کو وسعت دے کر اس کا اثر دور تک پھیلا دیا۔ تہذیب الاخلاق اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں انھوں نے بہت سے آرٹیکل ایسی مضمون پر لکھے۔ انگریزوں کو انھوں نے سب سے پہلے نہایت شد و مد کے ساتھ رسالہ اسباب بناوت میں مقننہ کیا تھا کہ ان کو بندستانوں کے ساتھ دوستی اور صداقت کا برتاؤ رکھنا ضرور ہے۔ اس کے بعد ہمیشہ اپنی تحریروں اور پبک اسپچوں میں اس بات کی تمنا ظاہر کرتے رہے کہ ہمارے اور انگریزوں کے موشل تعلقات پر امداد اور دوستانہ ہونے چاہئیں نہ حاکم محکومانہ۔

مسٹر پلنٹ کی دعوت میں اسپچ

اس موقع پر ہم سرسید کی ایک مختصر اسپچ جو انھوں نے علیگڑھ میں ایک

ڈونر پریسٹر بلنٹ ممبر پارلیمنٹ کا جامِ صحت پر دلوزہ کرنے کے وقت سٹیم میں
 کی تھی اور جس میں یہی تمنا خاص مسلمانوں کی طرف سے ایک لطیف پیرایہ
 میں ظاہر کی گئی تھی، بجنسہ نقل کرتے ہیں سر سید نے کہا "ہم کو نہایت
 خوشی ہے کہ مسٹر بلنٹ نے ہمارے ملک کو دیکھا۔ ہماری قوم کے مختلف
 گروہوں سے ملے جو ہم کو اسید ہے کہ انہوں نے ہر جگہ ہماری قوم کو تاج برطانیہ
 کا لائل اور کوئین رکھو یا ایمپریس اومٹ انڈیا کا دلی غیر خواہ پایا ہو گا۔ اگر
 ہماری کسی آندو سے وہ واقف ہوئے ہوں گے تو وہ صرف انگریزوں کی
 طرف سے سمیٹھی کی خواہش ہوگی جس کی نسبت بلاشبہ میں کہوں گا کہ ہماری
 وہ خواہش پورے طور پر پوری نہیں ہوتی۔"

وہ مسلمانوں کی یہ خواہش کہ مسلمانوں میں اور انگلش نیشن میں سمیٹھی قائم
 ہو، کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ کبھی کوئی ایسا زمانہ نہیں گذرا کہ ہم مسلمانوں
 میں اور انگلش نیشن میں کوئی معرکہ ایسا گذرا ہو کہ ہم میں اور ان میں کوئی بنانے
 مخالفت قائم ہوئی ہو، ان کو ہم سے بدلا لیتے کی رغبت ہو اور ہم کو ان کے
 عروج اقبالی سے رشک و حسد ہو کہ وسیڈ کے زمانہ میں جو ایک زمانہ ہر قسم
 کی عدالتوں کے براہِ گنہتہ ہونے کا تھا، انگلش نیشن کو بہت ہی کم ان معرکوں
 سے تعلق تھا۔"

"یہ بات سچ ہے کہ ہم نے ہندوستان میں کئی صدیوں تک شاہنشاہی
 کی، یہ بھی سچ ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کی شان و شوکت کو بھول نہیں سکتے
 لیکن اگر یہ خیال کسی شخص کے دل میں ہو کہ ہم مسلمانوں کو انگلش نیشن کے
 ساتھ اس وجہ سے کہ انہوں نے ہماری جگہ ہندوستان کی حکومت حاصل
 کی، کچھ حسد و رشک ہے تو وہ خیال محض بے بنیاد ہو گا۔ وہ زمانہ جس میں

انگریزی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی ایسا زمانہ تھا کہ پچھری انڈیا بیروہ ہو چکی تھی اس کو ایک شوہر کی ضرورت تھی اس نے خود انگلش نیشن کو اپنا شوہر بنانا پسند کیا تھا تاکہ گاسپل کے عہد نامہ کے مطابق وہ دونوں مل کر ایک تن ہوں مگر اس وقت اس پر کچھ کبت ضروری نہیں ہے کہ انگلش نیشن نے اس پاک وعدہ کو کہاں تک پورا کیا۔

”ہندوستان میں ہم نے اپنے ملک کی بھلائی کے واسطے انگلش حکومت قائم کی۔ ہندوستان میں انگلش حکومت قائم ہونے میں ہم اور وہ مثل پینچی کے دو پرشے کے شریک تھے، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان دونوں میں کس نے زیادہ کام کیا۔ پس ہم مسلمانوں کی نسبت ایسا خیال کرنا کہ ہم انگلش حکومت کو ایک ناگواری سے دیکھتے ہیں، محض ایک غلط خیال ہو گا۔“

”انگلش نیشن ہمارے متوجہ ملک میں آئی، مگر مثل ایک دوست کے نہ بطور ایک دشمن کے ہماری خواہش ہے کہ ہندوستان میں انگلش حکومت صرف ایک زمانہ دراز تک ہی نہیں بلکہ اٹرنل ہونی چاہیے، ہماری یہ خواہش انگلش قوم کے لیے نہیں ہے بلکہ اپنے ملک کے لیے، ہماری یہ آرزو انگریزوں کی بھلائی یا ان کی خوشامد کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اپنے ملک کی بھلائی اور بہتری کے لیے پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم میں اور ان میں سمیٹھی ہو، سمیٹھی سے میری مراد پولٹیکل سمیٹھی نہیں ہے پولٹیکل سمیٹھی تانبے کے برتن پر چاندی کے طبع سے زیادہ کچھ وقعت نہیں رکھتی اس کا اثر دونوں افریقہ کے دلوں میں کچھ نہیں ہوتا، ایک فریق جانتا ہے کہ وہ تانبے کا برتن ہے دوسرا فریق سمجھتا ہے کہ وہ جھوٹے طبع کی قلعی ہے، سمیٹھی سے میری مراد برادراتہ و دوستانہ سمیٹھی ہے۔ سرسید کہتے تھے کہ ”یہ اسپرچ جوب اخبار میں سرالیفیڈ لائل لفٹنٹ گورنر

کی نظر سے گندری اور اس کے بعد میں اُن سے ملا تو انہوں نے فرمایا کہ تم نے یہ عجیب طرح کی اسپیج دی تھی، میں نے کہا شاید عجیب ہو مگر غلط نہیں تھی: غالباً نبرائز کو اسپیج مذکور کے اس فقرہ پر تعجب ہوا ہو گا کہ ”انگلش حکومت کے قائم ہونے میں ہم اور وہ مثل قلعہ کے دو پلڑوں کے شریک تھے، شاید عام لوگ سرسید کی اس تلمیح سے آگاہ نہ ہوں، اس لیے اس کا جو مطلب ہم سمجھے ہیں اس کو مختصر طور پر بیان کرتے ہیں۔ غالباً سرسید نے اس فقرہ میں ہندو کے اُن تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ملک ہندوستان کی ابتدائی انگریزی فتوحات اور سرکاری کمپنی کے زعب و داب اور اس کی پالیسی کو مسلمان امیروں اور حکمرانوں کی تائید اور آسٹری سے بہت مدد ملی ہے، جیسے پلاسی کی لڑائی میں میر جعفر کا بمقابلہ سراج الدولہ کے لارڈ کلونبو کا ساتھ دینا، شاہ عالم کامرہوں کے مقابلے کے وقت اپنے شہنشاہ لارڈ ایک کی حفاظت میں سپرد کر دینا اور نظام حیدرآباد کا لارڈ ولزلی کی صلاح مہنت اور تمام فرانسیزیوں کی فوج کو اپنی قلمروں سے ایک قلم سوتوں کرنا وغیرہ وغیرہ۔

نمائش آگرہ کے دربار میں یورپین افسروں کے جھگڑا

ایک اور موقع پر اسی سووا کے جوش میں کہ ہندوستانیوں کے ساتھ انگریزوں کا برتاؤ اچھا نہیں ہے سرسید ایک ایسی جرات کر بیٹھے جس کی بدولت آخر کار اُن کو گورنمنٹ سے معافی مانگنی پڑی، فروری ۱۸۵۷ء میں جب کہ ڈیرینڈ صاحب اضلاع شمالی مغرب میں گورنمنٹ گورنر تھے، آگرہ میں ایک بہت بڑی نمائش ہوئی تھی اور سرسید بھی متنظم کمیٹی کے ایک ممبر تھے۔ اس کمیٹی میں اُن کے سوا اور بھی چند معزز ہندوستانی انگریزوں

کے ساتھ شامل تھے اور تمام ممبروں کو یکساں اختیار دیے گئے تھے، کسی طرح کا تفاوت انگریزوں اور ہندوستانی ممبروں میں نہ تھا، نمائش کی اخیر تاریخ دہرادے کے لیے مقرر تھی اور دہرادے کا انتظام مسٹر پاکک کلکٹر ضلع آگرہ کے سپرد تھا۔ صاحب موصوف نے نمائش گاہ کے قریب ایک میدان میں درباریوں کے لیے کرسیاں اس طرح بچھوائیں کہ جو مقام کسی قدر بلند تھا کرسیوں کی ایک لائن ٹوائس مقام پر لگائی اور اس پر ایک شامیانہ بھی جس سے دھوپ کی روک ہو، بچھوا دیا اور دوسری لائن اسی کے متوازی مگر اس سے ذرا نیچی جگہ پر لگوائی جس پر شامیانہ وغیرہ کچھ نہ تھا، ہر سید نے اکثر ہندوستانی درباریوں کو اس بات کا یقین دلایا تھا کہ اس موقع پر گورنمنٹ کو یہ منظور ہے کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں میں کچھ تمیز نہ رکھی جائے اور سب کے ساتھ یکساں تہاڑ کیا جائے۔ درباریوں میں سے ایک معزز ہندوستانی شاید دربار سے ایک دن پہلے چلتے پھرتے دربار کے میدان کی طرف جانکلے اور اتفاق سے اوپر کی لائن میں ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ ایک بابو نے آکر ان کو وہاں سے اٹھا دیا اور کہا کہ آپ کے واسطے بیچھے کی لائن لگائی گئی ہے، وہ وہاں سے سیدھے ہر سید کے پاس آئے اور حال بیان کیا اور یہ کہا کہ آپ کا خیال انگریزوں اور ہندوستانیوں کی مساوات کے باب میں صحیح ہے تھا ہر سید کو نہایت تعجب اور اس کے ساتھ سخت تداست ہوئی کہ جو کچھ لوگوں کو یقین دلایا گیا تھا۔ وہ غلط ہو گیا۔ یہ اسی وقت دربار کے میدان میں پہنچے اور قصداً اوپر کی لائن میں ایک کرسی پر جا بیٹھے۔ بابو نے آکر ان کو بھی ٹوکا یہ وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور مسٹر جیمس مسٹر ٹری گورنمنٹ سے جو وہیں دہرادے کے فلکٹ ہانٹ رہے تھے، سارا حال بیان کیا، انھوں نے بھی اس امر کو

ناپسند کیا اور سرسید سے کہا کہ آپ اس کا ذکر سٹرپالکٹ سے کریں۔ اتنے ہی میں سٹر تھارن ہل صدر بورڈ کے حاکم اعلیٰ وہیں چلے آئے۔ جب ان کو یہ قصہ معلوم ہوا تو وہ سرسید پر نہایت افر و خفتہ ہوئے اور کہا کہ تم لوگوں نے غدر میں کونسی برائی تھی جو ہمارے ساتھ نہیں کی! اب تم یہ چاہتے ہو کہ ہمارے اور ہماری عورتوں کے ساتھ پہلو پہلو دربار میں بیٹھو! سرسید نے کہا اسی سبب سے تو یہ ساری ہرا بیاں پیدا ہوئیں کہ آپ لوگ ہندوستانیوں کو ذلیل سمجھتے رہے۔ اگر ان کو اس طرح ذلیل نہ سمجھا جاتا تو کیوں یہاں تک نوبت پہنچتی۔ تھارن ہل صاحب اور زیادہ برہم ہوئے، آخر سٹر جسٹس نے سرسید کو سمجھایا کہ اس گفتگو سے کچھ فائدہ نہیں، سرسید وہاں سے اپنے ڈیرے میں چلے آئے اور دربار میں شریک نہیں ہونے، لیکن یہ خبر نواب افٹنٹ گورنر کو پہنچی تو انھوں نے بھی دربار کی ترتیب اور انتظام کو ناپسند کیا اور یہ حکم دیا کہ اس وقت زیادہ تبدیلی تو نہیں ہو سکتی لیکن ہر ضلع اور وقت کے حکام کو چاہیے کہ اپنے اپنے ضلع اور وقت کے ہندوستانی رئیسوں اور قسروں کے ساتھ پیچھے کی لائن میں بیٹھیں۔ دربار کے بعد جو یورپین افسر سرسید سے ملتا تھا اس واقعہ کو پوچھتا تھا اور جب وہ بیان کرتے تھے تو بگڑتا تھا۔ لاجپاہ انھوں نے وہاں زیادہ ٹھیرنا مناسب نہ سمجھا اور لات کو وہاں سے سوار ہو کر علیگڑھ چلے آئے مگر چند روز بعد لوکل گورنمنٹ کے سکرٹری کی چٹھی سرسید کے نام پہنچی جس میں ان سے اس بات کا جواب طلب کیا گیا تھا کہ تم دربار میں کیوں نہیں شریک ہوئے؟ اور بلا اجازت کس لیے علیگڑھ چلے گئے۔ سرسید نے آگرہ سے بلا اجازت چلے آنے کا سبب لکھ بھیجا اور دربار میں شریک نہ ہونے کی معافی چاہی اس کے بعد پھر وہاں سے کچھ باز پرس نہیں

ہوئی، مگر اس نمائش سے پہلے جو لارڈ لائیس مرحوم وائسرائے و گورنر جنرل نے
 آگرہ میں دربار کیا تھا وہاں سرسید کو ایک طلائی تمغہ دینے والے کا حکم دیا
 تھا اور وہ تمغہ اب تیار ہوا تھا۔ چونکہ سرسید نمائش کے دربار میں شریک
 نہیں ہوئے تھے اس لیے نواب لغٹ گورنر نے وہ تمغہ صاحب کمشنر
 قسمت میٹرھ کو دیدیا تاکہ وہ میٹرھ جاتے ہوئے علیگڑھ میں سرسید کو اپنے
 ہاتھ سے پہناتے جائیں۔ صاحب کمشنر جب علیگڑھ کے ریلوے اسٹیشن
 پر پہنچے تو سرسید صاحب الحکم وہاں موجود تھے ان کو ایک طرف لیجا کر سید
 اُس شخص کے جو قصداً نواب صاحب سے انھوں نے سخت گفتگو کی تھی یہ
 کہا کہ اگرچہ میں اپنے ہاتھ سے تم کو تمغہ پہنانا پسند نہیں کرتا لیکن گورنمنٹ کے
 حکم سے مجبور ہوں۔ یہ کہہ کر سرسید کو تمغہ پہنانا چاہا سرسید نے یہ کہہ کر کہ میں بھی
 گورنمنٹ کے حکم سے مجبور ہوں ان کے آگے سر جھکا دیا اور تمغہ پہن کر چلے
 آئے۔ ہم نے معتبر ذریعہ سے سنا ہے کہ انھیں دلوں میں گورنمنٹ کا ارادہ
 سب سچوں کی تنخواہ میں معقول اضافہ کرنے کا تھا مگر سرسید کی اس کارروائی سے
 وہ اضافہ مدت تک ظہور میں نہیں آیا اور سرسید کے ساتھ لوگ بھی جو
 ان کے ہم عہدہ تھے، اُس سے محروم رہے۔ نواب محسن الملک کا بیان
 ہے کہ اس واقعہ کے بہت دن بعد سٹرپالک سے جب کہ وہ کمشنر تھے
 ایک دن سرسید کا ذکر آیا انھوں نے نہایت چسپے چسپے ہو کر کہا کہ وہ بڑا
 مفسد اور باغی ہے اور آگرہ کی نمائش گاہ کا وہ تمام قصہ بیان کیا ہیں
 یہ حال سید صاحب کو لکھا بھیجا انھوں نے سٹرپالک کو ایک مفصل خط
 لکھ کر بھیجی جس میں اصل منشا اپنی اس جسارت کا بیان کیا تھا اس خط کے آنے کے
 بعد پھر سٹرپالک ان کی طرف سے بالکل صاف ہو گئے تھے۔

الغرض سرسید کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ ہندوستان کے ساتھ کوئی برتاؤ انگریزوں کی طرف سے ایسا نہ ہو جو ہندوستانیوں کی دولت کا باعث ہو خصوصاً مسلمانوں کی جانب سے انگریزوں کی بدگمانی رفع کرنے میں انہوں نے کوئی دقیقہ کوشش و تدبیر کافر و گلاشت نہیں کیا۔ انسٹی ٹیوٹ گرنٹ کی سالانہ جلدوں میں شاید ہی کوئی جلد ایسی نکلے جس میں ان کے متعدد اشکال اس مضمون پر لکھے ہوئے موجود نہ ہوں۔

ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو

خصوصاً ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کا ریویو جو انہوں نے سائنس میں بمقام بنارس لکھا تھا اور جس کا مفصل ذکر پہلے حصہ میں ہو چکا ہے، سرسید کی ان جلیل القصد خدمات میں سے ہے جس کے شکر سے ہندوستان کے تمام مسلمان عموماً اور وہابی مسلمان خصوصاً کبھی عہدہ پر آ نہیں ہو سکتے چونکہ اس ریویو میں سرسید نے اپنے وہابی ہونے کا اقرار کیا تھا اس لیے انگریزوں کی بدگمانی وہابیوں کی بالکل جاتی رہی تھی۔ منشی غلام نبی خاں مرحوم کہتے تھے کہ ”غائباً سنہ میں جب مسٹر گریفن وپٹی کمشنر لاہور نے منشی قادر بخش خاں تحصیلدار چوئیہ کو ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کی رپورٹ پر بھرم وہابیت زریہ مواخذہ کر کے صاحب فنانشل کمشنر کے پاس بھیجا اور کرنل ڈیوس کو جو اس وقت کمشنر تھے۔ یہ معلوم ہوا کہ قادر بخش خاں کا وہی مذہب ہے جو سید احمد خاں کا ہے تو انہوں نے فنانشل کمشنر سے سفارش کر کے ان کی تبدیلی تصور میں کروا دی۔ اس کے بعد جب ان کی تبدیلی تصور سے ہونے لگی تو مسٹر ابراہن اسٹنٹ کمشنر تصور نے ان کو جو سرٹیفکیٹ بغرض صفائی کے دیا تھا اس میں بڑا

بیوث اُن کی صفائی کا یہ لکھا تھا کہ یہ شخص وہی مذہب رکھتا ہے جو سید احمد خاں
صدر الصدور اصطلاح شمال مغرب کا مذہب ہے اور اس لیے اُس کی نسبت
بدخواہی سرکار کا اشتباہ محض لغو ہے۔“

ولایت میں مسلمانوں کی خیر خواہی کے خیالات

ولایت کا سفر جو سرسید نے ۱۸۶۹ء میں کیا اگرچہ یہ ظاہر اس غرض
سے معلوم ہوتا ہے کہ بیٹے کو تعلیم کے لیے انگلستان بھیجا کر اُس کے آلم و
آسائش و تعلیم و تربیت کا انتظام اپنی آنکھوں کے سہنے کریں اور اُس کی
طرف سے ہر طرح کا اطمینان حاصل کر کے واپس چلے آئیں مگر جن مشغلوں اور
جن منصوبوں میں انھوں نے سترہ مہینے لندن میں بسر کیے اُن سے صاف
پایا جاتا ہے کہ بیٹے کی تعلیم کا صرف ایک بہانہ تھا ورنہ اصل نفاذ اس
سفر دور دراز کا قوم کی خیر خواہی اور اسلام کی حمایت کے جوش کے سوا
کچھ نہ تھا، اُس وقت اسلام اور مسلمانوں کی لگن میں سرسید کا حال بعینہ
اس شعر کا مصداق تھا۔

”تَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ وَدِينِهِ“ سَعْدًا لِحُبِّكَ يَا دِينِي وَدِيَانِي“
مذہب اسلام کی خدمت جو کچھ کہہ دوں اُن سے بن آئی اس کا ذکر ہم اگلے عنوان
میں کریں گے، یہاں صرف یہ دکھانا منظور ہے کہ اس مضر کے آغانہ سے
کرا انجام تک برابر اُن کو مسلمانوں کی لو کس قدر لگی رہی ہے۔

۱۔ شاعر اپنے محبوب کی طرف خطاب کر کے کہتا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ لوگوں کو اُن کی دنیا

اور اُن کا دین مبارک ہو، میرا تو دین بھی تو ہی ہے اور دنیا بھی تو ہی ہے۔ ۱۲۔

دلسوزی کے آرٹیکل

اُن کے سفر نامہ سے جس کا نمونہ پہلے حصہ میں دکھایا جا چکا ہے اور اُن کے آرٹیکلوں سے جو ذمہ فوٹاً وہ سوسائٹی کے اہلکاروں میں پھینکے گئے تھے وہ لایٹ سے ہندوستان میں بھیجے گئے تھے۔ ہر شخص باسانی سمجھ سکتا ہے کہ ہندوستان سے جاتے وقت جو حالت کہ وہ مسلمانوں کی دیکھ گئے تھے اُس سے اُن کے دل پر عجب بے چینی اور قلق کا عالم تھا۔ خصوصاً اُن کے دل کی کیفیت اور تلامی۔

دلسوزی کے پرائیویٹ خطوط

ان پرائیویٹ خطوں کے دیکھنے سے بالکل آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے جو انھوں نے اپنے ہمدر اور دینی دوست سید مہدی علی خاں کو لایٹ سے بھیجے ہیں اور جو اس کتاب کے کچھ وقت مخدومی مولوی سید زین العابدین خاں نے راقم کو عنایت کیے ہیں۔ صاف پایا جاتا ہے کہ ایک شخص قوم کے سوز میں انگاروں پر لوٹ رہا ہے۔ کبھی یورپ کی ترقی کے مقابلہ میں مسلمانوں کی پستی و تنزل کا اندازہ کر کے نہایت مایوسی کے الفاظ لکھتا ہے۔ کبھی کسی انگریزی اخبار میں کوئی مضمون مسلمانوں کے برخلاف دیکھ کر بیچ و تاب کھاتا ہے۔ کہیں یہ صلاح دیتا ہے کہ ہندوستان میں کوئی انجمن مسلمانوں کی طرز معاشرت کی اصلاح کے لیے جلد قائم کرنی چاہیے، کبھی اسی غرض سے کوئی قومی اخبار یا میگزین ہندوستان میں جاری کرنے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے کبھی انگریزی میں ایسی کتابیں لکھوانے پر کمر باندھتا ہے جن میں یورپ کے مورتوں کے اُن بیجا اعترافات کا جواب دیا جائے جو انھوں نے

مسلمانوں باوشامبوں یا خلیفوں پر وارو کیے ہیں اور جن کا اثر ہندوستان کے مسلمانوں کی پریشکلی حالت پر بہت بُرا پڑتا ہے اور اس کام کے لیے ہندوستان سے چندہ طلب کرتا ہے، کبھی ایسی کتابیں لکھوانے کا ارادہ کرتا ہے جن سے مسلمانوں کو اپنی گزشتہ عظمت کا خیال پیدا ہو اور ان کو سلف کی ترقی اور اپنے تنزل کا اندازہ کرنے سے مغیبت آئے، کبھی کسی ہندوستان کے مسلمان کے اعزاز کی شہر سُن کر نہایت خوشی ظاہر کرتا ہے اور کبھی کسی ایسے قانون کے نافذ ہونے پر جس سے ہندوستانیوں کے حقوق کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے افسوس کرتا ہے۔ یہاں ہم چند فقرے مذکورہ بالا خطوں میں سے ناظرین کی اطلاع کے لیے بطور نمونہ کے نقل کرتے ہیں۔

ایک خط میں اس غربی مدرسہ کا جو دہلی میں منشی اموجان مرحوم کے مکان میں قائم کیا گیا تھا، ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں، "جان من و جناب من! ایسے ایسے مدرسوں سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی اُن کا نکانے والا نہیں ہائے افسوس، امرت ٹھوکتے ہیں اور زہر بنگلتے ہیں۔ ہائے افسوس ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور گھر گھر کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں۔ اے بھائی مہدی کچھ فکر کرو اور تعین جان لو کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آ گیا ہے۔ اب ڈوبنے میں بہت سی کم فاصلہ باقی ہے۔ اگر تم یہاں آتے تو دیکھتے کہ تربیت کس طرح ہوتی ہے؛ اور تعلیم اولاد کا کیا قاعدہ ہے؛ اور علم کیونکر آتا ہے؛ اور کس طرح پر کوئی قوم عزت حاصل کرتی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ میں یہاں سے واپس آ کر سب کچھ کہوں گا اور کروں گا مگر مجھ کافر، مردود، گردن سر ڈی ہوئی مرغی کھانے والے کفر کی کتابیں چھاپنے والے کی کون سے گا۔"

ایک اور خط میں اس طرح لکھتے ہیں، جس کتاب کے چھاپے ہوئے کا اشتہار میں نے بھیجا تھا وہ تمام ہو گئی۔ ہفتہ یا دو ہفتہ کے بعد اس کے نسخے آپ کے پاس بھیجوں گا۔ آپ دیکھیں گے کہ مصنف نے کیا انصاف اور کیا سچ اختیار کیا ہے، گو بعض خیالات اس کے ہمارے خیالات کے مطابق نہ ہوں وہ مسلمان نہیں ہے اگر نیز ہے جب آپ اس کی کتاب دیکھیں گے تو جیسا کہ وہ انگریز ہزاروں مسلمانوں سے بہتر ہے۔“

اب ایک اور بات ضروری ہے جو لکھتا ہوں انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں اور مسلمان حکومتوں کی تاریخیں نہایت ناانصافی اور تعصب سے لکھی ہیں اور کوئی برائی نہیں۔ جو مسلمانوں کی طرف منسوب نہ کی ہو ہماری قوم کے جوان لڑکے انگریزی میں انھیں تاریخوں کو پڑھنے اور دیکھتے ہیں جس سے بڑا نقص پیدا ہوتا ہے اور جو بات کہ انہ راہ ناانصافی اور تعصب کے مسلمانوں کی نسبت لکھی گئی ہے اس کو وہ سچ اور واقعی سمجھتے ہیں، اس لیے ایسی قسم کی انگریزی کتابوں کا پیدا ہونا جن میں مسلمانوں کا حال نہایت سچائی اور انصاف سے لکھا گیا ہو نہایت مفید بلکہ نہایت ضروری ہے۔“

”دو ہرٹے واقعے دنیا میں ہوئے ہیں جن سے مسلمانوں کو نہایت

نہ یہ اس کتاب کا ذکر ہے جہاں ڈیون پورٹ نے اسلام کی حمایت میں کھلی تھی اور جس کو لندن میں کوئی پبلشر نہیں چھاپتا تھا مگر سر سید نے دواں پیسج کراہنے روپیہ سے اس کو چھپوا کر ہندوستان میں بھیجا اور یہاں دو شخصوں نے اس کے الگ الگ ترجمے کیے۔ اگرچہ ڈیون پورٹ کی انگلستان میں کچھ وقعت نہ تھی اور اس کی کتاب میں اور مصنفوں کے اقوال نقل کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھا مگر چونکہ سر سید نے اس سے پہلے کہا اور پیش مصنف کی ایسی تخریر جس میں اسلام کی اس قدر حمایت کی گئی ہو نہیں دیکھی تھی اس لیے ان کو اس کے شائع کرنے کا خیال ہوا۔“

بڑا تعلق ہے، ایک واقعہ فتح اندلس کا ہے جس میں سات سو برس تک مسلمانوں کی عیاشیوں پر حکومت رہی اور جو انصاف اور تعلیم و تربیت مسلمانوں نے اُس قوم کی کمی نہایت ہی عجیب اور قابلِ فخر ہے۔ دوسرا واقعہ کروسیڈ کا ہے یعنی آٹھ لڑائیاں جو مسلمانوں اور عیسائی قوموں سے بیت المقدس پر ہوئیں، میں نے اُن عالم صاحب یعنی جان ٹولین پورٹا سے کہا ہے کہ ان دونوں واقعوں کی دو مختصر تاریخیں وہ لکھیں اور اُن کی رائے میں جو سچ اور انصاف ہو اور جس کا تصور اُن کی منصفانہ رائے میں ہو سب لکھیں اور چونکہ وہ نہایت منصف اور بہت بڑا عالم ہے اور جرمن لیٹن، فرینچ، گریک زبان جانتا ہے اور سب مصنفوں کی کتابیں پڑھ کر رائے قائم کرتا ہے، صرف انگریزی کتابوں پر اُس کو بھروسہ نہیں ہے۔ اس لیے امید ہے کہ جیسی بلا تعصب اُس نے یہ کتاب (یعنی اپالوجی) لکھی ہے ویسی ہی وہ بھی لکھے گا۔ ان دونوں کتابوں کے چھپنے اور تیار ہونے میں آٹھ سو روپیہ تخمیناً صرف ہو گا، فی کتاب چار سو روپیہ، بس میں چاہتا ہوں کہ آپ وہاں کے اجاب سے آٹھ سو روپیہ چھین کر کہ میرے پاس بھیجیں چندہ کرنے میں شہرت نہیں چاہیے صرف اجاب نخلصین سے چندہ ہو، مثلاً آپ سیر ظہور حسین، زمین العابدین، مرزا رحمت اللہ اور اجاب سے ملاقات کریں اور زبانی بات چیت کریں اور جس کی توفیق ہو اس کے کر جمع کریں۔ مولوی سید مہدی علیخاں کے لیے ہندوستان میں صاحب کشن نے خلعت کے لیے گورنمنٹ میں رپورٹ کی ہے اس کی مبادیہ کباب کے بعد سرسید اُن کو لکھتے ہیں ”سجائی مہدی! تم پائونڈیشن اخبار الہ آباد کے آرٹیکل ترجمہ سنو وہ لکھتا ہے کہ آج کل ہندوستان میں خاندان مسلمانوں

کے روز بروز گھٹنے جاتے ہیں۔ چنانچہ صرف بنگالہ میں تمام سلطنت کے ملازمین میں چھتہ مسلمان ہیں، وہ بھی ضعیف ہیں، جلد نشین ہیں گے اور ان کی جگہ یقینی کوئی مسلمان نہیں ہونے کا اور آئندہ بجز چیرا اسی اور دقمری کے کے کوئی مسلمان معزز عہدہ پر نہیں ہوگا۔ دیکھو جو میں کہتا تھا اور جس کاظم کرتا تھا اب سب لوگ وہی کہتے ہیں۔ یہ آرٹیکل بہت بڑا ہے کہیں سے دستیاب ہو تو منگا کر ہانکل سٹو، بہر حال جو عزت تم کو خدا دے وہ تمام قوم کی عزت ہے اور مجھ کو دوسری خوشی ہے ایک قومی دوسری خاص محبت و محبوبیت کی۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ با اقبال رکھے۔

مولوی امداد العلی جو سرسید کے سخت مخالف تھے ان کو ہندوستان میں سٹارٹ انڈیا کا خطاب ملنا تجویز ہوا ہے، یہ خبر سکر سرسید مولوی مہدی علیچاں کو لکھتے ہیں، بلا تضحیح میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ مولوی امداد العلی صاحب کی نسبت سٹارٹ انڈیا تجویز ہونے سے بے انتہا خوشی ہوئی، عین آزد مسلمانوں کی ترقی اور عزت کی ہے۔ چشم ماروٹن و دل ماشادہ ان کا یہ فرمانا کہ سید احمد نے انگریزوں کا چھوٹا کھا کر سٹارٹ انڈیا لیا اور انھوں نے موچوں پر تاوے کر انہیں نہیں بھول گیا ان کے موچوں نے منہیں ہیں داڑھی پر ہاتھ پھیر کر، میرے سر اور آنکھوں پر خدا کرے ایک ان کو اور ہزار اور مسلمانوں کو یہ دن نصیب ہو۔

اور کئی خطوں میں مولوی مہدی علیچاں کو اس بات کی تاکید لکھی ہے کہ میرے والپس آنے سے پہلے ایک ایسوسی ایشن مسلمانوں کی طرز معاشرت

لے مولوی امداد العلی اتباع سنت کے خیال سے موچوں میں رکھنے تھے یہ اس کی طرف اشارہ ہے ۱۲۔

کی اصلاح کے لیے قائم کرو اور ایک اخبار اسی مقصد کے لیے ایسوسی ایشن کی طرف سے ایسا اور ایسا نکالو اور چناں کرو اور چنیں کرو۔ پھر جب اس سے بھی کچھ کامیابی ہوتی نہیں دیکھی تو ممانعت کر دی۔ بعد ممانعت کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "اگر بالتخصیص مسلمانوں کی تربیت کے لیے جداگانہ مدرسہ مقرر ہو جائے تو ایک رحمت ہمارے لیے ہے۔ کوئی رات ہمیں حباتی کہ ایسے مدرسے تقریر کی باتیں اور تجویزیں یہاں نہیں ہوتیں۔ مگر بغیر دس لاکھ روپیہ نقد کے ممکن نہیں ہے۔" اسی طرح سرسید کے تمام خطوں میں جو ولایت سے انھوں نے سید ہدی علیخاں کو لکھے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کا وکفر اور نہ کے سوا کوئی مضمون نظر نہیں آتا۔

مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے کی تدبیریں

الغرض سرسید کے تمام منصوبے جو وہ ابتداء سے مسلمانوں کی بھلائی کے لیے برابر باندھتے رہتے تھے۔ اس رات پر آ کر ختم ہو گئے کہ ہندوستان میں چکر قوم کی تسلیم کے لیے ایک مٹھن کالج یا مٹھن یونیورسٹی قائم کی جائے انھوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی سوشل اور پولیٹیکل حالت درست کرنے کے لیے ایسوسی ایشن قائم کرنی یا کاغذ کی ناؤ سے اس دریا کو عبور کرنا کسی طرح ممکن نہیں بلکہ جب تک ان میں انگریزی تعلیم نہ پھیلائی جائے گی ان کی بھلائی کی تمام تدبیریں ایسی ہی فضول اور بیکار ثابت ہوں گی جیسے کسی کھیت میں تخم بڑی سے پہلے آب ہاشمی کرنا۔

ولایت میں ہندوستان کے طریقہ پر سیمفلٹ لکھنا

انھوں نے سخت ارادہ کر لیا اپنی تمام زندگی اس کام پر

وقت کر دیجیے چنانچہ اس مقصد کے متعلق تمام استبدادی مدارج جو ولایت میں طے ہوئے ممکن تھے، انھوں نے وہیں طے کر لیے، ایک پمفلٹ جس میں ہندوستان کے موجودہ نظام تعلیم پر اعتراض اور بجائے اس کے جو طریقہ تعلیم ان کے نزدیک ہندوستان کی حالت کے مناسب تھا اس کو بیان کیا تھا، لندن میں شائع کیا تاکہ جن کی رائے اس کے خلاف ہو وہ اخباروں کے ذریعہ سے ظاہر کریں۔

کیمبرج یونیورسٹی کو دیکھنا

نیز کیمبرج یونیورسٹی کو خود جا کر نہایت توجہ سے دیکھا اور اس کے تمام جزئی و کلی حالات پر غور کی۔

اشتہار جاری کرنا

پھر مسلمانوں اور نیز گورنمنٹ کی اطلاع کے لیے اردو اور انگریزی میں اشتہار چھپوا کر سید مہدی علیخان کے پاس اشاعت کی غرض سے ہندوستان میں بھیجے اور ہندوستان میں آکر نہایت باقاعدہ اور دانشمندانہ طریقہ سے اس منصوبہ کے پورا کرنے پر کمر باندھی جوان کی سالہا سال کی غور و فکر کا آخری نتیجہ تھا۔

انجمن خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان

ادھر تو انجمن خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان قائم کی جس کی کوششوں سے آخر کار مدرسہ العلوم قائم ہو گیا اور ادھر قوم کو جگانے اور تعلیم کی طرف

مائل کرنے کے لیے پڑچہ تہذیب الاخلاق نکالا۔

تہذیب الاخلاق نکالتا

مرسید کے ان دونوں کاموں کا مفصل حال ہم پہلے حصہ میں لکھ چکے ہیں یہاں ہم کو صرف یہ دکھانا ہے کہ تہذیب الاخلاق نے مسلمانوں پر کیا اثر کیا اور بدستہ العلوم سے ان کو اب تک کیا فائدہ پہنچا اور آئندہ کن فائدوں کے پہنچنے کی توقع ہے؟

تہذیب الاخلاق کے نتائج

ہندوستان میں ویسی اخباروں اور میگزینوں کی حالت کچھ تو اس وجہ سے کہ ان میں کوئی ایسا کرشمہ نہیں ہوتا جو پاک میں کچھ جنبش پیدا کرے اور زیادہ تر ہندوستانیوں کی مردہ دلی کے سبب جیسی کہ اب تک رہی ہے وہ سب پر ظاہر ہے۔ یورپ میں یہی اخبار اور میگزین قوموں کے دلوں کے مالک ہیں اور ان کے جذبات اور خیالات پر حکومت کرتے ہیں، مگر ہمارے ملک میں سوا اس کے کہ لوگ ان کو ایک دل کا پہلا وا جانتے ہیں وہ کسی مرضی کی دوا نہیں سمجھے جاتے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ تہذیب الاخلاق سے جو ایک سب سے زیادہ اثر مردہ اور دل مردہ قوم کے بیدار کرنے کے لیے نکالا گیا تھا، کیا امید ہو سکتی تھی؛ باوجود اس کے جو نتیجے اس سے پیدا ہوئے وہ نہایت تعجب انگیز ہیں۔

بات یہ ہے کہ جس وقت یہ پڑچہ جاری ہوا اس وقت مسلمانوں پر بسبب اس انقلاب کے جس نے غم کے بعد ان کی حالت دگرگوں کر دی تھی، دو مختلف حالتیں طاری تھیں ایک طرف مذہبی تعصبات اور

مذہبی جوش و خروش، جو ادہار اور تنزل کے زمانہ کے ہتھیار ہیں، نہایت
 زوروں پر تھے اور تہذیب الاخلاق کا جزو اعظم وہ مضامین تھے جن کو مذہبی
 تعصبات کے ساتھ وہی نسبت تھی جو آگ کو بارود کے ساتھ ہوتی ہے۔
 پس جیسی کہ امید تھی تہذیب الاخلاق نے متعصب مولوہوں کے گروہ
 میں تلامح پیدا کر دیا اور مذہبی مناظرہ کے ہتھیار جو مدت دراز سے کام
 میں نہ آنے کے سبب زنگ خوردہ پڑے تھے ان کو کام میں لانے کا موقع ملا۔
 دوسری طرف مسلمانوں کا ایک بہت بڑا گروہ ایسا بھی تھا جن کی افسردہ

اور مایوس طبیعتیں اپنے روز افزوں کے تنزل کے سبب ڈوبتی ہوئی ناو کی
 طرح کوئی ایسا سہارا ڈھونڈ ہی تھیں جس سے ان کی ڈھارس بندھے لیکن
 کوئی امید کی صورت نظر نہ آئی۔ تہذیب الاخلاق نے اس گروہ کے دل
 پر فی الواقع وہ کام کیا جو مرہم زخم پر یا ٹھنڈا پانی پیاسے پر کرتا ہے اس
 گروہ نے جبکہ وہ اپنے شہین ناچیز اور ایک نہایت کس پیرس حالت میں
 سمجھ رہا تھا اور ویوی ترقیات کے دروازے اپنے چاروں طرف مسدود
 پاتا تھا، دیکھا کہ ایک ناصح شفیق کمال دسوزی سے ان کو نیند سے جگاتا ہے،
 ان کی غفلت پر ملامت کرتا ہے، ان کے اسلاف کے کارنامے سنا کر
 ان کو غیرت دلاتا ہے اور ان کو ترقی کرنے کا گڑھ بتاتا ہے یہ گروہ اس
 کی آواز پر اس طرح دوڑا جیسے کسی بے سری فوج کا کوئی سردھو پیدا ہو
 جائے اور وہ اس کے اشارہ پر ادھر ادھر سے سمٹ کر اس کے گرد جمع ہو جائے
 مومن کہ موافق اور مخالف دونوں فریق ہمہ تن اس کی طرف متوجہ ہو گئے دوسرا
 اس لیے کہ اس کی آواز غور سے سنیں اور پہلا اس لیے کہ اس کی آواز کسی
 کو سننے نہ دیں۔ تعجب یہ ہے کہ جس قدر اس کی موافقت سے قوم کو فائدہ

پہنچا اسی کے قریب قریب اس کی مخالفت نے لوگوں کو قائدہ پہنچایا۔

مدارس اسلامیہ کا قائم ہونا

جوں جوں تہذیب الاخلاق "مدرستہ العلوم" کی طرف لوگوں کو بلاتا تھا اور جس قدر انگریزی تعلیم کی ضرورتیں ان کے ذہن نشین کرنا تھا اسی قدر مدارس اسلامیہ قائم کرنے کا جوش مسلمانوں میں بڑھتا جاتا تھا۔ چنانچہ اسی کی تحریک سے بے شمار اسلامی مدرسے ہندوستان میں قائم ہو گئے اور برابر ہوتے جاتے ہیں۔ تہذیب الاخلاق کو جاری ہونے شاید تین برس گذرے تھے کہ مولوی سخاوت علی صاحب نے انہماک میں ایک اسلامی مدرسہ قائم کیا۔ مدرسہ قائم کرنے کے بعد انھوں نے جیسا کہ تہذیب الاخلاق نمبر اولہ ۴ میں منقول ہے ایک موقع پر کہا کہ "اگرچہ پہلے بھی ہم کو اپنی قوم کی بھلائی کی فکر تھی مگر کوئی تقاضا کرنے والا اور بار بار جگانے والا نہ تھا۔ اب تہذیب الاخلاق نے میراں تک چھوڑنا اور گاہ کیا جس کے سبب اس قصبہ میں بھی ایک مدرسہ قائم ہو گیا، خدا اس پرچہ تہذیب الاخلاق کو ہمارے لیے ہمیشہ مبارک رکھے" انھوں نے یہ بھی کہا کہ "ہمارے مدرسہ انہماک اور صلح کے کل مدارس دیوبند، سہارنپور اور گنگوہہ کو بڑی تسلی ہے کہ یہ سب مدرسے اس مدرسۃ العلوم مسلمانان سے جس کے قائم کرنے کی کوشش ہو رہی ہے، مستفیض ہوں گے، گویا علی گڑھ ہمارے مدرسوں کے طلبہ کا قصر امید ہے۔ اگر درحقیقت ہم اپنی ترقی کریں گے تو وہ قصر ہمارے ہی لیے ہے پس کس قدر ہم کو اس کے بانیوں کا شکریہ گزارا ہونا چاہیے"

اس قول کے نقل کرنے کے بعد سرسید تہذیب الاخلاق میں لکھتے ہیں

کہ ”سب سے اخیر مدرسہ جو ہماری تحریروں کے اثر سے قائم ہوا وہ مدرسہ ایمانیہ لکھنؤ ہے جس میں بشمول دیگر علوم معینہ کے مدرسہ شیعہ اشنا معاشرہ کی بھی تعلیم ہوتی ہے اور اس سے خیال ہوتا ہے کہ ہماری کوششوں نے شیعہ اور سنی دونوں کے دل کو جگا دیا ہے۔ سرسید نے جس مضمون میں یہ حال لکھا ہے وہ ۱۸۷۷ء کا لکھا ہوا ہے جس کو اب چوبیس برس کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس عرصہ میں اور بے شمار مدارس اسلامیہ زیادہ تر اسی خیال سے قائم ہوئے ہیں کہ انگریزی تعلیم جس کی بنیاد مسلمانوں میں تہذیب الاخلاق نے ڈالی ہے اس کے اثر سے مسلمانوں کو بچایا جانے۔ یہ خیال فی نفسہ صحیح ہو یا غلط مگر اس میں شک نہیں کہ تہذیب الاخلاق ہی نے مسلمانوں میں یہ جوش پیدا کیا ہے اور اس طرح سرسید کی پیچ و پکار نے اپنے مخالفوں میں بھی وہ اسپرٹ پیدا کر دی ہے جس پر قومی ترقی کا دار و مدار ہے۔

اگرچہ تمام مدارس اسلامیہ جو ہندوستان میں اب تک قائم ہوئے ہیں ان میں آج تک کوئی تبدیلی زمانہ کے مقتضا کے موافق ظہور میں نہیں آئی اور وہ قدیم ڈگریاں تک نہیں چھوڑی گئی جو اس زمانہ کے ہرگز مناسب نہیں ہے لیکن چند سال سے ایسے آثار نظر آتے ہیں کہ زمانہ جو سب سے بڑا ریفارمر ہے ان کی اصلاح کے بغیر نہ رہے گا۔ چنانچہ ندوۃ العلماء جس کا پانچواں اجلاس سال گذشتہ میں ہو چکا ہے اس غرض سے قائم ہوئی ہے کہ مسلمانوں کے قدیم سلسلہ درس کی زمانہ حال کی ضروریات کے موافق اصلاح کرے۔ اور اگر ذرا غور کر کے دیکھا جائے تو خود ندوۃ العلماء کا وجود اسی نتیجہ کی ایک شان ہے جس کے لیے تہذیب الاخلاق جاری کیا گیا تھا۔ وہی کانپور جو تہذیب الاخلاق اور سرسید کی مخالفت کا سب سے بڑا مرکز تھا اور جہاں سے۔

تہذیب الاخلاق کے برخلافت نور الانوار نور الاحقاق اور امداد الاحقاق اور کیا اور
 کیادت وراثتک شالیج مہرتے رہے، وہیں سے علما کی یہ جماعت اس
 غرض سے اٹھی ہے کہ مسلمانوں کی قدیم طرز تسلیم زمانہ حال کی طرز تسلیم
 کے سانچے میں ڈھا بیجاٹے اور اس لیے اکثر علماء اس سے بدگمان ہو گئے
 ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ مجلس سید احمد خاں کے اشارہ سے قائم ہوئی ہے، ہم
 ایسا تو نہیں سمجھتے لیکن اتنا ضرور کہتے ہیں کہ ”ہذا ایضاً من برکات البرامکۃ“
 بے شک مسلمانوں کی اصلاح کا خیال ان کے دل میں سید کی چیخ پکار نے پیدا کیا

مخالف مولویوں کی رایوں میں انقلاب

اور اگر وہ اپنے ارادوں پر ثابت قدم رہے اور لومۃ لاگم سے خوف زدہ
 نہ ہونے تو رفتہ ضرور وہ اپنے موجودہ خیالات سے آگے بڑھیں گے اور
 جن باتوں کی درحقیقت قوم کو ضرورت ہے ان کی طرف متوجہ ہوں گے۔
 نواب محسن الملک نے ایجوکیشنل کالفرنس کے ایک اجلاس میں گفتگو
 کرتے وقت ندوۃ العلماء کی روٹنڈا میں سے اس کے بعض ممبروں کی تقریر کا
 خلاصہ نقل کیا تھا جو تہذیب الاخلاص جدید کی پہلی جلد میں چھپ گیا ہے اس
 کے دیکھنے سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ جو کچھ سرسید نے تہذیب الاخلاق
 کی اہم ترین جلدوں میں علوم جدیدہ کی ضرورت کے متعلق لکھا تھا، یا قرآن
 کی بعض آیتوں کی تفسیر علوم جدیدہ کے مطابق کی تھی اور جس پر ان کی تکفیر
 کی جاتی تھی، ہمارے علماء کی رایوں پر اس نے کس قدر اثر کیا ہے اور ان کے
 خیالات کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا ہے۔ اب وہ تسلیم کرتے ہیں کہ
 جلد قدیم علم کلام جو اس زمانہ کے فلاسفہ کے مقابلہ کے لیے مڈوں ہوا تھا اس

زمانہ میں اس کا مدارس اسلامیہ میں پڑھانا بے فائدہ ہے۔ اب فلاسفہ زمانہ
 حال کے مقابلہ کی ضرورت ہے اور اس لیے انگریزی زبان کا سیکھنا اور
 علوم جدیدہ سے واقف ہونا ضرور ہے۔ پہلے جو ہمارے علماء علوم جدیدہ
 کے پڑھنے سے اس لیے منع کرتے تھے کہ ان سے اصول اسلام میں تہمت
 پیدا ہوں گے اور الحاد اور دہریت پھیلے گی، اب برخلاف اس کے وہ
 بھی وہی کہنے لگے ہیں جو میں برس سے برابر سید کہتے چلے آتے تھے۔ چنانچہ
 ایک عالم نے ندوۃ العلماء میں یہ کہا کہ ”مذہب اسلام ایسا تہمت گھر کا نہیں
 جس پر نئے فلسفہ کا ریلہ کچھ اثر کرے اور نہ کبھی کچھلی صدیوں میں کچھ اثر کیا ہے
 فلسفہ بدلتا رہا ہے اور بدلتا رہے گا، پھر آسمانی مذہب کبھی نہ بدے گا۔
 اسلام کا کوئی دنیاوی فلسفہ نہیں نہ کوئی ہیئت و ریاضی ہے وہ تو صرف انسان
 کی اخلاقی و روحانی تعلیم کرنے والا ہے۔ پھر کہا کہ ”اسلام نے تاریخ کا بھی
 بظرف مورخانہ ذمہ نہیں لیا ہے بلکہ انھیں واقعات کا ذکر کیا ہے جو انسان کے
 لیے عبرت و حیرت پیدا کر دیں، اگر بطلیموس کی ہیئت ثابت ہو جائے
 تو کیا اور فیثاغورس کی قائم ہو جائے تو کیا، جزو لاینجز ہی باطل ہوا تو کیا اور ثابت
 ہوا تو کیا، خلا کا لطلان ہوا تو کیا اور اثبات ہوا تو کیا، ہمارے بزرگوں نے
 یونانی فلسفہ کے حملے روکنے کے لیے ایسے ایسے مسائل علم کلام میں داخل
 کیے تھے جن کو آج کل محض جمودتِ طبع کے لیے ہم لوگ پڑھتے ہیں، نہ
 وہ ہمارا مذہب تھا نہ کتاب و سنت اور مشکوٰۃ نبوت کا فرمودہ تھا۔ سب
 کچھ بگڑ جانے کو ہماری بلا ہے۔“

اگر تہذیب الاخلاق لوگوں کی مخالفت کے خوف سے صلح کل کا طریقہ
 اختیار کرتا اور جو رکاوٹیں مسلمانوں کی ترقی کی سزاہ تھیں ان کے دور

کرنے پر علی الاعلان کرنا ہندوؤں کا ظاہر ہے کہ اس کی مخالفت بالکل نہ ہوتی اور اس لیے جو عمدہ نتیجے اُس کی مخالفت سے پیدا ہوئے وہ ظہور میں نہ آتے۔ نیز جس قدر اس کی مخالفت کم ہوتی اسی قدر اس کے مددگاروں کا جوش کم رہتا اور اس لیے وہ مخالفت اور موافق دونوں کے حق میں کوئی معتدبہ نتیجہ پیدا نہ کر سکتا۔ یہی سبب تھا کہ جوں جوں اُس کی مخالفت زیادہ ہوتی گئی اسی قدر لوگ اس کی طرف زیادہ متوجہ ہوتے گئے اور اسی قدر اس کا سنتر زیادہ کارگر ہوتا گیا۔

مسلمانوں کا اسلاف کی ترقیات سنکر متنبہ ہونا

اُس نے جب کہ مسلمان اپنے اسلاف کے حال سے بے خبر تھے نہایت موثر طریقوں کے ساتھ اُن کو ان کے بندگوں کی علمی اور عقلی فتوحات سے آگاہ کیا تاکہ اُن میں وہ حمیت پیدا ہو جو اولاد کے دل میں اپنے آباء احب اور کی لڑائی سُننے سے پیدا ہونی چاہیے اور وہ اپنے موجود تنزل کا مقابلہ نہایت سلف کی ترقیات کے ساتھ کر کے خود ترقی کی طرف مائل ہوں، اگرچہ تہذیب الاخلاق کو اس مقصد میں پوری کامیابی ہوئی کہ اُس نے مسلمانوں میں مخدو مبہانت کا جویش توقع سے زیادہ پیدا کر دیا لیکن ان شیچرل موانع کے سبب جو گری ہوئی قوموں کی مدت تک اگنے نہیں دیتے، ابھی تک اُن میں وہ حرکت پیدا نہیں ہوئی جو سلف کے کارنامے سنکر ایک غیور قوم میں خود بخود پیدا ہو جاتی ہے اور اُن کو پستی و تنزل کے ننگ و عار سے نکلنے پر آمادہ کر دیتی ہے تاہم جس قدر ہمیں بائیس کے عرصہ میں کم و بیش ترقی کا خیال ہندوستان کے مسلمانوں میں پیدا ہوا ہے اُس کو اسی تہذیب

الاخلاق کا نتیجہ سمجھنا چاہیے، ورنہ مسلمانوں نے زمانہ کی مخالفت پر جس شد و مد کے ساتھ کمر باندھی تھی وہ اُس وقت تک کہ زمانہ اُن کو پیس نہ ڈالے، ہرگز کھٹنے والی نہ تھی۔ تہذیب الاخلاق جس کو ٹھے پر چڑھنے کی تاکید کرتا تھا صرف اُس کے بتانے ہی پر اکتفا نہیں کرتا تھا بلکہ اس کا نہ مینہ بھی اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے لوگوں کو ترقی کی طرف بلاتا تھا اور دوسرے ہاتھ سے مدرسہ العلوم کی تصویر اُن کے سامنے پیش کرتا تھا۔ اسی لیے اُس کی کوششیں بالکل اکارت نہیں گئیں۔

مسلمانوں میں عیسائی موزخوں کے الزامات رفع کرنے کا خیال پیدا ہونا

تہذیب الاخلاق ہی نے لوگوں میں یہ خیال پیدا کیا کہ یورپ کے مصنفوں نے جو غلطیاں اسلام کی حقیقت ظاہر کرنے یا اسلام کی تاریخ لکھنے میں کی ہیں اُن غلطیوں کو رفع کیا جائے اور ان کا منشا ظاہر کیا جائے۔ اگرچہ سرسید اپنی متعدد تصنیفات میں جیسا کہ اس کتاب میں جا بجا ظاہر کیا گیا ہے، اس موضوع پر بہت کچھ لکھ چکے تھے اور آئندہ مصنفوں کے لیے یہ رستہ صاف کر چکے تھے مگر اُن کی اکثر تحریرات عام طور پر شائع نہیں ہوئی تھیں۔ تہذیب الاخلاق ہی کی تحریک سے لائق لائق مسلمان اس کام پر کھڑے ہوئے بہت سے مسلمان تہذیب الاخلاق میں اسی موضوع پر کلمے گئے اور ان کے سوا عمدہ عمدہ متعدد کتابیں انگریزی اور اردو میں علیحدہ شائع کی گئیں۔ اس تحریک کا سب سے عمدہ نتیجہ مسلمانوں کے حق میں یہ ہوا کہ بہت سے تعلیم یافتہ مسلمان

جن سے ہم خود واقف ہیں یا جن کا حال معتبر ذریعوں سے معلوم ہوا ہے۔ اُن اعتراضوں کو دیکھ کر جو انگریزی کتابوں میں اسلام اور مسلمانوں پر وار دیکے گئے ہیں اسلام سے برگشتہ سہو چلے تھے، کوئی عیسائی مبر نے کا ارادہ رکھتا تھا اور کوئی سرے سے مذہب ہی کو لغو سمجھنے لگا تھا، مگر تہذیب الاخلاق کے مضامین دیکھ کر جو شبہات اسلام کی طرف سے اُن کے ذہن میں منظور کرتے تھے وہ یک قلم نازل ہو گئے اور اُن کے دل کا دغہ بالکل جاتا رہا۔ اب وہ اسلام پر سچتہ یقین رکھتے ہیں اور اپنے اُن پر اگتہ وہ خیالات ناام ہیں

تعصب قلبی توکل قناعت اور تقدیر

کی مزاحمتوں کا کم ہونا

تہذیب الاخلاق نے تعصبات کو بہت کم کر دیا، قلبی کی بندشیں ڈھیلی کر دیں، توکل، قناعت اور تقدیر کے جو غلط معنی لوگ سمجھے ہوئے تھے اور جس غلطی نے اُن کو نکما اور کابل اور حماطت کی طرح بلے جس و حرکت کر دیا تھا اُس سے اُن کو مطلع کیا اور صرف مطلع ہی نہیں کیا بلکہ لاکھوں کے خیالات بدل دیتے اور تہذیب و کوشش کی طرف اُن کا رخ پھیر دیا۔

سیلف بیلپ کا خیال پیدا ہونا

اسی پرچہ نے اُن کو اپنے دست و بازو پر بھروسہ کرنا اور گورنمنٹ کا سہارا چھوڑنا سکھایا اور سیلف بیلپ کا اصول جس کے بعبیر کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی اُن کے ذہن نشین کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ قومی کاموں میں ایک پیسہ

صرف کرنا نہیں جانتے تھے وہ سیکڑوں اور ہزاروں صرف کرنے لگے۔ کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ قومی کاموں میں چہندہ دینا کم سے کم ہندوستان کے مسلمانوں کو صرف تہذیب الاخلاق نے یا دوسرے نفلوں میں سید احمد خاں کی تحریروں اور اسپچوں نے سکھایا ہے اور اس بات کا بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ مسلمان جو روپیہ دود روپیہ مہینے سے زیادہ اولاد کی تعلیم پر خرچ کرنا نہیں جانتے تھے وہ اسی شخص کی بیخ پکار سے اب سچاس سچاس ساٹھ ساٹھ روپیہ مہینہ بے دریغ اپنے بچوں کی تعلیم میں خرچ کرتے ہیں اور ولایت کی تعلیم کے لیے ایک ایک لڑکے پر بیس بیس تیس تیس ہزار صرف کر دیتے ہیں۔ ہر سید کے مخالف جو ہمیشہ مستثنیٰ نیتوں کو اعتراض کا ذریعہ گردانتے ہیں اس مقام پر ضرور مسلمان لڑکوں کی وہ مثالیں پیش کریں گے جن کو ولایت جانے سے بجائے فائدہ کے نقصان پہنچا ہے مگر ایسے مستثنیات سے تو خدا کے کام بھی خالی نہیں پائے جاتے۔

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست
در باغِ لاله روید و در شورہ یوم خس

ہم کو اس باب میں ان شاذ و نادر مثالوں پر نظر کرنی نہیں چاہیے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ سرسید نے مسلمانوں کے خیالات میں کس قدر تبدیلی پیدا کر دی ہے کہ جو روپیہ وہ پہلے اولاد کی سیاہ شادلوں کی بیہوشیوں میں خرچ کرنے کے عادی تھے یا جس روپیہ سے جاہل اور نالائق اولاد کے لیے جابڈا خرید کر ان کی عیاشی اور بد چلنی یا کاہلی اور سستی کا سامان مہیا کر جاتے تھے، اب وہ روپیہ ان کی لیاقت اور اصلی عزت اور اقتدار بڑھانے میں صرف کرنا سیکھ گئے ہیں۔

تہذیب الاخلاق ہی نے اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کو مدت
دراز کے بعد قومیت کے معنی یاد دلانے ہیں۔

قومیت کا خیال پیدا ہونا

قومیت جو درحقیقت ایک لفظ اسلامی اخوت کا مترادف ہے اس کے مفہوم سے ہندوستان کے
مسلمانوں کو بالکل ذہول ہو گیا تھا ان میں بھی مثل ہندوؤں کے ذاتوں کی تفریق
پیدا ہو گئی تھی اور ایک ذات کو دوسری ذات کے ساتھ قومی حیثیت
سے کچھ تعلق نہ سمجھا جاتا تھا۔ پٹھانوں کو یہ استحقاق نہ تھا کہ وہ متعلو کی فتوحات
پر فخر کر سکیں اور مساوات اس بات کا حق نہیں رکھتے تھے کہ بنی امیہ یا بنی
عباس کے کارناموں پر نازاں ہوں۔ اس کے مذہبی فرقوں کے سوا اختلاف
نے ان میں ایک دوسری طرح کا تفرقہ ڈال دیا تھا جس کے سبب سے وہ رابطہ
جو تمام اہل قبلہ میں بسبب اتحاد اسلامی کے متعلق ہونا چاہیے باقی نہ رہا تھا۔
تہذیب الاخلاق نے ان دونوں تفرقوں کے دور کرنے کی بنیاد ڈالی اور
ہندوستان کے لاکھوں مسلمانوں میں کم سے کم یہ خیال ضرور پیدا کر دیا کہ ذاتوں
کے تفرقہ یا مذہبی حریفوں کے اختلاف سے قومی اتحاد میں کچھ فرق نہیں آتا
اور ہمارے نزدیک یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ قوم و قومیت و قومی ہمہ دی
اور قومی عزت کے الفاظ جن وسیع معنوں میں کہ اب ہندوستان میں عام
طور پر بولے جاتے ہیں یہ درحقیقت سرسید ہی کی تحریروں نے جو اول
سوسائٹی اخبار میں اور اس کے بعد تہذیب الاخلاق میں شایع ہوئیں لوگوں
کو بولنے سکھائے ہیں۔

اُردو لٹریچر میں انقلاب پیدا ہونا

اُردو لٹریچر کو بھی اس پرچہ سے کچھ کم فائدہ نہیں پہنچا۔ یہ پرچہ جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہو چکا ہے، چھبیس برس کے عرصہ میں تین دفعہ مختلف وقتوں میں جاری ہوا مگر سب سے زیادہ عرصہ تک صرف پہلی دفعہ یعنی سات برس برابر نکلتا رہا۔ لٹریچر کی خوبی کے لحاظ سے جس قدر عمدہ مضامین ان سات برس کے پرچوں میں شایع ہوئے پھر ویسے نہیں ہوئے اور جو نتائج کہ ہم نے ادھر بیان کیے ہیں وہ زیادہ تر انھیں سات برس کے پرچوں سے علاقہ رکھتے ہیں۔

اس پرچہ کو جاری ہونے صرف تین برس کا عرصہ گزرا تھا کہ سرسید کے ایک انگریز دوست نے جیسا کہ جلد نمبر ۱ میں مذکور ہے ان کو لکھا تھا کہ "تہذیب الاخلاق نے یہ ثابت کر دیا کہ اردو زبان میں بھی ہر قسم کے مضامین اور خیالات عمدگی اور سادگی سے ادا ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ثابت کیا کہ مذہب اسلام ایسا تنگ و تاریک رستہ نہیں ہے جیسا کہ اب تک سمجھا جاتا ہے۔"

مذہبی لٹریچر میں آزادی کا پیدا ہونا

یہ کہنا کچھ مبالغہ میں داخل نہیں ہے کہ سوشل اخلاق اور مذہبی مضامین جس سادگی اور لطافت اور شائستگی کے ساتھ اس پرچہ میں لکھے گئے ویسے کبھی کسی اردو زبان کے پرچہ میں نہیں لکھے گئے۔

اسی پرچہ نے مسلمانوں کے مذہبی لٹریچر میں جو صدیوں سے بند پانی کی طرح تھیں وحرکت چلا آتا تھا دعتہٴ نموج پیدا کر دیا۔ تہذیب الاخلاق

سے پہلے ہندوستان میں جو کچھ مذہب کے متعلق لکھا گیا تھا اُس میں سرسید کے سوا بہت ہی کم لوگوں کی تحریروں میں آزادی کا عنصر پایا جاتا تھا۔ تعصب اور تقلید نے اُرجلیٹی کی سوتیں بالکل بستہ کر دی تھیں، علمائے سلف کے اقوال اور اُن کی رایوں کو نقل کر دینا ہی تصنیف و تالیف کی معراج تھی۔

مذہبی مناظرہ کے طریقہ کی اصلاح

غیر مفید جوہریت آزادی کا دم بھرتے تھے اُن کی جو لاڈ گاہ بھی صرف چند مسائل فقہیہ متعلق یہ عبادات تھے اور اِس، پادریوں کے مقابلے میں اسلام کی حمایت کرنے کا طریقہ اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ جو اعتراضات وہ مذہب اسلام پر قرآن اور حدیث کے حوالوں سے کرتے تھے اُسی قسم کے اعتراضات عیسائی مذہب پر تو ریت و اسنجیل کے حوالوں سے کیے جاتے تھے، یورپین سویڈیزیشن اور یورپین سائنس کے حملے جو اسلام پر ہو رہے تھے اول تو اُن سے مسلمان عالم محض بے خبر تھے اور اگر اُن کو خبر بھی ہوتی تو تسلیم کی بدولت اُن میں یہ قابلیت باقی نہ رہی تھی کہ ان نئے حملوں کو دفع کرنے کے لیے نئے ہتھیار ایجاد کریں، مناظرہ کا طریقہ اس قدر نامہذب اور خراب ہو گیا تھا کہ کتابوں کے نام لٹھے جوہریت آرہ، ورہ، قبتقاب اور کنٹاپ رکھے جاتے تھے، تہذیب الاخلاق نے جہان تک کہ اُس سے ہو سکا تعصب کی جڑ کاٹی، تقلید کی بندشیں توڑیں، مذہبی تحریروں میں آزادی کی روح بھونکی، مذہبی حمایت کا فرسودہ طریقہ جو اس زمانے میں کچھ بکار آ رہا تھا اُس کی جگہ دوسرا طریقہ جو زمانے کے مناسب حال تھا جاری کیا، مناظرہ کے ناپسندیدہ طریقہ کی اصلاح کی اور اپنے طرز بیان سے اس طریقہ کی ایک مثال قائم کی جس کی قرآن نے۔

ہدایت کی تھی کہ ”وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ“

اردو شاعری میں انقلاب

اردو شاعری جس میں دو سو برس سے ایک ہی قسم کے خیالات برابر دہرائے جا رہے تھے اُس نے بھی زیادہ تر اسی پرچہ کی تحریک سے کروٹ بدلی۔ نئے میدانوں میں شعرا قدم رکھنے لگے۔ مبالغہ اور جھوٹ کی جگہ حقائق و واقعات کے خاکے کھینچنے لگے اور شاعری بجائے اس کے کہ محض ایک دل لگی کی چیز سمجھی جاتی تھی ایک کام کی چیز بننے لگی۔

مُحَمَّدَن كَاج كَابُونَا

سب سے عمدہ نتیجہ جو اس پرچہ کے اجرا سے مترتب ہوا اور جس کے لیے درحقیقت یہ پرچہ جاری کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ مسلمان جو قدیم سے انگریزی تعلیم کی سخت مخالفت کرتے چلے آتے تھے آہستہ آہستہ ان کی جھجک نکلی شروع ہوئی یہاں تک کہ لاکھوں مسلمان ہندوستان میں اب ایسے موجود ہیں جو انگریزی تعلیم کو اپنی اولاد کے حق میں نہایت ضروری جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بغیر اس کے ملک میں عزت سے رہنا ناممکن ہے۔

مُحَمَّدَن كَاج كَانَتَا

سب سے بڑی ملکی اور قومی خدمت جو سرسید سے بن آئی اور جس کا احسان بظاہر صرف مسلمانوں کی قوم پر مگر درحقیقت ہندوستان کی تمام اقوام پر ہے، وہ مدرسۃ العلوم کا قائم کرنا ہے۔ ہندوستان کی ایک ایسی قوم کا جس کی تعداد

قریب چھ کروڑ کے ہے تعلیم سے محروم رہنا تمام ملک کے لیے جیسا کہ ہم اوپر
لکھ آئے ہیں ایسا ہی مضر تھا جیسا کہ ایک محضوریس کا ماؤنٹ ہونا

ہندوؤں میں تحریک کا پیدا ہونا

انسان کے تمام اعضاء ریٹھیہ کیلئے خطرناک ہونا ہے اس کے سوا صرف مدرستہ العلوم
کی رئیس سے شمالی ہندوستان کے ہندوؤں میں قومی تعلیم کا جوش حد سے
زیادہ پیدا ہو گیا اور انھوں نے قومی چندہ سے متعدد کالج کھول لیے۔ پھر
خود مدرستہ العلوم میں کوئی قلعہ ایسا نہیں رکھا گیا جس کی رو سے وہ مسلمانوں
کے لیے مخصوص سمجھا جائے اس میں ابتدا سے آج تک ہندو مسلمان عیسائی
بنگالی پارسی سب قوموں کے طالب علم برابر پڑھتے رہے ہیں چنانچہ
۱۸۶۶ء سے اب تک جس قدر ہندو طالب علم محمدن کالج اور اس کی لاکلاس
سے مختلف امتحانوں میں کامیاب ہوئے ان کی تعداد یہ ہے گریجویٹ ۲۲،
انڈر گریجویٹ ۶۷، انٹرنیس ۷۸، ال ای بی ۸، وکالت ہائی کورٹ ۲ وکالت
ضلع ۵ میزان ۱۹۲ اور متعدد ہندو گریجویٹ اسی کالج کے پیرسٹری یا میڈیسن
میں ولایت جا کر کامیاب ہو چکے ہیں پس یہ کہنا کچھ بناوٹ میں داخل نہیں ہے
کہ محمدن کالج نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ تمام ہندوستان کی بھلائی کے لیے قائم
کیا گیا ہے اور اس سے غیر قوموں کو بھی برابر فائدہ پہنچتا رہا ہے۔ لیکن اس
میں شک نہیں کہ سرسید کا بڑا مفید اس کالج کے قائم کرنے سے یہی تھا

مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے موانع

کہ کسی طرح مسلمانوں کی حالت درست ہو اور وہ انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ

ہوں مگر یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ قطع نظر ان سخت مخالفتوں کے جو مدرسۃ العلوم قائم کرنے وقت پیش آئیں اور جن کا حال ہم آئندہ عنوان میں لکھیں گے مسلمان پہلے ہی انگریزی تعلیم سے متنفر تھے، ابتدا سے ہندو اور مسلمانوں کے خیالات میں جو تفاوت انگریزی تعلیم کے متعلق تھا اس کا اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے کہ ۱۸۶۴ء میں جبکہ گورنمنٹ نے کلکتہ میں ہندوؤں کے لیے ایک سنسکرت کالج قائم کیا تو ہندوؤں نے ایک عرضداشت اس مضمون کی گذرانی کہ ہم کو اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ گورنمنٹ ہمارے لیے سنسکرت کی تعلیم کا سامان مہیا کرے بلکہ اس کو چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو انگریزی تعلیم کی اشاعت میں کوشش کرے، برخلاف اس کے ۱۸۴۵ء میں جب کہ واقعہ مذکورہ پر گیارہ برس گزر چکے تھے اور ہندوؤں کا شوق دوبالا ہو گیا تھا کلکتہ کے مسلمانوں نے جس وقت یہ سنا کہ گورنمنٹ تمام ہندوستان میں انگریزی تعلیم پھیلانا چاہتی ہے تو انہوں نے ایک عرضی تیار کی جس پر آٹھ ہزار مسلمان ریشیوں اور عالموں کے دستخط تھے اور جس کا ماحصل یہ تھا کہ گورنمنٹ کا انگریزی تعلیم پر اس قدر توجہ کرنا صاف ولالت کرتا ہے کہ اس کا ارادہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا ہے۔

قطع نظر مذہبی خیالات کے مسلمان دیاوہ تر اس وجہ سے بھی انگریزی تعلیم کے مخالف تھے کہ ابتدائے اشاعت اسلام سے وہ جس ملک میں گئے اور جہاں جا کر رہے مستثنیٰ صورتوں کے سوا کبھی ان کو غیر ملک اور غیر قوم کی زبان سیکھنے کی طرف توجہ نہیں ہوئی وہ جہاں جاتے تھے اپنی زبان اور اپنا علم ادب اپنے ساتھ لیجاتے تھے جس طرح اسپین میں جا کر انہوں نے اسپینش زبان یا ایران میں ژند زبان نہیں سیکھی، اسی طرح

ہندوستان میں آکر اس ملک کی زبانوں کے سیکھنے کی طرف توجہ نہیں کی اور اس لیے غیر زبانوں کے سیکھنے کی فی الواقع ان میں قابلیت نہ رہی تھی۔ برخلاف اس کے ہندوؤں نے مسلمانوں کے عہد میں غیر زبان سیکھنے کا ملکہ اپنے میں بخوبی پیدا کر لیا تھا جو قومیں ملازمت پیشہ تھیں وہ اپنی اولاد کو کم سے کم فارسی زبان سکھانا نہایت ضروری جانتی تھیں اور اکثر شوقین لوگ فارسی کی تکمیل کے لیے عربی بھی سیکھتے تھے۔

پس مسلمانوں کو جس قدر کہ مذہبی خیالات انگریزی تعلیم سے مانع تھے اس سے زیادہ ان کی طبعی نامناسبیت جو تیرہ سو برس سے ان میں متواتر چلی آتی تھی ایک اجنبی زبان کے سیکھنے کی ان کو اجادت نہ دیتی تھی۔ مدارس انگریزی میں انگریزی زبان کے سوا اور بھی بعض سبکٹ ایسے تھے جن سے ہندوستان کے مسلمانوں کو کچھ مناسبت نہ رہی تھی۔ جغرافیہ جس میں ان کے اسلاف نے اگلے زمانہ میں بے اتنا ترقی کی تھی اب وہ اس کو محض لغو جانتے لگے تھے تاریخ کا حال بھی اسی کے قریب قریب تھا۔ ریاضی سے فی الواقع مسلمانوں کو کچھ لگاؤ باقی نہ رہا تھا۔ مسلمانوں کے ذہن میں عموماً یہ بات تہ نشین تھی اور اب تک ہے کہ انگریزی زبان میں منطق اور حکمت و فلسفہ بالکل نہیں ہے اور دنیا میں عربی کے سوا کوئی علمی زبان نہیں ہے۔

اس کے سوا اور بہت سے موانع تھے جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ جس وقت سرسید نے محمدن کالج قائم کرنے کا ارادہ کیا اس وقت مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی کیا حالت ہوگی! چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۸۵۸ء یعنی اس وقت سے جبکہ کلکتہ، مدارس اور بمبئی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں،

۱۸۵۷ء تک مسلمانوں کی تعلیم کی کیا حالت تھی،

۱۸۴۵ء یعنی اُس وقت تک کہ علیگرہ میں ابتدائی اسکول کھولا گیا، تمام ہندوستان میں مسلمان گریجویٹس کی تعداد صرف بیس تک پہنچی تھی جن میں ۱۷ بی اے اور ۳ ایم اے تھے حالانکہ اُس وقت تک ہندو گریجویٹس کی تعداد ۸۴۶ تک پہنچ گئی تھی جن میں ۷۱۵ بی اے اور ۱۳۱ ایم اے تھے نیز جو نفرت یا نامناسبیت اور اجنبیت مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے چلی آتی تھی اُس بات کا اتنا زہ بھی اچھی طرح ہو سکتا ہے کہ اگر بالفرض اُن کو تعلیم کا خیال پیدا بھی ہو جاتا تو بھی اُن میں انگریزی تعلیم کے ساتھ وابستگی اور مناسبیت پیدا کرنے کے لیے کس قدر عرصہ درکار تھا! اور وہ کتنی مدت میں اس قابل ہو سکتے تھے کہ اپنی ہموطن قوموں کے ساتھ جو چالیں برس پہلے سے انگریزی تعلیم پر دلدادہ اور اُس کے حاصل کرنے میں سرگرم تھیں تعلیمی دوش میں شریک ہوں۔

علیگرہ کالج نے ۱۹ سال میں کتنے مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم دی

ان تمام باتوں پر نظر کرنے کے بعد جو نتائج نہایت قلیل عرصہ میں علیگرہ محمدن کالج سے ظہور میں آئے انکو نہایت غنیمت سمجھنا چاہیے علیگرہ محمدن اسکول ۱۸۴۵ء میں اور محمدن کالج ۱۸۶۸ء میں کھولا گیا تھا اور کالج کے نتائج ۱۸۸۰ء سے نکلنے شروع ہوئے اُس وقت سے ۱۸۹۸ء

تک کہ جس کو ۱۹ برس سے زیادہ مدت نہیں گذری اس نے صرف اپنے مسلمان طلبہ میں سے ۱۲۶ گریجویٹ اور ۱۷۴ انڈر گریجویٹ پیدا کیے ہیں۔ جو طالب علم کہ محمدن کالج کی لاکھاس میں پکھر سنتے ہیں وہ ۱۸۹۰ء سے قانونی امتحانوں میں شریک ہونے لگے ہیں اس وقت سے اب تک صرف مسلمانوں میں سے ۱۴ ال ال بی کے امتحان میں اور ۵ وکالت کے امتحان میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

اور اگر اس سخت گیری پر جو آٹھ سات برس سے قانونی امتحانوں میں ہونے لگی ہے۔ نظر کی جائے تو اس قلیل عرصہ میں مذکورہ بالا نتائج خاص کر مسلمانوں کے حق میں بہت غنیمت ہیں۔

محمدن کالج کا اثر ملک کے دیگر حصوں پر

مگر محمدن کالج کے فوائد کو صرف ان نتائج ہی میں منحصر نہ سمجھنا چاہیے جو خاص کر اس کے طالب علموں نے یونیورسٹی کے مذکورہ بالا امتحانوں میں حاصل کیے ہیں بلکہ اس کا اثر ہندوستان کے تمام حصوں اور تمام صوبوں تک پہنچا ہے اور اس کا کسی قدر اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ لفسٹ گورنر بنگال نے ۱۸۹۶ء کے آغاز میں ایک موقع پر مسلمانان بنگالہ کی تعلیم کے متعلق یہ کہا تھا کہ "۱۸۸۱ء میں جبکہ میں نے بنگال کو چھوڑا تھا تو صوبہ مذکورہ کے تمام مدرسوں اور کالجوں میں ایک لاکھ پچاسی ہزار مسلمان طالب علم تھے اور اپنے اپنے پر محکمہ معلوم ہوا ہے کہ اس تعداد کی نو بہت قریب چار لاکھ نوے ہزار کے بہت گئی ہے۔ چونکہ ۱۸۸۱ء ہی سے زیادہ محمدن کالج کا چرچا ہندوستان میں ہوا ہے اور صوبہ بنگال

میں ظاہر کوئی زبردست تحریک مسلمانوں کی تعلیم کیلئے نہیں ہوئی ایسے سوا اس
کہ تہذیب الاخلاق کی اشاعت اور محمدن کالج کی شہرت سے یہ نتیجہ پیدا ہوا ہے
اور کوئی بات خیال میں نہیں آتی۔

نیز اسی کالج کی ریس اور اسی کے بانی کی چیخ پکار سے متعدد کالج اور
بے شمار اسکول خاص مسلمانوں نے انگریزی تعلیم کے لیے ہندوستان میں
کھول لیے جس کا ایک صریح نتیجہ یہ ہے کہ ۱۸۵۸ء سے لیکر اس وقت تک
کہ محمدن کالج کے طالب علم یونیورسٹی کے اعلیٰ امتحانوں میں شریک ہونے لگے
اوساں کی شہرت سے تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کا ولولہ
پیدا ہوا۔ یعنی ۱۸۸۱ء تک جو کہ چوبیس برس کا زمانہ ہوتا ہے تمام ہندوستان
میں مسلمان گریجویٹس کی تعداد صرف ۲۳ تک پہنچی تھی مگر ۱۸۸۲ء سے ۱۸۹۳ء
تک یعنی صرف بارہ سال میں تمام ہندوستان کے مسلمان گریجویٹس کی تعداد
۲۳ سے بڑھ کر ۲۳۹ تک پہنچ گئی اور ۱۸۹۴ء سے ۱۸۹۶ء تک یعنی تین سال میں
صرف الہ آباد یونیورسٹی اور پنجاب یونیورسٹی سے ۱۸۵ مسلمان بی اے اور
ایم اے کے امتحانوں میں کامیاب ہوئے اور اگر بد قسمتی سے وہ مشکلات جو گذشتہ
دس برس سے طالب علموں کو پیش آ رہی ہیں اور جنہوں نے خاص کر مسلمانوں
کی چلتی گاڑی میں روڑا اٹکادیا ہے پیش نہ آتیں تو اور بھی زیادہ عمدہ اور شہرت مند ہوتے

تعلیم کی ابتدائی مشکلات

اس کے سوا جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے یہ باعث بھی لحاظ کے قابل ہے

کہ قومی تعلیم کی چال اہل میں نہایت سست اور دھیمی ہوتی ہے۔ کم عمر لڑکے جن سے قومی تعلیم کی بنیاد قائم ہوتی ہے، باوجودیکہ ان کو حسد سے زیادہ ترغیب اور اشتعال کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اپنے وائیں بائیں کوئی مسلمان ایسا نہیں دیکھتے جس سے ان کو تعلیم میں کچھ مدد مل سکے، یا اس کی طرف کافی توجہ ہو۔ نہ تو قومی سوسائٹی میں ان باتوں کا چرچا ہوتا ہے جن سے تعلیم کا شوق اور اس کے ساتھ لگاؤ پیدا ہو، اور نہ خاندان کے چھوٹے بڑوں میں کوئی ایسا نظر آتا ہے جس سے مدرسہ کی پڑھائی میں کسی قسم کی اعانت کی توقع ہو۔ یہ خلاف اس کے جب قوم میں تعلیم کی بنیاد پڑ جاتی ہے تو ان کو گلی کوچہ اور گھر کے در دیوار سے یہی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ اس لیے امید ہے کہ اگر مسلمانوں میں تعلیم کا شوق اسی نسبت سے آئندہ بھی بڑھتا رہا جیسا کہ گذشتہ ۲۳ برس میں بڑھتا رہا ہے تو ان کی ترقی کی رفتار روز بروز تیز ہوتی جائے گی۔

ولایت کی تعلیم کا خیال شمالی ہندوستان

میں پیدا ہونا

ولایت کی تعلیم کا خیالی شمالی ہندوستان کے ہندو مسلمانوں میں درحقیقت اس وقت سے پیدا ہوا ہے جبکہ سرسید اپنے بیڑوں کو ساتھ لے کر انگلستان گئے ہیں، اس سے پہلے ہندوستان سے کوئی مسلمان اور شمالی ہند سے کوئی ہندو یا مسلمان ولایت میں تعلیم کے لیے نہیں گیا تھا۔ اگرچہ سرسید کو اس سفر کی جزا زیادہ تر اس اسکالرشپ کے سہارے سے ہوئی تھی جو سید محمود کی

تعلیم کے لیے گورنمنٹ نے عنایت کیا تھا لیکن چونکہ وہ خود بھی مع اپنے بڑے بیٹے کے، امپینے ولایت میں ٹھہرے تھے اور سید محمود کی تعلیم ختم ہونے تک ایک خدمت گار برابر پانچ برس ان کے ساتھ رہا تھا اور بعض ایسے اخراجات بھی جو اردوں کو اٹھانے نہیں پڑتے تھے سرسید کو برداشت کرنے پڑے تھے۔ اس لیے علاوہ دس ہزار روپیہ کے جو گورنمنٹ نے عطا کیا تھا پچاس ہزار روپیہ ان کو اپنی جائیداد اور کتابیں بیچ کر اور رخصت کے زمانے کی تنخواہ کٹوا کر گویا اپنے پاس سے خرچ کہ نا پڑا۔ اگرچہ سرسید کو اس سے بہت بڑی نریہ یاری ہوئی مگر ہندوستان کے لیے آئندہ ولایت جانے کی راہ کھل گئی۔ سرسید نے اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ بیٹے کو ولایت میں تعلیم دلا کر ملک کے لیے ایک مثال قائم کر دی بلکہ جیسا پہلے حصہ میں مذکور ہو چکا ہے انہوں نے متعدد تدبیریں ہندوستانوں کے اور فاسکر مسلمانوں کے ولایت بھیجنے کے لیے کیں جن کا نتیجہ ہر شخص اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ کلکتہ، مدنی اور مدراس کے علاوہ شمالی ہندوستان میں کوئی سال ایسا نہیں جاتا جن میں کچھ ہندو یا مسلمان طالب علم تعلیم کے لیے ولایت نہ جاتے ہوں ایک معتدبہ تعداد ولایت کے تعلیم یافتہ بیرسٹروں اور سول سروٹس وغیرہ کی جن کا پہلے بگاڑیوں اور پارسیوں کے سوا کسی قوم میں وجود نہ تھا، اکثر قوموں میں پیدا ہو گئی۔ ہجور ہند بر ذر پڑھتی جاتی ہے اور جیسا کہ نواب محسن الملک نے اپنے لاہور کے کچھ میں بیان کیا ہے اس وقت صرف محمدن کالج کے ۱۶ طالب علم بیرسٹریٹ لاہور اور ولایت میں ڈگری کی تعلیم پا رہے ہیں۔ اس حالت کا مقابلہ جب شمال ہندوستان کی اس حالت سے کیا جاتا ہے جبکہ سرسید نے پہلی ہی بل ولایت جانے کا ارادہ کیا تھا اور جبکہ

ہمارے ملک کے ہندو اور مسلمان دونوں مذہبی خیالات کے سبب یورپ جا کر عیسائی ہو جانے سے کم نہیں سمجھتے تھے اور غیر ملکوں کے مضر کے بالکل عادی نہ تھے تو دونوں حالتوں میں زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ اور اس میں شک کرنے کی ظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ جس طرح مسلمانوں میں ولایت کی تسلیم کا خیال صرف سرسید کی تحریک سے پیدا ہوا ہے اسی طرح شمالی ہندوستان کے ہندوؤں میں یہ خیال اسی شخص کی بدولت پھیلا ہے باوجودیکہ ہندوؤں سے انگریزی تعلیم میں صرف تھے مگر وہ ایسے چپ چاپ بہ رستہ طے کر رہے تھے جیسے تناخو۔ آدمی ایک کونے میں بیٹھ کر اپنا پیٹ بھر لیتا ہے اور پڑوسیوں کو خبر نہیں ہونے دیتا۔ یہاں تک کہ پچاس برس گزر گئے اور مسلمانوں میں کسی قسم کی جنبش پیدا نہیں ہوئی مگر سرسید کی چیخ پکار صرف مسلمانوں ہی کو جگانے والی نہ تھی بلکہ اُس نے شمالی ہندوستان کے دونوں صوبوں میں اس سرے سے اس سرے تک تعلیم کا نعل ڈال دیا۔ اگرچہ ہندوستان کی تعلیم پر ہندو پہلے ہی سے متوجہ تھے اور سرسید کی تحریک نے سوا اس کے کہ اُن کی ترقی کی رفتار کسی قدر تیز کر دی کوئی بڑا نمایاں اثر اُس پر نہیں کیا، لیکن اس میں شک نہیں کہ ولایت کی تعلیم کا خیال اُن میں صرف مسلمانوں کی رہا اور سرسید کے شور و نعل سے پیدا ہوا۔ مذہبی رکاوٹیں ہمارے ملک کے ہندوؤں میں اور ہندوؤں سے بہت زیادہ تھیں، چنانچہ بعض شریف ہندو اسی جرم میں کہ انھوں نے ولایت میں جا کر تعلیم پائی، براہِ راست سے خارج کر دیے گئے لیکن چونکہ تعلیم نے انکو ذکی الحس کر دیا تھا اور زمانہ کا ساتھ نہ دینے کے مضر نتائج سے وہ خوب واقف تھے، اس لیے انھوں نے وہ تمام فتیدیں جو

ترقی کے مانع تھیں توڑ ڈالیں اور مسلمانوں کو ولایت کی تعلیم میں بھی اپنے سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔

سرکاری ملازمت میں مسلمانوں کی تعداد کا بڑھنا

سرکاری یا غیر سرکاری ملازمت میں جس قدر ترقی مسلمانوں نے محمدن کالج کی تعلیم کے ذریعہ سے بواسطہ یا بلاواسطہ کی ہے اس کا اندازہ اس طرح پر کرنا صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ اس کالج کے قائم ہونے سے پہلے مسلمان ملازموں کی تعداد کیا تھی اور اس کے قائم ہونے کے بعد کہاں تک پہنچ گئی! یا یہ کہ ہندوستان کی دیگر قوموں کے ساتھ صیغہ ملازمت میں ان کو پہلے کیا نسبت تھی اور اب کیا ہے! بلکہ ہمارے نزدیک اس کا اندازہ اس طرح ہونا چاہیے کہ اگر محمدن کالج قائم نہ ہوتا اور سرسید کی تحریک سے تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو تعلیم کا خیال پیدا نہ ہو جاتا تو آج کے مسلمان سرکاری محکموں یا ہندوستانی ریاستوں میں ملازم پائے جاتے!

سرکاری ملازمت کی جو شرطیں گزشتہ بیس سال میں وقتاً فوقتاً قرار پاتی رہی ہیں اور انھیں کے قریب قریب ہندوستانی ریاستوں میں بھی قیدیں لگتی جاتی ہیں ان پر لحاظ کرنے سے اس بات میں کچھ شبہ باقی نہیں رہتا کہ اگر اب تک مسلمان اسی خواب غفلت میں رہتے اور انگریزی تعلیم سے جس قدر حصہ کہ انھوں نے اس عرصہ میں لیا ہے وہ حصہ نہ لیتے تو آج سرکاری فتر اور محکمے ان سے گویا بالکل خالی پاتے اور ہندوستان ریاستوں میں بھی وہ شاید خال خال ہی نظر آتے۔

قوم داری کے عہدے جو پہلے ہندوستانیوں کو ادنیٰ درجہ کی تعلیم یا سعی

سفارش وغیرہ کے ذریعہ سے مجاہد تھے۔ اب سوا اس کے کہ گورنمنٹ اپنے خاص اختیار سے کسی مستثنیٰ آدمی کو دیدے، گریجویٹس کے سوا کسی کو نہیں مل سکتے۔ کومیشن کے قاعدے نے ایجوکیشن کلاس کے سوا ہر درجہ کے آدمیوں کو عمدہ خدمات سے گویا بالکل محروم کر دیا ہے اور جس قدر ملازمت کے کے امیدواروں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے اسی قدر ملازمت کی شرطیں روز بروز زیادہ سخت ہوئی جاتی ہیں۔ سیکڑوں ٹل پاس اور انٹرنس پاس آٹھ آٹھ دس دس روپیہ ماہوار کی نوکری ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور شکل سے فیصدی دس کامیاب ہوتے ہیں۔

۱۸۸۸ء میں جبکہ محمدن کالج کی عمر دو تین برس سے زیادہ کی نہ تھی سر سید نے جو متعدد مضامین پنجاب یونیورسٹی اور مشرقی تعلیم کے خلاف لکھے تھے ان میں ایک جگہ لکھتے ہیں اور جب صدر عدالت دیوانی ہائیکورٹ نہیں ہوئی تھی مشرقی علوم اور مشرقی زبان کے نہایت ذہی علم و لائق شخص وکالت کرتے تھے اور ایسے کامیاب تھے کہ زمانہ ان پر رشک کرتا تھا۔ ۱۸۶۶ء میں صدر عدالت دیوانی ہائی کورٹ ہو گئی اور یورپین زبان نے اپنا راج کیا۔ وہ بار آور درخت علوم مشرقی اور مشرقی زبان کے جن کی پھینک آسمان تک پہنچی تھی اس طرح کلا کر زمین پر گر پڑے جیسے کوئی نیا نادر پودا پائے کے صدمے سے جھلس جائے اب ہائیکورٹ میں جا کر علمائے علوم مشرقی کا حال دیکھو کہ ان پر کھیاں بھینکتی ہیں۔ نہ وہ اپنی ذات کا کچھ فائدہ کر سکتے ہیں، نہ ملک کا نہ قوم کا تمام عہدوں میں میں سے مشرقی علوم و مشرقی زبان خارج ہو گئی ہے۔ دیوانی عہدوں میں جن کی بنیاد وکالت کے امتحان پر قائم ہوتی ہے مشرقی علوم و مشرقی زبان کی قدر و پریش نہیں رہی ہے۔ ہم نے سنا ہے کہ ہائی کورٹ کی وکالت کے

امیہ واروں کی فہرست میں ایک بھی مسلمان نہیں۔ یہ بھی سنا ہے کہ ایک لائق تحصیلدار عالم علوم مشرقی کو امیہ واران ڈپٹی کلکٹر می کی فہرست میں اس لیے جگہ نہیں مل سکی کہ وہ انگریزی نہیں جانتا تھا۔

سر تید کا یہ مضمون ۱۸۸۱ء کا لکھا ہوا ہے جس کو سترہ برس کا زمانہ گزر چکا ہے۔ اور جس کے بعد سرکاری عہدوں کی شرطیں آج تک برابر سخت ہوتی چلی آئی ہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس عرصہ میں جو تھوڑی بہت ترقی مسلمانوں نے انگریزی تعلیم میں کی ہے اگر اس کا ایک تک کچھ ظہور نہ ہوتا تو سرکاری معزز عہدوں پر شاندار سی کسی مسلمان کی صورت نظر آتی اور پالیسی نے جو ۱۸۸۱ء میں صوبہ بنگال کی نسبت لکھا تھا کہ "تمام بنگالہ میں چھتہ مسلمان عہدہ دار ہیں جو جلد نشین ہیں گئے اور ان کی جگہ یقینی کوئی مسلمان نہیں ہونے کا اور آئندہ بجز چہرہ اسی اور دفتری کے کوئی مسلمان معزز عہدہ پر نہیں دکھائی دے گا۔" بعینہ وہی حال صوبہ پنجاب اور اضلاع شمال مغرب و اوڈھ کا ہو جاتا کہ سرکاری عہدوں پر کسی مسلمان کی شکل دکھائی نہ دیتی پس یہ سمجھ لینا چاہیے کہ کم سے کم شمالی ہندوستان میں جس قدر تعلیم یافتہ نوجوان مسلمان سرکاری عہدوں پر نظر آتے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ محمدن کالج کے تعلیم یافتہ ہوں یا کسی اور کالج کے یہ سب اسی شور و غل کا نتیجہ ہے جو سر سید نے ولایت سے آ کر محمدن کالج قائم کرنے اور مسلمانوں کو اس کی طرف متوجہ کرنے کی غرض سے تمام ملک میں ڈال دیا۔

ملازمت میں محمدن کالج کے طالب علموں کی تعداد

اگرچہ اس صاف اور صریح نتیجہ پر خیال کرنے کے بعد اس بات کی

ضرورت باقی نہیں رہتی کہ خاص کر محمڈن کالج کے جن مسلمان طالب علموں نے گورنمنٹ سروس یا ہندوستانی ریاستوں کی ملازمت میں امتیاز حاصل کیا ہے ان کی گنتی بتائی جائے تاہم ان لوگوں کو اطلاع کے لیے جو انگریزی تعلیم یا محمڈن کالج کی علت غائی ملازمت کے سوا اور کسی چیز کو نہیں سمجھتے محمڈن کالج کے ان طالب علموں کی فہرست جو بالفعل سرکاری یا غیر سرکاری عہدوں پر ہندوستان کے مختلف حصوں میں مامور ہیں یا عنقریب مامور ہونے والے ہیں نواب محسن الملک کی ایک تحریر سے اس مقام پر نقل کرتے ہیں :

اسسٹنٹ پرنسپلٹ محکمہ ٹیک	جو پولیس اسکول الہ آباد میں	۱	اسپیرل سروس
۱۰	تعلیم پارے ہیں	۵	سول سروس
۳۱	جج	۲	بیرسٹریٹ لا
۳	مضمت	۱	سول سرجن
۲۹	انسپیکٹروں کی پولیس	۲۹	جو ڈاکٹری کیلے ولایت میں
۲۷	نائب تحصیلدار	۱۶	تعلیم پارے ہیں
۲۰	اسسٹنٹ سب ڈپٹی		جو ڈاکٹری کیلے لاہور تعلیم
۷	امپیم ایجنٹ	۲	پارے ہیں
۲۲۷	سررشتہ دار و سپیڈ کلرک وغیرہ	۶۷	ڈپٹی کلکٹر و اکٹرا اسسٹنٹ کمشنر

ملہ اس فہرست میں ہندو اور مسلمان سب شامل ہیں مگر ہندو وظائف میں باقی کُل مسلمان ہیں صرف دو کلاسیں ہندوؤں کی تعداد کسی قدر زیادہ ہے ۱۲۔

لکھ بنہدران کے ایک جج بائیکورٹ اور ایک سکریٹری ہوم ڈپارٹمنٹ حیدرآباد ہے ۱۲۔

مٹھن کالج کی خصوصیات

علیگڑھ مٹھن کالج کے جو نتائج اور پوسٹاں کیے گئے اگرچہ اُن کو مسلمانوں کی اس پست حالت کے لحاظ سے جو ہمیں بائیس برس پہلے تھی اور جو رڈر بورڈ زیادہ پست ہوتی جاتی تھی بہت غنیمت سمجھنا چاہیے لیکن ان نتائج سے مٹھن کالج کی کوئی ایسی خصوصیت ظاہر نہیں ہوتی کہ جس کی رو سے اس کو ہندوستان کے اور کالجوں پر ترجیح دیا جاسکے یا اُس کو مسلمانوں کے حق میں زیادہ مفید سمجھا جائے۔ سوا اس کے کہ اس کالج میں ہندوستان کے اور کالجوں کی نسبت مسلمان طلبہ کی تعداد کس قدر زیادہ پائی جاتی ہے کوئی تفارقت تعلیم اور نتائج تعلیم کے لحاظ سے محسوس نہیں ہوتا نہ یہاں کے طالب علموں نے آج تک فضیلت اور علمی یافتہ میں اور کالجوں کے طلبہ پر کوئی صریح فوقیت دکھائی ہے اور نہ یہ ثابت کیا ہے کہ یونیورسٹی کے نتائج امتحان میں اس کالج کے تعلیم یافتہ بہ نسبت دیگر کالجوں کے زیادہ کامیاب ہوتے ہیں پس تا وقتیکہ کوئی وجہ امتیاز کی نہ بتائی جائے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے اس سے بہتر اور اس سے مفید تر کوئی اسٹیٹوشن نہیں ہے۔

اب یہ ہے کہ نفس تعلیم کے لحاظ سے ہمارے ملک کے کالجوں کو جب تک کہ ان کی باگ ہندوستان کی موجودہ یونیورسٹیوں کے ہاتھ میں ہے ایک دوسرے پر ترجیح دینی ناممکن ہے ایک سانچے سے ایک ہی سے پرزے ڈھل کر نکلتے ہیں اور جس قسم کا بیج بویا جاتا ہے ویسی ہی جنس پیدا ہوتی ہے

دریں آئندہ طوطی صفتہ داشتہ اند

انچہ استاد ازل گفت جہاں میگوریم

بارہا خود مدبران سلطنت نے ایجوکیشنل ورکروں میں کہا ہے کہ سرکاری کالج اور یونیورسٹیاں کامل تعلیم دینے سے قاصر ہیں۔ پس جو تعلیم کا اصلی مقصد ہونا چاہیے اُس کو سر دست ہندوستان کے کسی کالج میں ڈھونڈنا حاصل ہے ہاں اگر ہندوستانیوں میں اتنی محنت اور اس کے ساتھ قدرت بھی ہو کہ وہ بھی یورپ کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کی طرح اپنے پرائیویٹ کالجوں میں فیلو سٹم جلدی کریں یا اپنی یونیورسٹی الگ قائم کریں تو ممکن ہے کہ اس ملک میں بھی ویسے ہی محقق اور موجد و مخترع پیدا ہونے لگیں۔ جیسے انگلستان، فرانس اور جرمنی میں پیدا ہوتے ہیں مگر یہ سب ناشدنی باتیں ہیں جن کو ہندوستان کی آب و ہوا اس آتی معلوم نہیں ہوتی۔

لیکن اگر تعلیمی نتائج سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو محمد ن کالج میں ہندو ایسی خصوصیتیں موجود ہیں جن کے لحاظ سے اُس کو ہندوستان کے دیگر کالجوں کی نسبت زیادہ مفید کہا جاسکتا ہے از انجملہ ایک نہایت صاف اور صریح خصوصیت کالج مذکور کی یہ ہے کہ اس میں ہر سال جس قدر روپیہ اسکالرشپوں میں خرچ کیا جاتا ہے ظاہراً ہندوستان کے کسی گورنمنٹ کالج یا پرائیویٹ کالج میں صرف نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ مسلمانوں کی مالی حالت کے لحاظ سے یہاں سب جگہ سے زیادہ اس بات میں کوشش کی جاتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو غریب طالب علموں کو جو شوقین اور ہونہار معلوم ہوتے ہوں اسکالرشپوں کے ذریعہ سے تعلیم میں مدد دی جائے اور تا بقدر غریب اور آسودہ حال طلبہ تقریباً یکساں حالت میں طالب علمی کا زمانہ بسر کریں۔ چنانچہ ۱۸۹۱ء سے لیکر ۱۸۹۶ء تک یعنی چھ سال میں کچھ کم تنائیں ہزار روپیہ اس کالج کے طلبہ کو اسکالرشپوں اور وظیفوں میں دیا گیا ہے۔ اگر وہی مقدار مسلمانوں

کو منتظرانِ کالج کی نسبت ایک سو اسی حصہ بھی قوم میں تعلیم پھیلانے کا خیال ہو تو مذکورہ بالا رقم سے دس حصہ زیادہ روپیہ اس مد میں صرف ہو سکتا ہے۔

سامانِ تربیت

لیکن بڑی خصوصیت اس کالج کی سامانِ تربیت ہے جس کو بانی کالج نے ہمیشہ تعلیم سے زیادہ اہم اور ضروری سمجھا ہے اور جس کے بغیر فی الواقع تعلیم کا عدم اور وجود برابر ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کا ہماری درسگاہوں میں کبھی خیال نہیں کیا گیا اور اسی لیے ہم لوگ تربیت کے مفہوم سے جیسی کہ چلبے واقفیت نہیں رکھتے۔ اگرچہ کالج کے بانیوں نے تربیت کے متعلق بہت کچھ تحریروں اور تقریروں میں بیان کیا ہے باوجود اس کے اکثر لوگ تربیت کے مفہوم سے اب تک ناواقف ہیں اور اسی واسطے محدثانِ کالج کے کھیلوں پر اور طالب علموں کے لباس وغیرہ پر اعتراض کرتے ہیں۔ اسی خیال سے ہم چلتے ہیں کہ اس سلسلے کو زیادہ وضاحت سے بیان کریں۔ کیونکہ سرسید کی لائف میں اس سے زیادہ کوئی مہتمم یا شانِ واقعہ نہیں ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کی درسگاہ میں تربیت کی بنیاد ڈالی ہے۔

ہمارے ہاں تربیتِ اولاد کا آلہ زیادہ تر تعلیم و تلقین، نصیحت و پند زجر و توبیخ یا زور و کوب کو سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہ تمام وسائل جب تک کہ ایک معتدبہ زمانہ تک عمدہ سوسائٹی میں نہ رہیں اکثر صورتوں میں محض فضول اور بیکار ثابت ہوتے ہیں۔ مذکورہ بالا وسائل سے اول تو اکثر صورتوں میں مضرت ناسخ پیدا ہوتے ہیں اور اگر کوئی عمدہ اثر دلوں پر ہوتا بھی ہے تو وہ برآب کی طرح جلد نائل ہو جاتا ہے۔ لیکن سوسائٹی کے اثر سے عمدہ

اخلاق رفتہ رفتہ طبیعت ثانی بن جاتے ہیں اسی سوسائٹی کے اثر سے ایجا
یورپ کے اخلاق اصولاً ایک سلچے میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور
اسی سوسائٹی کے سیرے ہونے سے ہم لوگوں کے اخلاق و عادات میں باہم
زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے لڑکے جب کسی درگاہ میں آتے ہیں تو بجائے اس کے کہ ان
کو کچھ سکھایا اور یاد کرایا جائے زیادہ تر اس باعث کی ضرورت ہوتی ہے
کہ جو کچھ وہ اپنے گھروں سے سیکھ کر آئے ہیں اس کو بالکل ان کے دلوں سے
سے بھلا دیا جائے۔ قطع نظر ان عام خرابیوں کے جو ہندوستانیوں کے اخلاق
اور معاشرت میں عموماً پائی جاتی ہیں، ہم غامکر ان چند خصلتوں کا ذکر کرتے
ہیں جو بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ منسوب کی جاتی ہیں، جیسے مذہبی تعصبات
باہمی نزاع، رشک و حسد، بغیبت، بدگمانی، کاہلی، تن آسانی، تصبیح اوقات
ادائے فرائض میں سستی کرنا، غصہ، بے اعتدالی، نافرمانی وغیرہ وغیرہ اور کچھ
شک نہیں کہ ان میں سے اکثر خصلتیں مسلمانوں میں بہ نسبت دیگر اقوام کے
زیادہ دیکھی جاتی ہیں۔ یہی باتیں جب چھوٹے بڑوں میں دیکھتے ہیں تو ان کی
طبیعتوں میں آہستہ آہستہ سرایت کرتی جاتی ہیں اور آخر کار ان کی طبیعت
ثانی بن جاتی ہیں۔

انہیں خرابیوں کے تدارک کے لیے محمدن کالج میں بورڈنگ سسٹم قائم
کیا گیا ہے۔ مگر پہلے اس سے کہ ہم اس سسٹم کے فوائد اور یہ کہ اس کو طلبہ کی
تربیت میں کیا دخل ہے، بیان کریں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جن طرح تعلیم کے
نتیجے اعداد کے ذریعے دکھائے جاسکتے ہیں اس طرح تربیت کے نتائج
نہیں دکھائے جاسکتے۔ نیز تعلیم کے کا اثر دفعہ اور نمایاں ہوتا ہے اور تربیت

کا اثر نامعلوم اور بتدریج ہوتا ہے جس طرح دھوپ اور ہوا اور پانی کی تاثیر سے پودے جو آہستہ آہستہ نشوونما پاتے ہیں ان کو نمو کرنا مالی کے سوا ہر شخص کو فوراً محسوس نہیں ہوتا اسی طرح تربیت کے نتائج بدیہی طور پر ایک مدت کے بعد ظاہر ہوتے ہیں۔ چونکہ کالج اور بورڈنگ ہاؤس کو قائم ہونے کے بعد عرصہ نہیں گذرا اس لیے یہاں ہم کو زیادہ تر یہ دکھانا مقصود ہے کہ محمدن کالج میں مسلمان طلبہ کی تربیت کا کیا سامان مہیا کیا گیا ہے؛ وہ کہاں تک ان کی حالت کے مناسب ہے؛ اور اس سے آئندہ کن نتائج کی توقع ہو سکتی ہے؛ نہ یہ کہ اس طریقہ تربیت سے اب تک کیا نتیجے مترتب ہو چکے ہیں؛

قومیت کا خیال

سب سے زیادہ ضرورت مسلمانوں کی موجودہ اور آئندہ نسلوں میں اتفاق و یک جہتی و قومی ہمہ روی پیدا کرنے کی ہے جس کے نہ ہونے سے تمام قوم روز بروز مضمحل اور تباہ ویران ہوتی جاتی ہے۔ یہ امید رکھنی کہ عظیم نصیحت سے باخبروں اور رسالوں میں اتفاق کے فوائد پر بڑے بڑے آرٹیکل لکھنے سے یا اس مضمون پر زور وار اور موثر نطیس شایع کرنے سے مسلمانوں میں اتفاق پیدا ہو جائے گا۔ ایسی ہی بات ہے جیسے حب کے عمل سے دشمنوں میں دوستی پیدا کرتی۔ ان میں اتفاق پیدا ہونے کی صورت یہی ایک صورت ہے کہ ان کی نسلیں اتفاق کے سایہ میں نشوونما پائیں اور ایک مدت تک ایسی سوسائٹی میں زندگی بسر کریں جہاں مختلف فائدوں اور مختلف صوبوں اور مختلف مذہبوں کے لڑکے ایک ہال میں کھانا کھائیں،

ایک مسجد میں نماز پڑھیں، ایک فیڈ میں مردانہ کھین کھیلیں، ایک میدان میں گھوڑے دوڑائیں، ایک کلب میں ڈبیٹ کریں، ایک کالج میں پڑھیں اور ایک احاطہ میں دن مات لگے بھائیوں کی طرح شیروٹو سکر سو کر رہیں، اور اس طرح اتفاق کی حلاوت ماں کے دودھ کی طرح ان کی رگ و پے میں سرایت کر جائے۔

ریاضت جسمانی

ریاضت جسمانی جس کا سامان مڈن کالج میں ہندوستان کے تمام کالجوں سے زیادہ مہیا کیا گیا ہے اور جس میں یہاں کے طالب علموں نے تمام ملک میں بڑی شہرت حاصل کی ہے، اکثر لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس سے طالب علموں کی طبیعت تعلیم سے اچھا ہو جاتی ہے اور کالج میں رہنے سے جو اصل مقصود ہے وہ حاصل نہیں ہوتا، مگر جس قوم کی تقلید سے ہم اپنی اولاد کو انگریزی تعلیم دلواتے ہیں ان کے ہاں ریاضت جسمانی تعلیم کا جزو غیر متناہک سمجھی جاتی ہے، لیکن صرف ان کی تقلید ہی سے ریاضت جسمانی کو محض کالج میں ضروری نہیں ٹھہرایا گیا بلکہ اس لیے اس کا زیادہ اہتمام کیا گیا ہے کہ جو طالب علم یہاں سے نکلیں وہ قوم میں مستعدی اور جفاکشی کی مثال ہوں اور سستی اور کاہلی جو مسلمانوں کی ایک قومی خصیلت سمجھی جانے لگی ہے بجائے اس کے وہ ان میں چستی و چالاکی کی بنیاد ڈالیں، وہ برعلافت ان تمام کتاب کے کیڑوں کے جو اپنے تمام قوائے دماغی کتاب کی تذکرہ دیتے ہیں اور زندہ دلی و سگفتگی اور تمام اسٹیکس اور چاؤ بلکہ بعض صورتوں میں اپنی زندگی تک تعلیم پر قربان کر دیتے ہیں، جب کالج کو چھوڑیں تو کھنے پٹھنے کے سوا وہ دنیا کے تمام کاموں کے لائق ثابت ہوں

وہ ہندوستان کی عام حالت کے برخلاف جہاں ایک شخص کا سپاہی اور عالم ہونا گویا اجتماعِ ضدین سمجھا جاتا ہے، تعلیم یافتہ بھی ہوں اور سپاہی بھی وہ ان فرسودہ دماغوں کی طرح جن میں کثرتِ مطالعہ سے تخیل اور برداشت کی طاقت نہیں رہتی، چڑچڑھے، نازک مزاج اور بددماغ نہ بنجائیں۔ اگر ان کو یورپین لٹریچر کی مانتھی میں رہنے کا اتفاق ہو تو محنت اور جفاکشی کے موقعوں پر ان کا ساتھ دینے سے عاجز اور ان کی نظر میں ذلیل نہ ہوں، وہ ملکی اور فوجی دونوں قسم کی خدمات کے لیے انتخاب ہو سکیں۔ اگر ان کو نوکری میسر نہ آئے تو اپنے دست و بازو پر بھروسہ کر کے ہر کام پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت کر سکیں۔ ان میں ایسی استعداد پیدا ہو جائے کہ بیکاری اور آرام طلبی جو مسلمانوں کی قومی خصالت بن گئی ہے اور جس کے سبب سے عرب میں "ہندی بطلان" ایک مثال ہو گئی ہے ان کو وبال معلوم ہونے لگے وہ غیر ملکیوں کے سفر سے نہ بچکے ان میں وہ سختیوں کے چیلنے کے عادی ہو جائیں۔ انھیں اغراض کے لیے محمدن کالج میں ریاضت جسمانی پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ محض تعلیم سے کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ اس میں دلیری اور مستندی کا عنصر پیدا نہ ہو۔ لارڈ ڈفرن اپنے عہد حکومت میں جب محمدن کالج کے ملاحظہ کو آئے اور ایڈریس میں کرکٹ وغیرہ کا ذکر سنا تو اس کا جواب دیتے وقت انھوں نے طالب علموں سے مخاطب ہو کر کہا تھا کہ "ہماری قوم نے پہلی فتح کرکٹ کے میدان میں حاصل کی تھی ایک حکیم کا قول ہے کہ "قومی قوتِ صحت پر منحصر ہے" اور چونکہ صحت بغیر ریاضت جسمانی کے قائم نہیں رہ سکتی اس لیے یہ کہنا چاہیے کہ قومی قوتِ ریاضت جسمانی پر منحصر ہے۔

نصوصاً ہمیں قوم کو خدا نے ہم پر حکمران کیا ہے اور جن کی پسند اور انتخاب

کے ساتھ بیماری تمام امیدیں وابستہ ہیں ان کے برابر کوئی قوم روئے زمین پر ریاضت جسمانی کی فریضہ نہیں، ان کو شیر خوارگی کے زمانہ سے ریاضت کے قابل بنایا جاتا ہے اور جب تک مرض الموت میں مبتلا نہیں ہوتے کبھی ریاضت ترک نہیں کرتے، علاوہ معمولی کھیلوں اور ریاضتوں کے سیکڑوں بلکہ ہزاروں کوس گھوڑے یا ہائیکل پیرا پیادہ پاسفر کرتے ہیں، کشتیاں کھیتے ہیں، گاڑیاں ہانکتے ہیں، برف پر دوڑتے ہیں، پیاروں پر چڑھتے ہیں، کانوں میں اترتے ہیں، لکڑیاں چیرتے ہیں، یہی سبب ہے کہ مصر کا ایک لائق مسلمان اپنے سفر نامہ یورپ میں لکھتا ہے کہ درمخاطر وہاں تک میں گھس جاتا، اخیر دم تک اپنے ارادہ پر ثابت قدم رہنا اور جس قدر زیادہ مشکلات پیش آئیں اسی قدر زیادہ ثبات اور استقلال سے ان کا مقابلہ کرنا دنیا کی کسی قوم میں ایسا نہیں پایا جاتا جیسا انگریزوں کا قوم میں پایا جاتا ہے۔ اسی قوم کی نظر میں کیا ہمارے نوجوان جب تک کہ انھیں کی برابر بلکہ ان سے زیادہ جفاکش محنتی، دلیر اور مستعد نہ ہوں محض کتاب کا کثیر لہنے سے کچھ اعتبار یا وقعت حاصل کر سکتے ہیں؛

برگز نہیں۔

جو لوگ گورنمنٹ سے یہ چاہتے ہیں کہ ہم کو والٹیر بنایا جائے اور ہم کو فوج میں معزز عہدے دیئے جائیں، جب تک کہ وہ بھی مثل انگریزوں کے اپنے تئیں ایجوکیشن سپاہی نہ بنائیں، برگز ایسی خواہش کرنے کا استحقاق نہیں رکھتے اور اسی لیے محمدن کالج کے بانیوں نے ریاضت جسمانی کو تسلیم کا جزد غیر منفک قرار دیا ہے۔

یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ کرکٹ، فٹ بال اور جیناٹک وغیرہ کے شوقین تعلیم میں کوشش نہیں کرتے یا لکھنے پڑھنے سے ان کا دل اچاٹ ہو

جاتا ہے۔ کیونکہ ہم نے سنا ہے کہ جس کالج ٹیم نے پچھلے دنوں میں بمبئی اور پارسا ٹیم اور پشیا ٹیم پر دو نمایاں فتحیں حاصل کی تھیں ان میں کئی گریجویٹ تھے۔ اور باقی جتنے کالج کلاسوں میں پڑھتے تھے وہ سب تعلیم کے لحاظ سے بھی اپنی جماعتوں میں اچھے سمجھے جاتے تھے۔

وقت کا خیال

ایک اور فائدہ بورڈنگ سسٹم سے طالب علموں کے لیے یہ سمجھا گیا ہے کہ بورڈنگ ہاؤس میں رہنے سے ان کو ضبط اوقات کی عادت پڑتی ہے۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ مسلمانوں کی اولاد تصنیع اوقات کرنے والی مشہور ہے، حالانکہ جس قوم کی گورنمنٹ سے ہمارے نوجوان لڑکوں کے خواستگار ہیں اس کا ایک ایک فرد وقت کو اپنی دولت بلکہ اپنا دین و ایمان سمجھتا ہے اور فی الحقیقت جو لوگ وقت کی کچھ قدر نہیں کرتے نہ وہ دین کے فرائض ادا کر سکتے ہیں نہ دنیا کے۔

وقت کی پابندی بھی وعظ و نصیحت سے یا کتابوں میں اسکی خوبیاں پڑھنے سے یا کسی نفع کی امید یا نقصان کے خوف سے نہیں ہوتی، بلکہ ایک مدت تک اس کی مشق کرنے سے ہوتی ہے۔ مجڈن کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں جو مینیجرن لڑکے ایک وارڈ میں رہتے ہیں ان کی اہلکار ایسی ڈالی ہے جس سے امید ہوتی ہے کہ وہ کالج سے نکل کر ہمیشہ اوقات کے پابند رہیں گے۔

صبح کے پانچ بجے سے رات کے نو بجے تک وہ مختلف فرائض میں جکڑے رہتے ہیں نماز پڑھنا، قرآن پڑھنا، ہوا خوری کرنا، یا گیند بلا کھیلنا، ازنگ اسکول ٹائٹ اسکول اور ریٹے اسکول میں پڑھنا، کھانا کھانا، مطالعہ دیکھنا

اور سونا یا سوکرا ٹھننا۔ غرض ہر ایک کام کے لیے خاص اوقات مقرر ہیں جن میں بیماری کے سوا کبھی فرق نہیں آنے پاتا۔ ظاہر ہے کہ آٹھ دس برس تک جب ان کی زندگی اس پابندی اوقات کے ساتھ گزرے گی تو امید نہیں کہ وہ عمر بھر اس عادت کو چھوڑ سکیں۔ اگرچہ بڑی عمر کے لڑکوں کے لیے بھی فرق اور اوقات مقرر ہیں مگر جو عادت بچپن میں ڈالی جاتی ہے۔ وہ طبیعت ثانی ہو جاتی ہے۔ بخلات بڑی عمر کے لڑکوں کے کہ اول تو ان کو بچپن برابر کالج میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوتا، دوسرے جو عادتیں وہ باہر سے سیکھ کر آتے ہیں ان کا مائل ہوتا مشکل ہوتا ہے۔ اسی لیے محمدن کالج میں بچپن سے رہنا نسبت بڑی عمر کے لڑکوں کے زیادہ مفید ہے۔

اطاعت کی مشق

شریفاہ اور باقاعدہ اطاعت و فرمانبرداری جو ہر قوم کا اور خاص کر محکوم قوم کا زیور ہے اس کی عادت ڈالوانے اور مشق کرانے کے جو ذریعے اس بورڈنگ ہوس میں موجود ہیں ظاہر ابندوستان کے کسی انسٹیٹیوشن میں موجود نہیں ہیں۔ علاوہ کالج اور ہائی اسکول اور ماننگ اسکول کے جہاں طالب علموں کو برابر پر و فیسروں اور اسٹروں کی آرڈر میں رہنا ضرور ہے وہ ہر وقت اپنے نہیں کسی نہ کسی ریڈ یا افسر کے زیر حکم پاتے ہیں جب تک وہ بورڈنگ ہوس میں ہیں پراکٹر کے محکوم ہیں جب تک ڈائنگ ہال میں رہتے ہیں ایک یورمین پر و فیسر ان کا نگران رہتا ہے۔ اسی طرح نسیڈ میں پر ووسٹ یا کیپٹن، یونین کلب میں پریسیڈنٹ یا اس کا قائم مقام، جینٹلمن اور قواعد کے وقت ڈن ماسٹر، گھوڑے کی سواری کے وقت رائڈنگ

ماسٹر بیماری کی حالت میں ڈاکٹر اور مسجد میں ایک دین دار عالم اُن کی روک
لوگ کے لیے مقرر ہیں جن کا حکم ماننا اُن کو ضرور ہے۔

ظاہر ہے کہ جب برابر آٹھ سات برس طالب علموں کی زندگی ان ضوابط
کے ساتھ بسر ہوگی تو کس قدر باقاعدگی اور اطاعت اُن کی طبیعت میں پیدا
ہو جائے گی! اور کس قدر وہ دنیا میں ہر جگہ سرورِ عزیز ہو کر رہنا سیکھ جائیں گے؟
ایسی اطاعت جو قواعد و اصول پر مبنی ہو اُس کی عادت اولاد کو ابتدا سے
عمر میں ڈلوانی ایسی ہی ضروری ہے جیسے ایل پچھڑے کو سدھا کر اور باگوں پر
صاف کر کے سواری کے قابل بنانا جس طرح اوکھے اور سرکش گھوڑے کا کوئی
خریدار نہیں ہوتا اسی طرح نافرمان آدمی کہیں عزیز نہیں سمجھا جاتا، اکثر انگریز
افسروں نے لوگوں سے یہ شکایت کی ہے کہ مسلمان لیے فرماں بردار
نہیں ہوتے جیسے ہندو اور اسی لیے یورپین افسران کی نسبت ہندوؤں کو
زیادہ پسند کرتے ہیں، اگر فی الواقع یہ شکایت صحیح ہے تو مسلمانوں کا اولاد
جن کا مدار معاش اب تک صرف نوکری پر رہا ہے اُن کو سب سے زیادہ
اطاعت اور فرمانبرداری سکھانے کی ضرورت ہے۔ یہ سمجھنا کہ آزادی
اور اطاعت میں منافات ہے صحیح نہیں ہے۔ انگریزوں کی قوم دنیا میں
سب سے زیادہ آزاد خیال اور آزاد طبع سمجھی جاتی ہے، حالانکہ اُن سے بڑھ
کر کوئی اپنے امیر کا حکم ماننے والا اور قانون پر چلنے والا اور قواعد کی پابندی
کرنے والا نہیں ہوتا۔ پس مٹھن کالج کے بورڈنگ ہوس میں رہنے سے
مسلمانوں کی اولاد ایک ایسی خصلت سیکھتی ہے جس پر اُن کی تمام آئندہ
کامیابیاں منحصر ہیں۔

قومی لباس کا خیال

اس کے سوا مسلمانوں میں قومیت کا خیال پیدا کرنے کے لیے ایک اور چیز کی ضرورت ہے جس کو آج تک ہندوستان کے عام مسلمانوں نے قابل التفات نہیں سمجھا۔ حالانکہ وہ ایک نہایت متم باشان مسئلہ ہے۔ لباس جس کی نسبت ہمارے بزرگوں کا یہ قول تھا کہ "اَلْقَامُ بِالْقَابِ" اور جس سے ایک قوم کی دوسری قوم سے تمیز کی جاتی ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے اس میں کوئی امتیاز باقی نہیں رکھا۔ انگرکھا، پاجامہ، ٹوپی، عمامہ، پگڑی یا جوتہ غرض کہ کوئی چیز مسلمانوں کے لباس میں ایسی نہیں ہے جس پر قومی خصوصیت کا اطلاق ہو سکے۔ ہندو مسلمانوں میں پہلے صرف اٹلے اور سیدھے پردہ کی تمیز تھی مگر جب سے اچکن کا رواج ہوا ہے یہ تمیز بھی باقی نہیں رہی۔ قطع نظر اور ملکوں کے جہاں ہر قوم ایک خاص لباس رکھتی ہے خود ہندوستان میں اکثر معزز قومیں ہیں جو صرف اپنے قومی لباس سے پہچانی جاتی ہیں، جیسے پارسی سر بٹے، بنگالی، راجپوت وغیرہ۔ مگر مسلمانوں کے لباس میں کوئی قومی خصوصیت نہیں پائی جاتی، لباس کا متحد ہونا قومی یکگانگت کے بڑھانے اور منائرت کے دور کرنے میں ویسا ہی دخل رکھتا ہے جیسا زبان، نسل اور مذہب کا متحد ہونا۔ اس کے مواجہ میں قوم کے لباس میں کوئی قومی خصوصیت نہیں ہوتی ان کی مجلسیں، ان کے میلے اور ان کی جماعتیں دوسری قوموں کی نظر میں ایک گویا رے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔

اسی سبب سے سرسید کو ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بھی اور قوموں کی طرح اپنے لباس میں کوئی خصوصیت اور ماہر الامتیاز پیدا

کریں، اور چونکہ بقول اُن کے آج ہندوستان میں کوئی مسلمان اتھارٹی ایسی موجود نہیں ہے جو ایک نیشنل لباس اختراع کرے اور اس کے رواج دینے پر زور دے، اس لیے انھوں نے مسلمانوں کی ایک معزز ترین قوم یعنی ترکوں کا لباس اول خود اختیار کر کے قوم میں ایک مثال قائم کی اور پھر محمدن کالج کے بورڈروں کے لیے اُس قاعدہ کے موافق جس پر قسطنطنیہ کی درسگاہوں میں عملدرآمد ہے یونی فارم کا قاعدہ جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر بعض موافق کے سبب وہ قاعدہ جاری نہیں ہو سکا۔ لیکن محمدن کالج کے طالب علم جو بورڈنگ ہاؤس میں آکر رہتے ہیں بغیر کسی جبر کے اپنے ہچشموں کو دیکھ کر خود بخود ٹرکس لباس اختیار کر لیتے ہیں جو علاوہ خوش قطع اور خوشنما ہونے کے ہر موسم اور ہر حالت کے مناسب اور قواعد حفظ صحت کے بھی موافق بنے، اور جب وہ کالج چھوڑ کر وہی لباس اپنے وطن میں جا کر پہنتے ہیں تو اکثر قوم کے نوجوان اُن کی دیکھا دیکھی وہی لباس اختیار کر لیتے ہیں اور اس طرح محمدن کالج ہندوستان کے مسلمانوں میں آہستہ آہستہ ایک قومی لباس کو رواج دے رہا ہے۔

اگرچہ بعض تنگدل انگریز جو ہندوستانیوں کو ہمیشہ پست اور ذلیل حالت میں دیکھنا پسند کرتے ہیں وہ اس لباس سے ناراض ہوتے ہیں لیکن چونکہ گورنمنٹ نے ہم کو برقوم کا لباس پہننے کی آزادی دی ہے اور انگریزوں میں بھی زیادہ تر وہی فیاض اور آزاد طبع لوگ ہیں جن کے لیے متعصبانہ خیالات نہیں ہیں اس لیے محمدن کالج کے طالب علم تہایت آزادی سے ٹرکس لباس پہنتے ہیں اور کسی کی بیجا ناخوشی یا ناگواری کا خیال نہیں کرتے۔

کالج کی سوسائٹیاں

نیز پورڈروں نے کالج کے احاطہ میں متعدد سوسائٹیاں قائم کر رکھی ہیں
 از انجملہ ایک کالج یونین کلب اور دوسری اسکول یونین کلب ہے۔ کالج اور
 اسکول کے طلبہ ہفتہ میں ایک روز مختلف مضامین پر اپنے اپنے صدر انجمن کے
 روبرو انگریزی یا اردو میں معارضہ بحث کرتے ہیں مگر کون بات آداب مناظرہ
 اور تہذیب کے خلاف زبان پر نہیں لاسکتے جو لڑکے ڈبیٹ یا اسپیکنگ
 میں عمدہ لیاقت ظاہر کرتے ہیں ان کو انعام دیے جاتے ہیں۔ اس سے علاوہ
 اسپیکنگ اور استدلال کا ملکہ پیدا ہونے کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہندوستان
 کے مسلمانوں میں جو مہادلوہ کا نا پسندیدہ طریقہ عموماً جاری ہے اس کی اصلاح
 کی ان میں بنیاد پڑتی ہے اور طالب علموں کو مختلف سوالات پر بحث کرنے
 کے لیے مختلف کتابیں دیکھنے اور ہر ایک سوال پر راستے قائم کرنے کا موقع
 ملتا ہے۔

طالب علموں ہی نے ایک دوکان ڈیوٹی شاپ کے نام سے پورڈرنگ
 ہاؤس میں کھول رکھی ہے جو مختلف طریقوں سے روپیہ جمع کر کے کالج اور
 طلبہ کی مدد کرتی ہے اس سے ان کے دل میں کالج کے ساتھ عمدہ روی اور اس کی
 امداد کے لیے عملی کام کرنے کی خود بخود ترغیب ہوتی ہے۔

ایک اور سوسائٹی براؤن ہڈ کے نام سے قائم کی گئی ہے جس میں ان تمام
 طالب علموں نے جو تعلیم ختم کرنے کے بعد کہیں لوکر ہو گئے ہیں اپنی آمدنی
 میں سے فیصدی ایک روپیہ ماہوار چھپتہ حصص کالج کی امداد کے لیے
 دینے کا وعدہ کیا ہے۔

اس کے سوا اور سوسائٹیاں ہیں ایک انجمن اخوان الصفا جس میں اُس کے ممبر آزادی کے ساتھ مختلف عشراؤں پر مضامین لکھ کر پیش کرتے ہیں، دوسری بختہ الادب جو عربی زبان میں تقریر یا تحریر کی مشق کرنے کے لیے قائم کی گئی ہے۔

ایک اور سوسائٹی ماں سب میں سائنس پر کچھ دینے اور اس کے تجربے دکھانے کے لیے طالب علموں نے قائم کی ہے جس کا مقصد بندوستانوں میں علمی مذاق پیدا کرنا ہے۔ یہ سوسائٹی گوا بھی ابتدائی حالت میں ہے مگر چونکہ وہ زمانہ کے مقتضا کے موافق ہے اس لیے اُس کے ترقی کرنے کی بہت کچھ امید کی جاتی ہے۔

ان سب سوسائٹیوں کے علاوہ ریاضت جسمانی کے لیے کرکٹ اور فٹ بال اور جمناسٹک کلب اور گھوڑے کی سواری کیلئے ریڈنگ اسکول ہے اگرچہ ریڈنگ اسکول نے مسلمانوں کی کم بہتی یا بے مقدوری کے سبب ابھی تک کچھ زیادہ ترقی نہیں کی مگر جو کلب ریاضت جسمانی کے لیے قائم ہیں ان میں ترقی سے بہت زیادہ ترقی ہوئی ہے جس کی وجہ سے کالج ٹیم نے تمام بندوستان کی یورپین اور ہندوستانی ٹیموں میں جیسا کہ کالج کی سالانہ رپورٹوں سے ظاہر ہے۔ توقع سے بہت زیادہ شہرت حاصل کی ہے۔

مذہبی تعلیم

مذہبی تعلیم و تربیت بھی اس کالج کی خصوصیات میں سے ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ یہ شاخ جیسی کہ ایک محمدن کالج میں ہونی چاہیے ابھی تک اس درجہ پر نہیں پہنچی لیکن اس کا الزام سرسید کالج کے اور متعلموں پر عائد

نہیں ہوتا۔ اول تو دو مذہبی کمیٹیاں جو شیعہ اور سنی دونوں کی مذہبی تعلیم کی نگرانی اور انتظام کے لیے جدا جدا مقرر ہیں اور جن سے سرسید نے لوگوں کی بدگمانی کے خیال سے خود علیحدگی اختیار کی تھی، انہوں نے کہیں اس طرف توجہ نہیں کی دوسرے ذہنی تسلیم کے کورس جو یونیورسٹی وقتاً فوقتاً مقرر کرتی ہے۔ وہ اس قدر مشکل اور طویل الذیل ہوتے ہیں کہ ان کے پورا کرنے میں طلبہ کو دوسری طرف متوجہ ہونے کا بہت ہی کم موقع ملتا ہے، یہ اتنا کہ اگر ان پر مذہبی تعلیم کا زیادہ بوجھ ڈالا جائے تو دو حال سے خالی نہیں، یا تو وہ کالج چھوڑ دیں گے یا یونیورسٹی کے امتحانوں میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ با اینہم جس قدر مسلمانوں کی مذہبی تعلیم و تربیت کا اہتمام اس کالج میں کیا جاتا ہے اور جس کی تفصیل اس کی سالانہ رپورٹوں میں ہمیشہ چھپتی ہے۔ ہندوستان کے کسی کالج میں اس کا وجود نہیں ہے۔

یہ سچ ہے کہ انگلستان کے جن کالجوں کی تقلید سے اس کالج میں تربیت کا مذکورہ بالا سامان مہیا کیا گیا ہے ان کے مقابلہ میں اس کالج کو مشکل سے ایک خاکا یا ایک ادھور نمونہ ان کالجوں کا کہا جاسکتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ انگلستان کے مذکورہ بالا کالج کتنی کتنی مدت میں موجودہ حالت تک پہنچے ہیں تو جس حد تک علی گڑھ محمدن کالج میں بائیس برس کے عرصہ میں پہنچ گیا ہے۔ اس سے کچھ کم تعجب نہیں ہوتا۔ انگلستان کے بڑے بڑے نامور کالج اور یونیورسٹیاں جو آج تمام یورپ میں مشہور و معروف ہیں کئی کئی سو برس تک نہایت گناہی اور سستی کی حالت میں رہی ہیں اور جس طرح بتدریج قوم میں تعلیم بڑھتی گئی اسی طرح آہستہ آہستہ ان کی حالت ترقی کرتی گئی۔ پس ہم کو اس کالج کی موجودہ حالت

پر نظر کرنی نہیں چاہیے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ جن اصول پر وہ قائم کیا گیا ہے۔ اگر انہیں اصول کے موافق وہ ترقی کرتا چلا گیا تو پچاس ساٹھ ہی برس وہ کس درجہ پر پہنچ جائے گا۔

یشک کالج کے اندرونی انتظامات میں بہت سی باتیں قابل اعتراض موجود ہیں جن کو سرسید کی خود رانی اور ضد اور مٹ کا نتیجہ کہا جاتا تھا اور کچھ شبہ نہیں کہ لوگوں کا یہ کہنا بالکل غلط نہ تھا لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ضرور سمجھنا چاہیے کہ صدیوں کے کام مہینوں اور دونوں میں پورے نہیں ہو سکتے اور ایک شخص کی طاقت سے باہر ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ایک قومی انسٹی ٹیوشن کو اس حد تک پہنچا جائے جس کے بعد کسی اصلاح یا ترقی کی ضرورت باقی نہ رہے اور ایک ریفارمر جس نے اگلے وقتوں کے بہت سے خیالات اور عہدت سی راہوں کی اصلاح کی جو اس کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ ساتھ کے ساتھ اپنے خیالات اور اپنی راہوں کی بھی اصلاح کرتا جائے۔

یورپین اسٹاف

ایک اور خصوصیت اس کالج کی یورپین اسٹاف ہے جس کو بانی کالج نے متعدد وجوہ سے نہایت اہم اور ضروری سمجھا ہے۔ ان کی رائے تھی کہ اول تو ہندوستانی تعلیم یافتہ علمی لیاقت اور طنز تسلیم کے لحاظ سے بھی یورپین پروفیسروں کی برابری نہیں کر سکتے اور اگر بالفرض ایسے لائق ہندوستانی پروفیسر بھی آجائیں تو ان کا اثر طلبہ کی تربیت پر جو اس کالج کا اصلی مقصد ہے ویسا ہو سکتا نہیں پڑ سکتا جیسا انگریز پروفیسر کا پڑ سکتا ہے۔ ڈیوٹی کا خیال وقت کی قدر، قواعد حفظِ صحت کی پابندی، سیلف پلیس

مستعدی اور ریاضت جسمانی کی عادت۔ یہ تمام خصلتیں یورپ میں بھی انگلش قوم کی خصوصیات میں شمار ہوتی ہیں، خصوصاً انگلستان کی مشہور یونیورسٹیوں کے گریجویٹ شریفانہ اخلاق کے لحاظ سے تمام قوم میں ممتاز گئے جاتے ہیں۔ اس کے سوا کالج کا نظم و نسق اور انسرانہ رعب و داب جیسا کہ ایک انگریز معلم کالج یا اسکول میں قائم رکھ سکتا ہے بندوستانی معلموں سے اس کی سرگز تو قیاساً ہی کیجا سکتی۔ اسی لیے کالج کے قواعد میں یہ اصول قرار دیا گیا ہے کہ کم سے کم ایک پرنسپل اور دو پروفیسر کالج میں اور ایک ہیڈ ماسٹر اسکول میں ہمیشہ یورڈین ہونا چاہیے اور جہاں تک کالج کی آمدنی میں گنجانش ہو اس تعداد میں اور اضافہ کیا جائے اور جب کسی یورڈین پروفیسر کی ضرورت ہو تو انگلستان کی کسی مشہور یونیورسٹی کا گریجویٹ جس کی علمی اور اخلاقی قضیات پر اس کے استادوں نے شہادت دی ہو ایک ہزار روپیہ سفر خرچہ دے کر بلا یا جائے۔ چنانچہ اب تک چار چار پانچ پانچ یورڈین انسر کالج اور اسکول میں برابر مقرر رہے ہیں اور اگر کالج فنڈ میں گنجانش ہو تو ممکن ہے کہ عند الضرورة ان کی تعداد اس سے زیادہ بڑھ جائے۔

اگرچہ بظاہر جو پیش قرار تنخواہیں یورڈین عہدہ داروں کو دیا جاتی ہیں وہ کالج کی مالی حیثیت سے بہت زیادہ معلوم ہوتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یورڈین اسٹاٹ نے عام طور پر اس ضرورت کو بخوبی ثابت کر دیا ہے جس کی بنا پر سرسید نے ان کالج کا جزو اعظم قرار دیا ہے۔ وہ باوجود قومی مذہبی اور ملکی مغایرات کے محمدان کالج کو گویا اپنا قومی انسٹیٹیوشن سمجھتے ہیں وہ اپنے علیہ کے ساتھ مشفقانہ اور بردبار نہ ہر تاؤ رکھتے ہیں، ان کی دعوتوں اور پارٹیوں میں ان کی مجلسوں میں، اور ان کے مباحثوں میں خود بھی شریک

ہوتے ہیں۔ اور اسٹیشن کے یورپین مشنوں اور ان کی لیڈیوں کو شریک کرتے ہیں اور ان کا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ وہ اس لیے کہ گورنمنٹ اور انگریزوں کی نظر میں ان کا اعتبار زیادہ ہو، ان کو گورنمنٹ کا ادب اور انگریزوں کی محبت سکھاتے ہیں۔ خود ان کا بڑا ڈجو ہندوستانی طالب علموں کے ساتھ ہے انگلش نیشن کی محبت اور وقعت ان کے دل میں پیدا کرتا ہے۔ وہ طرح طرح سے ان کو غیرت دلاتے ہیں اور ان کی غفلت کے نتائج سے ان کو خبردار کرتے ہیں۔ وہ اپنی عمدہ خصلتوں، شانستہ عادتوں، فرائض کی پابندی، صفائی ضبط اوقات اور دیگر خوبیوں سے طالب علموں کے کیرکٹر پر نہایت قوی اور پائیدار اثر پیدا کر دیتے ہیں جو کسی اور طریقہ سے پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ غریب طالب علموں کی طرح طرح سے امداد اور تقویت کرتے ہیں، بیماریوں کی خبر لیتے ہیں، کالج کے چندوں میں شریک ہوتے ہیں، اس کی ترقی کی تدبیریں سوچتے ہیں، اس کی محبت طالب علموں کے دل میں پیدا کرتے ہیں اور اس میں وہ تمام انتظامات اور تربیت کے طریقے جو انگلستان کے کالجوں میں جاری ہیں ہمیشہ آہستہ آہستہ جاری کرتے جاتے ہیں وہ باوجود مذہبی اختلاف کے مسلمان لوگوں کی مذہبی تعلیم و تربیت کا خیال خود مسلمانوں سے زیادہ رکھتے ہیں مسجد کی غیر حاضری پر ان کو سزا دیتے ہیں، مذہبی تعلیم اور قرآن خوانی کی ان کو ہما کیب کرتے ہیں، مولود کی مجلسوں اور ان کے دیگر مذہبی اجتماعوں میں شریک ہوتے ہیں ایک بڑا بدیہی ثروت اس بات کا کہ وہ محمدؐ کالج میں کس وقعت اور محبت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، یہ ہے کہ مسٹر آرنلڈ پر ویسٹ آف لاسٹی جو کالج کی بد قسمتی سے یہاں کا تعلق ترک کر کے لاہور کالج میں چلے گئے ہیں ان کی روانگی کے زمانہ میں ہر شخص کو جو کالج سے تعلق رکھتا تھا اس قدر افسوس ہوا تھا کہ بیان نہیں ہو سکتا خصوصاً کالج کلاسوں کے طالب علم جو ان کا کچھ

سنتے تھے اُن کو مسٹر آرنلڈ کی اور مسٹر آرنلڈ کو ان کی جہاں کا جس قدر رنج اور
 قلق ہوا تھا اُس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ ان سے پہلے جب مسٹر والس پیروفیسر
 اور مسٹر بورسٹ ہیڈ ماسٹر نے کالج سے قطع تعلق کیا تھا اس وقت بھی تمام
 کالج کو اسی کے قریب قریب رنج ہوا تھا جیسا کہ اس سال مسٹر آرنلڈ کے
 جلنے سے ہوا اور اسی طرح مسٹر ڈنٹن مرحوم ہیڈ ماسٹر کے قبل از وقت مرجانے
 پر کالج کے تمام متعلقین نے مثل اپنے عزیزوں کے رنج و ماتم کیا ہے۔ اگرچہ
 یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کالج کو ہمیشہ ایسے ہی دل سوز اور مسلمانوں کے ہمدرد
 پروفیسر ملتے رہیں گے جن کا ذکر اوپر ہوا یا جیسے کہ اب کالج میں موجود ہیں
 لیکن بہر حال یورپین اسٹاٹ کا اس کالج میں ہونا خاص کر مسلمانوں کی حالت
 کے لحاظ سے نہایت ضروری ہے۔

غدر ۱۹۱۷ء سے۔ بکراٹس وقت سے جبکہ ہندوستان کی سلطنت مسلمانوں
 کے ہاتھ نکل کر انگلش قوم کے ہاتھ میں گئی، ہندوستان کے مسلمانوں کا حاصل
 بعینہ ایک نوجوان بیوہ کا سارہا ہے کہ کیسی ہی عقیقہ اور پاک و امن ہو مگر
 بدگمانیوں سے کسی طرح نہیں بچ سکتی۔ پس ہندوستان کے مسلمانوں کو جس
 طرح اپنے مذہب کی رو سے اس بات کی ضرورت ہے کہ بچے دل سے
 انگلش گورنمنٹ کے دفاطریں اسی طرح ملکی مصلحت سے یہ بھی ضرور
 ہے کہ حکمران قوم کو کبھی اپنی طرف سے بدگمان ہونے کا موقع نہ دیں۔ آج
 کل انگریزی تعلیم سے انگریزوں میں تقریباً ویسی ہی بدگمانی پائی جاتی ہے جیسی
 کسی زمانہ میں جہالت اور تعصب سے پائی جاتی تھی۔ پس ایک ایسا ہوں
 انٹیشنیشن جہاں چار چار سو مسلمان ایک وقت میں انگریزی تعلیم پاتے ہیں
 اور کئی کئی برس تک دن رات وہیں زندگی بسر کرتے ہوں، جب تک

کہ اُس میں متعدد یورپین انسر اُن کے نگران اور اُن کے خیالات کی اصلاح کرنے والے موجود نہ ہوں حکمران قوم کے اطمینان کے لائق نہیں ہو سکتا۔ انھیں خیالات سے سرسید نے کم سے کم چار یورپین انسروں کا ہمیشہ کالج اور اسکول میں رہنا کالج کے قواعد میں داخل کر دیا ہے اور اس تدبیر سے کالج کو بہت فائدہ پہنچا ہے اور اس سے بہت زیادہ فائدے پہنچنے کی آئندہ توقع ہے۔ زیادہ تر اسی خصوصیت کی وجہ سے گورنمنٹ پندرہ ہزار چھ سو روپیہ سالانہ کی امداد اس کالج میں دیتی ہے اور اسی سبب سے تمام اینگلو انڈین انسر اور حکام عموماً اس کالج کی نسبت عمدہ خیال رکھتے ہیں، دورے سے نابالغ سردار زادوں اور رئیس زادوں کو تعلیم کے لیے یہاں بھیجتے ہیں ہر صوبہ میں یہاں کے طالب علموں کو خوشی سے نوکریاں دیتے ہیں۔ بعض اوقات پرنسپل سے خود درخواست کر کے یہاں کے طلبہ کو نوکری کے لیے بلاتے ہیں، بڑے بڑے جلیل القدر انگریز کالج کو آ کر دیکھتے ہیں، چار وائسرائے اور چھ سات لفٹنٹ گورنر اب تک یہاں آچکے ہیں۔ پارڈناتھ برودک نے دس ہزار روپیہ اسکارشپوں کے لیے اس کالج کو عنایت کیا ہے اور اُن کے سوانحی و ایسراڈن اور لفٹنٹ گورنروں نے اس میں چہترہ یا تھنے دینے میں خصوصاً سرسید کی وفات کے بعد جو خاص توجہ اور سر بیانہ سرپرستی حضور لارڈ ایگن اور آئریل مسٹر لاٹوش اور خاص کر سر انٹونی کڈائل نے کالج کی نسبت ظاہر فرمائی ہے اس کی شکر گزاری سے ہندوستان کے تمام مسلمان عموماً اور متقدمان کالج خصوصاً کسی طرح سبکدوش نہیں ہو سکتے اور کچھ شک نہیں کہ یہ تمام اقبالیات زیادہ تر یورپین اسٹاٹ اور خاص کر مسٹر تھیوڈر بک پرنسپل کالج کی بددلت اس انسٹیٹیوشن کو حاصل

ہونے ہیں۔ انھیں وجوہات سے سرسید کالج کی باگ کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں جانی نہیں چاہتے تھے جس سے یورپین اسٹاٹ کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ رکھنے کی جیسا کہ وہ خود ان کے ساتھ رکھتے تھے توقع نہ ہو۔

کالج کی نسبت مدبران سلطنت کی راتیں

جو راتیں اور خیالات محمدن کالج یا اس کے طلبہ اور اس کے بانی کی نسبت مدبران سلطنت نے وقتاً فوقتاً اپنی تحریروں یا تقریروں میں ظاہر کیے ہیں ان میں سے کچھ فقرے انتخاب کر کے ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

سرجان اسٹریچی

۱۸۸۰ء میں سرجان اسٹریچی نے اس ایڈریس کے جواب میں جو ہندوستان سے جاتے وقت ان کو کالج میں دیا گیا تھا کہا کہ ”سب سے بڑا اور اخیر کام جس میں انھوں نے یعنی سید احمد خاں نے اپنی زندگی اور اپنے تمام وسائل کو صرف کیا ہے یعنی اپنے ہم وطنوں کی تعلیم اور ان کی حالت کو ترقی دینے اور مسلمانوں اور گریزوں کے درمیان زیادہ تر اتحاد اور ہم روی پیدا کرنے کا وہ کام ہے جس کے بعض نتیجوں کو ہم مشاہدہ کر رہے ہیں مجھ کو کچھ شبہ نہیں کہ یہ نتیجے آئندہ زمانہ میں اور بھی زیادہ عجیب و غریب ہوں گے لیکن اب بھی میں اس کالج کی ترقی کو شمالی ہندوستان کی پچھلی توارینج کے نہایت عظیم اور دلچسپ واقعات میں سے تصور کرتا ہوں۔“

پھر صاحب ممدوح نے اپنی کتاب ”انڈیا“ میں اول ایجوکیشن کمیشن کی رپورٹ کا یہ فقرہ جو محمدن کالج کے متعلق ہے نقل کیا ہے کہ ”بعض

اقتدارات سے یہ کالج ہندوستان میں سب انسٹیٹیوشنوں سے اعلیٰ درجہ کا انسٹیٹیوشن ہے جو تعلیمی اور ملکی دونوں حیثیتوں سے بڑی عظمت اور وقعت کا وعدہ کرتا ہے۔ انگریزی حکومت کے آغاز سے لے کر اب تک مسلمانوں کی ذاتی کوشش کا یہ پہلا اظہار ہے۔ علیگر ٹھہ کی جماعت نے ایک مثال پیدا کی ہے جس کی اگر اچھی طرح سے پیروی کی جائے تو قومی تعلیم کا مسئلہ حل کر دے گی۔ ان لوگوں کی جنہوں نے ایسی دلسوزی سے محنت کی ہے اور اس بدرقہ کی جو سرکار کو تسلیم اور ترقی کے کام میں ملا ہے جہاں تک قدر و منزلت کی بات ہے نامناسب نہ ہوگی۔ اس کے بعد وہ اپنی کتاب "انڈیا" میں اہل انگلستان سے محمدن کالج کی سفارش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "انہیں (یعنی اہل انگلستان کو) اپنی مدد سید احمد خان کے کالج کے واسطے بھیجی چاہیے۔ ان کو اس سے زیادہ طہانیت بخش موقع نیک کرنے کا نہیں ملے گا۔"

ڈاکٹر بہتر

ڈاکٹر بہتر نے ۱۸۸۲ء میں جبکہ وہ ایجوکیشن کمیشن کے پریسیڈنٹ تھے اصلاح شمال مغرب کے دورہ کے وقت صرف محمدن کالج کی عظمت و شان کے لحاظ سے کمیشن کا پہلا اجلاس علیگر ٹھہ میں کیا اور اپنی اخیر اسپچ جو ایجوکیشن کے باب میں تھی وہ کالج کے بڑے اہل میں آکر کی اور کالج کی نسبت کہا تھا جو یہ کالج جس میں ہم جمع ہوئے ہیں، چونکہ یہ ایک نہایت عظیم اور شریف کوشش کا نتیجہ ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے کی گئی ہے اس کمیشن کا پہلا اجلاس جو اصلاح شمال مغرب میں ہونا چاہیے تھا علیگر ٹھہ میں تجویز ہوا ہے ہم امید کرتے ہیں کہ ہماری موجودگی اور اس مقام پر آنا اس سیلف ہیڈ

کی عظیم انسان مثال کی خوبی کا ایک ثبوت خیال کیا جائے گا۔ اگر ایسی ہی چند مثالیں سیلف ہیڈ پ کی اور ہوں تو ہندوستان میں ایجوکیشن کمیشن کی ضرورت نہ رہے گی۔ پھر کہا کہ ”یہ ایک نہایت شریف کام ہے جو کسی فانی انسان کے ہاتھوں سے دنیا کے پردہ پر ہوا ہو اور یہ میرے پاس موجود ہے وہ بہادر اور فیاض دل شخص جس نے میں پیرس کی پڑھ بیا اور پڑا استقلال کوششوں سے اس کام کو انجام دیا ہے“ پھر کہا کہ ”پہلے دس برسوں میں میرے دوست سید کو اکثر مایوسیوں کا منہ دیکھنا پڑا اور اس کے اختیار کیے ہوئے کام میں بہت کم ترقی ہوئی۔ اس کو اپنے بعض خیالات چھوڑ کر نئی تجویز میں اختیار کرنی پڑی اور لوگوں کی مخالفت اور ناراضی اور اپنے پرانے دوستوں کی سرد مہری اور جاہل دشمنوں کی پر ضرر شورش نہایت تحمل سے برداشت کرنی پڑی مگر اس نے ایک لمحہ کے واسطے ہمت نہ ہاری۔ رفتہ رفتہ مگر مضبوطی سے اس کے مقصد نے ترقی پائی۔ لوگوں نے اس پر اعتماد کیا کیونکہ وہ اپنے کام پر اعتماد رکھتا تھا۔“

سر ایفرڈ لائل

سر ایفرڈ لائل نے اس کالج کی نسبت کہا کہ ”اس نظیر کے قائم کرنے سے کالج کے بانیوں نے گورنمنٹ اور رعایا اور علی العموم ہندوستان کی تعلیم کے حق میں ایک عمدہ خدمت کی ہے۔ کیونکہ وہ ہم کو ایک ایسے مسئلہ کے حل کرنے میں مدد دے رہے ہیں جو اب تک شاید ہی دنیا کے کسی حصہ میں خاطر خواہ طور پر حل ہوا ہو۔“

مسٹر آکلنڈ کالون

مسٹر آکلنڈ کالون نے محمدن کالج کے طالب علموں کی نسبت کہا کہ جو شخص ان نوجوان آدمیوں سے واقف ہے جو اس کالج سے پاس ہو کر نکلے ہیں وہ غالباً اس امر میں مجھ سے اتفاق کریں گے کہ وہ اپنی تعلیم و تربیت کی علامتیں ایسی ہی صاف صاف ظاہر کرتے ہیں جیسی کہ انگلستان میں ہمارے پاک اسکولوں اور ہماری یونیورسٹی کے گریجویٹ ظاہر کرتے ہیں۔ علیگڑھ کالج کا طالب علم زیادہ خیالات اور ترقی یافتہ تعلیم و تربیت اور آزادانہ مصلحت رکھنے والا شخص خیال کیا جاتا ہے۔ سب سے بڑھ کر وہ ہندوستانیوں کے اس فرقہ کا ایک نمونہ ہو گیا ہے جو انگریزوں کی خواہش کی بخوبی داد دینے کے واسطے کوشش کرتا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی چاہتا ہے کہ ہم بھی ان کی خواہشوں کی اسی طرح داد دیں۔

مسٹر کین ممبر پارلیمنٹ

مسٹر کین جو پارلیمنٹ کے ایک نامور اور بڑی نوع کے خیر خواہ ممبر ہیں اور جو پچھلے برسوں میں شراب اور سکرات کے استعمال کے خلاف ہندوستان میں کچھ دینے اور اصلی حالات تحقیق کرنے کے لیے آئے تھے، انھوں نے سفر ہندوستان کے متعلق ایک کتاب موسوم بہ کچھ رسک انڈیا لکھی ہے جس کے ایک باب میں علیگڑھ کالج کی نسبت نہایت عمدہ اور مفصل خیالات ظاہر کیے ہیں ان میں سے ہم چند فقروں کا خلاصہ اس مقام پر نقل کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ "محمدن اینگلو اورینٹل کالج دوسرے کالجوں سے اس بات میں امتیاز رکھتا ہے کہ وہ ایک خاص تعلیمی جوش کی نسبت زیادہ تر ایک پریشک جوش

پھیلانے والا ہے۔ اسی فیدنگ کا یعنی اس بات کا کہ قومی بہبودی اسی اصول پر منحصر ہے جس کا وہ پابند ہے، یہ نتیجہ ہے کہ اُس کی بڑی امداد کی گئی ہے۔ نہ صرف مسلمانوں کا ترقی یافتہ گروہ بلکہ گورنمنٹ انگریزی بھی نہایت توجہ اور شوق سے اُس کی جانب نظر رکھتی ہے۔ دوسری جگہ وہ کہتے ہیں کہ "گورنمنٹ کالجوں سے یہ کالج دو خاص باتوں میں مختلف ہے۔ اول تو اس میں مسلمان طالب علموں کی مذہبی تعلیم کا بند و نسبت کیا گیا ہے۔ دن میں پانچ مرتبہ اذان کی آواز سن کر طالب علم اسی وسیع احاطہ کی تمام اطراف سے اپنے آبا و اجداد کے عقیدہ کے موافق عبارت کرنے کیلئے مسجد میں جمع ہو جاتے ہیں، نماز کے علاوہ قرآن اور دینیات اور اخلاق کی کتابوں کا پڑھنا کالج کے سلسلہ خواندگی کا ایک حصہ ہے۔ اس سے اس پر کی جاتی ہے کہ جو طالب علم اس کالج سے نکلیں گے وہ قدیم خیالات پر نئے علوم کا پیوند لگادیں گے اور اُس کے ذریعہ سے پُرانے خیالات کے لوگوں کو اس بات پر آمادہ کریں گے کہ وہ زمانہ کے ساتھ ساتھ چلیں اور جو طریقہ قوم کو اس کی ذیلی حالت سے نجات دینے کا موجود ہے اس کو اختیار کریں۔ دوسرا اصول جس میں یہ کالج سرکاری مدارس سے ممتاز ہے یہ ہے کہ اُس میں بنگلانہ سرکاری مدارس کے صرف عقلی تعلیم ہی پر توجہ نہیں کی جاتی، بلکہ وہ انگلت ان کی یونیورسٹیوں کے نمونہ پر قائم کیا گیا ہے۔ سب طالب علم ایک احاطہ میں رہتے ہیں، ایک جگہ کھانا کھاتے ہیں اور ایک صحت بخش کالج لائف سے خطا اٹھاتے ہیں کسی لاک میں ایک ایسے انسٹیٹوشن کا پایاجانا شکل ہے جو اس کالج کی یہ نسبت زیادہ تر زبردست جوش باہمی اتحاد کا پیدا کرتا ہو۔ قوم کی امیدیں اس انسٹیٹوشن کی کامیابی کے ساتھ وابستہ ہیں اور یہ ایک بڑی کوشش ہے جو ترقی اور اصلاح کے باب میں ایسی قوم نے کی ہے جس میں تقدیر پر بھروسہ کرنے کے عقیدہ نے تمام ہمتیں اور ارادے پست

کر رہے ہیں۔ پھر کرکٹ کلب کے منتقل کھتے ہیں کہ "کالج کی ایک ٹیم تمام اسپر
 انڈیا میں ہندوستانی ٹیموں سے گونے سبقت لیجاتی ہے اور اسپیشن کی نہایت
 عمدہ ایونوں کا مقابلہ کرتی ہے" پھر یونین کلب وغیرہ کی نسبت لکھتے ہیں۔
 کہ "ڈبلینگ سوسائٹی جو کیمبرج یونین کلب کے نوٹہ پرنٹام کی گئی ہے لڑکوں
 کو جلسہ عام میں گفتگو کرنے اور انگریزی طریقہ پر کاروبار انجام دینے کا سبق دیتی
 ہے۔ کالج کی دعوتوں اور جلسوں، مذہبی تہواروں، شاعرانہ صحبتوں، کرکٹ،
 فٹ بال اور جسمانی ورزشوں کے باعث نوجوان مسلمانوں کو اپنی زندگی کے
 مختلف طریقوں میں دل بہلانے کے لیے مدد ملتی ہے اور ان کی مختلف
 لیائٹیں ظاہر ہوتی ہیں۔ علموں اور طالب علموں میں کسی قسم کا تفرقہ جو قومی
 اختلاف سے پیدا ہوتا ہے مطلق نہیں ہے۔ علیگڑھ میں انگریزوں اور
 ہندوستانیوں کے درمیان جو صفائی قلب اور ملی جمل دیکھا جاتا ہے،
 ویسا شاذ و نادر ہی ہندوستان میں کہیں اور دیکھا جاتا ہے۔ اسپیشن کے انگریز
 جٹلمین اور لیڈریاں کالج کے طالب علموں کی پنج پر دعوت کرنے ہیں
 اور کالج کے ہال میں ان کے ساتھ دعوتوں میں شریک ہوتے ہیں۔ اس طرح
 پر محبت کی نیلنگ کی ایک ایسی بنیاد قائم کی گئی ہے کہ اگر اس کو ترقی ہو
 جائے تو وہ ہندوستان کے ہاٹ نہروں اور انگریزی حکومت دونوں کے
 حق میں بشارتوں کا باعث ہوگی ایسے موقعوں پر معزز بزرگ سید نے
 اکثر اوقات پُر جوش سرگرمی کے ساتھ اپنی یہ دل آرزو ظاہر کی ہے کہ انگریز
 اور مسلمان بچے دوست ہو جائیں اور ایک دوسرے کے اتفاق سے کام
 کیا کریں اور انھیں موقعوں پر اس نے کالج کے اس نشان کی طرف اشارہ
 کیا ہے جس میں بلال پر ایک صلیب لگی ہوئی ہے۔"

سر ایٹوئی مکڈائل

سر ایٹوئی مکڈائل نے برس ۱۹۱۹ء میں ٹرسٹیان کالج کی ایڈریس کا جواب دیا تھا اس میں انھوں نے کالج کا ذکر کرتے وقت فرمایا "ایک بڑے شاعر کا قول ہے کہ صلح کی فتوحات ٹرائی کی فتوحات کی نسبت کچھ کم نہیں ہیں۔ چنانچہ ہندوستان میں ہمارے عہد کی مصالحت آمیز فتوحات میں اس کالج کا قائم ہونا یقیناً ایک فتح ہے جس سے سب کے دلوں کو خوشی حاصل ہوتی ہے اور کسی کے دل کو تکلیف یا رنج نہیں پہنچتا، یہ ایک ایسی فتح ہے جس کی رونق روزِ زمانہ کی وجہ سے کم نہیں ہو سکتی" پھر فرمایا کہ "میں اس انسٹیٹیوشن کو نہایت عزت کے لائق سمجھتا ہوں جس طرح پر کہ میں کسی شخص کو پسند کرتا ہوں اس طرح پر میں اس ... انسٹیٹیوشن کو پسند کرتا ہوں جو آپ اپنے اوپر بھروسہ رکھتا ہو اور فخریہ طور پر آزاد ہوا ساسی کے ساتھ گورنمنٹ کی فیاضانہ مہربانی کی راہی طور پر قدر کرتا ہو" پھر اسپرچ کے خاتمہ پر یہ الفاظ کہے اس بات کی امید کرنا کچھ مبالغہ نہیں کہ یہ کالج ترقی پزیر آئندہ مسلمانوں کی بڑی درگاہ ہو جائیگا اور یہ مقام شرق کا قریب ہو جائیگا۔

لارڈ ایگلن نے نومبر ۱۹۱۶ء میں جبکہ سر حد پر سرکاری فوج آفریدیوں سے لڑ رہی تھی اور ہندوستان کے مسلمانوں کی نسبت اشیگوانڈ بن اخبارات حکمراں گروہ میں ہر گمانی پھیلا رہے تھے، محمدن کالج میں آنے کی خود خواہش ظاہر کی اور جو ایڈریس ٹرسٹیان کالج کی طرف سے ان کی خدمت میں پیش کی گئی اس کے جواب میں انھوں نے اس وقت جبکہ کالج کے تمام طالب علم اُنکے سامنے حاضر تھے یہ فرمایا "صاحب کوئی وقت ایسا نہیں ہے جبکہ اس قسم کا مجمع میری طبیعت کو اس قدر خوش معلوم ہو سکے جیسا کہ یہ معلوم ہوتا ہے پچھلے چند

ہسینوں میں اور اس وقت گورنمنٹ ہند بالکل اپنی خواہش کے برخلاف ان قوموں کے ساتھ جو تمہارے ہم مذہب ہیں۔ علانیہ لڑنے پر مجبور ہوتی ہے اور ایسے شخصوں کی کچھ کمی نہیں ہے جنہوں نے یہ بیان کیا ہے کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت اور اُس کی مسلمان رعایا کے درمیان مخالفت روز بروز ترقی ہے۔ صاحبان قابل امنوں ہنگاموں میں ہم بے پھرائی بات کو دیکھا ہے کہ جو ہم اکثر اوقات سابق میں دیکھ چکے ہیں۔ یعنی حضور مکہ معظمہ کی نسبت مسلمان رعایا کی خیر خواہی اور بہادری کو اور میں اس جگہ پر ایک زیادہ تر پر امن موقع پر اس بات کو تسلیم کرنے اور معلوم ہونے سے خوش ہوں کہ اس کالج کے اندر پر امن صورتوں میں خیر خواہی اور دفاعی کا وہی جوش ترقی پر بے جیسا کہ میدان جنگ میں ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے عمدہ خیالات مدبران سلطنت انگلیش اس کالج کی موجودہ حالت دیکھ کر وقتاً فوقتاً ظاہر کرتے رہتے ہیں اور کچھ شبہ نہیں کہ ایک تعلیمی انسٹیٹیوشن کی مددگی پر ان لوگوں کی شہادت سے بہتر کسی کی شہادت نہیں ہو سکتی۔

یہ ہے سید احمد خاں کی زندگی کا وہ کارنامہ جس کی اگرچہ مسلمانوں نے عام طور پر اب تک کچھ قدر نہیں کی لیکن یورپ کے نامور اخبار ناموراوت لندن نے گذشتہ اپریل میں اسی کارنامہ پر سرسید کی نسبت لکھا تھا کہ "اس شخص کو ہندوستان کے مسلمانوں کے حق میں تعلیم کا پروفٹ کہا جائے تو سچا ہے" اگرچہ اس عظیم الشان کام کی اہمیت دینی شکلات اُس مرحوم کی جانفشانی اور استقلال سے تشریحاً بالکل مل رہی ہے، مذہبی مخالفتوں اور بدگمانیوں کا طوفان فرد ہو گیا ہے، کالج کی سالانہ آمدنی اور خرچ کی نسبت پون لاکھ کے

قریب پہنچ گئی ہے۔ عمارتیں جس اعلیٰ اور وسیع پیمانے پر بنانی منظور تھیں گویا بھی ان کی تکمیل نہیں ہوئی مگر قوم کی تھوڑی سی توجہ سے پوری ہو سکتی ہے یورپین اور میٹرو اسٹاٹ توقع سے زیادہ عمدہ اور قابل اطمینان بہم پہنچ گیا ہے۔

یونیورسٹی کے نتائج امتحان کالج اور اسکول کی وقعت اور اعتبار لوگوں کی نظر میں روز بروز زیادہ کرتے جاتے ہیں، یورڈنگ ہاؤس ایک بے نظیر نمونہ پر جیسا کہ کبھی ہندوستان میں نہیں دیکھا گیا تھا طلبہ کی تربیت کے لیے قائم ہو گیا ہے مذہبی تعلیم و تربیت کا سامان بھی جہاں تک کہ منتظران کالج کی قدرت میں تھا مہیا کیا گیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ گورنمنٹ نے اس کی طرف خاص توجہ مبذول فرمائی ہے، مگر درحقیقت اس کا تھا تا اس کی اصلاح کرنا اور اس کو ترقی دینا قوم کا اور صرف قوم ہی کا کام ہے، اگرچہ سرسید کی زندگی میں تو لوگ قوم کی طرف سے بالکل مایوس تھے اور سمجھتے تھے کہ اعلیٰ انھیں بند ہوتے ہی کالج کی حالت دگرگوں ہو جائے گی مگر خدا کا شکر ہے کہ سرسید کے بعد مسلمانوں نے بالکل غلات توقع اور غلات امید کالج کی طرف توجہ ظاہر کی ہے کہ بقول ایک نظریہ کے اگر سرسید کو یہ خبر ہوتی کہ میرے بعد لوگ ایسی سرگرمی ظاہر کریں گے تو وہ بن آئی موت فرماتے۔

ترقی تعلیم کی دیگر تدبیریں

سرسید نے ترقی تعلیم کی غرض سے صرف محمدن کالج قائم کرنے اور اس میں تعلیم و تربیت کا سامان کا مہیا کرنے ہی پر قناعت نہیں کی بلکہ یونیورسٹی کے طریقہ تعلیم کی اصلاح اور ہائی ایجوکیشن کی ضرورت پر وہ اخیر دم تک اپنی تحریروں اور اسپچوں میں براہِ زور دیتے رہے۔ ہندوستان کی یونیورسٹیوں

کے نظام تعلیم کو وہ ہمیشہ ہندوستان کے حق میں غیر منفید خیال کرتے تھے اور جب سے لاکس میں یہ خیال پھیل گیا تھا کہ گورنمنٹ ہائی ایجوکیشن سوسائٹی کرنا چاہتی ہے ان کو سخت اندیشہ ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کے لیے جو مہم کر تعلیم کے وسائل مہیا کیے گئے ہیں، کہیں یہ تمام کوششیں برباد نہ ہو جائیں اور سرحد اتنے ہی اوسے نہ پڑ جائیں، اس لیے وہ ہمیشہ یونیورسٹیوں کے نظام پر نکتہ چینی کرتے تھے اور جب کبھی ان کو گورنمنٹ کے تیسرے ہائی ایجوکیشن کے برخلاف معلوم ہوئے انھوں نے فوراً اس کی حمایت پر قلم اٹھایا اور نہایت دلبری اور بے باکی سے اس پالیسی کی تغلیط کی، ۱۸۸۳ء میں انھوں نے ایجوکیشن میں شہادت دیتے وقت یونیورسٹی کے قواعد پر خوب دل کھول کر اعتراض کیے اس کے سوا ہمیشہ بدلیجہ تھری اور تقریر کے یونیورسٹی کے نقص اور مستقیم ظاہر کرتے رہے۔

ہائی ایجوکیشن کی حمایت

ہائی ایجوکیشن کے متعلق انھوں نے نیشن کو آگاہ کیا کہ لوگوں میں عمومی خیال پھیل گیا ہے کہ گورنمنٹ ہائی ایجوکیشن بند کرنا چاہتی ہے پس اگر گورنمنٹ کوئی کالج توڑے گی خواہ اس کے توڑنے کی کیسی ہی معقول وجوہات ہوں لوگ یہی سمجھیں گے کہ سرکار ہم کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم سے محروم رکھنا چاہتی ہے۔

پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت

اس سے پہلے ۱۸۸۱ء میں جس شد و مد کے ساتھ انھوں نے اسی بنا پر پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت کی تھی وہ اکثر لوگوں کو یاد ہوگی، اس مخالفت کی بنیاد

یہ تھی کہ اول لارڈ لٹن نے پنجاب کے بعض مقامات میں جو اسپیس میں کیں ان سے مشرقی علوم کی ترقی و تشریح کی بوجہ تھی۔ اس کے بعد جو ایڈریس اہل پنجاب نے لارڈ رین کی حضور میں گزارنے اور جو جواب حضور ممدوح نے ان پر دیے ان سے یہ احتمال قوی ہو گیا کہ اگر پنجاب یونیورسٹی کالج کو یونیورسٹی کے اختیارات مل گئے تو پنجاب میں ہائی ایجوکیشن کا نام و نشان باقی نہ رہے گا۔ چنانچہ ہذا کلسنس کے جواب میں یہ الفاظ موجود تھے کہ "ترقی و اشاعت زبانہائے مشرق و علوم مشرقی نہایت ہی کارآمد ہے۔ اور جہاں سیری محدود واقفیت معاملات ہندوستان میں ہے۔ میں ان خیالات سے اتفاق رکھتا ہوں جو میرے نزدیک آپ لوگ رکھتے ہیں کہ اس ملک میں صرف زبانہائے دیسی کے توسل سے علوم و فنون کی ترقی و اشاعت بہترین ہو سکتی ہے۔" اور جس ایڈریس کے جواب میں ہذا کلسنس نے یہ ارشاد فرمایا تھا اس میں صاف لکھا تھا کہ "ساتھ سے تین لاکھ روپیہ جو سرمایہ یونیورسٹی کالج ہے والیان ریاست ہاؤس اور دیگر روسائے پنجاب نے دراصل زبانہائے دیسی کی تکمیل سے تعلیم کو رواج دینے کی غرض سے عطا کیا تھا۔ سینٹ کو اس بارہ میں کچھ بھی شک نہیں کہ علم کو زبانہائے دیسی کے توسل سے ترقی دینا تقسیم کی ضروریات کو ملک کے حال بنانے کا بہترین طریقہ ہے اور سینٹ اور گورنمنٹ ہند کا بھی یہی مقصد ہے۔"

جب یہ ایڈریس اور اس کا جواب شایع ہوا اور سرسید کی نظر سے گذرا تو ان کی آنکھوں میں اندھیرا آ گیا اور جیسا کہ ان کی طرز تحریر سے پایا جاتا ہے عنانِ صبر ان کے ہاتھ سے جاتی رہی انہوں نے حد سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ پلے درپلے تین آرٹیکل پنجاب یونیورسٹی کے خلاف

لکھ کر شائع کیے جن کا تمام پنجاب میں نکل پڑ گیا۔ تعلیم یافتہ گروہ نے جن میں زیادہ تر ہندو ایجوکٹڈ شامل تھے تینوں آرٹیکلوں کو ایک جگہ جمع کر کے چھپوا دیا اور تمام پنجاب میں ان کو عام طور پر شائع کر دیا جس سے پنجاب یونیورسٹی کے اکثر حامیوں کی رائیں بدل گئیں اور ڈاکٹر لائسنز جو مشرقی علوم اور ویسی زبانوں کے نہایت سرگرم حامی تھے اور پنجاب یونیورسٹی کو گویا درخشاں یا اونٹیل یونیورسٹی بنانا چاہتے تھے انھوں نے سرسید کے آرٹیکلوں کا انگریزی اور اردو دونوں ہی زبانوں میں جواب لکھ کر شہر کیا مگر اس عربی مثل کے موافق "قَدْ سَبَقَ الشَّيْفُ الْعَدْلُ" سرسید کی تحریریں اپنا کام کر چکی تھیں اور اس لیے اب ان کا جواب لکھنا اور ان کی تردید چھاپنا سب سے سو دھھی، اگرچہ یہ تینوں آرٹیکل بہت جلدے ہیں اور یہاں ان کے نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے لیکن چونکہ یہ بھی سرسید کی ملکی خدمات میں سے ایک خدمت ہے اور اس کی وقعت کا اندازہ بغیر اس کے نہیں ہو سکتا کہ ان تحریروں میں سے کچھ فقرے بطور نمونہ کے ناظرین کو دکھائے جائیں اس لیے ہم تینوں آرٹیکلوں میں سے بعض بعض تفادات اس موقع پر نقل کرتے ہیں:

پہلے آرٹیکل کو جس کا عنوان "مشرقى علوم و فنون" ہے وہ اس طرح شروع کرتے ہیں "ہم کو نہایت ہرشیاری سے دیکھنا چاہیے کہ جو کچھ کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ہمارے اور ہمارے ملک کی بہبودی اور ترقی کے لیے ہے، ایسا نہ ہو کہ صرف دھوکا ہو، ہم کو اس وقت پچھلے زمانہ کے قصے اور کہانیوں کو یاد دلانا اور کہنا کہ ایشیا میں ایشیائی سلطنت کے زمانہ میں علوم و فنون کیا تھے اور ان

لے بین تواریخ چل پئی اب علامت بے فائدہ ہے

کے وقت میں ان کو کیسی ترقی اور کیسی سرسبزی تھی محض سببہ فائدہ ہے۔ ہم کو اپنے زمانہ کے حالات پر جو گورنمنٹ انگریزوں کی حکومت کا زمانہ ہے، غور کرنا اور اس کو ہندوستان ہی کی حدود میں محدود رکھنا ہمارے لیے زیادہ مفید اور زیادہ نریکار آمد ہے۔“

اس کے بعد انہوں نے وہ مختلف طریقے جو ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستانیوں کی تعلیم کے متعلق ابتدائے عملداری سے اختیار کرتی رہی (یعنی اول ہندوستانیوں کی تعلیم کے فرض سے غافل رہنا، پھر ان میں علوم مشرقی کے رواج دینے میں کوشش کرنا اور آخر کار لارڈ سکاٹ کے اصرار سے اہل ہند کو یورپ کے علم و حکمت کی تعلیم دینا) بیان کیے ہیں پھر انہوں نے دینیات کو مستثنیٰ کرنے کے بعد مشرقی علوم اور مشرقی لٹریچر کی جس کو پنجاب یونیورسٹی از سر نو زندہ کرنا چاہتی تھی، خوب قلعی کھولی ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ”ہم صاف صاف کہنا چاہتے ہیں کہ ہم کو مشرقی علوم کی ترقی کے پھندے میں پھنسانا ہندوستانیوں کے ساتھ نیکی کرنا نہیں ہے بلکہ دھوکے میں ڈالنا ہے۔ ہم لارڈ سکاٹ کو دوسرا دیتے ہیں کہ خدا اس کو بہشت نصیب کرے کہ اس نے اس دھوکے کی ٹٹی کو اٹھا دیا تھا، کیا وہ ٹٹی ہماری آنکھوں کے سامنے پھر لگائی جاتی ہے؛ ایڈریس کے ساتھ جو لارڈ پین کو دیا گیا تھا، بڑے بڑے ہندوستانی سرداروں کا ہونا اور بہت بڑی فیاضی سے بڑے بڑے چنندوں کا دیدینا مثل اسی فیاضی کے ہے جو ہمیشہ وہ اصلی مقصد سے نادانق رہ کر دیگر اسباب سے کیا کرتے ہیں۔ ان کی شان و شوکت ایسے امر کی جو فی الحقیقہ کچھ وقت نہیں رکھتا، وقت نہیں ٹرہا سکتی، چند تا عاقبت اندیش ہندوستانی شاید ان ہاتھوں سے خوش ہوتے ہوں گے اور گورنمنٹ کا احسان مانتے ہوں گے، مگر دور اندیش آدمی

ان تمام باتوں سے نہایت رنجیدہ ہوتے ہیں اور نہایت افسوس واپوس سے گورنمنٹ کی اور ان یورپین اعلیٰ درجہ کے حکام کی کارروائی کو جو اس میں شریک بن گئے ہیں ہم نہایت سچائی سے اور گورنمنٹ کی دلی خیر خواہی سے بتانا چاہتے ہیں کہ بھدار اور دو لاندیش ہندوستانی ان تمام کارروائیوں سے گورنمنٹ کی نسبت کیا خیال رکھتے ہیں، نہایت بد خیال ان کے دل پیدا ہوتا ہے۔ چند سال گذرے (یعنی یونیورسٹیاں قائم ہونے سے پہلے جبکہ مشرقی علوم کی تعلیم پر زور دیا جاتا تھا) کہ ان کو یقین کامل تھا کہ گورنمنٹ کو درحقیقت ہم کو واقعی تسلیم دینا منظور نہیں ہے اور وہ ہم کو اسی قدر تعلیم دینا چاہتی ہے جس قدر کہ اس کو ضرورت ہے۔ وہ ہم کو ایسا مرکب بنانا چاہتی ہے کہ اسباب لاو کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دے۔ اس کو انتظام ملک اور انتظام دفتر کے لیے چند ایسی تپدیاں درکار ہیں جو انگریزی لکھ سکتی ہوں مگر سمجھ نہ سکتی ہوں جیسے کہ ماسخپٹر میں سونے کا تانے کے لیے تپلیوں کی ضرورت ہے۔ جو کچھ کہ وہ یعنی گورنمنٹ، ہندوستان میں تعلیم کی نسبت کرتی تھی کوئی اس کا شکر گزار نہ تھا اس لیے کہ اس کو خود غرضی پر محمول کیا جاتا تھا۔ رعایا پروری پر

”کچھ بہت عرصہ نہیں گذرا یعنی جب کہ ہندوستان میں کلکتہ بمبئی اور مدارس یونیورسٹیاں قائم ہو گئیں، کہ ہندوستانیوں میں سے یہ خیال دور ہوا تھا اور ہندوستانی یہ یقین کرتے تھے کہ گورنمنٹ نے اپنی پالیسی بدل دی ہے اور درحقیقت اسکو اعلیٰ درجہ کی تعلیم دینا اور ہندوستانیوں کو انھیں کے فائدہ کیلئے تعلیم دینا مقصود ہے۔ مگر ہندوستانی خوب سمجھتے ہیں کہ تھوڑے دنوں سے بعض مدبران سلطنت کی پالیسی پھر بدلی ہے اور ہندوستانیوں کو اب اعلیٰ درجہ کی حقیقی تعلیم دینا وہ مناسب نہیں سمجھتی۔ ان کو (یعنی ہندوستانیوں کو) اب تک یقین

نہیں ہے کہ یہ پالیسی درحقیقت مستحکم ہو گئی ہے اور اس پر عمل کرنا فی الواقع
 قرار پا چکا ہے۔ مگر ایسے واقعات جو پیش آتے جاتے ہیں، جیسے کہ حضور
 عالی لارڈ لٹن کے وقت میں انڈین سول سروس کے قواعد قرار پانے اور جیسے
 کہ جناب ممدوح نے بعض اسپچوں میں علوم مشرقی کی ترقی کی ترغیب
 دی، یا جیسے کہ یہ حال میں واقعہ پنجاب یونیورسٹی کالج کو کامل یونیورسٹی بنانے
 کی درخواست کے وقت پیش آیا، دوسرا اندیشہ ہندوستانیوں کو نہایت
 تردد میں ڈالتا ہے اور وہ خوف زدہ ہو کر خیال کرتے ہیں کہ شاید وہ پالیسی
 مستحکم ہو گئی ہے اور وہی دھوکے کی ٹٹی پھر ہماری آنکھوں کے سامنے کھڑی
 کیجاتی ہے جس کو ہمارے محسن لارڈ مکالے نے اپنی نہایت سچی تحریروں
 اور زبردست باتوں سے اٹھایا تھا۔ ہم نے کوئی مجلس لائق ہندوستانیوں
 کی ایسی نہیں پائی جس میں ان خیالات کی رود بروز ترقی نہ ہوتی ہو۔ ہمارا
 ولی مقصد ہے کہ ہم اصلی حال ان ہندوستانیوں کی فیلنگ کا جن کی فیلنگ
 درحقیقت قدر و غور کے لائق ہے گورنمنٹ سے مخفی نہ رکھیں اور اس
 میں کوشش کریں کہ گورنمنٹ ایسی جماعت کی باتوں سے جن کے ظاہری
 بدن زدہ و جاہر سے جگمگاتے ہیں اور جن کے تمام کام درحقیقت و بیگر
 اسباب پر مبنی ہیں، نہ واقعی واقعات پر، دھوکے میں نہ آوے۔

دوسرے آرٹیکل میں جس کا عنوان "ریٹیکل یعنی ہماری زبان" ہے۔
 انہوں نے اول ان مشکلات کو بیان کیا ہے جو مغربی علوم کو ویسی زبانوں
 میں ترجمہ کر کے شایع کرنے میں پیش آتی رہیں اور ایٹ انڈیا کمپنی

۱۲ چنگہ انڈین سول سروس کے قواعد میں ایسے علموں کے لیے کسی یونیورسٹی کی ڈگری کی شرط نہیں تھی ایسے یہ
 نیپل پورہ ہا کر گورنمنٹ ہائی ایجوکیشن کو موافقت کرنا چاہتی ۱۲

کا کلکتہ میں ایک سوسائٹی کتابوں کا ترجمہ کرنے کے لیے قائم کرنا، پھر دہلی کالج میں بہت سی کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہونا اور پھر اسی مقصد کے لیے سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ کا قائم ہونا اور نینوں جگہ ناکامی کے سوا کوئی نتیجہ حاصل نہ ہونا نہایت عمدگی سے ظاہر کیا ہے۔ اس کے بعد وہ لکھنے ہیں کہ "جب غیر قوم یعنی مسلمانوں نے ہندوستان کو فتح کیا تو یہاں کے باشندوں میں سے وہی لوگ برسرِ عرصہ اور حکومت میں شریک ہوئے جنہوں نے اُن کے علوم، اُن کی زبان، اُن کے خیالات، اُن کا سامان، ان کا سائب و لہجہ اور اُن کی سبب روش اختیار کی۔ ہندوستان میں اس خیال کا پیداکرنا کہ ہم مشرقی علوم، ویسی زبان اور ویسی علوم کو ترقی دے کر عزت و دولت و حشمت و حکومت حاصل کریں گے بعینہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی امریکا کے اصل باشندوں کو خیال دلاوے کہ تم اپنی ویسی زبان اور ویسی علوم میں ترقی کر کے اپنی حکمران قوم میں عزت و دولت و حشمت و حکومت حاصل کرو گے۔"

"قومیں ترقی اور حکومت دونوں ماں جانی بہنیں ہیں۔ پس جب کسی قوم میں حکومت نہ رہے تو اُس کی ترقی صرف اس بات پر منحصر ہے کہ وہ اپنی فتح مند قوم کے علوم و زبان حاصل کرنے سے اپنے فتنہدوں کے ساتھ ملکی حکومت میں حصہ لے۔ علوم کی اُن شاخوں میں اعلیٰ درجہ کی لیانت حاصل کرے جن میں اُن فتنہدوں نے کاملیت حاصل کی ہے۔ سوشل عادات اور علمی و عملی و ملکی خیالات اُس قسم کے پیدا کرے جو فاتح و مفتوح میں کسی درجہ تک مناسبت پیدا کریں۔ جب تک فاتح و مفتوح میں اس قسم کی مناسبت پیدا نہ ہو اُس وقت تک باہمی دوستی کا بڑا ڈھالہ سے ہے اسی مناسبت کے نہ ہونے سے آج تک ہندوستان میں فاتح و مفتوح کے باہم درشنانہ

بڑناؤ نہیں ہے۔ خوشامد کی باتیں جو کوئی چاہے سو کر لے اور پورے شکل طریقہ میں جو کچھ بیان کرنا ہو کیا جائے مگر ہندوستانیوں کا حال اپنی فحتمند قوم کے ساتھ غلامی کی حالت سے کچھ زیادہ نہیں ہے۔ ہم اس کا الزام اپنی فحتمند قوم کے ذمہ نہیں دھرتے بلکہ خود اپنی قوم کے ذمہ ڈالتے ہیں کہ اُس نے خود اپنے تمہیں اس لائق نہیں بنایا کہ ہماری فحتمند قوم ہم سے ودستانہ بڑناؤ کر سکے پھر علوم مشرقی کی ترقی اور تھوٹی سوٹی ترجمہ کی ہوئی کتابیں ہم کو کیا نتیجہ دیں گی! اور ہم کو کونسی عزت و دولت و حثمت و حکومت بخشیں گی! یونیورسٹی کالج لاہور نے اب تک ہم کو کس نتیجہ پر پہنچایا ہے جو آئندہ پوری یونیورسٹی بڑ کر اور مردہ علوم مشرقی کو زندہ کر کے اور ہماری سیرانی شائستگی کو بچھڑا پیدا کر کے ہم کو پہنچانے گا۔ کچھ شبہ نہیں کہ یونیورسٹی کالج اب بھی ہماری ترقیوں کا سدراہ رہا ہے اور جب وہ یونیورسٹی ہو جائے گا اور ضرور ہو جائے گا تو ملک کے لیے، قوم کے لیے، ملکی اور قومی ترقی کے لیے آنت عظیم ہو گا ہم پر احسان رکھ کر ہم کو دھوکے میں ڈالا جاتا ہے کہ ہم تمہارے مشرقی علوم و تمہاری مشرقی زبان کو ترقی دیتے ہیں، مگر ہم پوچھتے ہیں کہ کیوں اور کس مطلب سے! اس کا جواب کسی پیرا یہ میں اور کیسے ہی بیٹھے لفظوں میں دیا جائے۔

اس کا نتیجہ یہی ہے کہ غلامی کی حالت میں رکھنے کے لیے :-
 "گورنمنٹ نے ہمارے لیے سول سروس میں داخل ہونے کا رسنڈ
 گو اس میں کیسی ہی شکلات پڑگئی ہوں، ابھی تک کھلا رکھا ہے۔ بیرٹری
 کی سند ڈاکٹری کا ڈپلومہ اور انجینیری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے
 لیے کوئی امر ہم کو مزاحم نہیں ہے۔ ہندوستان میں انڈین سول سروس کے
 عہدے کو جس میں ہماری بدبختی سے ابھی تک چنداں قابلیت کی ضرورت

نہیں سمجھی گئی ہے۔ جانے دو۔ مگر ہانی کورٹ کی ججی حاصل کرنے سے ہماری امیدیں ابھی منقطع نہیں ہوئی ہیں۔ چند دستاویزوں کا کونسل قانونی میں داخل ہونا ابھی تک بند نہیں ہوا ہے۔ ہم کو سمجھنا چاہیے کہ ان حقوق کے واجبی طور سے حاصل کرنے کے لیے ہم کو کیا کرنا ہے؛ کیا مشرقی مردہ علوم کو زندہ کرنے والی یونیورسٹی؛ کیا ہماری پُرانی شائستگی کو پھر ہمارے لیے مہیا کرنے والی تجویز؛ معمری بھدے بھی، جیسے دکالت و منصفی و سب ججی ہے؛ بغیر انگریزی زبان کی کافی بیاقت کے ہم کو بے سر نہیں آسکتے، پھر کیا مردہ علوم مشرقی کے زندہ ہونے اور ہماری مشرقی زبانوں کو ترقی سے ہم کو کچھ نتیجہ مل سکتا ہے؛ یونیورسٹی کالج لاہور۔ جو پوری یونیورسٹی ہونے والا ہے۔ بجز اس کے کہ ہم کو سیدھی راہ چلنے سے روکے، ہم کو ہمارے حقوق سے محروم رکھے اور ہم کو اس لائق نہ ہونے دے کہ ہم اپنے حقوق کا دعویٰ کر سکیں۔ ہمارے حق میں اور کیا کر سکتا ہے؛

ہم کو ایسا لائق ہونا چاہیے کہ ہم دور دراز اور مختلف ملکوں کے سفر کرنے کے قابل ہوں ہم بساطی کی سی دوکانداری سے نکلیں۔ ہم اپنی اور اپنے ملک کی تجارت کو ترقی دیں، ہماری تجارت کی ”مہڈن اینڈ ہندو کمپنی“ کے نام سے کوٹھیاں لندن میں ایڈنبرا میں، بروسلز میں، سینٹ پیٹرسبرگ میں برلن میں، وائٹا میں قسطنطنیہ میں، پکین میں، واشنگٹن میں اور دنیا کے تمام حصوں میں قائم ہوں اور ہم بحری و بری سفر اسی طرح خوشی سے کریں جیسے کہ اور تو میں کرتی ہیں جس سے ہم کو عزت و دولت، حشمت اور حکومت میں شرکت حاصل ہو۔ پھر کیا ہمارے مردہ مشرقی علوم کا زندہ ہونا اور مشرقی زبانوں کا ترقی دینا اور ہماری پُرانی شائستگی کو پھر قائم کرنا ہم کو اس قابل بنا دے گا؛ ہرگز نہیں۔ پس ہم کو علوم مشرقی

کے زندہ کرنے اور مشرقی زبانوں کے ترقی دینے کے جال ہیں پھنسانا صاف ایسی تدبیریں کرنا ہے کہ جہاں تک ہو سکے ہم کو ہماری ترقیاتیات حاصل کرنے سے روکا جائے جو لوگ دوراندریش ہیں وہ کبھی ایسی ہالسی کو پسند نہ کریں گے اور اس میں ہندوستان کی فلاح نہ تصور کریں گے۔ بلکہ اپنے حق میں ہندوستان کے حق میں اور گورنمنٹ کے حق میں شدید مسخر بھگیں گے۔

اس کے بعد ان اسباب کی طرف جن سے یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ گورنمنٹ ہائی اکیڈمی موقوف کرنا چاہتی ہے۔ اشارہ کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ”ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یونیورسٹی کی تعلیم نے بعض تعلیم یافتہ لوگوں کو زیادہ دلیر کر دیا ہے اور انہوں نے نہایت سخت اور بعض اوقات نہایت بیجا اور ناوایب اور نامنصفانہ نکتہ چینی گورنمنٹ پر کیا ہے، مگر ہم دل سے یقین رکھتے ہیں اور گورنمنٹ کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ وہی تعلیم یافتہ نکتہ چینی جس قدر گورنمنٹ انگریزی کے قدر دان ہیں شاید کوئی دوسرا نہ ہوگا۔ پس نکتہ چینی کے اندیشہ سے ہماری تعلیم کو برباد کرنا ہمارے حق میں کچھ انصاف نہیں ہے۔ ہم کو بائخ العلوم اور مالک العلوم کے خطاب دینا اور پھر بائخ کے سب سے پر رکھنا ہم کبھی پسند نہیں کر سکتے۔“

وہ ہمارے لیے سپہ ہارستہ کھلا ہوا ہے کہ جہاں تک ہم سے ہو سکے یورپین لٹریچر اور یورپین سائنس میں اعلیٰ درجہ کی ترقی کریں، جہاں تک ہم کو یونیورسٹی کے سچے خطاب حاصل ہو سکتے ہیں حاصل کریں، جب اس سے بھی زیادہ ہم میں جہت ہو آکسفورڈ و کمبریج کی یونیورسٹیوں میں تعلیم کو جائیں، اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی ڈگریاں حاصل کرنے میں کوشش کریں، اپنے تئیں مہذب و تعلیم یافتہ بنائیں اس کے اصلی و حقیقی معنوں میں بنائیں

اور جو فیضِ تعلیم و تربیت و تہذیب ہم نے ان مہذب ملکوں میں حاصل کیا
ہو اس کو اپنے جموطنوں اور ہم قوموں میں پھیلا دیں بے شک ہم کو ایسا کرنے
میں بہت مشکلات ہیں، ادھر ہم کو اپنی قوم کی جنالت و تعصب سے مقابلہ
کرنا ہے اور ادھر اپنی فخریہ قوم کے ان تنگدل لوگوں کی مزاحمت کا برداشت
کرنا ہے جو ہماری موٹیل اور پوکھل حالت کی ترقی اپنی طبعی تنگدلی کے برخلاف
سمجھتے ہیں، ہماری انگلیش لائف، انگلیش تمدن جنٹلمین کیسے اخلاق، یہاں تک
کہ ہمارے تغیر لباس سے بھی وہ ایسے ناراض ہوتے ہیں اور چشم چشم آلود
سے ہم کو دیکھتے ہیں جیسے کوئی نہایت نیک دل بڑے مجرم کو دیکھتا ہو۔ مگر ہم
کو اپنی اور اپنی قوم کی بھلائی پر نظر رکھنی چاہیے اور جو تکالیف اور مشکلات
ہم کو پیش آئیں نہایت تحمل اور سچتہ مزاجی سے برداشت کرنی چاہئیں، مگر ہم
اس بات کو محض رکھنا نہیں چاہتے کہ گریٹ ریپارمر (یعنی زنانہ) ان بانوں کو
ضرب ہونے دیگا اور کوئی مزاحمت اور کوئی ناخوشی و خفاگی اس کو روک نہیں
سکے گی لیکن بے شک یہ تنگدل کے خیالات ناراضی کو ترقی دینے والے اور
فاتح و مفتوح ہیں ہمدردی و محبت کو توڑنے والے ہیں۔

یہ دو آرٹیکل جن سے مفہوم ہوتا تھا کہ سرسید نے خاکہ پنجاب یونیورسٹی
پر حملہ کیا ہے جب یونیورسٹی کے مایوں کو شاق گذرے اور ان کے برخلاف
پنجاب سے بعض مضامین شائع ہوئے تو سرسید نے ایک تیسرا آرٹیکل جس
کا عنوان "ہمدی زبان اور ہماری اعلیٰ درجہ کی تعلیم" تھا اور لکھا جس سے
صرف یہ جتنا مقصود تھا کہ درحقیقت ہمارا مدنے سخن پنجاب یونیورسٹی کی طرف
نہیں بلکہ گورنمنٹ کی پالیسی کی طرف تھا جس سے خوف تھا کہ رفتہ رفتہ تمام
ہندوستان کی یونیورسٹیاں بھی اصول نہ اختیار کر لیں، اس آرٹیکل کو انھوں

نے اس طرح شروع کیا ہے ”ہمارے دو اڑھنکوں نے ہمارے پنجاب کے
دوستوں کو گھبرا دیا ہے بلکہ کسی قدر رنجیدہ کر دیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان
اڑھنکوں سے ہم کو بااختصاص یونیورسٹی پر حملہ کرنا مقصود ہے اور اپنے حسن ظن
سے اس کی بنیاد حسد پر قائم کی ہے۔ ہم کو افسوس ہے اگر یہ کمینہ نخصلت
ہم میں ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کالج جس کے اصول سے بلاشبہ ہم مختلف
الراے ہیں اگر وہ یونیورسٹی ہو جائے تو ملک کو ایسے اور وسیع ملک کو جس
میں تین اور یونیورسٹیاں موجود ہوں کوئی معتد بہ نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اگر وہ
صحیح اصول پر قائم ہوتی ہے اور اس سے ملک کو بخلات ہماری رائے کے فائدہ پہنچنے
والا ہے تو چشم مارٹن۔ ہماری مین خوشی ہے کہ ملک کو فائدہ پہنچے اور ہماری رائے
غلط ثابت ہو۔ اور اگر وہ فی الحقیقت ملک کو فائدہ پہنچانے والی نہیں ہے تو اس
کو ہرنے دو اس سے مخالفت کرتے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ خود اس
میں ناکامی کا بیج ہے اور وہ آپ ہی ناکام ہو جائے گی۔“

اس کے بعد مشرقی علوم اور مشرقی لٹریچر کی تعلیم کے نتائج کی طرف
اشارہ کر کے لکھتے ہیں کہ ”بنارس کالج نے سنسکرت زبان کی ترقی پر بہت توجہ
کی مگر وہ ایک کوجھی سنسکرت میں ان پندتوں کے برابر نہیں بنا سکا جو دھرتی
باندھے کمرے پنے سنسکرت اور شیوا لہ کھاٹ کی بیڑھیوں پر بیٹھ کر اپنی مقدس
زبان سنسکرت کو تحصیل کرتے ہیں۔ مگر ان کی تحصیل سے ملک کو بجز اس
کے کہ بنارس میں دس پانچ سنگاپنڈت اور زیادہ ہو گئے۔ کیا نتیجہ حاصل ہوا؟
یونیورسٹی کالج لاہور نے بلخ و بدخشاں کے طالب علموں کو جو کچھ تعلیم دی

لے جو آریکل سرسید کے خلات لاہور سے نکلے تھے ان میں لکھا تھا کہ پنجاب یونیورسٹی کالج

میں بلخ و بدخشاں کے طالب علم تعلیم پاتے ہیں۔

ہو۔ ہم کو اس کا حال معلوم نہیں۔ مگر آج تک (ہندوستان میں) اُس نے ایک کو بھی عربی یا فارسی میں اُن لوگوں کے برابر نہیں بنایا جنہوں نے مسجد کے چوپڑوں اور خانقاہ کے تنگ و تاریک حجروں میں بیٹھ کر اور درود فاتحہ کی ردھی پیر گذران کر عربی و فارسی کو تحصیل کیا اور اعلیٰ درجہ کا تہجران میں پیدا کیا۔ مگر اس کا نتیجہ بجز اس کے کہ سردوں کی روشیاں کھانے والے اور زیادہ ہو گئے ملک کو کیا فائدہ پہنچا؛ اگر پنجاب یونیورسٹی قائم ہو جائے اور ہم کو علوم مشرقی میں ویسی ہی تعلیم دے (گو ویسی تعلیم بھی ممکن نہیں) تو بجز اس کے کہ چند بھکاری اور چند فاتحہ کی ردھی کھانے والے ملک میں اور زیادہ ہو جائیں اور کیا نتیجہ حاصل ہو سکتا ہے؛ ہم کو صاف صاف بتاؤ کہ لاہور یونیورسٹی کالج نے جن لوگوں کو.... پر دفینیشی اور ہائی پر دفینیشی کے خطاب مرحمت فرمائے ہیں وہ کس مرض کی دوا ہیں اور اُن سے ملک کو قوم کو، اُس کی دولت کو، اُس کی حکومت کو، اس کی تجارت کو، اُس کے اخلاق کو، اس کی روشن ضمیری کو اور اس کی وسعت خیالات کو کیا فائدہ پہنچایا آئندہ پہنچ سکتا ہے؛ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ اس تعلیم کے مقصد یہ ہے کہ ایسے نہ ہونے پائیں تو سب کچھ تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد سرسید نے اس اعتراض کا راسخٹنگ سوسائٹی جو انہوں نے علیگڑھ میں قائم کی تھی وہ بھی تو اسی اصول پر مبنی تھی کہ مغربی علوم ترقیوں کے ذریعہ سے ملک میں شایع کیے جائیں۔ جواب دیا ہے، اور جو آسمان و زمین کا فرق سوسائٹی کے قیام کے وقت میں اور موجودہ زمانہ میں ہو گیا تھا اُس کو دکھایا ہے اور لکھا ہے کہ "اُس زمانہ کے مناسب حال بلاشبہ ایک شخص کو جو تپتے دل سے اپنی قوم اور ملک کی ترقی کا خواہاں ہو، اس خیال کا پیدا

ہونا کہ ہم ویسی زبان کے ذریعہ سے اپنے ملک و قوم کو ترقی دیں نہایت
 سچا اور واجب خیال ہو سکتا تھا، مگر رفتہ رفتہ تمام حجاب رفع ہوتے
 گئے اور خود زمانے نے بتا دیا کہ ہر جاتے ہو اور ٹھیک رستہ کدھر ہے۔
 پھر اس شکل کو اس طرح ختم کیا ہے کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ پنجاب یونیورسٹی
 کسی اصول پر قائم ہو، صحیح پیر یا غلط پیر، ہم کو کچھ زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکتی
 اور اس لیے ہم ضرورت نہیں سمجھتے کہ پنجاب یونیورسٹی پر کوئی حملہ کریں۔ ہاں۔
 بلاشبہ ہم کو اس وقت خوف پیدا ہوتا ہے جبکہ ہم ایسے لوگوں کو جن کے ہاتھ
 میں خدا نے ہمارے ملک کی بھلائی کیسائی نفع نقصان سپرد کیا ہے، مردہ مشرقی
 علوم و مشرقی زبانوں کے زینہ کرنے پر اٹل پلٹے ہیں تو ضرور سمجھتے ہیں
 بلکہ بہ لحاظ حب قومی اپنا فرض جانتے ہیں کہ اس امر کو بیان کریں کہ مردہ
 علوم مشرقی اور مشرقی زبانوں کے زندہ کرنے کی فکر میں پڑنا ہمارے لیے،
 ملک کے لیے، بلکہ گورنمنٹ کے لیے کچھ بھلائی نہیں ہے، اپنی قوم کو بھلتے
 ہیں کہ ان کا مقصد مغربی علوم و مغربی زبان کو اعلیٰ درجہ تک حاصل کرنا تو ایسا ہے
 اور گورنمنٹ سے التجا کرتے ہیں کہ ہندوستان میں یورپ کے علوم اور یورپ
 کی حکمت کو ترقی دینا اس کا مقصد ہو۔

الہ آباد یونیورسٹی کی مخالفت

پھر ۱۸۸۹ء میں جب کہ الہ آباد یونیورسٹی اسی اصول پر جس پر پنجاب یونیورسٹی
 کے قائم ہونے کا گمان تھا، قائم ہونے لگی اور سرسید کو معلوم ہوا کہ سرولیم پیو
 لفٹنٹ گورنر سابق جو مشرقی علوم کے بڑے قدر دان تھے ان کی پرانی تجویز کے
 موافق یہ یونیورسٹی بھی اسی غرض سے قائم ہونے والی ہے کہ مشرقی علوم اور

مشرقی زبانوں کو ترقی دے تو انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی کی بھی اسی شد و مد کے ساتھ مخالفت کی جیسے کہ پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت کی تھی۔ چنانچہ ان کے ایک آرٹیکل کے چند جملے بطور نمونہ کے میاں کہے جاتے ہیں۔ انھوں نے کہا: "افسوس ہے کہ لوگوں میں یہ خیال سچتہ ہوتا جاتا ہے اور دن بہ دن اس کو وسعت ہوتی جاتی ہے کہ الہ آباد یونیورسٹی ایک نفل پنجاب یونیورسٹی کی ہوگی۔ شاید اس کی صورت میں کچھ تبدیلی ہو گراس کی پالیسی وہی ہوگی جو پنجاب یونیورسٹی کی تھی۔ پس علوم مشرقی کی ترقی کا دھوکا دے کر انگلش ہائی ایجوکیشن کو گھٹانا اور جس طرح ایک تیلی اپنے کوٹھو کے بل کی آنکھیں بند کر کے دن رات ایک ہی سرکل میں کوٹھو کے گرد پھراٹے جاتا ہے اسی طرح ہندوستانی رعایا کی آنکھیں بند کر کے دن رات ایک ہی چکر میں ڈالے رکھنا بے شک ایک مہذب گورنمنٹ کا کام ہے۔ ہم اپنا یقین ظاہر کرتے ہیں کہ الہ آباد یونیورسٹی پنجاب یونیورسٹی کی بہن نہیں ہونے کی وہ انگلش ہائی ایجوکیشن کے لیے بمنزلہ ایک مادر مہربان کے ہوگی۔ لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ ہمارا خیال غلط ہے تو یہ سوال پیش آتا ہے کہ ہم کو کیا کرنا چاہیے! ہماری ماٹھے میں اس کا جواب صاف ہے، استقلال، استقلال، استقلال، ہمت، ہمت، ہمت، کوشش، کوشش، کوشش، ہم کو گورنمنٹ کی پالیسی کی کچھ پروا نہیں کرنی چاہیے اور خود اپنے لیے انگلش ہائی ایجوکیشن کے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اگر ہم میں سیلف رسپکٹ کا کچھ اثر باقی ہے تو گورنمنٹ کو دکھا دینا چاہیے کہ بلاشبہ گورنمنٹ کو لوگوں کی جانوں سپا اختیار ہے مگر لوگوں کی رائیں پر نہیں۔ اگرچہ بالیقین یہ نہیں کہا جاسکتا کہ سرسید کی تحریروں کا کیا اثر ہوا اور آریانی الواقع پنجاب یونیورسٹی اور الہ آباد یونیورسٹی کا مقصد مشرقی علوم

کی آڑ میں انگلش ہائی ایجوکیشن کو گھٹانا تھا یا نہیں مگر اس میں شک نہیں کہ جوہ
 خیالات دونوں یونیورسٹیوں کی نسبت شمالی ہندوستان کے تعلیم یافتہ
 گردہ میں پھیل گئے تھے اور جوہاں تک کہ معلوم ہوا ہے وہ خیالات محض بے بنیاد
 نہ تھے۔ اب تک علانیہ طور پر ان کا کچھ ظہور نہیں ہوا۔ بظاہر دونوں یونیورسٹیوں
 میں کوئی ایسا قاعدہ نہیں پایا جاتا جو ہائی ایجوکیشن کا سہرا ہو۔ بے شک پنجاب
 یونیورسٹی جس طرح بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں دیتی ہے اسی طرح اوٹیل
 کالج کے طلبہ کو بی او ایل اور ایم ایل یا بالغ العلوم اور مالک العلوم وغیرہ کی
 بھی ڈگریاں دیتی ہے مگر جیسا کہ سر سید نے کہا تھا کہ ”اس میں ناکامی کا بیج
 اس لیے وہ آپ ہی آپ ناکام ہو جائے گی“ اور ٹیل کالج روز بروز تنزل
 کرتا جاتا ہے اور کچھ عجب نہیں کہ ایک عرصہ کے بعد وہ فضول سمجھ کر توڑ
 دیا جائے۔

سر سید نے جو مذکورہ بالا آرٹیکلوں میں مشرقی علوم یعنی قدیم منطق فلسفہ
 طبیعیات اور ہیئت وغیرہ جن کا درس و تدریس مسلمانوں میں قدیم سے
 جاری ہے اور مشرقی زبانوں کو ترقی دینے یا دسی زبانوں میں مغربی علوم
 کے شائع کرنے پر اس قدر لے دے کی ہے اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے
 کہ وہ اس کے بالکل مخالف تھے۔ مشرقی زبانوں کی نسبت انہوں نے خود
 اپنے پہلے آرٹیکل میں لکھا ہے کہ ”بلاشبہ ہم اس بات کو کہ پنجاب یونیورسٹی
 کالج، قدیم مشرقی زبانوں کو ترقی دے، پسند کرتے ہیں کیونکہ قدیم لینگوج ماڈرن
 لینگوج کی زیور ہیں۔“ اسی طرح انہوں نے مغربی علوم کے دسی زبانوں میں
 ترجمہ ہونے کی نسبت دوسرے آرٹیکل میں لکھا ہے کہ ”ہم تسلیم کرتے ہیں
 کہ عام تعلیم کے لیے ہماری زبان نہایت عمدہ وسیلہ ہے جو تحصیل و تہائی

مکتبوں میں محدود رہنی چاہیے۔ اس کے سوا انھوں نے ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں خود اس مضمون کا رزلویشن پیش کیا تھا کہ ”علوم عربی جو ہماری قومی نشانی ہیں اور علوم مذہبی جو ہماری روحانی تربیت کا ذریعہ ہیں بدستور قائم رہیں اور مسلمانوں کے اوقاف کا روپیہ ان کی ترویج اور ترقی میں صرف کیا جائے۔ پس انھوں نے جو علی العموم مشرقی علوم اور مشرقی لٹریچر اور دیسی زبانوں کے ترجموں کی مخالفت کی ہے اس سے ان کا صرف یہ مطلب ہے کہ ہندوستان کے کالجوں میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم محض انگلش لیگنوج کے ذریعہ سے ہونی چاہیے نہ یہ کہ کالجوں میں انگلش لیگنوج بطور سیکنڈ لیگنوج کے برائے نام رہ جائے اور اصل مقصود مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں کی ترقی اور مغربی علوم کو بذریعہ دیسی زبانوں کے تعلیم و ترقی قرار دیا جائے۔

ٹیکنیکل ایجوکیشن کی مخالفت

مذکورہ بالا آرٹیکل کے سوا ان کی بشمار شہر میں اسی موضوع پر علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کی جلدوں میں نہ وجود ہیں جن میں شاید سب سے اخیر وہ آرٹیکل ہے جو علی گڑھ گزٹ مورخہ ۱۹ فروری ۱۸۹۸ء میں ان کے مرنے سے سوا مہینے پہلے شائع ہوا تھا اور جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کی موجودہ حالت کے لحاظ سے سر دست ٹیکنیکل ایجوکیشن کی چٹ داں ضرورت نہیں ہے بلکہ سب سے مقدم اعلیٰ درجہ کی واقعی تعلیم کی ضرورت ہے جو بینک بالکل پورے طور پر پوری نہیں ہونی۔ چند برسوں سے جو اکثر اعلیٰ حکام اپنی اسپیریوں میں ٹیکنیکل ایجوکیشن کی ضرورت بیان کرتے تھے اس سے بھی سرسید کو یہی اندیشہ ہو گیا تھا کہ گورنمنٹ کا ناشائستگی باقی ایجوکیشن یا لٹریچر کی تعلیم کے موقوف کرنے کا ہے اور اسی لیے جب کوئی ایسی اسپیشل ان کی نظر سے گذرتی تھی وہ ضرور اس کے برخلاف کچھ

شہ کچھ لکھتے تھے اور اسی بنا پر انھوں نے کانفرنس کے پانچویں اجلاس میں ایک رزولوشن ٹیکنیکل ایجوکیشن کے خلاف پیش کیا تھا اور رزولوشن کی تائید میں ایک طویل طویل اسپیک کی تھی جو کانفرنس کی روداد میں مندرج ہے اور جس کا ماحصل یہ تھا کہ اگر ٹیکنیکل تعلیم کالجوں اور اسکولوں میں محض اوپنل طور پر جاری کی جائے اور ہماری اعلیٰ درجہ کی لٹریٹری تعلیم کو اس سے کچھ صدمہ نہ پہنچے تو ہم کو اس میں کچھ عذر نہیں ہو سکتا لیکن اگر موجودہ طریقہ تعلیم میں کوئی ایسی تبدیلی کی جائے جو ہماری اعلیٰ درجہ کی لٹریٹری تعلیم میں مغل ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں یہ بات ظاہر کر دینی چاہیے کہ ہم ایسی تبدیلی سے سخت ناراض ہیں۔ سر سید کو یہ خیال اس سبب سے پیدا ہوا تھا کہ الہ آباد یونیورسٹی میں بغرض ترقی ٹیکنیکل ایجوکیشن یا یہ خیال کہ میں تجاؤز گورنمنٹ متعدد دفعہ ایسے امور پیش ہوئے تھے جو سر سید کے نزدیک علانیہ لٹریٹری تعلیم کو روکنے والے تھے اور انھیں دنوں میں گورنمنٹ شمال مغرب نے ایک رزولوشن بغرض ترقی ٹیکنیکل ایجوکیشن شتہر کیا تھا۔ اور ایک کمیٹی اس بات کے دریافت کرنے کو منعقد کی تھی کہ ٹیکنیکل تعلیم کو کن طریقوں سے ملک کے حق میں مفید بنایا جائے سر سید نے اس خوف سے کہ کہیں یہ سب تمہیدیں باقی ایجوکیشن کے موقوف کرنے کی نہ ہوں یہ رزولوشن کانفرنس کے جلسہ عام میں جس میں ایک ہزار لائق ہندوستانی موجود تھے اس غرض سے پیش کیا تھا کہ اس باب میں ہندوستانیوں کی عام رائے معلوم ہونے کے بعد یونیورسٹی کو اس سے آگاہ کیا جائے چنانچہ یہ رزولوشن جس کی تائید مولوی حسرت اللہ ایم اے اور سٹر ٹھیوڈور بکن نے بڑے زور کے ساتھ کی تھی تمام مجمع کے اتفاق سے پاس ہوا اور الہ آباد یونیورسٹی اور گورنمنٹ شمال مغرب کو اس تمام کارروائی کی اطلاع دی گئی۔

سرستید نے مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے لیے انھیں تدبیروں اور کوششوں پر
بس نہیں کی جو ان کی زندگی کے ساتھ ختم ہونے والی تھیں بلکہ وہ قوم کی تعلیمی مشکلات
کی حل کرنے والی ایک ایسی انجمن چھوڑ گئے ہیں کہ اگر مسلمانوں نے اس کو
قائم رکھا تو وہ تمام معاملات میں جو قومی تعلیم سے علاقہ رکھتے ہیں سرستید کا توہم البدل
ثابت ہوگی

محمد بن ایجوکیشنل کانفرنس کا قائم کرنا

انھوں نے ۱۸۸۶ء میں محمد بن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی
جس کا ذکر پہلے حصہ میں تفصیل کے ساتھ ہو چکا ہے۔ انھوں نے اس قومی انجمن
کو اپنی زندگی میں برابر گیارہ برس تک جاری رکھا اور اس عرصہ میں وہ تمام
مرحلے جو ابتداء ایسے کاموں میں پیش آتے ہیں نہایت خوبی کے ساتھ طے
کر دیے اور آئندہ نسلوں کے لیے رستہ بالکل صاف کر دیا کہ کس طرح
اُس کو چلائیں اور کیونکر اُس سے فائدہ اٹھائیں جو کام قوم کے کرنے کے تھے
ایک جم غفیر کے صلاح دشورے سے قوم کو اُن کے کرنے کی صلاح دی اور
جو باتیں گورنمنٹ پر ظاہر کرنے کی تھیں اُن کو بطور ایک جماعت کی رائے
کے با وقعت صورت میں گورنمنٹ کے کان میں ڈالا اور اپنی بے نظیر
یافت اور حسن تدبیر سے ایک ایسی مجلس کو جس میں تعلیم و تعلم کی روکھی بھکی
باتوں کے موا کچھ نہ تھا، چند سال کے عرصہ میں ایسا دلچسپ بنا دیا کہ پان پانسو
اور ہزار ہزار کوس سے ہندوستان کے مسلمان جو ایسی صحبتوں سے کوسوں
دور بھاگتے تھے خرچ کثیر برداشت کر کے ایسے چاڑ اور انگ کے ساتھ
جیسے کہ لوک پھول والوں کی سیر یا شالا مارے کے میلے میں دور دور سے آتے
ہیں۔ اس علمی مجمع میں آ آ کر شریک ہونے لگے۔

سول سروس فٹڈ اور سول سروس کلاس

ایک اور تدبیر ترقی تعلیم کی جو قوم کی معمولی بے پروائی سے براہ راست پوری نہ ہو سکی، سول سروس کلاس اور سول سروس فٹڈ ایسوسی ایشن کا قائم کرنا تھا جن کو سرسید نے اس غرض سے قائم کیا تھا کہ جو مسلمان اپنی اولاد کو ولایت کی تعلیم کے لیے تیار کرنا چاہیں ان کو محمدن کالج میں ایک خاص طریقہ پر استقامت اور تعلیم دیکھانے اور بعد امتحان کے جو لڑکے ولایت میں جانے کے قابل سمجھے جائیں ان کو چندہ کے ذریعہ سے مدد دیکھانے۔ یہ تجویز بھی اگر عمل جاتی تو مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے حق نہایت مفید تھی۔ یہاں تک کہ ایجوکیشن کلاس کے بندو بھی اس ایسوسی ایشن میں شریک ہونے کی دل سے آرزو کرتے تھے چنانچہ ۱۸۸۴ء میں جبکہ سرسید نے پنجاب کا دوسرا سفر کیا تو لاہور کے مقام میں برہم سماج اور آریہ سماج کے تقریباً پچاس معزز ممبروں نے اور نبل ٹرین ایسوسی ایشن لاہور نے سرسید سے یہ تمنا ظاہر کی تھی کہ "اس ایسوسی ایشن میں اگر ممکن ہو تو ہندوؤں کو بھی شامل کیا جائے وہ بہت خوشی سے اس میں چندہ دینے کو تیار ہیں" اگرچہ اور طریقوں سے ہندو مسلمانوں کے لیے ولایت کی تعلیم کی راہ کھل گئی مگر اس تدبیر میں کچھ کامیابی نہیں ہوئی اور آخر کار وہ کلاس اور وہ ایسوسی ایشن دونوں توڑ دی گئیں۔

کونسل کی ممبری

کونسل کی ممبری کے زمانہ میں جو ملک کی خدمت سرسید نے کی اس کو نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ تمام تعلیم یافتہ ہندوؤں نے برابر تسلیم کیا ہے

پنہا نچے جو ایڈریس انڈین ایسوسی ایشن لاہور نے ۱۸۸۴ء میں اُن کو دیا تھا اُس میں صاف لکھا تھا کہ ”ہندوستان کی قانونی کونسل میں جو آپ نے مہاسیٹ منفعت بخش کارروائی کی اُس کی نسبت یہاں (یعنی ایڈریس میں) صرف سرسری طور پر ذکر کیا جاسکتا ہے اور آپ جو اُس زمانہ میں جبکہ آپ مجلس مذکورہ (یعنی کونسل) میں کام کرتے تھے، بے فائدہ طور پر تمام فرقوں کی بہبودی فکر رکھتے تھے اور قومی خیالات کو دلیری اور راستبازی کے ساتھ ظاہر کرتے تھے اور بڑی سرگرمی کے ساتھ قومی مطالب کا خیال رکھتے تھے اس کے لحاظ سے آپ ہماری طرف سے اور ہمارے ہم وطنوں کی طرف سے دلی احسان مندی کے مستحق ہیں۔“ اس طرح برہم سماج اور آریہ سماج کے ایک معزز ڈپوٹیشن نے جیسا کہ سفر نامہ پنجاب میں مذکور ہے سہسید کی ممبری کونسل کی نسبت یہ الفاظ کہے تھے کہ ”ہم ممبران آریہ سماج اور برہم سماج کے تمام ہندوؤں کی طرف سے آپ کی اُن کوششوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو آپ نے قانونی کونسل میں اور نیز مختلف اوقات میں ہندوستان کے لیے کی ہیں۔ ہندو راجہ مہاراجہ (غالباً یہ اشارہ راجہ شیو پرشاد کی طرف ہے) جن سے بہت کچھ امید کی جاتی تھی ملک کے لیے خیر خواہ نہ ثابت ہوئے لیکن آپ نے حسب الوطنی کو ہاتھ سے نہ دیا اور البرٹنبل اور دیگر مفید ملک تجویزوں کی کونسل میں استقلال کے ساتھ حمایت کی۔“

حاشیہ بتفصیل) لٹ البرٹنبل سے مراد وہ مشہور مسودہ قانون ہے جو لارڈ پرن کے عہد میں وائسرائیل کونسل کے لیگل ممبر سٹر البرٹن نے ۱۸۸۴ء میں یہ اجلاس کونسل پیش کیا تھا اور اسی لیے یہ مسودہ البرٹنبل کے نام سے

مشہور ہو گیا تھا۔ اس مسودہ کا اصل مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی مجسٹریٹوں کو بھی مثل یورپین مجسٹریٹوں کے یورپین اور یوریشین باشندگان ہند کے فوجداری منقدمات کے فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے۔ چونکہ اس مسودہ کو یورپین اور یوریشین باشندوں کے حقوق سے تعلق تھا اس لیے جس قدر کہ لچس لیٹر کنسل میں اور اخباروں میں اس مسودہ پر بحث اور نکتہ چینی اور مخالفت ہوئی تھی ویسی شاید ہی ہندوستان کے کسی مسودہ قانون پر ہوئی ہو۔ ہندوستانی ممبروں میں سے سر سید نے اور آئرلینڈ کے سٹوڈنٹس نے اس مسودہ کی بڑے زور سے تائید کی تھی مگر راجہ شیو پرشاد مثل اکثر یورپین ممبروں کے اس کے مخالف تھے جس کی وجہ سے بنگالی اخباروں میں ان پر سخت تاثر ہوئی تھی۔ جو اسپچ سر سید نے اس مسودہ کی تائید کی تھی اس کو کسی قدر اختصار کے ساتھ ہم اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔

انہوں نے کہا "مائی لارڈ! میں اس بات سے واقف ہوں کہ اس بل کی نسبت اخبارات میں بہت بحث ہوئی ہے اور یورپین اور یوریشین باشندوں کے غیر سرکاری گروہ میں اس کی نسبت بڑا تہلکہ مچا ہوا ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ قانون مجوزہ سے ان کی آزادی خطرہ کی حالت میں ہے۔ اگرچہ ہر طرح پر میری یہ خواہش ہے کہ جو لڑیں یورپین اور یوریشین لوگوں نے ظاہر کی ہیں ان پر بخوبی غور کیا جائے لیکن مائی لارڈ میں اقرار کرتا ہوں کہ جو طریقہ مسودہ قانون سے برخلاف تحریک کرنے والوں نے اختیار کیا ہے اس پر میں دلی افسوس کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ تحریک کرنے والوں نے اختیار کیا ہے اس پر میں دلی افسوس کرتا

بھوٹنوں کے برخلاف نہایت سخت اور کسی قدر بے احتیاطی کے ساتھ
 کلمات استعمال کیے ہیں۔ مائی لارڈ! اس مقام پر میں اپنی دلی امید ظاہر
 کرتا ہوں کہ ہندوستان کے کسی حصہ میں میرے بھوٹن ان شخصوں کی
 پیروی نہ کریں گے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ واضعاً قانون کی غور کے
 واسطے وائل اور دعوتوں کے پیش کرنے کا سب سے عمدہ طریقہ عام
 طور پر مجمع کر کے سخت گفتگو کرنا ہے۔ میرے نزدیک جو مخالفت اس
 مسودہ قانون کی نسبت کی گئی ہے وہ زیادہ تر اس سبب سے ہے
 کہ لوگوں کو اس قسم کے معاملات میں ہندوستان کے قوانین کی تاریخ
 سے واقفیت نہیں ہے اور جو ضعیف تبدیلی قانون مروجہ میں اس بل
 کی رو سے کوئی تجویز کی گئی ہے اس کے سمجھنے میں انہوں نے
 غلطی کی ہے میں کانسیٹیوٹوشنل لا کے مسائل سے واقف ہونے کا
 دعویٰ نہیں کرتا لیکن اس مسودہ قانون کے برخلاف جو یہ حجت پیش
 کی گئی ہے کہ ہندوستان میں حضور قمبر بند کی یورڈین اور یوریشین رعایا
 ایسے حقوق رکھتی ہے جن کے سبب سے وہ ہندوستان کی لجنسیٹیو
 کونسل کے اختیار سے باہر ہے، اس کی قانونی صحت کی نسبت میں بل
 متاثر شبہ کر سکتا ہوں میں ہندوستان کی لجنسیٹیو کونسل کا ایک ناچیز
 ممبر ہونے کی حیثیت سے اس قسم کی پابندی کو ناپسند کرتا ہوں۔ ہم
 نے اپنے اختیارات انگلستان کی بٹری پارلیمنٹ سے حاصل کیے
 ہیں اور جب تک ہم ان اختیارات کی حد سے تجاوز نہ کریں اس
 وقت تک میرے نزدیک ان تمام معاملات میں جو ہندوستان

سے متعلق ہیں، اس کونسل کی قانونی حکومت کی نسبت شبہ کرنا بیجا معلوم ہوتا ہے۔ جو تحریک بالمثل اس مسودہ کے برخلاف کی گئی ہے اس میں ہم انھیں دلیلوں اور راولوں کی تکرار پانے ہیں جو اب سے پہلے خطرہ پیدا کرنے والوں نے اس وقت پیش کی تھیں جبکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی عدالتوں کے ہندوستانی جموں کو صیغہ دیوانی کی ان نالیات کی تجویز کا اختیار دیا گیا تھا جن میں یورپین اور یوریشین فریق مقدمہ ہوں ہیں بغیر اندیشہ تردید کے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ جن مقدمات میں یورپین شریک ہوتے ہیں ان میں ہندوستانی جموں کے اختیارات دیوانی کے عمل میں لانے سے قومی اختلاف کی ٹھیک کوئی نا انصافی بلکہ شکایت بھی نہیں پیدا ہوئی ہے بیشک اس زمانہ کے خطرے پیدا کرنے والوں کے اندیشے بے اصل تھے اور ان کی پیشین گوئی غلط ثابت ہونے والی تھی اس وقت تمام برٹش انڈیا میں ہندوستانی جج اہل یورپ پر اختیارات دیوانی ایک ایسے طریقہ میں استعمال کرتے ہیں جو درحقیقت اس الزام کے لائق نہیں ہے کہ قومی امتیاز کا اس میں اثر پایا جاتا ہے۔ لیکن بعض اوقات یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ دیوانی کا اختیار فوجداری کے اختیار سے مختلف ہے۔ دیوانی کا اختیار صرف جائیداد پر موثر ہوتا ہے اور فوجداری کا اختیار ذاتی خصانت اور آزادی پر پس ہندوستانی جموں کے دیوانی کے اختیار کی اطاعت سے یہ لازم نہیں آتا کہ فوجداری کے معاملات میں بھی ان کے اختیار پر رعنا مندی ظاہر کی جائے۔

”مائی لارڈ! میں اس وجہ کو نہیں سمجھ سکتا جس پر یہ امتیاز مبنی ہے۔ عدالت ہائے دیوانی کی ڈگریات ایک شخص کو دو لٹمنٹس مٹلس کر سکتی ہیں، دیوانی کے بعض صیغے صرف ذاتی تعلقات ہی سے متعلق نہیں ہوتے مگر ان میں ذاتی گرفتاری کے اختیارات بھی شامل ہوتے ہیں اور انصاف کی غرض سے ان میں اس قسم کی کارروائی کی اجازت دی گئی ہے جو فوجداری کی عدالتوں کے واسطے قرار دی گئی، دیوانی کے مقدمات میں واقعات کی نسبت نتیجوں کے قرار دینے کا قاعدہ زیادہ تر وہی ہے جیسا فوجداری کے مقدمات میں ہوتا ہے ہندوستان میں دیوانی اور فوجداری کی عدالتوں میں امرحق کی تحقیقات ایک ہی قانون شہادت کے بموجب کی جاتی ہے، عدالت ہائے دیوانی کی تجویزوں سے فریقین کی نیکنامی پر تفریباً اسی طرح دھبا لگ سکتا ہے اور ان کی عزت برباد ہو سکتی ہے جیسی فوجداری عدالتوں کے احکام سے۔ پس میرے نزدیک دونوں عدالتوں کے جوڈیشل اختیارات میں امتیاز قرار دینے کے لیے کوئی معقول بنیاد موجود نہیں ہے۔ اگر راست بازی انصاف اور قومی بے تعصبی دیوانی کے معاملات میں ہندوستانی حجوں میں پائی جاتی ہے تو اس بات کا سمجھنا مشکل ہے کہ ان میں وہی خصلیتیں فوجداری کے ان مقدمات میں نہ پائی جائیں جن میں یورپین اور یوریشین شریک ہوں، تمام ہندوستانی مجسٹریٹ اب بھی ان مقدمات، فوجداری میں جن میں ایل لیوڈپ نالشی ہوں اور بطور فریق مندر رسیدہ کے عدالتوں سے چارہ جونی کریں، اختیارات

عمل میں لاتے ہیں۔ میں نے اب تک کبھی یہ نہیں سنا کہ یورپین
انگریزی رعایا نے ہندوستانی مجسٹریٹوں سے دادخواہی کرنے میں
کوئی عذر کیا ہو، پس جب کہ یہ صورت ہے تو اس بات کی کوئی
وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہندوستانی مجسٹریٹوں پر ان مقدمات میں
جن میں یورپین انگریزی رعایا کی نسبت ناشیں پیش کی جائیں
اس قسم کا اعتبار نہ کیا جائے۔ جو مجسٹریٹ کو دادرسی کے مجاز ہیں۔
ضرور ہے کہ وہ سزا دینے کے بھی مجاز ہوں اور رعایا کے کسی
فرقہ کا یہ کہنا نا واجب اور بیجا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ہندوستانی
مجسٹریٹوں کے دوہرہ پارہ جوٹی کے واسطے تو جائیں گے لیکن اس
بات کو گوالا نہ کریں گے کہ جو ناشیں ہم پر کی جائے اُس میں وہ ہماری
نسبت تجویز کریں۔ میں یقین کرتا ہوں کہ مھلکہ یہ صحیح اطلاع دی
گئی ہے کہ جزیرہ لنکا میں جو اس ملک کے متصل واقع ہے۔
اور جو برطانیہ کی وسیع سلطنت کا ایک جزو ہے ہندوستانی
مجسٹریٹ اسٹج یورپین انگریزی رعایا پر فوجداری کا اختیار عمل میں
لاتے ہیں اور وہاں اس جوڈیشل ناقابلیت کو جو قومی تفرقہ پر مبنی
ہو، کوئی جانتا بھی نہیں حالانکہ انگریزی سرمایہ اور انگریزوں کی تجارتی
اولوالعزمی کو بجائے اس کے کہ وہ اس جزیرہ سے جاتی رہیں ہو۔
نہایت ترقی ہوئی ہے۔ میرے نزدیک لنکا میں قبوہ کے کاشتکاروں
کے مطالب بنگالہ کے نیل کے کاشتکاروں کے مطالب سے کسی
حالت میں کمتر نہیں ہیں اور لنکا کے باشندے ہندوستان کے باشندوں
کی نسبت کسی طرح پر کچھ کم ایشیائی نہیں ہیں اور نہ لنکا میں ان کا

حاشیہ ۱
کوئی نہایت مضبوط محب قوم بھی میزان شائستگی میں اس سے زیادہ
نہر اعلیٰ رتبہ کا دعویٰ کرے گا جو وہ ہندوستان کے باشندوں کی
نسبت قرار دے گا مگر باوجود اس کے یوروپین انگریزی رعایا پر فوج
واری کے اختیار کے معاملہ میں پٹیش انڈیا کا قانون لڈکا کے قانون
سے پیچھے ہے۔ پس مائی لارڈ! میرے نزدیک یہ کچھ نا واجب
بات نہیں ہے کہ ہندوستان کے باشندے یہ خیال کریں کہ اب
وہ زمانہ آ گیا ہے کہ قانون میں اصلاح کرنے کی شدید ضرورت ہو گئی
ہے۔ مائی لارڈ! جیسا کہ میں نے اس مسودہ کو سمجھا ہے اس میں یہ
تجویز نہیں کی گئی ہے کہ ہر ایک ہندوستانی مجسٹریٹ کو انگریزی
یوروپین رعایا کی نسبت تجویز کرنے کا اختیار دیا جائے بلکہ صرف
انھیں ہندوستانیوں کے معاملہ میں جنھوں نے اپنی مسلمہ راست بازی اور
لیاقت کی بدولت جو ڈیشل سروس میں ایسے عہدے حاصل کیے
جائیں جو رتبہ میں اعلیٰ درجہ کے انگریزی عہدیداروں کے مساوی ہیں
اس مسودہ میں ان جو ڈیشل ناقابلیتوں کے دور کرنے کی تجویز کی گئی
ہے جو قومی امتیاز پر مبنی ہیں، اس قسم کے ہندوستانی عہدیداروں
کی تعداد نہایت محدود ہے اور اس وجہ سے اس مسودہ کی نسبت
یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ وہ بغیر کافی غور و تامل کے پیش کیا گیا ہے یا
اس کے سبب سے وادرسی کے موجودہ ذریعوں میں کسی بڑی عملی
تبدیلی کا ہونا منظور ہے۔

”جس دلیل پر قومی امتیازت کا نہایت لحاظ کیا گیا ہے میرے
تذریک اس میں بڑی غلطی ہے جس چیز کی لوگ ان ملکوں میں جن

کو شائستہ گورنمنٹ کی برکت حاصل ہے اطاعت کرتے ہیں۔ وہ کچھ خاص شخصوں کی حکومت نہیں ہے بلکہ وہ قانون کے احکام ہیں جب تک کہ قانون منصفانہ ہے طرفدار اور با رحم ہوگا اور جب تک اس قانون کا عمل درآمد ٹھیک ٹھیک طور پر کیا جاسکے گا اس وقت تک ان شخصوں کی قومیت جو قانون کی تعمیل کریں، باریک خبیال والوں کے نزدیک بھی چنداں لحاظ کے قابل نہیں مہرنی چاہیے۔ جس چیز کی تعظیم اور ادب اور اطاعت درکار ہے وہ قانون کی حکومت ہے نہ کہ خاص خاص شخصوں کی۔ پس جو لوگ ہندوستانیوں کو اپنی برابری کا مستحق نہیں سمجھتے وہ اگر غور کریں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ ہندوستانی مجسٹریٹ گورنمنٹ کے نوکر ہیں جن کے متعلق گورنمنٹ کے احکام کی تعمیل کرنا ہے۔ قانون کے مناسب عمل درآمد کے واسطے انتظام کرنا گورنمنٹ کا فرض ہے اور اس مقصد کے واسطے گورنمنٹ کو ثبات عمدہ ذریعے جو بہم پہنچ سکیں منتخب کرنے پڑتے ہیں اور یہ ایک پوری اور غیر واجبی تجویز معلوم ہوتی ہے کہ گورنمنٹ کی کوئی رعایا اس بات پر اصرار کرے کہ عہدیداروں کا انتخاب کسی خاص قوم یا فرقہ پر حصر رکھا جائے۔ میرے نزدیک یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کے اصول کی نسبت کسی جدید فیصلہ کی حاجت نہیں ہے، اس سوال کی نسبت اس وقت بحث کی گئی تھی اور اس کا فیصلہ عمدہ طور پر ہو گیا تھا جبکہ انگلستان نے اپنی عالی حوصلگی اور انصاف سے ہندوستان کے باشندوں کو یہ حقوق عطا کیے تھے کہ سلطنت کی ملازمت میں ہندوستانیوں کی اسی حیثیت پر لوکری دیجائے

جیسی کہ خاص انگریزوں کو اس فیصلہ کا پچھلے برسوں میں عملی طور پر
نفاذ کیا گیا ہے اور انتظامی مصلحت اس خفیف تبدیلی کی مقتضی
ہوئی ہے جو اس بل میں بتجویر کی گئی ہے۔

دو لیکن مائی لارڈ! اس مسودہ کی تائید میں انتظامی مصلحت
کی بہ نسبت زیادہ اعلیٰ درجہ کی وجوہات موجود ہیں، یعنی میں آزادی
النصاف اور انسانیت کے ان عمدہ اصولوں کا ذکر کرتا ہوں جن
کی جائے فرار کہیں اس قدر نہیں جیسی کہ اس قوم کی طبیعت میں ہے
جس نے سب سے پہلے غلاموں کو آزاد کیا اور سب سے پہلے
ہندوستانیوں کو اس امر سے مطلع کیا کہ سائٹیوشنل حقوق کے
معاملہ میں قوم و مذہب کے امتیازات کی قانون کی نگاہ میں کچھ وقعت
نہیں ہونی چاہیے تاہم یہ سنی دیتی ہے کہ کسی ملک کی فلاح و بہبودی
کی برباد کرنے والی اس سے زیادہ کوئی بات نہیں ہے کہ حکم
اور محکوم کے درمیان قومی تفرقہ قائم رکھا جائے۔ کوئی شخص مجھ سے
زیادہ اس بات کا خواہاں نہیں ہو سکتا کہ اگر فری قوم اور ہندوستان
کے باشندوں کے درمیان دوستانہ خیالات کو بہ نسبت اس کے
جیسی کہ اب تک ہوئی ہے اور زیادہ ترقی ہو قدرت نے دونوں قوموں
کو ایک پولٹکل اور میں کہہ سکتا ہوں کہ ایک سوشل رشتہ میں ملایا
ہے جس کو جوں جوں زمانہ گزرتا جاوے گا اسی قدر زیادہ استحکام
ہوتا جاوے گا۔ مجھ کو یقین و اتق ہے کہ جب تک قومی امتیازات کو ملک
کے عام قانون میں دخل ہو گا اس وقت تک دونوں قوموں کے
درمیان اصلی دوستانہ خیالات کی ترقی کے باب میں مزاحمتیں قائم

رہیں گی۔ زندگی کی سوشل خوشی اور موافقت پر شکل ہمہری سے اور ایک ہی قانون کے زیر حکم رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ہندوستان میں ذات کا سلسلہ شاید اس قدر عرصہ تک ہرگز قائم نہ رہتا اگر زمانہ قدیم کے متفقین برہمن کے واسطے ایک قانون اور شدر کے واسطے دوسرا قانون نہ بناتے خیر زمانہ سابق کی ضرورتیں کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن مائی لارڈ! میں امید کرتا ہوں کہ انگریزی حکومت کے ڈیڑھ سو برس گذر جانے سے ہم شائستگی کے اس درجہ تک پہنچ گئے ہیں کہ قومی اقدار کو بہر کیفیت ملک کے عام قانون میں کم کرنا ہر ایک وجہ سے مناسب ہے۔ میرے نزدیک یقیناً اب وہ زمانہ آ گیا ہے جبکہ ہندوستان کے تمام باشندے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان یورپین ہوں یا یوریشین اس بات کو سمجھنے لگیں کہ وہ ہمسر رعایا ہیں اور ان کے پر شکل حقوق یا کانسٹیٹیوشنل رتبہ میں قانون کی نگاہ میں کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہیے اور ہندوستان میں انگریزی حکومت کے ماتحت جو حفاظت کا استحقاق ان کو حاصل ہے وہ کچھ قوم یا مذہب کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس بڑے حق کے سبب سے ہے جس میں سب شریک ہیں یعنی اس جلیل القدر شاہنشاہ کی وفادار رعایا ہونے کے حق کے سبب جس کے عہد دولت مہد نے ہندوستان کو امن و آسائش بخشی ہے اور اس کو تجارتی اولو العزمی اور زمانہ شائستگی کے ہنر اور فنون کے اکتساب کے واسطے ایک مناسب تمام بنا دیا ہے۔

” مائی لارڈ! چونکہ یہ موقع غالباً اچیر موقع ہے جو قانونی کونسل

جو کام خاصکر مسلمان معزز خاندانوں کی بھلائی کامر سید نے ممبری کونسل کے
 زمانہ میں کرنا چاہا تھا اُس کا مفصل ذکر پہلے حصہ میں ہو چکا ہے یعنی قانون وقف
 خاندانی کا مسودہ جو بری صحت اور جانفشانی اور اعلیٰ درجہ کی قانونی لیاقت سے
 تیار کیا تھا اور جو بعض قانونی موافقات کے سبب کونسل میں پیش نہ ہو سکا وہ
 کم سے کم اس بات کو ہمیشہ یاد دلانے گا کہ قوم کی بھلائی کی کوئی تدبیر جو خیال میں
 آسکتی تھی عام اس سے کہ ممکن الوقوع ہو یا نہ ہو، اس شخص نے اُس کا تقاضا
 کیے بغیر نہیں چھوڑا۔

نیشنل کانگریس کی مخالفت اور پٹریاٹک

ایسوسی ایشن قائم کرنا

نیشنل کانگریس میں شریک ہونے سے جو ۱۹۰۶ء میں سرسید نے مسلمانوں کو
 باز رکھا اگرچہ افسوس اور نہایت افسوس ہے کہ ان کی اس کارروائی سے تعلیم

سے مخاطب ہو کر گفتگو کرنے کا مجھکو حاصل ہو گا اس لیے میں
 اس اخیر گفتگو کو بغیر کہے اس بات کے ختم نہیں کر سکتا کہ حضو
 کا عہد حکومت اس بات پر دل سے مبارکبادی کا مستحق ہے
 کہ اُس میں ایک ایسا مسودہ قانون پیش کیا گیا جس کے ذریعہ
 سے میں یقین کرتا ہوں کہ حسد انگیز قومی امتیازات بہت کچھ دور
 ہو جائیں گے اور آخر کار حکام اور محکوم کے درمیان اس ملک میں
 جس میں بہت سی قومیں مختلف مذاہب کی رہتی ہیں، دوستی اور باہمی
 ادب اور بھروسہ کو ترقی ہوگی۔

یافتہ ہندوؤں میں عموماً ایک قسم کی ناراضگی مسلمانوں سے پیدا ہو گئی مگر درحقیقت سرسید نے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان کیا کہ ایک خاصہ وار جھڑپی میں جو شاہد اوروں کے لیے درخت بار وار ہوا ان کا دامن الجھنے نہیں دیا۔ سرسید کی اس کارروائی کو اول اول تعلیم یافتہ لوگ نہایت تعجب سے دیکھتے تھے مگر پچھلے دنوں میں پونا کے افسوسناک واقعات نے امید ہے کہ ان کا تعجب رفع کر دیا ہوگا۔ مسلمان جو تعلیم میں نسبتاً سرہٹوں سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے اگر کانگریس والوں کے خیالات عام طور پر ان میں پھیل جاتے تو کچھ شک نہیں کہ وہ اپنی جہالت اور ناعاقبت اندیشی سے بہ نسبت پونا کے برہمنوں کے بہت زیادہ اپنے تئیں گورنمنٹ کی بدگمانی کا نشانہ بنا لیتے اور جب ان پر کوئی ایسا بُرا وقت اڑ پڑتا جیسا پچھلے دنوں میں پونا کے برہمنوں پر پڑا تو جو ہمدردی اہل پونا کے ساتھ لاک نے ظاہر کی اور جس قدم ان کی طرف سے ڈینیس میں سپردی کی گئی اس کا سوا حصہ بھی بد نصیب مسلمانوں کے ساتھ نہ مسلمانوں کی طرف سے اور نہ غیر قوموں کی طرف سے ظہور میں آنے کی امید تھی۔ اگر اس میں کسی کو شک ہو تو وہ مولوی ہدایت رسول کی مثال پر غور کرے جو کانگریس کے بعض جلسوں میں شریک ہو کر بنگالیوں سے آزادی کا سبق پڑھ کر آئے تھے اگر عام مسلمانوں میں جو تعلیم سے عموماً بے بہرہ ہیں اور جن میں شکل سے پچاس ہزار میں ایک تعلیم یافتہ نکلے گا۔ کانگریس میں گروہ کے خیالات پھیل جاتے تو ان سے اکثر ایسی ہی نجف اور مالانی حرکتیں سرزد ہوتیں جیسی ہدایت رسول سے لکھنؤ کے ایک عام مجمع میں سرزد ہوئی اور جب وہ عدالت میں ماخوذ ہونے تو اپنے ہمیں ویسا ہی بے یار مددگار پاتے جیسا مولوی ہدایت رسول کا حال ہوا کہ اسکو منہات تک میسر نہ آئی اور جو سزا عدالت مانتے نے اس کے لیے تجویز کی اس کو بے چون و چرا اٹھانا مہرم کی طرح

پس اگرچہ مسلمانوں کی علیحدگی سے ہندوؤں میں ناراضی پھیل جانے کا نہایت افسوس ہے لیکن کانگریس کی شرکت میں جو مضر نتائج مسلمانوں کے حق میں پیدا ہونے والے تھے وہ ان کے لیے اس سے بہت زیادہ افسوس ناک ہوتے اس لیے مسلمانوں کو سرسید کا دل سے شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس شخص کی چیخ پکار سے وہ ایک ایسے ایجنڈیشن میں جو دیوانوں کے لیے ہوئی آواز اور ہشیاروں کے لیے خالی بادل کی گرج تھی، شریک ہونے سے باز رہے اصل بات یہ ہے کہ جب ہم کانگریس کے بلند ارادوں پر نظر کرتے ہیں اور پھر اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھتے ہیں تو ہم کو لامحالہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ "حلو خوردن لاروئے باید" ہماری قوم میں عموماً پھوٹ پڑی ہوئی ہے۔ مذہبی تعصبات مازہ اکالہ کی طرح قوم کو فنا کر رہے ہیں، ہر فرقہ دوسرے فرقہ کی جان کا مال کا عزت و آبرو کا خواہاں ہے، پولیس ہمارے مذہبی بھگڑوں کی تحقیقات کرتے کرتے اور حاکم سنا میں دیتے دیتے ٹھک گئے مگر ہم رٹنے بھگڑنے کے لیے اسی طرح تازہ دم ہیں، تمام قوم ہزاروں بیہودہ رسموں کی پابندی میں گرفتار ہے۔ اسراف اور فضول خرچی ہماری قومی خصیت بن گئی ہے، صد ہا خاندان اپنی فضولیوں کے سبب بگڑ گئے اور بگڑتے چلے جاتے ہیں کروڑ ہا روپیہ کی جائیداد قرضہ کی ڈگریوں اور عدالت کے بھگڑوں میں غیر قوموں کے پاس منتقل ہوتی چلی جاتی ہے، تقسیم کے لحاظ سے اگر بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو ابھی ہم نے الف بے تے شروع کی ہے۔ سورتوں کی تعلیم جو قومی ترقی کی جڑ ہے، اس کے لحاظ سے ہم اب تک بالکل مضر ہیں، تجارت میں گویا ہمارا کچھ حصہ ہی نہیں دولت

کو ہمارے ساتھ وہ نسبت ہے جو پانی کو چھلنی کے ساتھ ہے، لاکھوں مسلمان شہر شہر اور گاؤں گاؤں بھیک مانگتے پھرتے ہیں مگر ہم اس کا کچھ تدارک نہیں کرتے، ہزاروں اشرف خاندانوں کے لاوارث اور مفلس بچے آوارہ اور مطلق العنان پھرتے ہیں مگر ہم سے ان کی پرورش اور تعلیم کا کچھ انتظام نہیں ہو سکتا، ہماری حالت پر فی الواقع یہ مثل صادق آتی ہے کہ "اونٹ سے اونٹ، قہری کونسی کل سیدھی" جب کہ ہماری قوم کا یہ حال ہے تو کس برتنے پر ہم نیشنل کانگریس میں شریک ہو سکتے ہیں اور کیا منہ کر ہم گورنمنٹ سے ان حقوق کا مطالبہ کر سکتے ہیں جن کے ہم مستحق نہیں ہوتے۔ ہم کو پہلے اس سے کہ گورنمنٹ سے کچھ مانگیں، مانگنے کا استحقاق پتہ کرنا چاہیے اور پہلے اس سے کہ گورنمنٹ سے ان اصلاحوں کے خواستگار ہوں ہو اس کے اختیار میں ہیں ہم کو وہ اصلاحیں کرنی چاہیں جو خود ہمارے اختیار میں ہیں۔ ہم کو اپنی معاشرت، مذہب، اخلاق اور تعلیم و تربیت کے متعلق ہزاروں کام کرتے ہیں جن کے بغیر ہماری دنیا اور دین دونوں خراب ہیں پھر ہم سلطنت کی کسی بات کی توقع رکھتے ہیں۔ ہم کو اپنے نبی کا یہ ارشاد یاد رکھنا چاہیے کہ "عَالَمٌ لَمْ يَكُنْ" یعنی جیسی تمہاری حالت ہوگی ویسی ہی تم پر حکومت کی جائے گی، اس لیے سرسید نے اپنی لکھنؤ والی اسپچ کے آخر میں مسلمانوں کی یہ نصیحت کی تھی کہ "گورنمنٹ سے حقوق طلب کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ اپنے تئیں ان حقوق کا مستحق بناؤ" اور کہا تھا کہ "جو چیز تم کو اعلیٰ درجہ پر پہنچانے والی ہے وہ صرف باقی ایجوکیشن ہے جب تک ہماری قوم میں ایسے لوگ پیدا نہ ہوں گے ہم ذلیل رہیں گے، اوروں سے پست رہیں گے اور اس عزت کو نہ پہنچیں گے جس پر پہنچنے کو ہمارا دل چاہتا ہے، یہ دلسوزی کی چند نصیحتیں ہیں جو میں نے

تم کو کی ہیں مجھے اس کی کچھ پروا نہیں ہے کہ کوئی مجھے دیوانہ کہے یا اور کچھ، میرا فرض تھا کہ میرے نزدیک جو باتیں قوم کی بھلائی کی ہیں وہ ان سے کہہ دوں اور اپنا فرض ادا کروں اور خدا کے سامنے جوقادر مطلق اور رحیم اور گناہوں کا بخشنے والا ہے۔ اپنے ہاتھوں کو دھو دوں۔

یہ بے سلسلہ سرسید کی سرکاری، ملکی اور قومی خدمات کا جن میں بعض ایسی جلیل القدر ہیں کہ جس قوم میں ایک مثال بھی ایسی خدمات کی پائی جائے وہ قوم کم سے کم دنیا کی نظر میں حقیر نہیں سمجھی جاتی، جیسا کہ کہا گیا ہے

”مَنْ تَخَلَّى تَمِيمٌ وَنَ كَرِيْمٌ وَمُسْلِمَةٌ ابْنُ عَمْرٍا وَنَ قَسِيْمٌ“

(یعنی جب کہ مسلمہ بن عمرو یعنی میرا ممدوح) بنی تمیم میں سے ہے تو یہ کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ بنی تمیم جو ان مردوں سے خالی ہیں)